نشاطِ فلسفہ

ول ڈیورانٹ

مترجم : ڈاکٹر محمد اجمل

Scanned with CamScanner

Shahbaz
Kiani

نشاط فلسفہ

Scanned by Shahbaz Kiani for non-commercial use. 31 May 2020

تصنیف :

ول ڈیورانٹ

ترجمہ :

ڈاکٹر محمد اجمل ایم اے، پی ایچ ڈی، (لندن)

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اہتمام : لیاقت علی
ناشر : "تخلیقات" لاہور
کمپوزنگ : المدد کمپوزرز --- راج گڑھ، لاہور
فون --- 7114647
پرنٹر : المطبعۃ العربیہ
سن اشاعت : اگست 1995
ٹائٹل ڈیزائن : ریاظ
قیمت : -/180 روپے

Scanned with CamScanner

فہرست مندرجات

دعوت فکر: 9

حصہ اول

منطق اور فلسفہ علم

باب اول:- فلسفے کا سحر

1- ابتدائیہ 14
2- ماہرین فلسفہ علم 16
3- عالمان دین 18
4- سائنس دان 21
5- سائنسوں کی ملکہ 25

حصہ دوم

منطق اور فلسفہ علم

باب دوم:- حقیقت کیا ہے؟

1- حواس اور عقل 30
2- رموز علم 36
3- عقل اور جبلت 43

حصہ سوم

مابعد الطبیعات

باب سوم:- مادہ، زندگی اور ذہن

1- لاادری کا مقدمہ 50
2- مادیت 51
3- عینیت 54
4- مادہ کیا ہے؟ 56
5- زندگی 61
6- مادہ پرست کا نظریہ 63
7- عینیت پرست کا جواب 66

Scanned with CamScanner

8- ترکیب 68

باب چہارم:- کیا انسان ایک مشین ہے؟

1- تناظر 71
2- میکانکیت 75
3- جبریت 80
4- حیاتیات کا عہد 86

حصہ چہارم

مسائل اخلاق

باب پنجم:- ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق

1- اخلاق کی اضافیت 89
2- زراعتی نظام اخلاق 91
3- صنعتی نظام اخلاق 94
4- ہمارے بداخلاق بزرگ 98
5- خاندان 100
6- اسباب 102

باب ششم:- اخلاق اور بداخلاقی

1- اخلاق، ذہانت کی حیثیت سے 105
2- فطری اخلاق 107
3- اخلاق کی کسوٹی 111
4- عالمگیر اخلاق 114
5- جنس اور اخلاق 115

باب ہفتم:- عشق

1- ہم عشق کیوں کرتے ہیں؟ 117
2- ایک حیاتیاتی نظریہ 118
3- بدنیاتی بنیاد 120
4- روحانی ارتقاء 124

باب ہشتم:- مرد اور عورت

1- محبت کی جنگ 130
2- شخصیت کے اختلافات 132

Scanned with CamScanner

(الف) نسلی جبلتیں 132
(ب) انفرادی جبلتیں 134
(ج) اجتماعی جبلتیں 137
3- ذہنی اختلافات 139
4- عورت اور فطنیت 142
5- کیا یہ اختلافات فطری ہیں؟ 144

باب نہم :- عصر حاضر کی عورت

1- انقلاب عظیم 147
2- اسباب 149
3- ہماری بیٹیاں 153
4- ہماری بڑی بوڑھیاں 157

باب دہم :- شادی کی شکست

1- شادی کا ارتقاء 161
2- شادی کا تنزل 164
3- شادی کی تعمیرنو 168
4- بچے پیدا کرنا 174

باب یازدہم :- بچوں کے متعلق ایک اعتراف

1- ذاتی 177
2- جسمانی 178
3- اخلاقی 180
4- جنسی 186
5- ذہنی 187
6- دربارۂ سرور 192

باب دوازدہم :- شخصیت کی تعمیرنو

1- شخصیت کے عناصر 193
2- سلبی شخصیت 198
3- ایجابی شخصیت 201
4- شخصیت کی دوبارہ تعمیر کرنا 203
5- نسخے 207

Scanned with CamScanner

حصہ پنجم

جمالیات

باب سیزدہم :- حسن کیا ہے؟

1- فلسفیوں کا جمالیاتی شعور 213
2- حیوانوں میں جمالیاتی احساس 215
3- بنیادی حسن : اشخاص 217
4- ثانوی حسن : فطرت 220
5- حسن ثالث : فن 224
6- معروضی حسن 227

حصہ ششم

فلسفہ تاریخ

باب چہار دہم :- تاریخ کا مفہوم ایک مکالمہ 230
1- یوماتوک میں افتتاحیہ 231
2- تاریخ کی مذہبی تاویل 235
3- تاریخ کی جغرافیائی تعبیر 239
4- تاریخ کی نسلی تعبیر 247
5- تاریخ کی معاشی تعبیر 254
6- تاریخ کی نفسیاتی تعبیر 261
7- مجمع تاریخ 268
باب پانزدہم :- کیا ترقی سراب ہے؟
1- ترقی کا آغاز 272
2- ترقی کا عروج 275
3- ترقی یا تنزل 277
4- چند اور فروعی باتیں 281
5- تاریخ کا خلاصہ 283

باب شانزدہم :- تہذیب کی تقدیر

1- اعصابی دور 293
2- اقوام کی فنا 295
3- اقتصادیات اور تاریخ 298

Scanned with CamScanner

4- حیاتیات اور تہذیب 300
5- اجتماعات اور تہذیب 303
6- تہذیب کی بقائے دوام 306
7- امریکا کا مستقبل 307

حصہ ہفتم

فلسفہ سیاست

باب ہفدہم:- آزادی کے محاسن

1- شراب اور آزادی 312
2- آزادی کا مسلک 315
3- مزاجیت 318
4- آزادی کی مشکلات 321
5- جیفرسن کا تصور ریاست 323

باب ہشدہم:- کیا جمہوریت ناکام رہی ہے؟

1- جمہوریت کے ماخذ 327
2- جمہوریت کا زوال 329
3- جمہوریت کے طریقہ ہائے عمل 334
4- عطائی نسخہ 338

باب نوزدہم:- رئیسیت

1- رئیسیت کا احیاء 342
2- طرز ہائے حکومت 343
3- سیاستدانی 345
4- قدامت پسندی 347
5- حکومت اور تہذیب 348
6- جمہوریت اور انتشار 350
7- رئیسیت کی خامیاں 352
8- ایک اور عطائی نسخہ 354

باب بیستم:- ہم نے جنت الارض کیونکر بنائی؟

1- جنت الارض کے فوائد 358
2- میئر جاگتا ہے 361
3- وہ عظیم مجلس مشاورت 362

Scanned with CamScanner

4- تعلیم کے ذریعہ حکومت 365
5- لکھ پتیوں کی اشتراکیت 367
6- جنت الارض کے لیے سرمایہ 369
7- لیکن در حقیقت 370

حصہ ہشتم

مذہب ---- ایک مکالمہ

باب بست و یکم :- باغ میں: مذہب کی تشکیل

1- مادہ میں روح دیکھنا 375
2- سحر 380
3- ٹوٹم اور تحریم 384
4- آبا پرستی 385
5- فطرت پرستی 387

باب بست و دوم :- کھانے کی میز پر: کنفیوشس سے مسیح تک

1- کنفیوشس 395
2- تصوف 398
3- یہودیت 401
4- مسیحیت 406
5- کیتھولک مسلک اور پروٹسٹنٹ مسلک 413

باب بست و سوم :- کتب خانہ میں: خدا اور بقا

1- بقا 418
2- خدا کے تغیر پذیر تصورات 425
3- مذہب کا منصب 432
4- خدا کا نیا تصور 439

حصہ نہم

باب بست و چہارم :- زندگی اور موت

1- بچپن 443
2- شباب 445
3- کہولت 447
4- موت 450

Scanned with CamScanner

دعوت فکر

اس کتاب میں ایک مربوط فلسفہ حیات ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری کتاب "داستان فلسفہ" میں بڑے بڑے مفکروں کی شخصیتوں اور ان کے فلسفوں کو بیان کیا گیا تھا اور انہیں آسان زبان میں ادا کرنے اور موجودہ حالات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے برعکس اس کتاب میں فلسفہ کے مسائل کو سلجھایا گیا ہے۔ لیکن اس کتاب میں نہ قصے کہانیاں ہیں اور نہ عظیم مفکروں کے اقوال، جن سے پہلی کتاب میں موضوع کی گرانباری گوارا بن جاتی تھی۔ لیکن اس سے شاید ہمیں یہ فائدہ ہو کہ ہم اپنی زندگی کے مسائل کے قریب تر آ جائیں کیونکہ یہاں ہمارا موضوع خود ہماری ذات ہے۔

جب سے دولت اور فلسفہ کے ظہور نے یونان کے روایتی مذہب کو ختم کیا ہے، انسانی کردار اور ایمان میں کبھی اتنی گہری اور خطرناک تبدیلیاں نہیں ہوئیں جتنی آج کل ہو رہی ہیں۔ آج پھر سقراط کا زمانہ ہے۔ ہماری اخلاقی زندگی خطرہ میں ہے اور پرانے رسوم و عقائد کے انحطاط سے ہماری ذہنی زندگی میں تب و تاب اور وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ ہمارے خیالات اور اعمال کی بنیاد ندرت اور تجربہ ہے۔ کوئی بات قطعی طور پر طے شدہ اور یقینی نہیں رہی۔ ہمارے زمانہ میں جس سرعت سے طرح طرح کی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ پیر-کلین کے عہد میں بھی نہیں ہوئیں۔ ہر چیز بدل گئی ہے۔ ان اوزاروں سے لے کر جو ہماری مشقت کو پیچیدہ بناتے

Scanned with CamScanner

ہیں اور ان پہیوں سے لے کر جو ہمیں زمین پر گھمائے پھرتے ہیں، ہمارے جنسی تعلقات کے نت نئے اسالیب اور ہماری روحوں کی المناک حقیقت پسندی تک، ہر چیز بدل رہی ہے۔ زراعت سے صنعت، دیہات سے قصبہ اور قصبے سے شہر کے ارتقا نے سائنس کے مقام کو بلند تر کر دیا ہے، اور فن کی حیثیت کو گرا دیا ہے۔ فکر کو آزادی ملی ہے۔ ملوکیت اور رئیسیت کا خاتمہ ہوا ہے۔ جمہوریت اور اشتراکیت نے جنم لیا ہے۔ عورت کو حریت حاصل ہوئی ہے۔ شادی کے علائق اور پرانے اخلاقی نظام شکستہ ہو گئے ہیں۔ رہبانیت کی جگہ عیاشی اور پارسائی کی جگہ لذت پرستی نے لے لی ہے اور تعیش کو سکون قلب سے بلند تر مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ جنگوں کی تعداد کم تو ہو گئی ہے لیکن وہ خطرناک تر ہو گئی ہیں۔ ہم سے ہمارے محبوب ترین مذہبی عقائد چھن گئے ہیں اور ان کے عوض میں ہمیں ایک میکانکی اور قسمت پرست فلسفہ حیات کا غلام بننا پڑا ہے۔ یہ سب کچھ سائنس کے ارتقا کا نتیجہ ہے اور ہم اس انقلاب میں کوئی مرکز اور استحکام تلاش کر رہے ہیں۔

ہر پھلتے پھولتے تمدن میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب پرانے رجحانات اور عادتیں نئے حالات پر قابو پانے کے لیے ناکافی ثابت ہوتی ہیں اور قدیم نظام اخلاق، زندگی کے اٹل نشوونما کے بوجھ سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ جب سے ہم نے کارخانوں اور دفتروں کی خاطر کھیتوں اور گھروں کو خیرباد کہا ہے، ہر شعبہ زندگی میں فطری اسالیب ترتیب و عمل ٹوٹ گئے ہیں۔ عقل نئے نئے تجربوں میں اس لیے الجھ رہی ہے کہ جبلتوں کی آبائی آمادگی اور سادگی کو شعوری ہدایت کے سپرد کر دیں۔ بچوں کی غذا کے بارے میں مصنوعی اصولوں اور ہمارے ژولیدہ دماغ ماہرین غذائیات کی حیاتین سے لے کر تجارتی بدنظمیوں کو دور کرنے کی کوششوں تک، ہر مسئلہ میں ہمیں فکر و تدبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہم اس آدمی کی طرح ہیں جو اپنی ٹانگوں کے متعلق سوچے بغیر چل نہیں سکتا یا اس کھلاڑی کی طرح ہیں جو کھیلتے وقت بھی اپنی ہر حرکت کا تجزیہ کرنے پر مجبور ہے۔ جبلت کی وحدت ہم سے جدا ہو گئی ہے۔ ہم فکر اور تشکک کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں۔ وسیع علم اور طاقت کے باوجود ہم اپنے مقاصد، اپنی اقدار اور اپنے منصوبوں کے متعلق کوئی پختہ یقین نہیں رکھتے۔

کسی صحت مند ذہن کے لیے اس انتشار سے ایک ہی مناسب راہ فرار ہے اور وہ یہ کہ وہ لمحہ اور جزو سے ابھر کر کل پر غور کرے۔ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے ایک مربوط زاویہ نگاہ کھو دیا ہے۔ زندگی ہمارے لیے اس قدر پیچیدہ اور متحرک ہو گئی ہے کہ ہم اس کی وحدت اور اہمیت کی تھاہ نہیں لا سکتے۔ ہم شہری نہیں رہے، فقط افراد بن کے رہ گئے ہیں۔ ہم ایسے مقاصد سے محروم ہیں جو ہمیں موت سے آگے کوئی بات بجھا سکیں۔ ہم انسانیت کے چیتھڑے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آج ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں کہ زندگی کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لے

Scanned with CamScanner

سکے۔ تجزیہ میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن ترتیب میں کمی۔ ہم ہر شعبہ میں ماہرین سے خائف ہیں اور تحفظ کی خاطر اپنے مخصوص پیشوں کی چاردیواری میں محبوس ہو کر رہ گئے ہیں۔ زندگی کے ڈرامے میں ہر شخص کو اپنا پارٹ تو یاد ہے لیکن وہ اس کے مطلب سے نابلد ہے۔ زندگی بے معنی ہو رہی ہے اور آج جبکہ اس کے بھرپور ہونے کے بہت امکانات ہیں، وہ تہی دامن نظر آتی ہے۔

آؤ، ہم بے باکی سے آتش نمرود میں کود پڑیں اور اپنے مسائل کا اس طرح مطالعہ کریں کہ ہر جزو کل میں سما جائے، ہمارے نزدیک فلسفہ کی تعریف ایک مربوط زاویہ نظر ہے، جس میں ذہن زندگی پر محیط ہو جاتا ہے اور بد نظمی میں وحدت اور ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفہ ہمارے لیے چند بے جان تصورات کو الٹنے پلٹنے کا نام نہیں۔ وہ تصورات جو ہماری روزمرہ زندگی سے کوسوں دور ہیں، بلکہ ان تمام مسائل کا مجموعہ ہے، جو ہماری زندگی کی قدر و اہمیت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ پہلے ہم منطق سے دوچار ہولیں اور پیلاطس کے اس سوال کا جواب دیں کہ "حق کیا ہے؟" ہم پہلے مختصر طور پر فلسفہ علم کو بیان کریں گے اور انسانی عقل کی حدود کو متعین کریں گے۔ ان علوم کو دنیائے فلسفہ میں ناجائز اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں انہیں مختصراً بیان کیا جائے گا کہ قصر فلسفہ میں انہیں اس سے برتر مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہم مابعد الطبیعیات کے مسائل پر غور و خوض کریں گے اور مادیت کے بارے میں کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ فکر مادہ کا وظیفہ ہے کہ نہیں؟ اور "انتخاب" ایک مشین کا، جو عارضی طور پر زندگی سے معمور ہے التباس فکر تو نہیں؟ اس کے بعد ہم اخلاقیات کی اقلیم کی سیر کریں گے، اور اچھی زندگی کی نوعیت دریافت کریں گے۔ ہم اخلاقی انقلاب، شکستہ رشتہ عقد اور بے کیف محبت کے اسباب و نتائج پر غور کریں گے۔ ہم موجودہ زمانہ کی عورت کے بارے میں بے جا احترام یا جذبہ انتقام میں مبتلا ہوئے بغیر اظہار خیال کریں گے۔ ہم زینو اور ایپی کیورس کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کریں گے اور خوشی کے ایوانوں کی تلاش کریں گے۔ ہم اپنے نتائج کو یکجا کر کے تعلیم و تدریس اور شخصیت کی تعمیر کے لیے مشعل ہدایت بنائیں گے۔

چند لمحوں کے لیے ہم جمالیات کے مسائل، حسن کی نوعیت اور آرٹ کی ممکنات کا جائزہ لیں گے۔ ہم تاریخ کا مطالعہ کریں گے اور اس کے مطالب و قوانین متعین کریں گے۔ ہم ترقی کے معانی سمجھیں گے اور اپنے تمدن کے ستارۂ تقدیر پر کمند پھینکیں گے۔ پھر ہم فلسفہ سیاست کی طرف رجوع کریں گے اور سرکش جوانوں کی طرح نراج، اشتراکیت، اشتمالیت، جمہوریت، رئیسیت اور آمریت کے مسائل پر بحث و تمحیص کریں گے۔ فلسفہ مذہب ہمیں ہستی باری تعالیٰ اور بقائے روح کے پرانے سوالوں میں الجھائے گا۔ اور ہم تاریخ مذہب کی روشنی میں مسیحیت کے ماضی اور

Scanned with CamScanner

مستقبل کا مطالعہ کریں گے اور آخر میں یاسیت اور امید آفرینی کے دیو تا ہم کو انسانی زندگی کی لذت و الم کا مفہوم سمجھائیں گے اور پھر کل کا جائزہ لے کر ہم زندگی کی قدر و اہمیت بیان کریں گے۔ یہ سیاحت لامتناہی ہے۔

مصروف ناظر یہ سوال کرے گا، کیا یہ تمام فلسفہ مفید ہے؟ اس طرح کا سوال افسوسناک ہے۔ ہم یہ سوال شاعری کے بارے میں نہیں پوچھتے، حالانکہ شاعری بھی ایک ایسی کائنات کی تخیلی تعمیر ہے، جسے ہم پوری طرح نہیں سمجھ پاتے۔ اگر شاعری ہم پر حسن کے وہ اسرار و رموز واضح کرتی ہے، جنہیں ہماری ناتربیت یافتہ آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں تو فلسفہ ہمیں سمجھنے اور جذبہ عفو سے آراستہ ہونے کی دانش بخشتا ہے۔ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیے؟ یہ ساری کائنات کی دولت سے کہیں زیادہ قیمتی خزانہ ہے۔ فلسفہ ہماری جیبوں کو گرم نہیں کر سکتا اور نہ ہمیں جمہوری ریاست کے معزز عہدوں سے سرفراز کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمیں ان لذتوں سے کسی قدر بے نیاز کر دے کیونکہ آخر دولت اور بلند مرتبوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر ہمارا ذہن بے خبر رہے، ہماری شخصیت متزلزل، ہمارا کردار متوحش، ہماری آرزوئیں اور امنگیں بے ربط، شوریدہ سر اور ہمارا سکون مفقود رہے؟

پختگی حاصل زندگی ہے۔ شاید فلسفہ "بشرط استواری و وفاداری" ہماری روحوں کو وحدت کی صحت سے مالا مال کر دے۔ ہم اپنے تفکر میں کس قدر خام اور بے ربط ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فلسفہ کے ذریعے ہم اپنے خیالات میں صفائی اور ربط پیدا کر لیں، اور متناقض آرزوؤں اور عقیدوں کو اپنے دل و دماغ میں دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیں اور ممکن ہے کہ ذہن کی یہ مرکزیت ہمارے مقاصد میں وہ ہم آہنگی پیدا کر دے، جو شخصیت کی جان ہے اور ہماری ہستی کو توازن اور برتری بخشتی ہے۔ فلسفہ وہ مربوط علم ہے جو زندگی میں آہنگ پیدا کرتا ہے۔ شخصیت کی نظم و ترتیب ہی ہمیں سکون اور آزادی کے بلند مقامات پر لے جاتی ہے۔ علم طاقت ہے، لیکن حکمت ہی ہمیں آزادی کی نعمت سے مالا مال کرتی ہے۔

آج ہمارا تمدن سطحی اور ہمارا علم خطرناک ہے۔ ہمارے پاس مشینیں تو بہت ہیں، لیکن مقاصد کے معاملہ میں ہم مفلس ہیں۔ مذہبی ایمان کی حرارت سے جو توازن ہمیں حاصل تھا، آج معدوم ہے۔ سائنس نے اخلاق کی مافوق الفطرت بنیادیں اکھیڑ دی ہیں اور ساری دنیا ذاتیت کے انتشار میں الجھی ہوئی ہے کیونکہ ہماری شخصیتیں کٹی پھٹی ہیں۔ ہم پھر اس مسئلہ سے دوچار ہیں جس نے سقراط کو پریشان کیا تھا۔ ہم کس طرح ایک فطری اخلاق کی طرح ڈالیں کیونکہ اخلاق کی مافوق الفطرت بنیادیں اب انسانی کردار کو متاثر نہیں کرتیں۔ فلسفہ کے بغیر اور اس وحدت نظر کے بغیر جو

Scanned with CamScanner

مقاصد کو جوڑتی ہے اور تمناؤں اور آرزوؤں کی تہذیب و ترتیب کرتی ہے، ہم اپنی تمدنی وراثت کو کلیت یا انقلابی جنون سے ضائع کر رہے ہیں۔ ہم اپنے امن پسند مقاصد کو تج کر جنگ کی اجتماعی خودکشی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں لاکھوں سیاست دان ہیں لیکن اہل سیاست ایک بھی نہیں۔ ہم زمین پر اس سرعت سے گھومتے ہیں کہ اس سے پہلے کسی قوم کو یہ رفتار نصیب نہیں ہوئی، لیکن ہم یہ نہیں جانتے اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور کیا، جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں ہماری اداس روحوں کو کوئی امن و سکون میسر آ سکے گا؟ ہم طاقت علم کے نشہ میں سرشار ہیں۔ یہ علم ہمیں برباد کر رہا ہے، اور ہمارا علاج "فکر و نظر" کے سوا کچھ نہیں۔

* * *

Scanned with CamScanner

حصہ اول

مقدمہ

باب اول

فلسفے کا سحر

۱۔ ابتدائیہ

آج ہمیں فلسفے سے محبت کیوں نہیں؟ سائنسوں نے جو اس کی اولاد ہیں، اس کی جائیداد کے حصے بخرے کر لیے ہیں اور اسے گھر سے باہر دھکیل دیا ہے۔ یہ ناشکری کی انتہا ہے۔ کسی زمانہ میں عظیم شخصیتیں اس کے لیے جان دینے کو تیار تھیں۔ سقراط نے دشمنوں سے بھاگنے کی بجائے فلسفہ کے لیے جام شہادت پینا منظور کیا۔ افلاطون نے اس کے لیے ایک ریاست قائم کرنے کی خاطر دو مرتبہ اپنی جان خطرہ میں ڈالی۔ مارکس اور پلیئس کو اپنے تخت و تاج سے زیادہ اس سے محبت تھی اور برونو اس کا وفادار ہونے کے جرم میں آگ میں جلا دیا گیا۔ کسی زمانہ میں کلیسا اور حکومتیں اس سے کانپتی تھیں۔ اور اس کے نام لیواؤں کو اس لیے قید و بند میں ڈال دیتی تھیں کہ ان کی وجہ سے حکومتوں کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ ایتھنز کی حکومت نے پروٹیگورس کو جلاوطن کر دیا اور سکندریہ کی حکومت ہائپیشیا سے لرزتی تھی۔ ایک مشہور پاپائے روم نے نہایت منکسر المزاجی سے

ارسٹپس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بادشاہوں نے والٹیئر کو اپنی مملکتوں سے نکال باہر کیا۔ اور جب تمام مہذب دنیا نے اس کے قلم کی طاقت کے سامنے سر جھکا دیا تو وہ حسد سے جل بھن گئے۔ ڈائیونیسئیس اور اس کے بیٹے نے افلاطون کو سائیراکیوز کی حکومت بخش دی اور سکندر کی اعانت نے ارسطو کو تاریخ کا قابل ترین انسان بنا دیا۔ ایک عالم بادشاہ نے فرانسس بیکن کو انگلستان کی قیادت عطا کر دی اور اسے اس کے دشمنوں سے بچایا۔ فریڈرک اعظم، جب نیم شب کو اس کے سارے عظیم الشان جرنیل سو جاتے تھے تو وہ فلسفیوں اور شاعروں سے صحبت فکر و سخن قائم کرتا اور ان کی وسیع اور غیر فانی اقلیموں کو رشک کی نظر سے دیکھتا۔

وہ دن فلسفہ کے لیے عظیم الشان دن تھے جب نہایت دلیری سے اس نے تمام علم کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور ہر مرحلہ پر ذہن کی ترقی کے سلسلہ میں پیش پیش رہا۔ انسان اس وقت اس کی عزت کرتے تھے جبکہ راست بازی کی محبت سے زیادہ کوئی چیز قابل احترام نہیں سمجھی جاتی تھی۔ سکندر، دیو جانس کلبی کو صرف اپنے آپ سے کمتر سمجھتا تھا اور دیو جانس کلبی نے اسے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہونے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ اس کا جسم اس کے اور سورج کی روشنی کے درمیان حائل تھا۔ ارباب سیاست، مفکر اور فنکار خوشی سے اسپیشیا کا کلام سنتے تھے اور دس ہزار طلبا دور دور سے پیرس میں ابی لارڈ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے آتے تھے۔ فلسفہ تب ایک بزدل کنواری بڑھیا نہ تھی جو دنیا کے آلام سے خوف کھا کر کال کوٹھڑی میں پڑی رہتی۔ اس کی تابناک آنکھیں دن کی روشنی سے خائف نہ تھیں، وہ خطروں سے الجھتی اور انجانے سمندروں کے دور دراز سفر طے کرتی۔ اس زمانہ میں جبکہ اسے بادشاہوں کے درباروں تک رسائی میسر تھی، کیا وہ خود کو ان حدود میں محصور کر سکتی تھی جن میں وہ آج اسیر ہے؟ کبھی وہ ایک رنگین روشنی تھی جو حساس ترین روحوں کو حرارت اور نور سے لبریز کر دیتی تھی۔ آج وہ محدود علوم اور تدریسی نظاموں کی ایک حقیر حاشیہ بردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی وہ عقل کی دنیا کی پرتفاخر ملکہ تھی اور بلند ترین انسان تہ دل سے اس کی خدمت کرتے تھے۔ لیکن آج اپنے حسن و قوت سے عاری وہ مفلسی کی حالت میں رہگذر پر کھڑی ہے اور کوئی مفلس سے مفلس شخص بھی اسے محترم نہیں جانتا۔

آج ہمیں فلسفہ سے اس لیے محبت نہیں کہ اس میں بے باکی اور جرات رندانہ باقی نہیں رہی۔ سائنسوں کی اچانک یورش نے ایک ایک کر کے اس سے ساری اقلیمیں چھین لی ہیں۔ علم کائنات اب محض علم سیارہ اور علم ارض بن گیا ہے۔ فلسفہ قدرت اب حیاتیات اور علم الطبیعیات تک محدود ہے۔ فلسفہ ذہن نے نفسیات کا روپ دھار لیا ہے۔ تمام اہم مسائل اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہیں۔ وہ اب مادہ کی نوعیت اور قوت اور نشوونما کے اسرار پر غور نہیں کرتا۔ وہ

"ارادہ" جس کی "آزادی" کے بارے میں اس نے سینکڑوں مرتبہ بحث و تمحیص کے اکھاڑے جمائے، موجودہ زمانہ میں مشینوں کے بوجھ تلے کچلا گیا ہے۔ سیاست، جس کے مسائل کبھی فلسفہ کے مسائل تھے، اب کم ظرف روحوں کی آماجگاہ ہے۔ وہ اب فلسفہ کی شمع ہدایت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اس کے قبضے میں اب صرف چند ویرانے ہیں۔

مابعد الطبیعیات کے یخ بستہ اور سرد مہر مسائل، فلسفہ علم کی طفلانہ پہیلیاں اور اخلاقیات کی بے جان بحثیں، جن کا انسانوں کی روز مرہ زندگی پر ذرا بھی اثر نہیں، لیکن یہ ویرانے بھی اس سے چھن جائیں گے۔ نئی سائنسیں اٹھیں گی اور اپنے ناپ تول کے نئے نئے اوزاروں کے ساتھ ان مملکتوں میں بھی داخل ہو جائیں گی، اور شاید دنیا یہ بھول جائے کہ فلسفہ کا بھی کبھی کوئی وجود تھا، اس نے کبھی دلوں کو گرمایا تھا اور ذہنوں کو روشنی دکھائی تھی۔

۲۔ ماہرین فلسفہ علم

جس انداز سے فلسفیوں نے پچھلے دو سو سال میں فلسفہ لکھا ہے، اس سے وہ بجا طور پر بے حرمتی اور گمنامی کا مستحق بنا ہے۔ بیکن اور سپینوزا کی وفات کے بعد فلسفہ کی کیا حیثیت رہ گئی ہے؟ یہ فلسفہ زیادہ تر فلسفہ علم پر مشتمل ہے۔ اس فلسفہ علم کی نوعیت خارجی دنیا کے وجود کے بارے میں ایک متصوفانہ اور ناقابل فہم دار و گیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ ذہانت جو فلسفیوں کو مملکتیں عطا کرتی تھی، اس استدلال میں الجھ کر رہ گئی ہے کہ آیا سیارے، سمندر اور دوسرے انسان اس وقت بھی موجود تھے جب وہ نظر نہیں آتے تھے۔ اڑھائی سو سال سے یہ آنکھ مچولی جاری ہے، جس سے نہ فلسفہ کو کوئی فائدہ پہنچا ہے نہ زندگی کو، ناشر کی جیب البتہ گرم ہوئی ہے۔

اس صورت حال کی کسی قدر ذمہ داری ڈے کارٹ کے اس سادہ اور معصوم بیان پر عاید ہوتی ہے کہ "میں سوچتا ہوں اس لیے میں موجود ہوں"۔ ڈے کارٹ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے فلسفہ کی ابتدا کم سے کم مفروضات سے کرے۔ اس نے "باقاعدہ شک" کے اسلوب سے تمام تصورات حتیٰ کہ عیاں بالذات حقائق پر شک کی نظر ڈالی اور فقط اس ایک بیان کی اساس پر ایک مربوط فلسفہ کا نظام قائم کیا۔ فکر پر وجود کی اس طرح بنیاد رکھنا ایک نہایت خطرناک اقدام تھا۔ عقل مند لوگ یقینا یہی نتیجہ نکالیں گے کہ اس اساس پر قائم کیا ہوا وجود محض چند پڑھے لکھے لوگوں کا حق ہے اور ستم ظریف لوگ اس کی بنا پر ایک پوری صنف (عورت) کو نہ صرف روح سے بلکہ حقیقت سے محروم کر دیں گے۔

لیکن اس بیان سے سب سے بڑا نقصان فلسفہ کو پہنچا، کیونکہ فقط ایک آدمی کے سوچنے کی

صلاحیت پر دنیا کی حقیقت کی بنیاد رکھنے سے اتنی مشکلات پیدا ہوئیں کہ فلسفیوں کی دس نسلوں نے اپنی ساری قوت فکر انہیں سلجھانے پر صرف کر دی ہے۔ ڈے کارٹ کی ”انا“ یا ”خودی“ ایک روحانی اور غیر مادی حقیقت تھی۔ اب ایک مادی وجود دوسرے مادی وجود سے تعلق کے باعث ہی حرکت کر سکتا ہے، لیکن ایک غیر مادی روح ایک سالماتی جوہر پر کیونکر اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اس مشکل سے مادیت، عینیت اور متوازیت کے فلسفے پیدا ہوئے۔ متوازیت کے پیرو یہ کہتے تھے کہ اگر ذہن اور دماغ اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پہ اثر انداز نہیں ہو سکتا، تو وہ ایک دوسرے کو متاثر کیے بغیر ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ مادہ پرستوں کا بیان تھا کہ چونکہ ذہن یقیناً مادہ پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے اس کا جوہر بھی مادہ ہو گا۔ عینیت پسند فلسفی یہ استدلال کرتے تھے کہ چونکہ فکر کی حقیقت یقینی طور پر عیاں بالذات ہے، اور تمام موجودات اس حد تک حقیقی ہیں جس حد تک ان کا مشاہدہ ہو سکتا ہے، اس لیے مادہ فقط خیالات اور مشاہدات کا ایک مجموعہ ہے۔

اور اس طرح ایک مزے کی جنگ چھڑ گئی۔ اور اب صرف جنگ باقی رہ گئی ہے اس کی لذت غائب ہو گئی۔ کہیں کہیں فلسفہ علم کا ایک ایسا ماہر بھی نظر آتا ہے جس کے چہرہ پر تبسم کھیلتا ہے۔ مثلاً بریڈلے اور ولیم جیمز۔ کبھی کبھی ڈیوڈ ہیوم کی طرح ایک مفکر علم ایسا بھی پیدا ہوتا ہے، جو جانتا ہے کہ اس کا فلسفہ محض ایک کھیل ہے اور اسے شاطرانہ درایت سے کھیلتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ باقی سب سنجیدگی میں مبتلا ہیں۔ جان لاک سے لے کر روڈولف آؤکن تک سب کے چہرے تنے ہوئے ہیں اور ہر نسل کے ساتھ ان کا تناؤ بڑھتا جاتا ہے، ان کی اداسی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تاکہ اپنے اداس فلسفہ کی آبرو قائم رکھیں۔ بشپ بارکلے نے اعلان کیا کہ وہ چیز وجود نہیں رکھتی جس کا مشاہدہ نہ کیا جائے، خواہ یہ مشاہدہ خدا کرے یا انسان۔ اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے بشپ کے ہونٹوں پر تبسم کی لہریں کبھی نمودار نہیں ہوئیں۔ حالانکہ آئرلینڈ کے ایک ایسے ذہین فرزند سے یہ مسلسل متانت کسی قدر بعید ہے۔

یہ بات یقیناً درست اور اس قدر واضح ہے کہ اس کا ذکر بے سود ہے کہ کسی ذہن کے لیے وہی چیزیں حقیقت رکھتی ہیں جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے اور کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اس بات میں اور اس بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جب تک اس کا مشاہدہ نہ کیا جائے۔ بارکلے نے ان دو باتوں کو الجھا دیا تھا اور یہ الجھاؤ ان فلسفیوں کے لیے لازمی تھا جو ہولباخ، مولشاٹ اور بخنر کی بے رنگ مادیت سے سہمے رہتے تھے۔ بارکلے کی یہ کوشش بہت شاندار تھی کہ اس نے ایک ہی چالاک وار سے یہ ثابت کر دیا کہ مادہ کا وجود ہی نہیں ہے اور اس طرح مادیت سے نجات پائی۔ یہ منطق کی شاندار فتح تھی، لیکن فلسفہ کے طالب علموں کے لیے یہ

سبق مضمر ہے کہ وہ دونوں آنکھیں کھلی رکھ کر کسی فلسفی پر نظر ڈالیں، کیونکہ یہ کوشش کسی قدر پر فریب تھی۔ ایک پادری کو بھی اس قسم کے خیر آمیز فریب سے ہچکچانا چاہیے تھا۔ اناطول فرانس نے کہا ہے کہ جھوٹ اور ادب انسان اور حیوان میں تمیز پیدا کرتا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس قسم کا مبنی فلسفہ کس حد تک ادب کے زمرہ میں آسکتا ہے؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فلسفہ علم کے قطعی کوئی مسائل ہی نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ مسائل ہیں اور بے شمار ہیں۔ جیسا کہ شاید ہمارے مشاہدے میں بھی آئے لیکن شاہد و مشہود اور عالم و معلوم کا تعلق، زمان و مکان کی معروضی یا اعتباری حیثیت، یہ تمام معمے نفسیات کا موضوع ہیں اور انہیں متواتر مشاہدہ اور تجربہ کی مدد ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ استحالہ کے مسائل یا گائے کے بھنے ہوئے گوشت کے کیمیاوی تجزیہ کی طرح فلسفہ کے مسائل نہیں ہیں۔ اگر یہ مسائل فلسفہ کے مسائل ہیں تو دنیا کے تمام مسائل فلسفیانہ مسائل ہیں۔ یہ ایک المناک حادثہ ہے کہ جدید فلسفیانہ خیالات کی شاندار تمثیل کے ایک اداکار نے تقریباً ہر کردار نبھانے اور ہر فقرہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ عالمان دین

یہ مفروضہ بھی اسی قدر مضر ہے کہ فلسفہ کا کام سائنٹیفک طرز فکر کا تجزیہ کرنا ہے۔ اس مفروضہ میں بھی آرزو چوری چھپے خیال کو جنم دیتی ہے۔ جب مادہ کے وجود کی دلائل سے تردید نہ ہو سکی تو بے چارے پروفیسروں نے سائنس کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کی ٹھان لی۔ ماخ، پیٹرسن اور پوان کارلے نے اعتراف کیا کہ سائنس کے قوانین قدرت کی عادتوں کے مختلف بیانات ہیں (وہ قدرت جس کا مکمل مشاہدہ کبھی نہیں ہو سکتا) اور یہ قوانین کبھی بھی زیادہ وسیع مشاہدہ کی بنا پر غلط یا نامکمل ثابت کیے جا سکتے ہیں۔ ان عاجزانہ اعترافات میں بعض فلسفیوں نے عقل کو ناقص ثابت کرنے کا شاندار موقع سمجھا کیونکہ سائنس ہمیں کوئی یقینی علم نہیں دے سکتی، بلکہ محض قیاسی علم دے سکتی ہے، اس لیے ہم مذہب کے عجائب خانہ سے وہ تمام طفلانہ عقائد نکال کر نئی نسل کے ہاتھوں یہ کہہ کر بیچ سکتے ہیں کہ یہ محض معمولی طور پر کرم خوردہ ہیں۔ چاروں طرف سے مہذب بزرگ اٹھے اور انہوں نے ریاضی کے تمام بین اصولوں، زمان و مکان کے عدد و پیمائش، کیف و کم کے تصورات کا معائنہ کیا اور نہایت عالمانہ طمطراق سے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی ذہن میں غیر معقول عقائد کی بہت گنجائش ہے۔

اس نامناسب چالاکی کے بعد اگر کوئی دیانت دار انسان فلسفہ سے بدگمان ہو جائے تو اس

میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس تمام منطق سے کیا فائدہ، اگر اس کا تمام استدلال ہماری پوشیدہ آرزوؤں کی تسکین کا بہانہ ہو۔ بریڈلے نے کہا تھا کہ مابعد الطبیعیات ایک ایسا علم ہے، جس میں ہم اپنے جبلی عقائد کے لیے کمزور دلائل تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ان دلائل کو تلاش کرنا بھی ہماری ایک جبلی آرزو ہے۔ کبھی کبھی یہ علم دوسروں کو کسی بات کا یقین دلانے کے لیے کمزور دلائل تلاش کرنے کی کوشش بھی بن جاتا ہے۔ والٹیئر میں یہ اخلاقی جرات تھی کہ اس نے کہا ''میں جانتا ہوں کہ میری خادمہ اور میرا خانساماں اپنے ماحول کے قدیمی عقائد پر قائم ہیں۔ اس سے یہ امکان کسی قدر کم ہو جاتا ہے کہ وہ میرے گھر سے زیورات چرائیں گے یا میرے کھانے میں زہر ملا دیں گے''۔ لوٹزے نے کہا کہ کوئی فلسفیانہ عقیدہ ایک ایسے بنیادی زاویہ نگاہ کے لیے جواز کی حیثیت رکھتا ہے جو کہ ہمارے بچپن میں بن چکا ہوتا ہے۔ دیانت دار نیطشے نے لکھا تھا کہ ''فلسفی اکثر ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے خیالات ایک بے لاگ، پاک اور غیر متعصب منطق کا نتیجہ ہوتے ہیں، حالانکہ دراصل وہ کسی خیال یا نظریہ کی، جو کہ ان کی کسی دلی خواہش کا منطقی عکس ہوتا ہے، دلائل کے ذریعہ حمایت کرتے ہیں''۔

یہ ہیں وہ خامیاں جنہوں نے فلسفہ کو داغدار بنایا ہے۔ حق کی جستجو ہی نے حق کو بے آبرو کیا ہے۔ اس طرح فلسفہ ہنگامی عقیدوں کا غلام بن جاتا ہے اور اس میں وہ عالمانہ اخلاق، حقیقت کے لیے وہ جانفشاں احترام نظریہ کے خلاف واقعات کی طرف وہ توجہ نہیں آتی جو ہمبولٹ اور ڈارون جیسے سائنس دانوں، لیونارڈو یا گوئٹے جیسے ''ادبی'' فلسفیوں کو ممتاز بناتی ہے۔ اہل مدرسہ (جنہیں غلطی سے فلسفی سمجھا جاتا ہے، اور جو دراصل علمائے دینیات تھے) اس طرز فکر کے بانی ہوئے کہ فلسفیانہ خیالات کی جستجو دینی تصورات کی تبلیغ کے معاملہ میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی کتابیں دراصل اس جہاد کا حصہ تھیں جو کہ پاپائے روم نے کفر اور شرک کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔ وہ بے باکانہ کہتے تھے کہ فلسفہ دینیات کا غلام ہے اور اگرچہ جدید فلسفہ کے بانیوں یعنی بیکن، ڈے کارٹ اور سپینوزا نے فلسفہ کی اس بے آبروئی کے خلاف احتجاج کیا تھا، لیکن آج ان کے پوتوں اور نواسوں نے اس پرانے رواج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

ان چیزوں نے فلسفہ کو گھن لگایا اور اس گھن سے فلسفہ میں وہ دوسری خامیاں پیدا ہوئیں جن کی تعداد ایک موروثی مرض کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ فلسفہ کی گمنامی کی وجہ اس کی بددیانتی کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بجا ہے کہ جدید فکر کی گمنامی کی ایک وجہ حق کا فقدان اور عالمگیر تصورات کی دقت بھی ہے لیکن یہ مشکلیں ایسی نہیں جن کے باعث انسان فلسفہ میں دلچسپی ہی نہ لے۔ شیلے کے خیالات سمجھنا آسان نہیں لیکن سب اس کا احترام کرتے ہیں۔ عورت ایک معمہ ہے، لیکن

کون مرد، جس کی رگوں میں زندگی دوڑتی ہے اس معمہ کو سمجھنے کی دائمی کوشش میں مبتلا نہیں رہتا۔ نہیں جدید فلسفہ کی تاریکی کی وجہ اور ہی کچھ ہے۔ جب آدمی رومان کے راستے پر گامزن ہو تو اسے سمجھنا زیادہ مشکل ہے، بہ مقابلہ اس وقت کے جبکہ وہ سچ بول رہا ہو۔ ہر حقیقت پر ہزاروں واہمے استوار ہوسکتے ہیں اور کوئی ہنرمند ہی اپنے تخیل کی پرواز کو حقیقت کی طرح مربوط بنا سکتا ہے۔ لیکن اہل تخیل کبھی مفکر بنا نہیں چاہتے۔ ان کے جوہروں کی حاجت سیاست کو زیادہ ہے، اور کبریائی فلسفہ، ادنیٰ افسانہ نگاروں کے حصہ میں آتا ہے، جن کے افسانے حقیقت کے ایک لمس سے ہی پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت دیانت کی کمی نے ہی جدید فکر کو کھوکھلا بنا دیا ہے۔ وہ شخص جسے اپنے ضمیر پر اعتماد نہیں، انسانی زندگی کے اہم مسائل سے گریز کرتا ہے۔ کسی وقت بھی زندگی کی یہ وسیع و عریض تجربہ گاہ اس کے حقیر جھوٹ کو بے نقاب کر سکتی ہے۔ کسی وقت بھی وہ حقیقت کے سامنے برہنہ ہو کر لرزہ براندام ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے لیے ادق کتابوں اور فلسفیانہ مجلوں کی پناہ گاہیں بناتا ہے۔ وہ فقط ان پارینہ اوراق کی صحبت میں عافیت محسوس کرتا ہے اور اپنی گھریلو زندگی کے حقائق میں بھی کوئی آسودگی نہیں پاتا۔ وہ اپنے زمان و مکان کے ان مسائل سے دور بھاگتا ہے جو اس کی نسل کے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ ان اہم مسائل سے خوفزدہ ہے جو فلسفہ کی جان ہیں۔ وہ باتوں میں ربط پیدا کرنے سے گھبراتا ہے اور اپنے زمانہ کی زرخیز بدنظمی کو وحدت اور تنظیم میں منسلک کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ ہراساں ہو کر ایک حقیر گوشہ میں چھپ جاتا ہے اور ادق الفاظ کی تہوں کے نیچے زندگی سے بے تعلقی ڈھونڈتا ہے۔ وہ مفکر نہیں رہتا، فلسفہ علم کا ماہر البتہ بن جاتا ہے۔

یونان کا یہ حال نہیں تھا۔ یونانی فلسفی مہارت کم اور سوجھ بوجھ زیادہ رکھتے تھے۔ پارمینائیڈیس نے بھی علم کے مسائل پر غور کیا تھا۔ لیکن سقراط سے پہلے فلسفیوں کی نگاہیں اس دنیا کے حقائق پر تھیں اور وہ مباحثہ سے نہیں بلکہ مشاہدہ اور تجربہ سے حقیقت کے راز دریافت کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ وہ قہقہے لگانے والا فلسفی ڈیموکریٹس، ان لوگوں کے لیے ایک خطرناک مصاحب نہ ثابت ہوگا جو خارجی دنیا کے مسائل کو اسی طرح حل کرتے ہیں، جس طرح فیلسوف اس مسئلہ کو سلجھاتے تھے کہ سوئی کے ناکے پر کتنے فرشتے ناچ سکتے ہیں۔ ذرا تھیلس کا تصور کرو، جس نے اس الزام کی تردید میں کہ فلسفی بے وقوف ہوتے ہیں، تجارت کی منڈی پر قبضہ کر لیا تھا اور ایک سال کے اندر خاصی دولت سمیٹ لی تھی۔ انکساگورس نے، جسے یونان کا ڈارون کہنا چاہیے، فار قلیس کو ایک حیلہ جو سیاست دان سے ایک مفکر اور ایک صاحب نظر سیاستدان میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس بڈھے سقراط کا تصور کرو، جو شمس و نجوم سے بے خوف ہو کر زندہ دلی سے یونان کے نوجوانوں کے

اخلاق بگاڑتا تھا اور حکومتوں کی بنیادیں ہلا دیتا تھا۔ وہ آج کل کے بے جان اور بے ہمت فیلسوفوں کو کس نظر سے دیکھتا جو ملکہ علوم کے دربار میں زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ افلاطون اور اس سے پہلے کے جواں مرد مفکروں کے لیے فلسفہ علم محبت کے ابتدائی مراحل کی طرح فلسفہ کا زینہ ہے۔ یہ چند لمحوں کے لیے خوشگوار ہوتا ہے، لیکن اس تخلیقی کمال سے بہت دور ہے، جو فلسفہ کے شیدائیوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کہیں کہیں اپنے چھوٹے مکالموں میں افلاطون مشاہدۂ فکر اور علم کے مسائل سے عشاق کی طرح کھیلتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اپنے شدید لمحوں میں اس کی نظر وسیع میدانوں کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے لیے مثالی ریاستیں تعمیر کرتا تھا اور انسان کی فطرت اور تقدیر پر غور کرتا تھا۔ ارسطو کے ہاں بھی ہمیں فلسفہ کی بے پناہ وسعت اور شکوہ کی تعظیم نظر آتی ہے۔ اس نے فلسفہ کے تمام محلات کی سیر کی تھی اور نہایت خوش سلیقگی سے انہیں آراستہ کیا تھا۔ ارسطو کے ہاں ہر مسئلہ کو اپنا صحیح مقام حاصل ہے اور ہر سائنس نے عقل کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ فلسفہ کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو تجزیہ علم کے تاریک گوشوں میں دفن کر دے۔ اس کا فریضہ تو یہ ہے کہ وہ ہر مملکت علم میں بے باکانہ داخل ہو اور مختلف علوم کے نتائج کو انسانی شخصیت اور انسانی زندگی کی ترتیب و تدوین کے لیے مربوط کرے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ فلسفہ کا کام یہ نہیں کہ وہ چند آسمانی معموں کو حل کرے، جن کا انسانی امور سے کوئی تعلق نہیں۔ فلسفہ کا اہم ترین مسئلہ اس غیر محدود اور وسیع کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے ارتقائی امکانات کی کھوج کرنا ہے۔

۴۔ سائنس دان

یہ تو رہیں وہ باتیں جو فلسفہ نہیں ہیں اور ان کا شمار فلسفہ میں ہونا بھی نہیں چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلسفہ کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے؟ کیا ہم ملکہ علوم کو اس کی پہلی وسعت اور قوت دوبارہ واپس دلا سکتے ہیں؟ کیا ہم فلسفہ کو دوبارہ وہ مربوط علم تصور کر سکتے ہیں جو زندگی کو بھی مربوط کر سکتا ہے؟ کیا ہم فلسفہ کا کوئی ایسا تصور پیش کر سکتے ہیں جو فلسفہ کے شیدائیوں کو پہلے اپنے آپ پر اور پھر ایک مملکت پر حکومت کرنے کا اہل بنا سکے اور ایسی صفات کا حامل بنا سکے جو فلسفی حکمرانوں میں ہوتی ہیں۔

مدت گزری میں نے فلسفہ کی تعریف یوں کی تھی کہ وہ کل تجربہ کا مطالعہ ہے یا تجربہ کے ایک جزو کے کل سے تعلق کا۔ اس تعریف سے یہ فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر مسئلہ فلسفہ کا موضوع بن سکتا ہے، بشرطیکہ اسے کل کے زاویہ نظر اور سارے انسانی تجربے اور انسانی مقاصد کی روشنی

میں دیکھا جائے۔ ایک فلسفیانہ ذہن کا طغرائے امتیاز فکر کی چابکدستی نہیں بلکہ نظر کی وسعت اور فکر کی وحدت ہے۔ سپنوزا کے دوامی نقطۂ نظر کی بجائے ہم کل کا نقطۂ نظر اختیار کریں گے۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر ایک ہی نتیجہ پر مرکوز ہوتے ہیں۔ جس طرح نگاہیں ایک مرکز پر مل جاتی ہیں مگر جہاں انسان اپنے تجربہ کو ایک منظم وحدت میں منسلک کر سکتا ہے۔ موجودات کو دوامی نقطۂ نظر سے دیکھنا، لافانی دیوتاؤں کا ہی کام ہے، جن کا غالباً وجود نہیں۔

سائنس اور فلسفہ کے تعلق کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ سائنس تو ایک دریچہ ہے، جس میں سے فلسفہ دنیا کو دیکھتا ہے۔ سائنس حواس اور فلسفہ روح ہے۔ فلسفہ کے بغیر سائنس کا علم دیوانے کے احساسات کی طرح منتشر ہے۔ سپنسر نے ٹھیک کہا تھا کہ فلسفہ عمومی علم ہے۔ لیکن اس نے یہ غلط کہا تھا کہ فلسفہ محض علم ہے۔ فلسفہ کے لیے اس دقت پسند اور ارفع نظر کی ضرورت ہے جس سے علم برگزیدہ ہو کر خواہشات کی بدنظمی میں تنظیم اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ فلسفہ وہ مختص صفت ہے جسے حکمت کہا جاتا ہے۔

سائنس کے بغیر فلسفہ بے جان ہے۔ کیونکہ حکمت محنت سے حاصل کیے ہوئے علم، بے غرض اور غیر متعصب اذہان کے دیانت دارانہ مشاہدہ اور تحقیق کے بغیر ہرگز پھل پھول نہیں سکتی۔ سائنس کے بغیر فلسفہ انحطاط پذیر اور بددیانت ہو جاتا ہے۔ لیکن سائنس فلسفہ کے بغیر نہ صرف لاچار ہو جاتی ہے بلکہ تخریبی انداز اختیار کر لیتی ہے۔ سائنس محض بیان ہے، وہ جو کچھ دیکھتی ہے، کہتی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ حقیقت کا بغور مشاہدہ کرے اور اسے انسانی مقاصد سے قطع نظر جوں کا توں بیان کر دے۔ نائیٹرو گلیسرین اور کلورین دو گیسیں ہیں۔ سائنس کا کام یہ ہے کہ ان کا تجزیہ کرے اور بتائے کہ یہ کن کن اجزا سے مرکب ہیں اور ان کے خواص کیا ہیں؟ یہ بھرے شہروں کو تباہ کر سکتی ہیں۔ یہ انسانی فنون کے بہترین صنم خانوں کو برباد کر سکتی ہیں۔ یہ ایک پوری تہذیب اور اس کے حسن و حکمت کا نام و نشان مٹا سکتی ہیں۔ سائنس ہمیں بتائے گی کہ یہ تخریبی کام کس طرح جلدی سے ہو سکتے ہیں۔ کہ شہری کو (اگر وہ زندہ رہے تو) اس کا کم سے کم بار اٹھانا پڑے۔ لیکن کیا تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیے؟ کون سی سائنس اس سوال کا جواب دے سکتی ہے؟ زندگی جلب منفعت اور جنون ملکیت سے خوشگوار بنتی ہے یا تخلیق و تعمیر سے؟ کیا علم اور منفعت کی جستجو مشاہدۂ حسن کی ہنگامی سرمستی سے بہتر ہے؟ کیا ہمیں اپنی اخلاقی زندگی سے تمام الہیاتی عقائد کو ختم کر دینا چاہیے؟ کیا ہمیں ذہن کو مادہ کے یا مادہ کو ذہن کے نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیے؟ کون سی سائنس ان مسائل کو حل کرے گی؟ زندگی کے یہ بنیادی مسائل مربوط تجربہ اور اس حکمت کے بغیر کیونکر حل ہو سکتے ہیں جس کے سامنے علم محض ایک ہیولیٰ ہے؟ اور جس کی نگاہ کامل میں تمام علوم کو اپنا صحیح مقام اور

اپنی صحیح اہمیت حاصل ہے۔

سائنس اجزا کا بیان ہے۔ فلسفہ کل یا کسی جزو کے کل سے تعلق کی ایسی تعبیر ہے جس سے جزو کا مقام واضح ہو۔ سائنس، ذرائع اور وسائل کی بزم ہے۔ فلسفہ مقاصد اور مناصب کی محفل۔ حقائق اور قوانین مقاصد ہی کے ذریعے قدر و اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ انسانی آرزوئیں کسی مرکز پہ لائی جائیں اور وہ صحت مند شخصیت کے منظم اجزا بن جائیں، یہ کام بھی فلسفہ کا ہے اور اس کے بلند ترین مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔

فلسفہ کی فطرت اپنی نوعیت کے اعتبار سے سائنس سے کہیں زیادہ مفروضات اور شرائط پر مبنی ہے۔ سائنس کی ابتدا بھی شرطیہ بیانوں سے ہوتی ہے۔ اس کی انتہا اس قابل مشاہدہ علم پر ہونی چاہیے جو انسانی مفاد یا آرزو سے بے نیاز ہو۔ اس کے برعکس فلسفہ کی ابتدا سائنس اور قابل مشاہدہ علم سے ہوتی ہے اور وہ ان بنیادی مسائل کے متعلق، جن کے بارے میں کوئی متعین حقائق میسر نہیں، وسیع مشروط بیانات ترتیب دیتا ہے۔ یہ شعور کی تخیلی تکمیل ہے۔ یہ ہمارے سائنٹیفک علم کی خامیوں کو ان مفروضوں سے پورا کرتا ہے، جن کا ثبوت تجربہ کے ذریعے مہیا نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے ہر شخص فلسفی ہے۔ ایک محتاط، متشکک، لاادری یا نظریہ کردار کا پیرو، اس وقت بھی ایک طرح کا فلسفہ بیان کرتا ہے، جب وہ ساری دنیا کے سامنے احتجاجا” یہ اعلان کرتا ہے کہ فلسفہ لایعنی ہے۔ اگر ایک لاادری اس مکمل غیر جانبدارانہ طریقہ سے زندگی بسر کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی حقیقت کے اثبات و تردید سے گریز کرے۔ اگر وہ اپنے خیالات اور اعمال کو غیر جانبدارانہ طریقہ سے ایجاب و انکار کے درمیان تقسیم کر دے تو وہ شاید فلسفہ پر ایک بے جان اور غیر متحرک نظام اخلاق، ایک فکری بے حسی، ایک کائناتی غنودگی طاری کر دے۔ مگر اس کیفیت کا حاصل کرنا مشکل بھی ہے اور انسانیت سے بعید بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک راہ کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم اپنے انداز زندگی سے ایجاب و انکار کرتے ہیں۔ ہم اس طرح عمل کرتے ہیں کہ گویا ہم نے اس تذبذب میں سے ایک راہ اختیار کر لی ہے، جسے ہم فلسفہ کہتے ہیں۔ ہم نیوٹن کی طرح مشروط بیان پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کی کشش ہمیں فلسفہ کی طرف لے جاتی ہے۔

کیا ہم یہ مان لیں کہ تاریخ فلسفہ، ایک فلسفہ کی دوسرے فلسفہ سے تردید کا نام ہے۔ اور یہ کہ فلسفی برادر کشی کے جنون میں مبتلا ہیں، اور جب تک وہ حقیقت کی قلمرو سے ہر حریف کو ختم نہ کر دیں، انھیں چین کی نیند نہیں آتی۔ وہ انسان جو زندگی کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہے، کیسے اس بات کے لیے وقت نکالے کہ ان عالمانہ تنازعوں کو حل کر سکے یا اس جنگ کو ختم کرے۔ کیا یہ فلسفے ایک دوسرے کو ختم نہیں کر دیتے؟ اس سلسلے میں عمر خیام کے تجربہ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

یک چند بکودکی باستاد شدیم یک چند ز استادی خود شاد شدیم
پایاں سخن شنو کہ مارا چہ رسید از خاک در آمدیم برباد شدیم

بظاہر یہ فلسفہ کی تضحیک ہے۔ لیکن شاید عمر خیام نے یہ سب کچھ محض تفریحا" کہا ہو۔ شاید وہ اس دروازہ سے باہر نہ نکلا ہو، جس سے وہ داخل ہوا تھا۔ اور شاید وہ مسجد کے دروازہ پر اپنے جوتوں کے ساتھ اپنی عقل بھی چھوڑ آیا تھا۔ کوئی شخص بھی عظیم مفکروں کی صحبت سے اپنے ذہن کو تربیت دیئے اور ہزاروں اہم مسائل پر اپنے خیالات وسیع کیے بغیر نہیں اٹھا۔ لیکن آخر وہ کیا چیز تھی جس نے عمر خیام کے بچپن کے مذہب کو حسن اور وخت وز کی عبادت میں تبدیل کر دیا تھا؟ عمر خیام کی شاعری کو فلسفہ کے علاوہ کون سی چیز عظمت دیتی ہے؟

سائنس کی تاریخ میں ہمیں ایسے عظیم انقلاب نظر آتے ہیں کہ ان کے سامنے ساری تبدیلیاں اس کی بنیادی یگانگت اور ہم آہنگی میں گم ہو جاتی ہیں۔ آج وہ سدیمی مفروضہ کون سے دور افتادہ سیارہ میں اڑ گیا ہے؟ کیا موجودہ علم الافلاک اسے خاطر میں لاتا ہے؟ کہاں ہیں آج نیوٹن کے قوانین جبکہ آئن سٹائن اور منکوسکی اور دیگر برگزیدہ حضرات نے اپنی ناقابل فہم اضافیت سے ساری کائنات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ جدید طبیعیات کی بدنظمی میں مادہ کا ٹھوس پن اور بقائے توانائی کہاں رخصت ہو گئی؟ بے چارہ اقلیدس جو کہ درسی کتابوں کا سب سے بڑا مصنف تھا، آج کہاں ہے؟ جبکہ ریاضی کے ماہروں نے نئے نئے اختراعات سے ایسی لامحدود کائناتیں تخلیق کر لی ہیں کہ ان میں سے ایک، دوسرے کا حصہ بن سکتی ہے اور جب وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ سیاست کی طرح طبیعیات میں بھی خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان طویل ترین فاصلہ ہے؟ آج علم الارث کہاں ہے جبکہ ورثہ کی جگہ بچپن کی تربیت نے لے لی ہے؟ آج مینڈل کہاں ہے جبکہ ماہرین علم الارث اکائی خصوصیات کو نہیں مانتے؟ وہ شریف الطبع تخریب نواز ڈارون کہاں ہے جبکہ ارتقا کی بے وجہ تبدیلیوں کو اچانک نئی خصوصیات پیدا ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کیا یہ نئی خصوصیت "دوغلوں" کے ناجائز بچے ہیں؟ یا کیا ہمیں ان کی توجیہ کے لیے اس نظریہ کی طرف لوٹنا پڑے گا کہ ایک نسل تربیت سے حاصل کردہ صفات دوسری نسل کی وراثت میں دیتی ہے۔ کیا ہم پھر ایک صدی پیچھے لوٹیں اور لیمارک کے زراف کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ پروفیسر ونڈت کی وسیع و عریض تجربہ گاہ اور سٹینلے ہال کے سوالات کی فہرستوں کو آج ہم کیا کریں، جبکہ کوئی نظریہ کردار کا پیرو اپنے پیشروؤں کے خیالات کو فضائے آسمان میں بکھیرے بغیر جدید نفسیات کا ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتا؟ تاریخ کی وہ نئی سائنس کہاں ہے جبکہ ہر ماہر مصریات نسلوں اور تاریخوں کا اپنا علیحدہ زینہ بناتا ہے، جو کہ ایک دوسرے سے چند ہزار سال دور ہوتا ہے۔ آج ہر اچھا ماہر انسانیات ٹائیلر --- ویسٹر

مارک اور سپنسر کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور آج فریزر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم مذاہب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہماری سائنس ہمیں کہاں لے جا رہی ہے؟ کیا اس نے اچانک اپنی دائمی حقانیت کھو دی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ "قدرت کے قوانین بھی" انسان کے مشروط بیان ہوں؟ کیا اب سائنس میں کوئی استحکام اور یقین نہیں رہا؟

شاید اگر ہم روح اور ذہن کا امن تلاش کریں تو ہمیں وہ سائنس میں نہیں، فلسفہ میں ملے گا۔ فلسفیوں کے اختلاف، خیالات کے بنیادی اختلاف کی بجائے ان کے زبانوں کے انداز بیان کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفیوں کے اکثر اختلاف سائنس کے اپنے تلون کی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ سائنس کچھ عرصہ کے لیے ایک مفروضہ کو سینہ سے لگاتی ہے، پھر اس کا جی بھر جاتا ہے اور بیزار ہو کر کسی اور نئے نظریہ کی طرف رخ کرتی ہے۔ جب فلسفیوں کے انداز بیان کو ان کے اصلی خیالات میں تحلیل کیا جائے تو ہمیں انسانی زندگی کے اہم مسائل کے بارے میں ان میں ایک عظیم یکسانی اور یگانگت نظر آتی ہے۔ سنیتیانا ازروئے کسر نفسی کہتا ہے کہ مجھے ارسطو کے فلسفہ میں کوئی اضافہ نہیں کرنا، بلکہ اس فلسفہ کا اطلاق آج کل کے حالات پر کرتا ہے۔ کیا کوئی جدید ماہر حیاتیات، ماہر طبیعیات یا ماہر ریاضی کسی قدیم یونانی سائنس دان کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے؟ آج کی سائنس ہر قدم پر ارسطو کی سائنس کو جھٹلاتی ہے، لیکن اس کا فلسفہ اس وقت بھی عمیق اور نظر افروز رہے گا، جب آنے والا زمانہ آج کی سائنس کو حقارت اور تضحیک کی نظر سے دیکھے گا۔

۵۔ سائینسوں کی ملکہ

اس بحث و تمحیص کے بعد ہم اب شاید یہ محسوس کریں کہ فلسفہ ابھی تک ملکہ علوم ہے۔ آج بھی لوگ اسے ملکہ علوم سمجھنے پر آمادہ ہو جائیں گے اگر وہ اپنے آپ کو قدیم شان و شکوہ میں ملبوس کر لے، اور تمام علوم کو اپنے سایہ شفقت میں لے لے۔ تمام عالم اس کا موضوع ہے اور ساری کائنات اس کا خاص مضمون۔ اور جس طرح ایک دانش مند ملکہ اپنی مملکت کے مختلف حصوں کو عقلمند گورنروں کے سپرد کرتی ہے، اور وہ گورنر اپنے ماتحت کارندوں کے ذریعے امور سلطنت اور ان کی تفاصیل یکجا کرتے ہیں اور پھر گورنر اور حاکم اعلیٰ مل کر ان معلومات کو منظم کرتے اور نئے منصوبوں کی تدوین کرتے ہیں۔ اسی طرح فلسفہ بھی اپنی مملکت کو بہت سے صوبوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس جنت فکر میں ہزاروں محل ہیں۔

اس مملکت کا پہلا صوبہ جسے فلسفہ کا دروازہ کہنا چاہیے "منطق" کے غیر شاعرانہ نام سے

موسوم ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اپنے حسن کو اجنبی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے تمام چاہنے والوں کو اس آزمائش میں سے گزارنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس کی لذتوں سے سرشار ہونے کے مستحق بن جائیں۔ کیونکہ فلسفہ کی لذتیں، محبت کے کمال کی مانند ہیں، جہاں کسی ادنیٰ روح کو باریابی حاصل نہیں۔ ہم حقیقت کو دیکھ کر کیونکر پہچان سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ان آزمائشوں اور امتحانوں پر غور نہ کیا ہو جن کے ذریعے ہمیں اس کے اصلی وجود کا ثبوت مل سکتا ہے، ہم پائیلٹ کے لرزہ انگیز سوال کا جواب کیونکر دے سکتے ہیں؟ کیا ہم اس کے جواب کے لیے اپنی بے باک اور ضعیف عقل، اپنے عمیق اور تاریک وجدان یا اپنے حواس کے بے لگام فیصلہ کی مدد لیں؟ ہم کس طرح اپنے حواس اور اپنے خیالات کو تعصبات اور قدیم اصنام کی پرستش سے آزاد کریں، تاکہ عقل کے چراغ روشن رہیں اور ہم ہر ہنگامی حقیقت کو اپنے ہاں ایک متعین مقام دے کر اس کا خیر مقدم کریں۔ ہم کس طرح کھلاڑیوں کی طرح حکمت کی طلب اور جستجو کے لیے اپنی تربیت کریں؟

اور پھر اس مملکت کے مرکز سے کہیں دور آزمائش کا ایک اور مقام ہے، جہاں فلسفہ علم کا اژدہا رہتا ہے۔ اگر ہمارے قدم منطق کی دشوار راہوں پر لڑکھڑائے تھے تو اس مقام کی تاریکی میں ہماری آنکھیں بے نور ہو جائیں گی۔ ہم بہت سی دلدلوں میں پھنسیں گے اور شاید ہم اژدہے کے منہ کے بہت قریب جا پہنچیں اور اس کے پر اجلال کلام سے اس قدر مسحور ہو جائیں کہ ہمیشہ کے لیے اس کے خلاؤں میں محبوس ہو کر "فیلسوف" بن جائیں۔ لیکن ہمیں اس آزمائش میں سے بہرحال گزرنا ہے۔ اور علم و مشاہدے کی دنیا کی حقیقت کے معمہ کو کسی جائز طریقہ سے حل کرنا ہے۔ اس طرح شاید ہم ملکہ عظمیٰ کی بارگاہ میں رسائی حاصل کر سکیں۔

مابعد الطبیعیات ایک عظیم الشان مگر تاریک صوبہ ہے۔ یہ ہماری اپنی روشنی سے روشن ہوتا ہے اور اس میں ہماری روح کے لیے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔ یہاں کائنات کی فطرت مستور ہے اور ہمیں اپنے رموز سے پریشان کرتی ہے۔ یہاں فلسفہ کا وہ اعلیٰ نغمہ سنائی دیتا ہے جو اس نے فیثاغورث کو سنایا تھا کیونکہ اس کے ذریعے فطرت شعور حاصل کرتی ہے اور اپنے مقاصد پر تنقید و تبصرہ سے مطالب و معانی پاتی ہے۔ یہاں ہم مادے اور زندگی، دماغ اور ذہن، مادیت اور روحانیت، میکانکیت اور مقصدیت، جبریت اور حریت کے مسائل پر سر دھنتے ہیں۔ انسان کیا ہے؟ کیا وہ تاروں، پرزوں اور الجھے ہوئے پہیوں کی بنی ہوئی کوئی چیز ہے، جسے آسمان اور زمین کی قوتیں حرکت میں لاتی ہیں؟ یا وہ اپنی حقیر اور مضحکہ خیز حیثیت میں بھی ایک تخلیقی دیوتا ہے؟ ایک اور صوبہ "تاریخ" کے نام سے مشہور ہے، جہاں لاکھوں، کروڑوں عوام اور چند برگزیدہ ہستیاں دور دراز ممالک اور بعید زمانوں سے اپنی داستانیں لاتے ہیں، تاکہ ہم ان میں ربط پیدا کر کے ان سے سبق

سیکھیں۔ ماضی کا کیا مطلب ہے؟ کیا ترقی و تنزل کے بھی قوانین ہیں، جن کی رو سے ہم تہذیبوں، نسلوں اور قوموں کے نشیب و فراز کو سمجھ سکیں۔ یہاں ہم موفسکو اور بکل کو انسانوں کے نشوونما پر جغرافیائی حالات کے اثر کے متعلق تقریریں کرتے سنیں گے۔ یہاں کونڈور سے جواب جاں بلب ہے، موت کے کرب کو ترقی اور انسانی کمال کے لامحدود امکانات کے تصور سے بہلاتا نظر آئے گا۔ یہاں ہیگل اپنی جدلیاتی بساط بچھاتا اور کارلائل اپنی عظیم الشان شخصیتوں کا ذکر کرتا دکھائی دے گا۔ یہاں نسل پرست لوگ اپنی نسل کی پاکیزگی اور برتری کے گیت گاتے اور وحشیوں کے ظہور کا رونا روتے سنائی دیں گے۔ یہاں مارکس اپنے اقتصادی نظریہ تاریخ کے ثبوت میں اعداد و شمار اور دلائل کے طوفان اٹھائے گا اور یہاں غالباً ہمیں ایک دو صاحب ذوق ایسے بھی ملیں گے جو ان دیوانوں کو یہ بتائیں گے کہ ان کی توجیہات حقیقت کے فقط چند پہلو ہیں، حقیقت نہیں۔ اور فطرت اور تاریخ میں اس سے کہیں زیادہ تنوع موجود ہے، جس کا ذکر ان کے فلسفوں نے کیا ہے۔ اور دور ایک گوشے میں ہمیں نیٹشے، دائمی تواتر کے گیت گاتا سنائی دے گا اور سپنگلر کی پرجوش آواز میں مغربی دنیا کے زوال کی پیش گوئی سنائی دے گی۔

اور اگر ہم ایک اور صوبہ کا رخ کریں تو ایسی گفتگوئیں سنیں گے جن کا موضوع سیاست ہے۔ چند لمحوں کے لیے ہمیں خوف لاحق ہو گا کہ امریکہ دریافت ہو چکا ہے، کیونکہ یہ لوگ بغیر احترام کے جمہوریت اور بغیر خوف کے فردیت پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔ یہ اشتراکیت کی خامیوں کو جانتے ہوئے بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ اشرافیت کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ادنیٰ نسل کے لوگوں سے اس کی ناانصافی سے انہیں گھن آتی ہے، اور کبھی کبھی وہ نوجوانوں کی والہانہ عقیدت سے اس "جنت الارض" کا ذکر کرتے ہیں، جس میں عقلمند حکومت کرتے ہیں اور جس کا ہر شہر متمول اور حسین ہے۔

ان نغموں کی جھنکار کے ساتھ، جو اس لفظ نے ہمارے کانوں کو سنائی ہے، ہم مملکت کے قلب میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں حقیقی فلسفہ ہمارے سامنے ہے، یہاں وہ اپنے عشاق کے سامنے حسن، ثبات اور خیر کا مجسمہ بن کر آتا ہے۔ کیونکہ فلسفہ خفیہ طور پر فن کا حاسد ہے اور اس میں حسن کے لیے جو تخلیقی خون ہے، اس سے جلتا ہے۔ سائنس نہیں، فن اس کا بڑا حریف ہے، کیونکہ بہترین انسان فن کے ساتھ بھی ایسی ہی وفا کرتے ہیں۔ حکمت خوش سلیقگی سے شاید یہ تسلیم کر لے کہ حسن کی عبادت تلاش حق سے بہتر ہے، کیونکہ حق اس قدر مشکل الحصول ہے کہ شاید ہم اس کے دامن کو کبھی نہ چھو پائیں۔ لیکن حسن فانی ہے، اس لیے وہ ہماری پرستش کا خیر مقدم کرتا ہے اور ہمیں اس کا صلہ دیتا ہے۔ فلسفہ حسن کا مطالعہ کرتا ہے، لیکن فن فلسفہ کو محترم جانتا ہے اور اسے

ازسرنو تخلیق کرتا ہے۔ فن محبت کے شدید لمحات، تعمیر کے صنم خانوں کے متناسب شکوہ، سنگ تراشی کی حسن افروز شوکت، رنگوں کی آگ، الفاظ کی موسیقی اور خوش آئند آوازوں کے اژدہام میں اس کا جلوہ دیکھتا ہے۔ لیکن افسوس! فلسفہ صرف حسن کے مسائل سے واقف ہے۔ حسن کیونکر پیدا ہوتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے، اور کیا حسن ہیئت میں موجود ہے، یا ہمارے دلوں کی طلب میں؟ یہ صوبہ جمالیات کا ہے، جسے علماء نے صدیوں تک بے کیف رکھا ہے، لیکن پھر بھی وہ حیرت اور لذت کے نور سے معمور ہے۔

مملکت کے مرکز میں اخلاقیات کا صوبہ ہے۔ یہ صوبہ بھی درسی تصورات کی وجہ سے کسی قدر خشک ہو گیا ہے، لیکن بعض پہلوؤں سے فلسفہ کا زرخیز ترین خطہ بھی ہے، کیونکہ زندگی کا فن، فن کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اور اخلاقیات، زندگی کے فن کی داستان ہے۔ یہاں فلسفہ اپنے متنوع علم کو حکمت حیات کا اعلیٰ مقام بخشتا ہے اور اپنے سب قلعوں سے انسانیت کی ہدایت کے لیے علم جمع کرتا ہے۔ بہترین زندگی کیا ہے؟ نیکی کا کیا فائدہ ہے؟ اور طاقت کب چنگیزی بنتی ہے؟ کیا اخلاق کا کمال سقراط کی حکمت، نیطشے کی بے باکی، یا مسیح کی نرم روی میں ملتا ہے؟ کیا ہم زینو اور سپنوزا کی طرح بیراگی یا ایپی کیورس اور رینان کی طرح لذت پسند نہیں؟ کیا زندگی کا مقصد لذت اندوزی ہے؟ کیا محبت صرف قانون کی حدود ہی میں جائز ہے؟ عدل کیا ہے اور وہ ہماری صنعتی تہذیب کے متعلق کیا کہتا ہے؟ یہ اہم ترین سوال ہیں، جن میں تہذیبوں کی تقدیر مضمر ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو ہر ریاست اور ہر فرد کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے سامنے سائنس اپنے حساب کتاب اور قوانین، اپنی رقیق اور ٹھوس چیزوں اور گیسوں کے ساتھ بیکار اور سرد مہر معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسا شعبہ علم جو زندگی کا دوست نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر موت سے سازش کر رہا ہے۔

لیکن موت بھی فلسفہ کا موضوع ہے اور جب تمام مناظرے ختم ہو جائیں، تو فکر خوفزدہ ہو کر اس دشمن عظیم کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور فلسفہ مذہب کی قلمرو میں داخل ہوتا ہے۔ دینیات، مافوق الفطرت ہستیوں اور ان کے انسان سے تعلقات کا علم ہے۔ ان ہستیوں کے بارے میں فلسفہ خاموش ہے۔ لیکن فلسفہ انسان کی کم علمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کے ساری زندگی اور کائنات سے اس کے تعلق، اس کی ابتدا اور انتہا کا ذکر کرتا ہے۔ فلسفہ کو انسان کی بقا سے وہی شغف ہے جو اسے دوسرے اہم مسائل سے ہے۔ شاید ہمیں فلسفہ کی تعریف یوں کرنا چاہیے کہ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور پھر وہ خدا سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ دینیات کے خدا سے نہیں جو شاید کائنات سے باہر کہیں وجود رکھتا ہے، بلکہ فلسفیوں کے خدا سے، جو دنیا کا قانون اور ہیئت، قوت اور

عزم ہے۔ اگر کوئی ذہن کائنات کی راہنمائی کر رہا ہے تو فلسفہ اسے جان کر اور سمجھ کر اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ذہن موجود نہیں تو فلسفہ اس بات کو بھی جاننا چاہتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے تو اسے بے خطر تسلیم کرنا چاہتا ہے۔ اگر ستارے محض دھند کے بے ربط انبوہ ہیں، اگر زندگی محض ایک حادثہ ہے جو اجتماعی طور پر مستقل مگر انفرادی طور پر فانی ہے، اگر انسان محض ایک کیمیاوی مرکب ہے جس کی تقدیر اور انتہا، انتشار اور فنا ہے، اگر فن کی تخلیقی سرمستی، عالم کی لطیف حکمت اور صوفیوں کی بے لوث شہادت، حیاتیاتی دنیا کے محض چند تابندہ واقعات ہیں، اور ہر سوال کا جواب، اور ہر روح کا انجام موت ہے تو فلسفہ اس حقیقت سے بھی دوچار ہوگا اور اس تنگ دائرہ میں بھی انسان کی عظمت اور اہمیت کی جگہ نکالے گا۔ اب ہم اپنے سفر کا آغاز کریں۔

◆

حصہ دوم

منطق اور فلسفہ علوم

باب دوم

حقیقت کیا ہے؟

۱۔ حواس اور عقل

پاک طینت اور منکسر المزاج نیٹشے نے سخت تندی سے کہا ہے "پورے نئے عہد نامے میں صرف ایک قابل احترام شخصیت نظر آتی ہے، رومی وائسرائے پائیلٹ۔ ایک رومی کا نجیب بیٹا، جس کے سامنے "حقیقت" کے لفظ کو بری طرح مجروح کیا گیا تھا۔ اس نے نئے عہد نامہ کو فقط ایک سوال سے، جس کے علاوہ اس کتاب میں کوئی اور قابل قدر قول نہیں، متمول کر دیا تھا۔ اور وہ سوال تھا "حقیقت کیا ہے؟" اناطول فرانس اسے دنیا کا اہم ترین سوال سمجھتا تھا، اس لیے کہ آخر وہ اور کون سا ایسا سوال ہے جو اس سوال پر مبنی نہیں؟

منطق، فلسفہ کی ضیافت میں ایک نہایت معمولی ابتدائی طعام ہے۔ اس سے جہاں ایک بھوک کی تسکین ہوتی ہے، اس سے ہزاروں بھوکیں مر بھی جاتی ہیں۔ ہم منطق کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا استدلال اکثر وہ آرزوئیں ہوتی ہیں، جنہیں ہم عقل کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ہم اپنے زعم میں غیر جانبدار خیالات کی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں، حالانکہ ہم ان واقعات اور اصولوں کا انتخاب کر رہے ہوتے ہیں، جو ہماری کسی نجی یا قومی آرزو کے مطابق ہوں۔

ہم منطق کو مشتبہ جانتے ہیں، کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی تمام دلائل و براہین سے زیادہ وسیع، بھرپور اور گہری ہے۔ منطق ازلی حقائق سے مرکب اور منجمد ہے۔ لیکن زندگی متحرک اور انقلاب آفریں ہے اور تمام قوانین سے بغاوت کرتی ہے۔ ان چیزوں کی تعداد جسے عقل نے پہلے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بعد میں مان لی تھیں، خاصی ہے۔ شاید ہم نے اپنی جوانی میں صحیح استدلال کے تمام اصول یاد کر لیے تھے، لیکن بعد میں یہی دیکھا کہ حقیقت کی پہچان اور زندگی کی حکمت اس منظم شعبہ علم کے اندر نہیں سما سکتی۔ ہماری خوشی شاید اسی میں ہے کہ ہم منطق کو اپنے جائزہ کے آخری حصہ تک ملتوی کر دیں، کیونکہ اس سے فلسفہ خشک اور بے جان ہو جاتا ہے۔ اور پہلے ان مسائل سے دوچار ہو لیں جو کم بنیادی سہی، لیکن ہماری زندگی کے لیے نہایت اہم ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہم حق کی تلاش میں یہ جانے بغیر روانہ نہیں ہو سکتے کہ آخر ہمیں تلاش کس چیز کی ہے۔ اور ہم اس چیز تک کس راہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ اگر ہم اس تک پہنچ بھی جائیں تو یہ کس طرح پہچانیں گے، یہ وہی چیز ہے جس کی ہمیں تلاش تھی--- سفر کی کوئی اور ترتیب یقیناً غیر منطقی ہوگی۔

ابتدا میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ منطق کے مسئلہ کو ان گمنام خوش فکروں نے، جنہیں سوفسطائی کہتے ہیں، خوب اچھی طرح سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ علم (یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جان لاک نے دو ہزار برس بعد اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا) صرف حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے حق کی کسوٹی یا یوں کہئے کہ پائیلٹ کے سوال کا جواب "احساس" ہے۔ حقیقت وہ ہے جو ہم چکھتے، چھوتے، سنتے، سونگھتے اور دیکھتے ہیں۔ اس سوال کا اس سے زیادہ آسان جواب اور کیا ہوگا؟ لیکن افلاطون اس جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو حقیقت کا سرے سے وجود ہی نہیں، کیونکہ ہر شخص کے حواس مختلف طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ پھر بندر اور فلسفی، دونوں حق کی کسوٹی ہیں۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس کا "حق" زیادہ سچا ہے۔ افلاطون کو یہ یقین تھا کہ عقل حق کی کسوٹی ہے۔ عقل کا حواس سے وہی تعلق ہے، جو سیاست دانوں کا عوام سے، اور وحدت اور مرکزیت کا ایک بے ربط انبوہ سے ہوتا ہے۔

ارسطو کو اس سے اتفاق تھا اور اس نے پہلی مرتبہ استدلال کے قوانین وضع کر کے علم منطق کی بنیاد رکھی۔ کوئی خیال صحیح نہیں ہو سکتا، اگر وہ استدلال کے ان قوانین کی پوری پابندی نہ کرے۔ مثلاً انسان، ایک باشعور حیوان ہے (ابھی تک یہ مثال منطقیوں کی کتابوں میں ملتی ہے) سقراط ایک انسان ہے، اس لیے سقراط ایک باشعور حیوان ہے۔ پرہو نے کہا بالکل نہیں۔ ہر قیاس "انحصار مقدمہ بر نتیجہ ہے"۔ یعنی ہم جس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، اسے پہلے ہی سے فرض کر

لیتے ہیں۔ ہمارا کبریٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک ہم یہ فرض نہ کر لیں کہ نتیجہ صحیح ہے۔ مثلاً انسان کو باشعور ثابت کرنے کے لیے یہ فرض کر لینا ہرگز صحیح نہیں کہ (جس میں سقراط بھی شامل ہے) باشعور حیوان ہے۔ شاید وہ محض حیلہ جو حیوان ہے، اس لیے عقل ہمیشہ غیر متعین ہے۔ ا-پی کیورس کہتا تھا "بجا ہے"۔ ہمیں پھر سوفسطائیوں سے رجوع کرنا چاہیے۔ فقط اپنے "حواس" پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ لیکن متشککین کہتے تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے حواس کو سورج شلجم کی طرح چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور ستارے آسمان کے جسم پر پھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہم اپنے حواس پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ پرہو نے کہا، کوئی بات بھی یقینی نہیں ہے۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کے شاگردوں نے، جو اس سے بہت عقیدت رکھتے تھے، اس کی موت پر افسوس نہیں کیا، کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہے۔

اس طرح فلسفہ کی جولان گاہ میں حواس اور عقل کا باہمی کھیل ہوتا رہا، حتی کہ یونان اور روما کا تمدن مٹ گیا اور یورپ مسیحیت اور کلیسا کے قبضے میں آ گیا۔ اور اس وقت چونکہ لوگ کبریائی احکام میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس بات پر یقین رکھنا جسے حواس جھٹلائیں، مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے لوگ سوفسطائیوں اور ا-پی کیورس کو بھول گئے اور اگرچہ اہل مدرسہ حق کی تعریف یوں کرتے تھے کہ جب خیال اور اشیاء مطابق ہوں تو خیال صحیح ہوتا ہے۔ وہ افلاطون اور ارسطو کی پیروی میں عقل کی برتری کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ لیکن سب سے بہتر استدلال، استخراجی استدلال تھا، جس کے ذریعے ہم ایک متعین طرز فکر کو یقینی مان کر دنیا کا ایک منظم تصور استنباط کر سکتے تھے۔ خیال مشاہدہ سے عظیم تر حقیقت ہے، کیونکہ یہ مشاہدہ سے حاصل کی ہوئی معلومات کی ابتدا اور انتہا ہے۔ لیکن اعیان یا جماعتی تصورات غیر فانی ہیں۔ جو مشہودات سے پہلے اور آخر موجود ہیں اور انہیں کی وجہ سے مشہودات ایک خاص ہیئت اختیار کرتی ہیں۔ انسانیت جیتے جاگتے انسانوں سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے اور حسن گلاب کے پھولوں سے زیادہ حقیقی ہے۔ حتی کہ ڈے کارٹ، جو ابھی تک اس تصور کا اسیر تھا، جس سے اس نے انسانوں کو آزاد کر دیا تھا، ہر فلفی سے مطالبہ کرتا تھا کہ حواس کی شہادت کو مسترد کر دو اور سوائے "واضح خیال" کے کسی چیز پر پورا یقین نہ رکھو۔

عہد جدید حواس کی بحالی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ سائنس میں گیلیلو نے اور فلسفہ میں بیکن نے حواس کو ان کی پرانی حیثیت واپس دلائی۔ ماہر فلکیات نے حواس پر آلات مشاہدہ کا اضافہ کیا۔ فلفی نے عقل اور مشاہدہ کا امتزاج پیدا کیا اور مقدس ترین نتائج کو استقرائی اصولوں پر پرکھا۔ اگر کسی کو منطق پڑھنا ہے، تو وہ بیکن کی "نودم او گنیم" پڑھے۔ بیکن کے نزدیک منطق، شمشیرزنی

کے مقابلہ کی طرح دلچسپ ہے۔ استدلال ایک معرکہ تسخیر ہے اور فلسفہ سراغ رسانی کا ایک افسانہ، جس میں حقیقت ایک مجرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتنی چوٹیلی باتیں ہیں اور کتنی حکمت ہے اس کتاب میں۔ کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے "انسان جو قدرت کا نمائندہ اور مفسر ہے، صرف اسی قدر کرتا اور جانتا ہے، جس قدر اس کا مشاہدۂ قدرت اسے اجازت دیتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ نہ کچھ جانتا ہے اور نہ جاننے کا اہل ہے"۔ کیا اس سے پہلے کسی نے تصوف، جہالت اور بلند بانگ علمی دعووں کے خلاف اتنی مکمل جنگ کا اعلان کیا تھا؟ یہ وہ بانگ درا تھی، جس نے باذوق لوگوں کو یکجا کیا اور تجدید علم کے نقارے پر چوٹ لگائی۔

اور پھر انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کے درمیان مباحثہ چھڑ گیا۔ لائبنز، کانٹ اور ہیگل نے حواس پر شکوک کی بھرمار کر کے انہیں معمہ بنا دیا۔ اور عقل کے اس دعویٰ کی پشت پناہی کی کہ وہی حواس کی شہادت کو پرکھ سکتی ہے۔ ہابز، لاک اور مل نے اس عقل کو بنظر تحقیر دیکھا جو حواس کی کائنات سے باہر ہمیں حقیقت تلاش کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ کانٹ نے کہا: لیکن ریاضی حسیاتی تجربہ سے بے نیاز ہے۔ ۵x۵ ہمیشہ ۲۵ ہوں گے چاہے حواس کچھ ہی کہیں۔ مل نے جواب دیا نہیں۔ ہم ۲x۲ کو اس لیے ۴ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تجربہ میں اور اس تجربہ میں جو ہمیں ورا ثتاً" ملا ہے، ۴ ہمیشہ ۲x۲ کا نتیجہ رہا ہے۔ لاک نے کہا: علم حواس سے پیدا ہوتا ہے اور ریاضی کی بلند ترین پرواز کی صحت بھی اس وقت تک غیر یقینی ہے، جب تک کہ تجربہ اس پر مہر قبولیت ثبت نہ کرے۔

کسی مباحثہ کا اتنا عجیب انجام کبھی نہیں ہوا۔ وہ فلسفہ جو علم کو فوق التجربہ سمجھتا تھا، یورپ میں ختم ہو گیا اور انگلستان نے اسے اپنا لیا۔ اور وہ فلسفہ جو تجربہ کو اہم سمجھتا تھا، انگلستان میں ختم ہو کر، امریکہ میں زندہ ہو گیا۔ کئی صدیوں سے انگلستان کا رجحان "عمل" کی طرف رہا تھا اور اس کی منطق کے عملی نتائج انگلستان پر تجارت پیشہ جماعت کی حکمرانی کا عکس تھے۔ لیکن اب جبکہ تجارت پیشہ جماعت نے زمیندار طبقہ کو مسخر کر لیا ہے، انگریز مفکر یکایک ناقابل فہم باتیں کرنے لگے ہیں۔ انہوں نے کانٹ اور ہیگل کو جرمنی سے درآمد کیا اور حواس کو بے معنی قرار دے دیا اور استخراجی استدلال سے ایسے قوانین اخذ کیے جو نہ صرف منطق کے لیے بلکہ کل کائنات کے لیے صحیح تھے۔ بریڈلے نے تجربہ کو "مطلق" کا نام دیا اور پھر اس کو فضا میں تحلیل کر دیا۔ بوسنکے نے تمام منطق، نفسیات استدلال بنا دیا اور پھر استنباط کی یوں تعریف کی: استنباط ایک عین کے اندر اختلافات کی حقیقت کی طرف درپردہ اشارہ ہے۔ اور یہ اشارہ ان اختلافات میں اس عین کی وضاحت کے ذریعے ہوتا ہے، جو براہ راست حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے منطق کو استدلال کی

سائنس سے تمام تصورات مجرد کی سائنس بنا دیا۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے ساتھ اس نے استخراجی یقینوں سے ریاضی کی ایک عمارت تعمیر کی جو تجربہ سے قطعی بے نیاز ہے اور صحت کی تعریف یوں کی:

الفاظ کا وہ مجموعہ صحیح ہے جو ایک واقعہ کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہو۔ کس واقعہ کے ساتھ کیا تعلق؟ میرا خیال ہے کہ بنیادی تعلق یہ ہے "وہ الفاظ کا مجموعہ صحیح ہے۔ اگر وہ شخص جو وہ زبان سمجھتا ہے، وہ لفظ اس وقت استعمال کرے جب وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں پائے، جس میں وہ تمام عناصر پائے جائیں جو ان الفاظ کا مطلب ہیں اور یہ عناصر اس میں اتنا شدید رد عمل پیدا کریں کہ وہ ان الفاظ کو استعمال کرے جن کا مطلب یہ عناصر ہیں"۔

افسوس! کیا برطانوی لوگ اپنی زبان سیکھنے جرمنی جاتے ہیں؟ اور کیا اہل مدرسہ کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے، جس میں ان خیالات کی تحقیق و تدقیق ہوتی تھی جن کا نہ تجربہ سے کوئی تعلق تھا، نہ زندگی کو کوئی فائدہ؟ اکثر جدید فلسفہ اس کوشش پر مشتمل ہے کہ جو کچھ سب لوگ جانتے ہیں اسے ایسے علم میں ڈھالا جائے جسے کوئی نہ سمجھ سکے۔

ولیم جیمز۔ امریکہ کی فعالیت پسند فضا کے زیر اثر تصورات محض سے بیزار تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ فلسفہ کے لیے ادق یا ناقابل فہم ہونا ضروری نہیں، اور حقیقت کا مطلب اتنے صاف اور سیدھے انداز میں بیان ہو سکتا ہے کہ اسے ایک تاجر بھی سمجھ سکے۔ حقیقت افادہ ہے۔ کسی خیال کی صحت کو اس کے ماخذ یا عیاں بالذات اصولوں سے استنباط کے ذریعے پرکھنے کی بجائے جیمز نے صحت کا معیار عمل کو بنایا اور ہر خیال کے عملی نتائج دیکھنے کی دعوت دی۔ اور اس طرح خیال کا رخ پھر محسوسات کی طرف پھیر دیا۔ جون ڈیوئی کے نزدیک خیال پیٹ اور ٹانگوں کی طرح محض ایک آلہ کار ہے اور اس کا معیار صحت یہی ہے کہ وہ اپنا وظیفہ پوری طرح ادا کرتا ہے کہ نہیں۔ خیال کا وظیفہ زندگی کو سمجھنا اور اس پر قابو پانا ہے۔ یہ تھی انگلستان کی استقرائی روایت، جسے دوبارہ شباب میسر آ گیا ہے۔ افادیت، ایک پرانے طرز فکر کا نیا نام ہے۔ یہ محض بیکن کے نظریہ کی تفصیل ہے، جس نے کہا تھا کہ وہ اصول جو عمل میں سب سے زیادہ کار آمد ہے، وہی خیال کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ صحیح ہے۔ بینتھم کا بھی یہی فلسفہ تھا کہ افادہ صحت کی کسوٹی ہے۔

افادیت میں کئی خامیاں ہیں، کیونکہ اس کے نرم مزاج بانی نے عام آدمی کو یہ فرض کرنے کی اجازت دے دی تھی کہ ان کے تمام بے بنیاد عقاید صحیح ہیں۔ اگر وہ انہیں اس دنیا کی جابرانہ بے نیازی سے فرار کرنے میں مدد دیں۔ لیکن ذاتی یا ہنگامی افادہ کسی عقیدہ کو صحیح نہیں بنا دیتا۔ فقط مستقل اور عالمگیر افادہ سے کوئی عقیدہ صحیح بنتا ہے اور چونکہ یہ ایسی شرط ہے جو کبھی مکمل طور پر

پوری نہیں ہوتی، صحت، فقط امکانِ صحت بن جاتی ہے۔ جب افادیت کو ماننے والے فلسفی کسی خیال کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ "یہ کبھی صحیح تھا" کیونکہ یہ کبھی مفید تھا تو ان کی بات لایعنی تھی، اس لیے کہ اس کی حیثیت ایک مفید غلطی کی تھی اور ہم کبھی اس بات کا یقین کرنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے کہ ہمارے محبوب عقاید ہی کہیں بقول نیٹشے "غلطی کی مفید ترین قسم" نہ ہوں۔ اس دنیا کی تخلیق عقل کی بنیاد پر نہیں ہوئی۔

اس طرح ہمیں پھر سوفسطائیوں کی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور ہم اسی فیصلے پر پہنچتے ہیں، جو ان کا تھا۔ حواس ہی صحتِ خیال کی کسوٹی ہیں، لیکن حس نہیں تمام حواس۔ ایک حس شاید ہمیں فریب دے دے، جس طرح روشنی ہمیں رنگوں کے بارے میں فریب دیتی ہے یا فاصلہ قامت کے بارے میں۔ اور کوئی دوسری حس ہی ہماری اس ایک حس کی غلطی کی تصحیح کر سکتی ہے۔ حقیقت مربوط احساس ہے۔ لیکن احساس میں ہمیں وہ تمام آلے اور اوزار شامل کرنے پڑیں گے، جن سے ہم حواس کو تیز اور وسیع کرتے ہیں۔ میٹ پیا، دوربین، خوردبین، حساس پلیٹ، ایکس رے، ہماری آنکھوں کو حساس تر بنانے کے آلے ہیں۔ ٹیلی فون، سٹیتھسکوپ اور ریڈیو، ہماری دنیائے سماعت کو وسیع تر بناتے ہیں۔ اور پھر احساس میں داخلی حس کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ ہماری زندگی اور ذہن کا اندرونی "احساس" دوسرے حواس کی شہادت کی طرح فوری اور قابلِ اعتماد ہے۔ آخر باوجود خود فریبی میں مہارت کے ہم کسی چیز سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں، جتنے اپنے آپ سے۔

یہ صحیح ہے کہ حواس ہمیں کوئی یقینی چیز نہیں بتا سکتے۔ ہیوم ٹھیک کہتا تھا، حواس ہمیں کوئی ماورائی قسم کی علیت کی شہادت نہیں دیتے۔ بلکہ فقط واقعات کی ترتیب کی۔ ہم کبھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ واقعہ ب ہمیشہ واقعہ الف کے بعد رونما ہوا ہے، اس لیے ہمیشہ ب الف کے بعد ظہور پذیر ہوگا۔ احساس کسی مستقبل کے ایک لمحہ کا بھی ہمیں یقینی علم نہیں دے سکتا۔ ہم محض اس امکان سے خطرہ میں کود سکتے ہیں کہ جو ترتیب واقعات پہلے تھی، آئندہ بھی وہی ہوگی۔ اور ہمیں ضرورت بھی اسی کی ہے۔ فقط ایک منطقی کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دنیا اتنی بوقلموں اور انقلاب آفرین ہے کہ ہمارے کلیے ہمیشہ خطرناک طور پر نامکمل رہتے ہیں۔ کوئی کلیہ ہمیں مطلق حقیقت نہیں بتاتا، فقط اضافی حقیقتیں بتاتا ہے اور ہمیں اضافی حقائق پر اکتفا کر لینا چاہیے۔

ہمارے علاوہ بھی دنیا میں لوگ ہیں اور ان کے حواس اور ان کی شہادت ہمیشہ ہمارے حواس کی شہادت کے مطابق نہیں ہوگی۔ جب پیرانڈیلو کے تمثیل میں سینیورا اینی کہتی ہے کہ وہ تب یقین کرے گی جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی اور اپنی انگلیوں سے چھوئے گی تو لینڈیزی اسے

بتاتا ہے "تمہیں کچھ اس تجربہ کا بھی احترام کرنا چاہیے جو دوسرے لوگوں نے دیکھ اور چھو کر حاصل کیا ہے اور جو ممکن ہے اس تجربہ کے بالکل برعکس ہو جو تم دیکھتی اور محسوس کرتی ہو"۔ جہاں معاملہ ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک سے زیادہ کا ہے، حقیقت اجتماعی طور پر مربوط احساس ہے، جہاں ایک سے زیادہ لمحات کا تعلق ہے۔ حقیقت مستقل طور پر مربوط احساس کا نام ہے۔ حقیقت رنگ رنگ کے شیشوں سے بنا ہوا گنبد ہے اور ہر شخص اپنے حقیر گوشہ سے ان رنگوں کا ایک مختلف امتزاج دیکھتا ہے۔ شاید حقیقت ہماری خود فریبیوں کا مشترکہ سرمایہ ہو اور یقین وہ غلطی ہو جسے تمام لوگ صحیح سمجھتے ہوں۔ لیکن ہمیں اسی تعریف پر راضی ہو جانا چاہیے۔

لیکن آخر اس کاروباری منطق میں جو ایک عامی کے تعصبات کی تصدیق کرتی ہے، عقل کا مقام کیا ہوگا؟ اس کا وظیفہ یہ ہے کہ احساسات کو خیالات میں، اور خیالات کو علم اور علم کو حکمت، مقاصد کو شخصیت، افراد کو سماج اور سماج کو امن میں مربوط کرے۔ تسخیر حقیقت میں عمل کا کام ثانوی مگر اہم ہے۔ یہ بہت سے احساسات کے انتشار اور تناقض میں ربط پیدا کر کے ہم آہنگ علم کی بنیاد رکھتی ہے۔ وہ علم جس کی تصدیق یا تردید آئندہ احساسات کر سکیں، اس کی شہادت، حواس کی شہادت سے کہیں کم یقینی ہے۔ کیونکہ مشہود کو عبور کرنے میں ہم استخراج سے کام لیتے ہیں۔ اور ہر استخراجی قدم ہمیں حواس کی شہادت سے دور لے جاتا ہے اور حقیقت کے امکان کو کم کر دیتا ہے۔ لیکن زندگی میں یہ جوا بھی کھیلنا پڑتا ہے۔ ہمیں متناقض احساسات اور جانبدار نظریوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں یہ منظور ہے کہ ہم اپنی فہم و فراست اور تسخیر فطرت کو وسیع اور فراخ کریں اور جس طرح کوہلر کے بندر اسی وقت بہتر استدلال کرتے تھے جب وہ پورے طور پر حالات کا جائزہ لے لیتے تھے، اسی طرح ہمارے لیے بھی مدلل حقیقت، فلسفہ اور حکمت، اخلاق اور حسن کی طرح مبسوط زاویہ نظر ہے، جس میں جزو کل میں سما گیا ہو۔ حواس کے ذریعے ہمارے قدم زمین پر جمے رہتے ہیں۔ عقل اور استدلال کے ذریعے ہم اپنی نگاہ حواس سے پرے ڈالتے ہیں اور نئے حقائق کا تصور باندھتے ہیں، جن کی حواس شاید کسی دن تصدیق کریں۔ احساس "صحت کی کسوٹی ہے، لیکن عقل صحت کو دریافت کرتی ہے"۔

۲۔ رموز علم

تو یہ ہے ہمارا مستقر۔ لیکن اس مستقر پر ہم ہر طرف سے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ عینیت میں یقین رکھنے والے، احساس کی صحت کی تردید کرتے ہیں اور صوفی عقل کے قابل اعتماد ہونے پر شک کرتے ہیں۔ ہم ان سے کس طرح دوچار ہوں گے۔

عمل ہی سے نیکی اور بدی کی تعمیر ہوتی ہے اور استعمال ہی سے شیریں اور تلخ بنتے ہیں۔ لیکن درحقیقت صرف ذرات موجود ہیں اور خلا۔ اس طرح تیئس سو برس گزرے مادیت پرست ڈیموکریٹس نے فلسفہ علم کی بنیاد رکھی اور عینیت کی طرح ڈالی۔ اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ اس مفکر خنداں کے ذہن میں تمام محسوسات کی داخلیت کا تصور تھا۔ رنگ، حدت، وزن، ہیئت، آواز، ذائقہ، شامہ اور درد یہ سب صفات چیزوں میں موجود نہیں بلکہ یہ سب کی سب محسوس کرنے والے میں موجود ہیں۔ ہابز نے بیس صدیوں کے بعد کہا کہ تمام وہ صفات جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، مادہ کی مختلف حرکات ہیں جو مختلف طریقوں سے ہمارے حواس کو متاثر کرتی ہیں۔ آواز ہوا کی حرکت ہے۔ روشنی اثیر کی حرکت ہے، یا نگاہوں پر جواہر فرد کی بم باری ہے اور رنگ روشنی کی لہروں کی شرح اور حجم سے زیادہ پردۂ چشم کے متاثر حصہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ معروضی حقیقت نہ گرم ہے نہ سرد، نہ بدصورت ہے نہ خوبصورت، نہ تاریک ہے نہ بے رنگ اور نہ خاموش۔ اگر دنیا میں آنکھیں یا حساس جسم نہ ہوتا تو روشنی کیونکر ہوتی؟ اگر دنیا میں کان نہ ہوتے تو آوازیں کیونکر ہوتیں۔ حسین ترین قوس قزح ہماری نظروں میں ہے نہ کہ آسمان میں! اب دیکھیں کہ عینی فلسفی کیا کہتے ہیں؟ عینی فلسفی یہ مانتے ہیں کہ ہم سوائے خیالات کے اور کچھ نہیں جانتے۔

یہ خارجی دنیا، جسے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری ذات سے الگ رہ کر قائم ہے، رنگوں کی دنیا ہے، لیکن رنگ داخلی ہیں۔ وہ ہم میں ہیں، ان چیزوں میں نہیں جنہیں ہم دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ چند رنگوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مثلاً قدرت میں انہیں سرخ رنگ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم سب ان کی طرح ہوتے تو کیا گلاب کبھی سرخ ہوتا۔ رنگ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور شام سے مصنوعی روشنی کے وقت تک بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں کون سا رنگ ''اصلی'' ہے؟ کیا کپڑے کا اصلی رنگ وہ ہے جو ہم دکان میں اسے خریدتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یا وہ، جب ہم اسے روشنی میں پہن کر چلتے پھرتے ہیں۔ دوسرے حیوانوں کی آنکھیں ہماری آنکھوں سے بالکل مختلف ساخت رکھتی ہیں۔ اور شاید وہ اور رنگوں اور شکلوں کی شہادت دیتی ہیں، کون سی شکل یا رنگ حقیقی ہے۔ ہماری آنکھیں قوس قزح کے بڑے حصہ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ بہتر آنکھیں رکھنے والے حیوان دنیا کے رنگ اور شکلیں ہم سے بہتر طریقہ پر دیکھ سکتے ہیں۔ ہم میں سے کون انسان یا حیوان، حقیقی دنیا کو دیکھتا ہے؟ اور یہ میز جسے ہم گول سمجھتے ہیں، اگر ہم اسے غیر متعصب نظر سے دیکھیں تو شاید یہ بیضوی ہو۔ کیا تمام شکلیں اور رنگ شاہد کے مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں؟

اسی طرح شامہ اور ذائقہ پر غور کرو۔ ہر شخص کی پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کو مچھلی کا اچار پسند ہے۔ لاکھوں اسے پسند کرنے کا صرف دعویٰ کرتے ہیں۔ مفلس چینی سڑی ہوئی

مچھلی کے ذائقہ کو خوشگوار سمجھتے ہیں اور دولت مند فرنگی سڑے ہوئے پنیر کے ذائقہ کو اچھا کہتے ہیں۔ اسی طرح گرم اور سرد کے تضاد کو لو۔ ایک ہاتھ گرم پانی میں ڈالو دوسرا سرد پانی میں۔ اور پھر دونوں ہاتھوں کو نیم گرم پانی میں ڈالو۔ نیم گرم پانی ایک ہاتھ کو سرد اور دوسرے کو گرم لگے گا۔ حقیقت میں یہ کیا ہے؟ اسی طرح لذت اور الم پر غور کرو۔ جب زبان سے دماغ تک کی نسیں کاٹ دی جائیں یا زکام سے متاثر ہوں تو غذا میں کوئی چاشنی باقی نہیں رہتی۔ کیا ذائقہ غذا میں، ذائقے میں یا دماغ میں ہے؟ ہمارے دانت میں درد ہے۔ ہم اس عصب کو جو دانت کو دماغ سے جوڑتی ہے بے حس کر دیں تو درد مٹ جائے گا۔ کیا یہ درد دانت میں تھا یا دماغ میں؟ یہی حال حسن اور قبح کا ہے، یہ عورت حسین ہے۔ لیکن کیا یہ اپنے بھائی، اپنے رقیب کے لیے بھی اسی طرح حسین ہے جس طرح تمہارے لیے؟ کیا اس کا حسن اس میں ہے یا ہماری آرزو میں؟ معروضی دنیا سے وہ تمام صفات لے لو، جو تم اپنے وجود اور اپنے مشاہدہ سے منسوب کرتے ہو تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ذرات، خلا، مادہ، مکان اور زمان۔

لیکن یہ مادہ سوائے احساسات کے، جو خیالات کی شکل میں تمہارے ذہن میں یکجا ہوتے ہیں، اور کیا ہے؟ مکان "پیچھے"۔ "آگے"۔ "ساتھ"۔ "نیچے"۔ "اوپر"۔ "یہاں"۔ "وہاں"۔ "نزدیک"۔ "دور"۔ "بڑا"۔ "چھوٹا" کے علاوہ کیا ہے؟ اور یہ سب رشتے سوائے مشاہدہ کرنے والے کے رویہ کے اور کیا ہیں؟ کیا اشیاء بذات خود آگے ہیں یا پیچھے، یہاں ہیں یا وہاں، بڑی ہیں اور چھوٹی نہیں، یا وہ ہماری نسبت سے ایسی ہیں۔ ایک چیز آنکھوں کو کچھ اور نظر آتی ہے اور خوردبین سے کچھ اور، اور دوربین سے کچھ اور۔ موسیو برجرٹ کے کتے نے کہا "میرا آقا جب میرے نزدیک آتا ہے تو بڑا ہو جاتا ہے اور جب دور جاتا ہے تو چھوٹا ہو جاتا ہے۔ میں ہی فقط وہ ہستی ہوں جو جہاں جاتا ہوں یکساں رہتا ہوں"۔ ایک سنگترے کا اصلی حجم کیا ہے؟ کیا وہ جو مکھی اس کے گرد گھوم کر محسوس کرتی ہے، یا وہ جو مجھے اسے ہاتھ میں لے کر محسوس ہوتا ہے۔ یا پھر وہ جو دور سے کوئی آدمی اسے سمجھتا ہے۔ تم پیمانہ کا حوالہ دے کر پناہ نہیں لے سکتے کہ سنگترے کا حجم وہ ہے جو پیمانہ ہمیں بتاتا ہے۔ پیمانہ کا ہر انچ سنگترے کی طرح ہے۔ وہ تمہیں بڑا لگتا ہے اور مکھی کو چھوٹا۔ اور مریخ کے کسی باشندہ کو تمہارے اندازے سے کہیں چھوٹا۔ درحقیقت انسان ہی تمام چیزوں کا پیمانہ ہے اور اس کے مشاہدہ کی دنیا بیشتر اس کی تخلیق ہے۔

آئن شٹائن نے کہا کہ نظریہ اضافیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زمان و مکان سے مادی معروضیت کا آخری شمہ بھی چھن گیا ہے۔ زمان سوائے ہمارے "پہلے" اور "بعد" کے احساس کے اور کیا ہے اور کیا اذہان کے وجود کے بغیر بھی "پہلے" اور "بعد" کا احساس باقی رہ جاتا ہے؟ شاید

وقت کا احساس پروانے کے ذہن میں زیادہ شدید ہو، بہ نسبت ہمارے ذہن کے، کیونکہ ہماری زندگی اس سے کہیں زیادہ سست ہے۔ کون سا وقت زیادہ حقیقی ہے۔ والٹیئر کے ایک افسانہ میں زحل کے ایک باشندہ نے یہ شکوہ کیا تھا کہ اس کے سیارہ پر زندگی کی میعاد فقط پندرہ ہزار برس ہے، اور اس مختصر سے عرصے میں کون کیا سیکھ سکتا ہے؟ وہ سال جس میں ہمارے تجربات زیادہ ہوں، اس سال سے زیادہ لمبا ہوتا ہے جس میں ہمارے لیے کوئی قابل یادگار واقعہ رونما نہ ہوا ہو۔ دانت نکلواتے ہوئے وقت دوچند ہو جاتا ہے۔ فلمیریون اس آدمی کا ذکر کرتا ہے جو زمین سے روشنی کی رفتار سے زیادہ دور ہو رہا تھا۔ اس نے انقلاب فرانس کے تمام واقعات معکوس سلسلہ وقت میں دیکھے۔ یعنی جو واقعات بعد میں ہوئے تھے، انہیں پہلے دیکھا اور جو پہلے ہوئے تھے، انہیں بعد میں۔ مکان زمان کو بدل دیتا ہے جیسے سمندری سفر میں ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ یا ہم نے موسیو پاسی پارتو کے "اسی (۸۰) دن میں دنیا کے سفر" میں دیکھا کہ زمان مکان کو بدل دیتا ہے۔ وہ سیارہ جسے ہم شمالی آسمان پر دیکھتے ہیں، اب وہاں موجود نہیں ہے۔ وہ روشنی دینے کے فورا بعد، جسے ہم اب دیکھ رہے ہیں، اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ زمان و مکان کا سلسلہ مقام اور فاصلہ کا ایک الجھا ہوا مرکب ہے۔ یہ ایک طرز مشاہدہ ہے، کوئی خارجی چیز نہیں۔ انسانی ذہن ایک زندان ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ ہمارے مشاہدہ کا کتنا حصہ مشہود میں ہے اور کتنا شاہد میں۔ یہ ہیں وہ محسوسات جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیں حقیقت کا پتہ دیتی ہیں۔

لیکن نہیں۔ محسوسات ہمیں حقیقت کی خبر نہیں دے سکتیں۔ ہم صرف اپنے خیالات کو جانتے ہیں اور ہم ان کی صحت کا اندازہ اس خارجی دنیا کے ذریعے نہیں کر سکتے جو ہماری محسوسات نے تخلیق کی ہیں۔ ہم یہ کیونکر جان سکتے ہیں کہ کوئی چیز دراصل کیا ہے، جبکہ وہ ان حواس کے طرز مشاہدہ میں رس بس کے ہم تک پہنچتی ہے جن کے ذریعے ہم اسے جانتے ہیں۔ یہ خارجی دنیا جسے ہم خیال کی صحت کا ضامن سمجھتے ہیں، خود تخلیق خیال ہے۔ یہ وہ خیال ہیں جنہیں ہم احساسات کے انتشار میں ربط پیدا کر کے بناتے ہیں۔ ہم دیکھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کے تاثرات کو ملا کر کوئی چیز بناتے ہیں۔ ہم مشاہدہ کرنے میں کوئی چیز تخلیق کرتے ہیں۔ ہمارے ذہن، ہمارے خیالات کی دنیا یقینا وجود رکھتی ہے، باقی ہماری فرضی باتیں ہیں۔

کیا یہ سچ ہے؟ شاید فلسفہ یقینی موجودات سے شغف نہیں رکھتا اور فن کی طرح فلسفہ علم کے بارے میں بھی ہم فقط یہی کہہ سکتے ہیں کہ ذوق کے معاملہ میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ شخص جو خیالات کی وضاحت چاہتا ہو، خارجی دنیا کی یہ عینی تردید اسے قائل نہیں کر سکتی۔ یہ استدلال منطقی قلابازی، وحشیوں کے سحر اور زمانہ وسطیٰ کے اسرار کی یادگار ہے۔ تجربہ ہی ہر چیز

نہیں کیونکہ اس کے علاوہ تجربہ کا ماخذ بھی ہے اور اسی ماخذ کو ہم مادہ کہتے ہیں۔ مادہ کے بارے میں ہم جون سٹوارٹ مل کے اس قول سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ محسوسات کا مستقل امکان ہے۔

عینی فلسفہ کے فریب کا راز یہ ہے کہ وہ "مطلب" کو "وجود" کے ساتھ الجھا دیتا ہے۔ وہ چیزیں جن کا کوئی شاہد مشاہدہ نہیں کرتا، ان کا کوئی مطلب نہیں، لیکن شاید ان کا وجود ہو۔ بریڈلے نے کہا تھا کہ کسی چیز کے حقیقی ہونے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کا مشاہدہ کیا جائے۔ لیکن کیا وہ دور کے سیارے دوربین کی ایجاد سے پہلے وجود نہیں رکھتے تھے۔ اور کیا ہم یہ یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا سیارہ موجود نہیں جو ہمیں موجودہ آلوں سے بھی نظر نہ آتا ہو؟ بے شک وہ ایسے نہیں تھے اور نہ ہیں جیسا ہم ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ روشنی کا نقطہ جسے ہم شعریٰ کہتے ہیں، شاید تاریک مادہ کا ایک ہیولیٰ ہو، جو اس تیز رفتاری سے ذرات پیدا کرتا ہو کہ وہ راستہ میں روشن ہو جاتے ہوں، لیکن ان ذرات کا سرچشمہ خارجی دنیا ہے۔ دوربین اس کی تخلیق نہیں کرتی۔ کسی مہندس نے یہ پیش گوئی کی کہ اگر ہم اپنی دوربین آسمان کے ایک خاص گوشہ کی طرف موڑلیں تو ہمیں وہاں ایک نیا سیارہ دکھائی دے گا۔ دوربینوں نے دیکھا اور ایک نیا سیارہ دریافت کیا۔ کیا اس طرح ہم نے نیپتون کو تخلیق کیا تھا؟

ہم یہ مانتے ہیں کہ ان سیاروں کا وجود، جن کا ابھی ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے، محض ایک استنباط ہے اور کوئی استنباط یقینی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک استنباط جس کی کئی ہزار سالوں سے ہر رات مشاہدہ سے تصدیق ہوئی ہو، نہایت معقول استنباط ہے۔ جو انسانی زندگی کے لیے اور اس فلسفہ کے لیے جو گوشہ گیری اختیار کرنے کی بجائے زندگی کو متاثر کرنا چاہتا ہو، کافی ہے۔ جب ہم اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہیں اور اس میں کوئی زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے تو کیا اس کمرے کا وجود باقی نہیں رہتا؟ غالباً رہتا ہے، کیونکہ جب ہم لوٹتے ہیں تو وہ کمرہ وہیں موجود ہوتا ہے۔ یہ معلوم کر کے ہمیں تسکین ہوتی ہے کہ مس مے سنکلیئر، جو ناول اور فلسفیانہ رسالے لکھ کر اپنا دل بہلاتی ہیں، یہ مانتی ہیں کہ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہیں تو اسے تخلیق نہیں کرتیں۔ فلسفہ مذہب عورتوں کو خوب فریب دیتا ہے لیکن مردنے بھی فلسفہ علم سے دھوکا کھایا ہے۔

"اعتباری" اور "معروضی" ان لفظوں کا مطلب کیا ہے؟ شاید عینی فلسفہ کا کھیل ان الفاظ کی تعریف نہ کرنے سے ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہم عینی فلسفی کی بات مان کر دنیائے اعیان (جسے وہ صحیح سمجھتا ہے) اور اس دنیا میں تمیز کریں، جو ہمارے لیے حقیقت رکھتی ہیں، لیکن اس کے لیے نہیں۔ اعتباری دنیا سراسر خیالات اور اعیان پر مشتمل ہوگی اور باقی سب کچھ معروضی ہوگا۔ لیکن یہاں ہمیں ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ اس معروضی دنیا میں مشاہدہ کرنے والے کا جسم

بھی شامل ہے جس میں اس کی آنکھیں، زبان، ناک، کان اور انگلیوں کے سرے بھی شامل ہوں ے۔ اس کے حواس بھی اس کی ٹانگوں کی طرح معروضی دنیا کا ایک حصہ ہیں اور اس کی ٹانگیں بھی یقیناً اس دنیا کا حصہ ہیں جیسے کہ وہ زمین، جس پر وہ کھڑا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم یہ مان لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احساسات معروضی حالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کی ہم یوں وضاحت کریں گے:

رنگ کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ رنگوں کے احساس کے تین اسباب ہیں: اول، ہمارے احساس کے خارجی سبب کی مادی اور کیمیاوی ترکیب (ہم اس خارجی سبب کے وجود کے لیے دلائل پہلے دے آئے ہیں)۔ دوم، روشنی کی مقدار اور قسم، جس میں اس کے ماخذ کی کیمیاوی ترکیب اور لہروں کی شرح اور حجم بھی شامل ہے۔ سوم، دیکھنے والے کی آنکھیں۔ اعصاب بینائی اور دماغ کے مراکز بینائی، ان میں سے کوئی چیز بھی "خارجی" نہیں اور غالباً ان آلات کے ذریعے جو دوسری سائنسوں کے آلات سے زیادہ نازک نہیں ہوں گے، ہم اپنا پردۂ چشم، اعصاب بینائی اور دماغ کے مراکز بینائی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سب حالات خارجی دنیا کے حصے ہیں، شعور یا خیال کے حصے نہیں ہیں۔

روشنی کے ان تین اسباب سے معروضی حالات کی ترکیب ہوتی ہے، جن میں سبب، توسط اور حس شامل ہیں۔ ان میں سے کسی سبب کی تبدیلی سے رنگ کا احساس تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم کیمیاوی ترکیب سے کسی چیز کا رنگ سرخ کر سکتے ہیں۔ ہم مصنوعی روشنی سے نیلے کپڑوں کا رنگ سیاہ کر سکتے ہیں اور ہم آنکھوں کی پتلی دبا کے سرخ چھوٹے ستارے دیکھ سکتے ہیں۔ مختلف رنگ نتیجہ ہیں مختلف معروضی حالات کا۔ یہ کسی چیز کی مستقل صفت نہیں ہیں اور نہ یہ مشاہدہ کرنے والے کی تخلیق ہیں۔ عینی فلسفی صحیح کہتا ہے کہ کوئی درخت سبز نہیں ہوتا، جب تک کوئی اسے دیکھنے والا نہ ہو، لیکن وہ یہ غلط فرض کرتا ہے کہ مشاہدہ سے درخت کا سبزہ تخلیق ہوتا ہے۔ اگر مشاہدہ سے سبز رنگ پیدا ہوتا ہو تو مشاہدہ کرنے والے کو درخت، بادل، گلاب اور سنہری بال سب کچھ سبز نظر آ سکتا ہے۔ دائمی حقیقت یہ ہے کہ جہاں متضاد تصورات کے درمیان صحت کا فیصلہ کرنا ہو، حقیقت ان تصورات کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

رنگوں کے علاوہ یہ بات ہیئت اور آواز کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ آواز بھی معروضی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ خارجی سبب، ہوائی موجیں اور عصب سماعت، یہی حالت اس نیم گرم پانی کی ہے جو ایک ہاتھ کو گرم اور دوسرے ہاتھ کو سرد محسوس ہوتا ہے۔ حرارت حساس اعصاب اور مادی حالات کا مرکب ہے۔ اور چونکہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے زیادہ گرم ہے، ہر ہاتھ کے نتیج احساسات مختلف ہوں گے۔ لیکن حالات پانی اور ہاتھ دونوں معروضی ہیں، مشاہدہ کرنے والا انہیں

تخلیق نہیں کرتا۔ حقیقی رنگ، حقیقی ہیئت، حقیقی حرارت اور حقیقی آواز کیا ہے؟ کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ہر انسان کے حواس حالات کی نوعیت بنانے میں شرکت کرتے ہیں اور ہر شخص کے حواس مختلف شہادت دیتے ہیں۔ زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم ان مشاہدات کو ”حقیقی“ سمجھیں، جن کے متعلق مختلف لوگ ایک سی شہادت دیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عناصر جن کے بارے میں مختلف لوگ متفقہ شہادت دیں، معروضی عناصر ہیں، جو مختلف شخصیتوں کی ساخت سے مستغنی ہیں۔ حقیقت اجتماعی طور پر مربوط احساس ہے۔

ہم نے زمان اور مکان کے مسائل کو آخر تک کے لیے اس لیے ملتوی کر رکھا ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں اس قدر شدید انتشار ہے کہ شائن میٹز اور آئن شائن جیسے سائنس دان کانٹ کے آگے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ مکان بحیثیت فاصلہ کی پیمائش کے، کسی حد تک اضافی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ فاصلہ اور مقام کا تعین دونوں ہم سے اضافی تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مکان چونکہ حرکت کی تمام ممکن سمتوں کا مجموعہ ہے، ہمارے وجود سے بے نیاز ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ولیم جیمز نے مینیت کی کافی کامیاب تردید کر دی تھی، جب اس نے نہایت بے اعتنائی سے کہا کہ ہم نسبتوں کا بھی اسی طرح براہ راست مشاہدہ کرتے ہیں جس طرح کسی اور چیز کا۔ اور اگر یہ تردید کافی نہ ہوتی تو کوہلر کے وہ تجربات جو چمپانزی بندروں پر کیے، اس تردید کے لیے کافی ہوتے۔ ہم ترکیب عدم مساوات، حرکت اور سکون کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جب ہم ایک ساکن پس منظر کے مخالف ایک کیڑے کی حرکت دیکھتے ہیں تو ہم براہ راست زمان و مکان کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔

وقت حرکت کی اولاد ہے۔ اگر حرکت نہ ہو تو کائنات میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو۔ اگر کوئی تبدیلی نہ ہو تو وقت باقی نہ رہے۔ وقت جو پہلے اور بعد کا احساس ہے، ایک بہاؤ کا احساس ہے اور ”اضافی“ حیثیت رکھتا ہے اور صرف اذہان ہی دنیا کو وقت بخش سکتے ہیں۔ لیکن وقت بمعنی تبدل یا انقلاب معروضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر تمام اذہان ختم ہو جائیں تب بھی یہ جاری رہے گا۔ درخت تب بھی پھوٹے، پھلے پھولے اور مرجھائے گا جبکہ کوئی شخص اس کا مشاہدہ کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی مشاہدہ کرنے والا شخص بھی باقی نہ رہے تو سمندر کا مد و جزر بدستور قائم رہے گا اور زمینوں کے بڑے بڑے خطے سمندر کی تہہ میں پگھل جائیں گے۔ سمندر بائرن کی سخن وری سے پہلے بھی موجزن تھا اور اس کے آخری شعر کے بعد بھی رواں دواں ہے۔ یہ زمان و مکان کی کائنات ایک بین حقیقت ہے، جو ایک صاحب فہم و فراست کے لیے اسی قدر صحت رکھتی ہے جس قدر کہ کوئی الہیاتی نظریہ۔ اس دنیا کا وجود ہمارے وجود کا سبب، اس کی پابندی اور اس کا سرچشمہ ہے۔ ہمارے ذہن اس دنیا کو وجود عطا نہیں کرتے بلکہ معنی اور اہمیت دیتے ہیں۔ دنیا کی چیزوں کا کوئی

مفہوم نہیں، جب تک کہ ہم ان میں مفہوم پیدا نہ کریں۔ شاید اسی لیے یہ دنیا "ناقابل فہم" ہوگئی ہے۔

ہم یہ امید کرتے ہیں کہ فلسفہ کی تحریک میں فلسفہ علم کا وحشت ناک خواب ختم ہوگیا ہے۔ اور زندگی اور موت کے مسائل کا ذکر پھر سنا جائے گا۔ عینیت نے اگرچہ مشاہدہ کی دنیا میں حواس کی اہمیت مسلم کر کے علم کی خدمت سرانجام دی تھی، تاہم اس فلسفہ میں ایک خاص طرح کی معصومیت تھی۔ اگر یہ فلسفی اپنی زندگی کی ترتیب اپنے نظریوں کے مطابق دیتے، اگر وہ اس مفروضہ پر عمل کرتے کہ یہ خارجی دنیا "غیر حقیقی" ہے، تو ہم ان کا اسی طرح احترام کرتے جس طرح ہم صوفیوں کا احترام کرتے ہیں جو زندگی کو اپنی پارسا خود فریبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دنیا کے یہ زعما دنیوی جاہ و جلال کی ہوس ایک حقیقت پسند کی طرح کرتے ہیں۔ جیسا کہ مادام ڈی سٹیل نے کہا تھا کہ فکٹے نے بھی اپنے انکسار کے لمحات میں یہ بات مان لی ہوگی کہ اس نے اپنی بیوی کو اس کا مشاہدہ کر کے تخلیق نہیں کیا تھا۔

جرمنی سے جو کہ پریوں کی کہانیوں کی سرزمین ہے، اس سب سے عظیم کہانی کی ابتدا ہوئی کہ ذہن نے دنیا کی تخلیق کی ہے اور رومانی تحریک نے اس افسانہ کی طرح ڈالی۔ رومانی تحریک، والٹیئر کے عہد کی مادیت، حقیقت پرستی اور تشکک کے خلاف جذبات اور تخیل کی بغاوت تھی۔ یہ ایک احتجاج تھا، اس تحقیر انسانی کے خلاف جو کوپر نیکس کے انکشافات سے ہوئی تھی۔ ڈارون کے نظریہ کے سامنے یہ تحقیر مدہم سے مدہم ہوتی جا رہی ہے اور غالباً بہت جلدی بالکل سرد پڑ جائے گی۔ فرانس کے فلسفہ میں عینیت کچھ کم ہی ہے کیونکہ وہاں لوگ منافقت کے بغیر بے باکانہ آرزو کر سکتے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ غیر فانی بننے کے لیے یہ لازمی ہے کہ دنیا ختم کر دی جائے، کیونکہ دنیا ہمارے وجود سے پہلے بھی قائم تھی اور ہماری موت کے بعد بھی قائم رہے گی۔ جب قدرت یہ سنتی ہے کہ انسان ہی ہر چیز کا پیمانہ ہے تو ہماری خود فریبی پر ہنستی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ انسان اس کے افسانے میں محض ایک فقرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلسفہ کل کی روشنی میں جزو کو دیکھنے کی کوشش کا نام ہے۔ ہمیں اپنی حقیر حیثیت پر قانع رہنا چاہیے۔

۳۔ عقل اور جبلت

ہم نے اب تک اس حملہ کی مدافعت کی ہے جو کہ عینی فلسفہ نے حواس پر کیا تھا۔ اب اس سے پہلے کہ ہم منطق کو خیرباد کہیں اور زندگی کے مسائل سے الجھیں، ہمیں عقل پر تصوف کے حملہ کو روکنا ہے۔ ہیوم نے کہا تھا کہ جب عقل، آدمی کی مخالفت کرتی ہے تو آدمی بھی ضرور عقل کی

مخالفت کرنے لگتا ہے۔ اگر عقل آرزو کی تسکین کے لیے منطق ہواد نہ تلاش کر سکے تو آرزو کا عقل کے تسلط کے خلاف بغاوت کرنا قرین قیاس ہے۔ ہماری زندگی میں جو ان امیدوں پر قائم ہے، جو عقل سے ہزاروں کوس آگے ہیں، اس بات کا امکان ہو سکتا تھا کہ ہم ایک ایسی ماورائے عقل منطق ایجاد کریں، جو ہمارے خوابوں کے جواز کا تانا بانا بنے گی۔

اور جس طرح ڈیموکریٹس نے عینیت کی طرح ڈالی تھی، اسی طرح ایلیا کے مشکک فلسفی زینو نے تصوف کی راہ صاف کی۔ سقراط سے ایک صدی پہلے زینو نے اپنی "الجھنوں" سے عقل کا ایسا مذاق اڑایا کہ وہ سراسر بے عقلی نظر آنے لگی۔ ایکیلیز، کچھوے کے پیچھے بھاگتا ہے، لیکن چونکہ کچھوا اس سے آگے ہے، اس لیے وہ کبھی کچھوے کو نہیں پکڑ سکتا کیونکہ جونہی ایکیلیز اپنے مقام سے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے کچھوا چلا تھا، کچھوا تھوڑا سا اور آگے بڑھ جاتا ہے اور جتنی دیر میں ایکیلیز یہ فاصلہ طے کرتا ہے، کچھوا اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اسی طرح یہ دوڑ لامتناہی رہتی ہے، حتیٰ کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عقل سب کچھ ثابت کر سکتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ کچھ نہیں ثابت کر سکتی۔ اسی طرح ایک چلتا ہوا تیر حرکت نہیں کرتا، کیونکہ جب تک کوئی چیز ایک جگہ پر ہے وہ ساکن ہے۔ اڑتا ہوا تیر ایک لمحہ میں ایک ہی جگہ پر ہے، اس لیے وہ اس لمحہ ساکن ہے اور اس لیے وہ اپنی پرواز کے ہر لمحہ میں ساکن ہے۔ اناطول فرانس اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "استدلال سے ہر چیز ثابت ہو سکتی ہے۔ ایلیا کے زینو نے یہ ثابت کیا ہے کہ اڑتا ہوا تیر ساکن ہے۔ ہم ایسی بات بھی ثابت کر سکتے ہیں جو اس خیال کی ضد ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ ضد کو ثابت کرنا زیادہ مشکل ہے"۔

یونانی اور رومی اپنی لذت پرستی کے لمحات میں بھی رواقی تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عقل اور آرزو میں تناقص ہے، تو انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنی مجبوریوں کو قبول کر لیا۔ وہ عقل کی پیروی تو کرتے تھے لیکن، اس کے بلند بانگ دعووں کو زیر لب تبسم کے ساتھ سنتے تھے۔ لیکن مشرق سے تصوف کی وہ طاقتیں امڈیں، جنہوں نے ہمیشہ انسانی امید سے نئی زندگی حاصل کی تھی اور یونان میں سرایت کر گئیں اور اس ناتواں اور کمزور حیات عقل پر مسلط ہو گئیں، جو کبھی یونان میں پھلی پھولی تھی۔ کبریائی الہام و وحی نے آکر مظلوموں کی ڈھارس بندھائی اور جب یونان تباہ اور ہر یونانی مفلس ہو گیا، تو عقل مر گئی اور ایمان نے (جو کہ کبھی نہیں مرتا) یونان کے عہد زریں کو ختم کر دیا۔ منطق کیا کیا ثابت کرتی ہے؟ اب یہ بات اہم نہیں رہی۔ خدا نے عجیب و غریب باتیں کہی تھیں۔ اور جتنی زیادہ وہ ناممکن معلوم ہوتی تھیں، ان پر ایمان لانا اتنا ہی زیادہ قابل قدر فعل تھا۔ "ناممکن بات پر یقین لاؤ"۔ یہ لاکھوں غلاموں کا نظریہ زندگی بن چکا تھا۔ پندرہ صدیوں تک حقیقت کی

تعریف عقل اور حواس کے ذریعے نہیں ہوتی تھی، بلکہ الہامی کتاب کے مطالعہ اور اسقفوں کی تفسیروں کے توسط سے کی جاتی تھی۔

یہ کلیسا کی زبردست غلطی تھی کہ اس نے اہل مدرسہ کو یہ اجازت دے دی کہ وہ الہام اور وحی کو عقل کے ذریعے ثابت کریں۔ اس نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ کھیل بغیر کسی قسم کی دشواری کے جاری رہے گا اور کوئی غیر متوقع حادثہ بہترین دماغوں کو عقل پسندی کی طرف راغب نہیں کر دے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ڈے کارٹ کو عقل سے محبت ہو گئی۔ سپنوزا نے اس کے لیے فاقے کیے۔ برونو اس کی خاطر جلا دیا گیا۔ اور لوگ اپنی نئی محبوبہ کو اس کی مظلومی کی وجہ سے اور بھی احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔ عقل کی پرستش خود ایک مذہب اور ایک ایمان بن گئی۔ روشنی کے زمانہ نے اس پر اپنا یہ مستحسن ایمان قائم کیا کہ انسان میں پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لاتعداد اور لامتناہی امکانات موجود ہیں۔ اور انقلاب فرانس نے عقل کی حسین دیوی کی پرستش کے لیے کئی صنم کدے تعمیر کیے۔ کوئی ایسی رحمت نہیں تھی جو عقل انسانیت پر نچھاور نہ کر سکتی۔

روسو اس صاف شفاف فضا میں ناخوش تھا۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے اس لیے اسے ایمان کی ضرورت تھی۔ جب عقل نے اس کی تضحیک کی تو وہ اسے ایک مرض سمجھنے لگا۔ اس نے کہا کہ میں یہ اعلان کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ غور و خوض کرنے کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے اور فکر کرنے والا حیوان ایک ذلیل حیوان ہے۔ یونان اور مشرق کے تعلقات کا کھیل پھر کھیلا گیا۔ زندگی سے تھکے ہوئے انقلاب، دہشت اور شوکت سے سہمے ہوئے انسان ایمان کی طرف پلٹے اور واپسی پر انہوں نے جبلت اور جذبات کی مدد طلب کی۔ ڈی موسے نے کہا، ہمیں اب بے عقل بن جانا چاہیے۔ متشکک ہیوم نے علیت، استقرا اور سائنس کو محض مفروضے اور امکان میں تحلیل کر کے دشمن کو غیر شعوری طور پر کمک پہنچائی۔ کانٹ نے جو ان سب سے زیادہ زیرک مفکر تھا، زینو کے فلسفہ کو دہرایا اور یورپ والوں سے کہا کہ خدا "حریت" عزم اور بقا کے بارے میں جو چاہو یقین کرو، کیونکہ عقل ایک ناقص آلہ ہے، جو اس قابل نہیں کہ اس کی بارگاہ میں مافوق الفطرت قلمرویں اور ارضی جنتیں قربان کر دی جائیں۔ شوپنہار نے یہ حقیقت بے نقاب کی کہ عقل عزم کی غلام ہے۔ اور فرائیڈ نے ہزاروں مثالیں دے کر عقل کی سطحیت ثابت کی اور یہ دکھایا کہ عقل محض جسمانی خواہشات کا لباس ہے۔ نیطشے نے جبلت کی یہ تعریف کی کہ وہ تمام ذہانتوں سے زیادہ ذہین ہے۔ برگساں نے عقل کی یہ کہہ کر مذمت کی کہ یہ فطری طور پر مادہ پرست ہے اور اس سینما کی مانند ہے جو اپنے جامد ٹکڑوں میں کھو کر زندگی کے تسلسل اور قلب و نظر کی واردات سے بے خبر ہے۔ امیلی سے لے کر تخلیقی ارتقا تک یہ تمام زمانہ یعنی روسو، کانٹ، شوپنہار، نیطشے، برگساں اور

ولیم جیمز کا زمانہ عہد خرد کے خلاف رومانی بغاوت کا زمانہ تھا۔ آج لوٹسے کے خلاف کنفیوشس، زینو کے خلاف سقراط اور روسو کے خلاف والٹیئر کی جنگ از سر نو لڑی جانی چاہیے۔

جبلت کیا ہے؟ اگر ہم نفسیات کے تازہ ترین رجحانات کی پیروی کریں تو جبلت کو ایک لایعنی تصور سمجھ کر ٹھکرا دیں گے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ماہرین نفسیات جو جبلت کو ایک ہاتھ سے دھکیلتے اور دوسرے ہاتھ سے ناآموختہ عمل کا نام دے کر سینے سے لگا لیتے ہیں تو ہم پرانی شراب کو کیوں نہ پرانے پیمانے میں بھرا رہنے دیں اور کیوں نہ اپنے چلنے، دوڑنے، کھانے، کھیلنے، لڑنے، فرار کرنے، جنس مخالف سے عشق اور اپنے بچوں سے محبت کرنے کے موروثی میلانات کو جبلت ہی کے نام سے پکاریں۔

”جبلت“ ایک مفید تصور ہے جو ہمارے کردار کے ان پہلوؤں کی توجیہ کرتا ہے جنہیں ہماری نسل نے فوری ضرورتوں کو بغیر تامل کے پورا کرنے کے لیے پیدا کیا ہے لیکن یہ رجحانات صرف قدیم اور ایک ہی قسم کے حالات پر قابو پانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ رجحانات حیوانی اور شکاری زندگی کے پس منظر میں ہویدا ہوئے ہیں اور اگرچہ یہ رجحانات اس وقت ہماری خدمت کرتے ہیں جبکہ فکر کرنے کا وقت نہیں ہوتا ہمارے لیے وہ قدیمی حالات کو سازگار بناتے ہیں، نہ کہ آج کے حالات کو۔ بچہ سانپ سے ڈر کر بھاگتا ہے، لیکن ایک بھری ہوئی بندوق سے کھیلتا ہے۔ ایک آدمی ایک گہرا مفکر ہو سکتا ہے، لیکن ایک بے مغز گڑیا کو اپنا شریک حیات بنا سکتا ہے۔ مثلاً سقراط نے زینتھپ سے شادی کی اور گوئٹے نے کرسٹیان سے۔ ہم جبلی طور پر ملیریا اور زرد بخار سے نہیں لیکن بجلی کی کڑک اور تاریکی سے ڈرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں پر ترس نہیں کھاتے جو جوہر قابل رکھتے ہیں اور انہیں اس جوہر کے نشوونما کا موقع نہیں ملتا، لیکن ایک مجروح کے رستے ہوئے زخم کو دیکھ کر ہمیں رحم آ جاتا ہے۔ ہم کسی عظیم ناانصافی سے اس قدر متاثر نہیں ہوتے جس قدر کہ تھوڑے سے بہتے ہوئے خون سے۔ ہم اس ویٹر کے حقارت آمیز رویے کو جسے ٹپ نہ کیا گیا ہو زیادہ محسوس کرتے ہیں لیکن اپنی سستی، جہالت اور حماقت کا احساس تمہیں کم ہوتا ہے۔ جبلت غالباً وحشیوں کی شکاری زندگی کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن زراعتی زندگی کے لیے کافی نہیں اور جب ہم فطرت کی طرف لوٹنے کی آرزو کرتے ہیں تو ہماری خواہش یہی ہوتی ہے کہ ہم شکاری زندگی کی طرف مراجعت کر جائیں۔ لیکن جب سے تہذیب کی ابتدا ہوئی ہے، جبلت زندگی کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر رہی ہے اور اس لیے ہمیں عقل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

عقل کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ شاید جب قطب سے برف کے تودے پگھل کر آئے تو ہوا منجمد ہو گئی۔ زراعت تباہ اور حیوانوں کی لاتعداد اقسام ختم ہو گئیں اور چند حیوانوں نے بھاگ کر خط

استوا کے علاقہ میں اس انتظار میں پناہ لی کہ شمال کا غیظ تھم جائے۔ غالباً اس تاریک زمانہ میں جبکہ سردی کے طوفان نے قدیم اور معینہ انداز زندگی کو ختم کر دیا اور جب موروثی طرز کردار نئے ماحول سے سازگار ہونے میں ناکام رہا تو وہ حیوان جن کا جبلی نظام مکمل اور لچک سے محروم تھا، ختم ہو گئے کیونکہ وہ بدلے ہوئے ماحول کے پیش نظر اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اور انسان نے جس کی ساخت میں لچک تھی، آگ جلانے، کھانا پکانے اور کپڑا پہننے کا فن سیکھا اور اس طرح اس طوفان کا مقابلہ کیا۔ اور جنگل اور میدان کے تمام حیوانوں پر تسلط قائم کر لیا۔

ان حالات میں سے عقل پیدا ہوئی اور جیسا کہ گریہم والس نے کہا ہے کہ عقل بھی ایک خاص حد تک جبلی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک نئے ماحول میں ہم جبلی طور پر زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ نئے حالات کا ہر عنصر ہم میں سے ایک علیحدہ رجحان کو تحریک دیتا ہے اور اس طرح ہمارا عمل ایک مکمل مرکب بن جاتا ہے جو حالات کے کسی قدر مکمل مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اضطراری عمل ایک خاص عمل ہے، جو ایک خاص تحریک کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، جیسے کسی زخم کو چھیڑنے سے ہمیں درد کا احساس ہوتا ہے۔ جبلت ہمارا ایک عمومی عمل ہے جو حالات کے کسی خاص عنصر کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے مثلاً جب ہم کسی حسین چہرے کی آرزو کرتے ہیں۔ عقل حالات کے مکمل جائزہ پر مبنی ایک مکمل عمل ہے۔ اس لیے وہ محبت کو مٹا دیتی ہے اور ممکن ہے ہماری نسل کو ختم کر دے۔ جس طرح احساسات آرزو کے مطابق خیالات کے سانچے میں ڈھلتے ہیں، اس طرح جبلت اور عادت ہزاروں آزمائشوں اور غلطیوں کے بعد معقولیت کا رنگ اختیار کرتی ہے۔ جبلت اور عقل میں "قسم" کا نہیں بلکہ "مقدار" کا فرق ہے۔ وہ ایک دوسرے کے عناصر بہم پہنچاتے ہیں۔ تدبیر مختلف حرکات کی باہمی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے۔ تمیز اور فہم حالات کے عناصر کا تجزیہ کرنا ہے، تاکہ ہم اپنے عمل کو مکمل بنا سکیں۔ عقل احساسات کا تجزیہ ہے اور عمل کی ترکیب۔

اس کی کمزوری اس تاخیر سے پیدا ہوتی ہے، جس کی یہ تخلیق ہے۔ بہت سے ہونہار فلسفی ایک ہی مسئلہ کا تجزیہ کرتے کرتے تباہ ہو گئے۔ گرفیولیز نے کہا کہ اگر ہم کسی مسئلہ پر بہت دیر تک غور کریں تو ہم کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔ اس لیے فرانس کے کبھی اشتراکی برگساں کے فلسفہ وجدان کو بہت پسند کرتے تھے۔ برگساں نے خرد پر پابندیاں عاید کیں۔ اور یہ تجویز کیا کہ نتائج اور اعمال کے بعد ہمیں لمحات فرصت میں استدلال کرنا چاہیے۔ مزید برآں عقل جب احساسات کا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ شہادت اور ثبوت سے زیادہ خیال کی باریکی کو اہمیت دینے لگتی ہے۔ اس طرح وہ مرقوم تاریخ بن جاتی ہے، جو محض ایک آرزو کی وکیل ہوتی ہے، جیسے کہ آج ایک بچہ بھی یہ کہتا ہے کہ عقل ہماری آرزوؤں کے جواز ڈھونڈنے کا وسیلہ ہے۔ اکثر اوقات ہم کوئی کام اس لیے نہیں

کرتے کہ ہمارے پاس اس کام کے واسطے دلائل موجود ہیں‘ بلکہ ہم دلائل اس لیے تلاش کرتے ہیں کہ ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں پر کوئی فلسفہ تعمیر کرنا آسان ترین بات ہے۔ ہمیں احتیاط کرنی چاہیے کہ ہم اشتراکی محض اس لیے نہ بنیں کہ ہم مفلس نہیں یا رجعت پسند‘ اس لیے کہ ہم اس نظام میں کامیاب ہیں۔ جو فلسفہ ہمیں سب سے زیادہ مسرت بہم پہنچاتا ہے‘ ہمیں اس کی صحت پر سب سے زیادہ شک کرنا چاہیے۔ جیسا کہ برٹرینڈ رسل نے خوب کہا ہے کہ "ہمیں عزم للیقین کی ضرورت نہیں بلکہ دریافت کرنے کی خواہش کی ضرورت ہے جو کہ عزم للیقین کی ضد ہے"۔

اور پھر عقل ہمیں تشکک سطحیت اور بے مقصد زندگی کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔ ہر دلیل اپنا تضاد خود پیدا کرتی ہے۔ اسی حمیت کے ساتھ جس طرح کہ دوسرا قانون حرکت کام کرتا ہے۔ اناطول فرانس نے بروسون سے کہا "یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا الٹا بھی صحیح ہے" اور وہ صوفی بارز کا ایک قول دہراتا ہے کہ دلیل اور لفظوں کی شعبدہ بازی میں یہ فرق ہے کہ موخر الذکر کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں‘ عقل ایک نامکمل آلہ ہے۔ علم طب یا انسانی آنکھ کی طرح۔ ہم اس کی فطری کوتاہیوں کے باوجود اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ کچھ کام عقل سے زیادہ جبلت سے بہتر ہو سکتے ہیں۔ شاید حکمت اسی میں مضمر ہو کہ کلیوپٹرا کے حضور میں ا-سٹنی کی طرح آرزو کی آگ جلائی جائے نہ کہ سیزر کی طرح سوچا جائے۔ محبت کرنا اور ناکام رہنا شاید اچھا سوچنے سے بہتر حالت ہو۔ یہ کیوں بہتر ہے؟ اور کیا یہ اس لیے ہے کہ جبلت قابل اعتماد ہے۔ یا کسی صوفیانہ وجدان نے ہمیں یہ حکمت سکھائی ہے۔ نہیں تجربہ نے یعنی احساسات نے ہم پر یہ واضح کیا ہے کہ سرمستی کا ایک لمحہ استدلال کے ایک برس سے بہتر ہے۔

ہم استدلال اس لیے نہیں کرتے کہ ہم استدلال کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا زمانہ اتنا متحرک ہے کہ اس میں جبلی آرزوؤں کے بل پر جینا محال ہے۔ اب بھی شاید زندگی کے قدیم راستوں میں جبلت کام آتی ہو۔ مثلاً مامتا‘ زراعت اور گھریلو زندگی میں۔ لیکن یہاں بھی عقل کا دخل ہے۔ کیونکہ ضبط تولید مامتا پر پابندیاں عاید کرتی ہے اور عورت کو گھر سے نکل کر صنعتی دنیا میں شرکت کرنا پڑتی ہے اور ہر کھیتی اب دلالوں‘ دور دراز کی منڈیوں اور چالاک سرمایہ داروں کے ساتھ منسلک ہے۔ ہم شہریوں کے لیے جبلی اعمال ہر روز خطرناک تر ہوتے جا رہے ہیں‘ کیونکہ ہر جبلت کی اپنی انانیت ہے اور وہ ہر حالت میں تسکین چاہتی ہے۔ چاہے اس سے پوری شخصیت کا حشر کچھ ہی ہو۔ ہر جبلت ہمارا ایک حصہ ہے‘ جو تخت و تاج کا دعویدار ہے۔ ان

حصوں کو مربوط کرنے سے ہی ہم نظر، مرکزیت، عقل اور صحت دماغ حاصل کر سکتے ہیں۔

ذرا جنسی آرزو پر غور کرو۔ یہ ہمیں جنسی تعلقات اور شاید کئی ایک افراد سے جنسی تعلقات پر مائل کرتی ہے۔ اس کی نظر، اس کی شدت کی وجہ سے تنگ ہے اور یہ نتائج پر غور نہیں کرتی۔ ہم جبلت کے زور سے شادی رچاتے ہیں، لیکن عقل کے زور سے طلاق دیتے ہیں۔ جبلت کسی لڑکی کو اس سپاہی کی آغوش میں ڈال دے گی، جس سے اس کا پہلے پہل سابقہ ہو۔ شوہر کو زانی اور ہر بیوی کو فقط ماں بنا دے گی، جو ہمیشہ باردار نظر آتی ہے۔ یہ دنیا کی آبادی کو اس تیزی سے فراواں کر دے گی، جس طرح عقل اور ایجاد اشیا کو فراواں کرتی ہے اور آدمی کی آخری حالت اس کی پہلی حالت کی طرح زبوں ہو گی۔ جبلت کے زور پر بھوکا آدمی خوب کھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ جبلت کے زور پر چلنا سیکھنے والا بچہ زینے یا چھت کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ جبلت کے زور پر ہم چڑیا گھر میں شیر کی گھن گرج سن کر بے جا خوف کھاتے ہیں۔

جبلت کے زور پر ایک بزدل سپاہی جنگ میں ایک خوفناک حیوان کی طرح اپنے ہاتھوں کو خون سے آلودہ کر لیتا ہے، نفرت اور مایوسی سے اندھا ہو جاتا ہے اور ایک ذلیل موت کے لیے تقدیر کو اکساتا ہے اور ایک تربیت یافتہ اور اہل تدبر جرنیل فوج کے پیچھے حفاظت میں کھڑا رہتا ہے۔ اپنی فتح کی داستان لکھتا ہے اور جنگ سے لوٹ کر کل وجد کا مختار بن جاتا ہے۔

اس لیے ہم راہبوں کو ان کے وجدان اور تسلی بخش ایمان اور جنگل کے باشندوں کو ان کی زیرک جبلتوں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں۔ کنفیوشس نے کہا کہ انسان، حیوان سے صرف تھوڑا سا مختلف ہے اور اکثر انسان اس تھوڑے سے فرق کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم احساسات اور عقل کے حامی ہیں اور اس فکر کو زندگی کا امتحان بنانے اور زندگی میں فکر کا اضافہ کرنے پر مطمئن ہیں۔ ہم غالباً بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کریں اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ہم آخر میں اطمینان قلب حاصل کر لیں۔ فکر کی لذت وہ لذت ہے، جو عاشق کی سرمستی و سرور کی طرح الم سے بھری پڑی ہے۔ ہم بہت سے یقینوں اور خود فریبیوں کو فکر کی ترقی کے ساتھ ختم کر دیں گے۔ لیکن عقل کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ قید خانے میں سقراط بن کے رہنا اس سے بہتر ہے کہ ہم تخت پر کیلیبان بن کر رہیں۔ آیئے ہم مل کر فکر کریں۔

* * *

حصہ سوم

مابعد الطبیعیات

باب سوم

مادہ‘ زندگی اور ذہن

ا۔ لاادری مقدمہ

دنیا کی فطرت کیا ہے؟ اس کا مادہ اور ہیئت کیا ہے؟ اس کی ساخت اور عناصر‘ اس کے قوانین کیا ہیں؟ مادہ اپنی داخلی فطرت میں اور اپنے وجود کی اصلیت کے لحاظ سے کیا ہے؟ ذہن کیا ہے؟ کیا وہ مادہ سے ہمیشہ کے لیے مستغنی اور اس پر حاوی ہے‘ یا وہ مادہ سے منتج اور اس کا غلام ہے؟ کیا وہ خارجی دنیا جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ داخلی دنیا جسے ہم شعور میں محسوس کرتے ہیں‘ ”جبریت“ کے قانون کے مطابق ہیں‘ یا مادہ اور ذہن میں حادثہ اور حریت عزم کا بھی کوئی عنصر موجود ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جو بہت کم لوگ پوچھتے ہیں‘ لیکن ہر شخص ان کا جواب دیتا ہے۔ یہ سوال ہمارے فلسفوں کے آخری سرچشمے ہیں‘ جن پر ایک مربوط سلسلہ خیال میں ہر چیز کا انحصار ہے اور ان سوالوں کے جواب کا علم ساری دنیا کی وراثت حاصل کرنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

ہمیں ابتدا ہی میں لابدی ناکامی پر قانع ہو جانا چاہیے۔ نہ صرف اس لیے کہ اس قصر فلسفہ کی تسخیر کے لیے ریاضی، علم الافلاک، علم الطبیعیات، علم الکیمیا‘ میکانکیات‘ حیاتیات اور نفسیات سے مکمل واقفیت ضروری ہے‘ بلکہ اس لیے کہ یہ بات عقل کے حق میں نہیں جاتی کہ جزو کل کو

سمجھ لے۔ وہ مکمل زاویہ نظر جس کی ہم فلسفہ میں جستجو کرتے ہیں، خیال کے تمام پھندوں اور غیر متعلق راہوں سے بچ کر نکلے گا۔ ذرا سی کسر نفسی اور تھوڑی سی دیانت ہمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ زندگی اور کائنات کا تنوع اور بوقلمونی، ہمارے محدود اذہان کے احاطہ سے باہر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمہ دان دیوتا ہمارے محبوب نظریوں کا تمسخر اڑاتے ہوں، اور یہ بہت ممکن ہے کہ ہم میں صرف ایک ہی قابل فخریات ہو اور وہ یہ کہ ہم اپنی جہالت اور نادانی کی تھاہ پا گئے ہوں۔ جتنا زیادہ ہم سیکھتے ہیں، اتنا ہی ہمیں اپنی کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر ترقی کا قدم ہمیں نئے مسائل اور نئے شکوک میں الجھاتا ہے۔ سالمہ میں سے ذرہ، ذرہ میں سے برقیہ اور برقیہ میں سے مقادیر برقیات پیدا ہوئی ہیں اور مقادیر برقیات ہمارے اسالیب فکر اور ہمارے قوانین کی زد سے باہر ہے۔ تعلیم مسلمہ قوانین کی شکست اور فن تشکک میں ترقی کا نام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے آلے مادہ سے وابستہ ہیں اور ہمارے حواس ہمارے ذہن سے۔ اس کہر میں ہمیں جو کہ سطح دریا پر محض نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں، سمندر کی گہرائیوں کا علم حاصل کرنا چاہیے۔

اس لیے ہم ان مسائل پر اس پادری کی طرح فکر کریں گے جو ممبر پر پہلی مرتبہ دعائے عشائے ربانی پڑھنے چڑھتا ہے۔ ہم ان مسائل کو پوری طرح حل کر لینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکیں گے کہ ایک دوسرے پر اپنی پوشیدہ آرزوئیں آشکار کر دیں۔ اگر مذہب نے عقیدہ پر حد درجہ اصرار کر کے ہمیں برہم کیا ہے تو ہم احتجاجا" بے باک مادیت کی تبلیغ کریں گے، جس طرح کہ شیلے نے، جو کہ خدا اور بقائے روح پر ایمان رکھتا تھا، اپنے آپ کو فقط اس لیے "دہریہ" کہا تھا کہ رجعت پسند کلیسا کی آسودگی کو متزلزل کر دے۔ اگر ہم "نرم دل" ہیں تو ہم ایمان کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اور ایک میکانکی اور لاخدا کائنات کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ شاید عمر کے تقاضے کی وجہ سے ہم زیادہ متین ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جوانی کی بغاوتیں اب ہمیں غیر ضروری اور انتہا پسند معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں قدیم خیالات میں سے حقیقت کی تابانی ہم تک پہنچ رہی ہے جو کبھی غدارانہ اور بے بنیاد معلوم ہوتے تھے۔ اور ہم سائنس اور تاریخ سے ہر اس خبر کا خیر مقدم کرتے ہیں جو ہمارے پرانے عقاید کی تابانی کو بحال کر دے۔ ہماری طبیعیات اور کیمیا، ہماری فلکیات اور حیاتیات، یہ تمام میدان ہیں، جن میں ہم اپنے مفروضوں کی تصدیق اور اپنی امیدوں کی تسکین تلاش کریں گے۔

۲- مادیت

جس طرح مادیت وہ فلسفہ ہے جسے صرف وہ ذہن قبول کرتا ہے جس نے مافوق الفطرت

اعتقادات کو بالائے طاق رکھ دیا ہو، اس طرح وہ دنیا کا پہلا تصور ہے جو اس قوم میں نمودار ہوتا ہے جس کا سرکاری فلسفہ مذہب ختم ہونے پہ آجائے۔ سقراط سے پہلے کے مفکر جنہیں بیکن اور نیٹشے، سقراط اور افلاطون سے بھی بہتر سمجھتے تھے، سب کے سب مادیت پرست تھے۔ تھیلیس، انیگزیمانڈر اور انیگزیمینز نے کائنات کی اس طرح توجیہ کی کہ وہ پانی، آگ یا ہوا سے پیدا ہوئی ہے اور لیوسپس اور ڈیموکریٹس نے مادہ کو ذرات میں تحلیل کیا، جو جدید طبیعیات اور کیمیا کے زیر اثر پارہ پارہ ہوگئے ہیں۔ لیکن اس زمانہ کے آزاد خیال مفکر اس فلسفہ سے مطمئن تھے۔

کئی نسلوں سے یہ سادہ فلسفہ زینو کے تشکک اور انکساگورس کی دوئی کے خلاف قائم رہا۔ لیکن سقراط خارجی دنیا سے پیچھے کی طرف لوٹا۔ اور اس نے وہ “خودی” دریافت کی، جو مادہ سے بہت مختلف تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس “خودی” سے موت ناآشنا ہے۔ افلاطون کے نزدیک مادہ “عدم” کے برابر تھا اور وہ ذہن کو باقی سب چیزوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے “خارجی دنیا” کو مشاہدۂ ذہن اور ساخت اور ہیئت کو “اعیان” کے زیر اثر سمجھا۔ اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ ساری دنیا ایک “تخلیقی روح” کی سوچی ہوئی مکمل کائنات کی معمولی سی نقل ہے۔ ماہر حیاتیات، ارسطو نے اس دنیا کو ایک بدلتی ہوئی اور جستجو میں سرگرم دنیا سمجھا اور اسے “خلا اور ذرات” میں تحلیل کیا۔ اس کے نزدیک اس کی اصلیت روح ہے۔ ہر مادہ میں کچھ فعالیت موجود ہے، جو اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک اپنی تکمیل نہ کرے۔ ہر عین ایک اعلیٰ عین کے لیے مادہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت نشوونما کے اصول سے معمور ہے۔ مادیت پورے طور پر اس قوت کو بیان نہیں کرسکتی۔ ایک سو برس تک ڈیموکریٹس کو لوگوں نے فراموش کیے رکھا۔

اپی کیورس کی شخصیت ڈیموکریٹس کی شخصیت کے بالکل برعکس تھی۔ وہ پلانک، بولر اور کیوری کا پیش رو تھا۔ جنہوں نے “ذرہ” میں حریت اور لاجبریت کا اصول کارفرما دیکھا۔ اور اسے فنا اور تخریب کی علامت پایا۔ ہر چیز آزاد ہے اور ہر چیز فانی ہے۔ لیوکریٹس جو کہ زندگی سے بیزار تھا، لابدی موت کا ہر پیغام سن کر خوش ہوا۔ اسے یہ بات حسین معلوم ہوئی، اگرچہ یہ المناک بھی تھی کہ شاعر بھی ذرات سے بنے ہوئے ہیں اور یہ کہ ہر ذی حیات اور ہر ذرہ برباد ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے اندوہ سے نجات حاصل کرلے گا۔

پھر مسیحیت آئی اور پندرہ سو برس تک فلسفہ کی نظر میں مادہ کی حیثیت بالکل اجنبی کی سی رہی۔ چند ابتدائی مدرسوں کے نزدیک روح ایک عمدہ قسم کی گیس تھا اور خدا کو اس سے بھی زیادہ عمدہ گیس سمجھا گیا تھا۔ ہیگل نے خدا کی تعریف یوں کی کہ وہ ایک گیسوں کا بنا ہوا ذی حیات ہے۔ لیکن مادہ کی حیثیت اکثر و بیشتر فلسفہ کے شیطان کی تھی، جو روح کے لیے ایک قید خانہ کی حیثیت رکھتا

تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مادہ نے اسکوائینس کے فلسفہ میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ مادہ کو صلاحیت کے اعتبار سے "زمان" جتنا قدیم سمجھا گیا اور وہ "انفرادیت کا اصول" بن گیا۔ اپنے اعیان اور حدود کے ذریعہ وحدت "کثرت" میں تبدیل ہو گئی اور روح کا سمندر الگ الگ ندیوں میں تقسیم ہو گیا اور انہیں اتفاقی روحوں کا نام دیا گیا۔

بہر حال ڈے کارٹ کے عہد میں مادہ کی حقیقت تسلیم کر لی گئی۔ یہ بجا ہے کہ اس فرانسیسی مفکر نے اسے واحد حقیقت نہیں مانا۔ اور ابتدا میں اس نے "خودی" اور "فکر" کے فلسفہ کے ساتھ "عینیت" کے کواڑ کھول دیئے جو آگے چل کر مادہ کی زیرک دشمن بن گئی۔ لیکن اس نے خارجی دنیا کو ایک مشین سمجھا۔ اس کے لیے سربلند حیوان بھی محض کلیں تھیں۔ سوائے انسان کی روح کے ہر چیز طبیعیات کے اصولوں کی پابند تھی، حتیٰ کہ ہاضمہ، تنفس، اخراج اور تولید میکانکی اصولوں کے مطابق کام کرتے ہوئے تصور کیے جاتے تھے۔ ڈے کارٹ کے اس سخت فلسفہ کی بدولت مادیت کو از سر نو جوانی حاصل ہوئی۔

جدید فلسفہ دو بڑی تحریکوں کا مجموعہ ہے، جیسا کہ ہیگل نے کہا ہے دو متضاد تصورات سے مرکب ہے۔ پہلا فلسفہ خارجی دنیا سے شروع ہوتا ہے۔ مادہ طبیعیات میکنکس اور علم ریاضی۔ یہ فلسفہ ایک مافوق الفطرت تعبیر کائنات کے خلاف احتجاج کی نمائندگی کرتا ہے، جیسے کہ وہ فرد جو فریبوں سے آزاد ہو گیا ہو۔ وہ کائنات کے مشاہدہ سے حقیقت کے قانون وضع کرتا ہے اور پھر ذہن کو ان معروضی قوانین کے مطابق سمجھتا ہے۔ لازمی طور پر اس کے نتائج میں مادیت، میکانکیت، جبریت اور وہ کردار پرستی، جو اس بات پر فخر کرتی ہے کہ وہ مادہ سے شعور تک نہیں پہنچ سکتی، اس کے پیرو ہیں۔ گلیلیو، ڈے کارٹ، ہابز، نیوٹن، ڈڈرو، ہولباخ، لامیٹری، ہیکل، سپنسر، رسل اور واٹسن۔ اس کی مخالف تحریک شعور سے شروع ہوتی ہے۔ اور شعور سے مادہ تک پہنچنا اس کے لیے محال ہے۔ اس کا آغاز داخلی دنیا میں یقین سے ہوتا ہے۔ ذہن نفسیات، فلسفہ علم اور فلسفہ اخلاق، یہ فلسفہ ایک مادی نظریہ حیات کے خلاف احتجاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تمام چیزوں کو حسیات اور خیالات سمجھتا ہے اور مادہ کو ذہن کی کیفیات میں تحلیل کر دیتا ہے۔ اس کے لازمی نتائج ہیں روحانیت، عینیت، قوتیت اور حریت عزم، اور اس کے ہیرو ہیں ڈے کارٹ، لائبنیز، بارکلے، کانٹ، فکٹے، ہیگل، شوپنہار، نیٹشے، برگساں اور ولیم جیمز۔ اس طرح متضاد فلسفے آپس میں نر اور مادہ کی طرح برسرپیکار ہیں۔ یہ فلسفے مفید اسی وقت ہوں گے جب وہ آپس میں مل جائیں۔

پہلی تحریک سترہویں اور اٹھارویں صدی کے فلسفیانہ خیالات پر حاوی رہی۔ سپنوزا اس نشو و نما سے علیحدہ رہا اور اپنے گوشہ میں اس مسئلہ کو سلجھاتا رہا۔ اس نے دنیا کو وحدت الوجود کا حل

عطا کیا۔ مادہ اور ذہن ایک مرکب حقیقت کے داخلی اور خارجی پہلو ہیں۔ اور تمام چیزیں کسی نہ کسی حد تک زندگی میں شریک ہیں۔ یورپ کو اس بات پر اعتبار نہیں آیا۔ اس کے برعکس ہابز نے تمام حقیقت کو مادہ میں تحلیل کر دیا اور ہر اس لفظ یا محاورے کو لایعنی قرار دیا جو مادی حالات کا بیان نہیں۔ گسینڈی نے نہایت شرافت سے ڈے کارٹ کے "دوئی" کے فلسفہ پر اعتراضات کیے اور یہ کہا کہ فلسفہ نے ابھی تک ڈیموکریٹس کے فلسفہ سے آگے ترقی نہیں کی۔ نیوٹن نے جہاں خلوص نیت سے دینداری کا اعلان کیا اور خروج کی عجیب و غریب تفسیریں لکھیں، وہاں خارجی دنیا کو نہایت سادہ اور مترتب "قوانین حرکت" میں تحلیل کیا۔ جب یہ قوانین فرانس میں پہنچے تو وہاں کے منطق پسند لوگوں کو اس نتیجہ پر پہنچنا ہی پڑا کہ یہ قوانین، سیب کے گرنے سے لے کر، ایک دوشیزہ کی نماز تک پر حاوی ہیں۔ لامیتری نے نہایت بے باکی سے اپنی کتاب "آدمی مشین ہے" لکھی۔ اور یہ بتایا کہ کس طرح مختلف جسمانی حالتیں مثلاً جوش و خروش یا مرض، ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اس طرح ان کی جسمانی ترکیب واضح ہوتی ہے۔ ہولباخ نے آدمی اور مادہ دونوں کو منطقیانہ سخت گیری کے ساتھ اپنے "نظام کائنات" میں ڈھالا۔ اور ہیلوٹیس نے اخلاق اور خوبی کو مادی قوانین میں تحلیل کر دیا۔ ڈڈرو کو یقین نہیں تھا کہ فلسفہ علم "شعور" کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ سپنوزا کی پیروی میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مادہ اور ذہن ایک ہی بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو اس وقت تک "مادہ پرست" کہنے کا تہیہ کر لیا تھا جب تک دنیا میں ہر بادشاہ اور ہر پادری کی گردن نہیں دبا دی جاتی۔

"مادیت" اور "اشتراکیت" ایک ہی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں۔ یہ ظلم و ستم کے خلاف بغاوت پسند جوانوں کے احتجاج کی دو صورتیں ہیں۔ علم بغاوت ایسا ہے جسے ادھیڑ عمر میں لوگ لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ جب فکر پر پختگی اور انکسار کی رہنمائی میں زندگی کی غیر شعوری پیچیدگیاں واضح ہونے لگتی ہیں۔

۳۔ عینیت

دوسری تحریک کا پیغمبر بشپ بارکلے تھا۔ بارکلے نے کہا کہ آخر تم مادہ کو احساس اور مشاہدہ کے ذریعہ ہی جانتے ہو۔ اس کی حقیقت مشاہدہ میں مضمر ہے۔ اگر کوئی ذہن اس کا مشاہدہ نہ کرتا تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور کانٹ نے اس میں اضافہ کیا کہ حسیات کے اندر کوئی فطری ترتیب یا نظم نہیں۔ "مشاہدہ کی وحدت فوق المادہ" اس میں ترتیب پیدا کر کے مربوط خیالات کو جنم دیتی ہے۔ حسیات میں ذہن ہی نظم و ترتیب پیدا کرتا ہے۔ اور جس چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ کسی حد تک ذہن

ہی کی تخلیق ہوتی ہے۔ ترتیب پیدا کرنے والا ذہن مادہ کی منفعل تخلیق کس طرح ہو سکتا ہے، جبکہ جس شکل میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ اسے خود پیدا کرتا ہو۔

اور ان میں سب سے زیادہ زیرک فلسفی آرتھر شوپنہار نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ حقیقت جس کا ہم براہ راست مشاہدہ کر سکتے ہیں، ہماری "خودی" ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ ہم اس "خودی" کو ایک ایسے مادہ میں تحلیل کر دیں، جسے ہم صرف ایک "خیال" کی حیثیت سے اور اپنے غیر مکمل حواس کے توسط سے جانتے ہیں۔ شاید اگر ہم "مادہ" کو "اندر" اور "باہر" سے اسی طرح جان سکتے، جس طرح کہ ہم اپنے آپ کو جانتے ہیں، تو ہم مادہ کی اصلیت میں ایک قوت عزم دیکھتے، جو ہمارے جسموں سے زیادہ ذہنوں کے قریب ہے۔ ان حالات کے پیش نظر منطقیانہ نقطۂ نظر سے مادیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ بخنر، موئشوٹ اور فائرباخ سادہ لوح فلسفی ہیں۔

وہ بے رنگ مادیت جو انیسویں صدی کے وسط میں اس جاہلانہ خود فریبی میں پیش کی گئی ہے، کہ یہ ایک نیا فلسفہ ہے، احمقانہ انداز سے "عزم حیات" کی تردید کرتی ہے اور سب سے پہلے حقائق زندگی کی طبیعیاتی اور کیمیاوی قوتوں سے تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور پھر ان کو مادہ کے میکانکی اثرات گردانتی ہے لیکن یہ میں کبھی نہیں مان سکتا کہ سادہ ترین کیمیاوی مرکبات کی بھی میکانکی تشریح ہو سکتی ہے، چہ جائیکہ روشنی، حدت اور بجلی کی خصوصیات کی۔ ان کی تشریح قوت ہی کے تصور سے ہو سکتی ہے۔

نیطشے کو مادہ کے متعلق یہ نظریہ اور "عزم للقوت" کا تصور ورا ثتا" ملا جو کہ شوپنہار کے "عزم" کا سرقہ تھا۔ کوئی دیندار بھی مادیت کے اس قدر خلاف نہ ہو گا جتنا کہ یہ اسقفوں اور دینیات کا تمسخر اڑانے والا فلسفہ تھا۔ "میکانکیت اور مادہ سے مطلق پرہیز" --- یہ تھا اس کا پروگرام۔ کیونکہ یہ دونوں ادنیٰ مراتب کے لیے اظہار کے طریقے ہیں اور ایک حقیر ترین شکل ہے جو عزم للقوت اختیار کرتی ہے۔ ایک اچھے جرمن کی طرح وہ عینی فلسفہ کو پوری طرح نگل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ فریب فکر ہے۔ یہ ایک ایسا واہمہ ہے جسے ہم نے حسیات کی تشریح کے لیے تراشا ہے۔ جہاں تک کہ مادی ذراتیت کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی تردید مکمل اور جامع ہے۔ اور علمی دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو اسے کچھ اہمیت دے۔ وہ شوپنہار کی طرح اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ مفروضہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ تمام میکانکی عمل جہاں تک اس میں کوئی قوت کام کرتی ہے، صرف عزم کی طاقت یا عزم کا اثر ہے۔ ایک ذرہ محض "عزم للقوت" کی ایک حقیر مقدار ہے۔ وہ اثر حیرت انگیز ہے جو "عینیت" نے ان باغیوں پر کیا جو مادیت کی طرف اس لیے مائل تھے کہ وہ مذہبی عقاید کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا۔ ہربرٹ اسپنسر نے کہا کہ اگر ہمیں

ان دو راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے کہ ذہنی واقعات کو مادی واقعات کے ذریعے سمجھو، یا مادی واقعات کو ذہنی واقعات کے ذریعہ، تو اول الذکر زیادہ قابل قبول ہوگی۔ اور وہ مایوسی کا دلچسپ پیغمبر برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

> "یہ عقیدہ کہ فقط مادہ ہی حقیقت ہے، ان متشکانہ دلائل کے بعد جائز نہیں ہو سکتا جو احساس کی طبعی توجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ہم "مادیت" کو عقاید کا ایک ایسا نظام سمجھتے ہیں جو روایتی عقاید کی تردید کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں قدیم عقاید منتشر ہوتے ہیں، مادیت تشکیکیت میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ آج کل "مادیت" کے سرکردہ ہوا خواہ یا تو "امریکہ" کے چند سائنس دان ہیں یا روس کے چند سیاست دان۔ کیونکہ ان دو ملکوں میں روایتی فلسفہ مذہب ابھی تک برسراقتدار ہے"۔

۴۔ مادہ کیا ہے؟

فلسفہ علم کے ان شکوک سے قطع نظر جن کے متعلق ہم کافی غور و فکر کر چکے ہیں اور اس بات کو مسلم جانتے ہوئے بھی کہ خارجی دنیا جو ہمیں ہمیشہ اپنے وجود کے قطعی ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے، معروضی طور پر حقیقی ہے۔ آیئے ہم آگے بڑھیں اور اس کی ساخت پر غور کریں۔

ہمارا پہلا انکشاف یہ ہے کہ انیسویں صدی کی طبعیات کا قدیم اور بے جان مادہ ختم ہو چکا ہے۔ ٹینڈل اور ہکسلے کا مادہ ناقابل تحلیل تھا۔ اس کی مثال پکوک پیپرز والے، اس موٹے لڑکے کی تھی، کہ اسے جہاں کہیں رکھا جاتا آرام کرتا اور سو جاتا۔ وہ اپنے حجم اور وزن کے رعب داب کے ساتھ اسے تحریک میں لانے کی ہر کوشش کا مقابلہ کرتا یا جب حرکت میں آنے پر مائل ہوتا تو اپنا رخ بدلنے کی ہر کوشش کی مدافعت پر آمادہ کرتا۔ برگساں نے نہایت آسانی سے یہ ثابت کر دیا کہ اتنا بے جان مادہ کبھی حرکت کی توجیہ نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ وہ زندگی اور ذہن کی تخلیق کر سکے۔ لیکن جب برگساں نے یہ فلسفہ پیش کیا، ماہرین طبعیات مادہ کے اس تصور کو ترک کر رہے تھے اور اس میں ایک قوت دریافت کر چکے تھے۔ مثلاً برق جس کی توجیہ مادہ اور ذرات کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ کون سی ناقابل بیان قوت تھی جس کا جب مادہ میں اضافہ ہو تو اس کی طاقت کو زیادہ کر دیتی تھی۔ مگر اس کے وزن اور اس کی ابعاد کو جوں کا توں چھوڑ دیتی تھی؟ ایک برقی رو ایک سلکی یا ایک لاسلکی ہوا میں کس طرح گزرتی تھی؟ کیا وہ ایک ایسی چیز تھی جو تار کے ذرات میں سے گزرتی تھی اور چند ذرات دوسرے ذرات سے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان برقی لہروں میں جو روشنی کی طرح ہلکی تھیں،

وہ کون سی چیز تھی جو حرکت کرتی تھی؟ ذرات، اثیر یا کچھ بھی نہیں؟ اور جب ایکسرے میں ایک برقی شعلہ ایسی موجیں بکھیرتا ہوا خلا میں سے گزرتا تھا جو نلکی کی دیواروں میں سما جاتی تھیں، یا کیمیاوی طور پر حساس کی ہوئی دھات کو بدل دیتی تھیں، وہ کون سی چیز تھی جو خلا اور دیواروں میں سے گزرتی تھی؟ اور جب مادہ ریڈیم کی طرح مکمل طور پر فعال ہوگیا اور ذرات (جنہیں کاٹا نہیں جا سکتا) لامتناہی طور پر قابل تقسیم نظر آئے تو ہر ذرہ برقی لہروں کا ایک نظام بن گیا، جو ایک دوسری برقی لہر کے گرد گھومتا تھا۔ مادہ نے کس طرح اپنا حجم، وزن، طول، عرض، دبازت اور ٹھوس پن کھو دیا اور تقریباً وہ تمام صفات بھی ترک کر دیں جن کی بنا پر اس نے کبھی ہر حقیقت پسند ذہن کا احترام حاصل کر لیا تھا۔ کیا ٹھوس پن ایک واہمہ تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مادہ زندہ ہو؟

مادہ میں اس "قوت" کے آثار پہلے ہی موجود تھے۔ ارتباط، اشتراک اور تنافر کے واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اب یہ بات ممکن نظر آئی کہ یہ حقائق اور ان کے ساتھ برق اور مقناطیس ذراتی طاقت کی صورتیں تھیں، جو ایک ذرہ میں برقی لہروں کی بے تاب حرکت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن برقیہ کیا ہے؟ کیا یہ مادہ کا ایک حصہ ہے جو قوت کا اظہار کرتا ہے؟ یا کیا یہ قوت کا پیمانہ ہے جو کسی مادی چیز سے بالکل بے تعلق ہے؟ موخر الذکر راہ ناقابل فہم ہے۔ لے بون کہتا ہے کہ ایک اعلیٰ ذہن کے لیے یہ یقیناً ممکن ہوگا کہ وہ مادہ کے بغیر قوت کا تصور کر سکے۔ لیکن اس تصور تک ہم نہیں پہنچ سکتے۔ ہم چیزوں کو تبھی سمجھ سکتے ہیں جب انہیں اپنے روزمرہ خیالات کے سانچے میں ڈھال لیں۔ چونکہ ہم قوت کی اصلیت سے واقف نہیں، ہم مجبور ہیں کہ اسے مادہ کی سی ہیئت دیں، تاکہ اس کے متعلق غور و فکر کر سکیں۔ جیسا کہ برگساں نے کہا کہ ہماری ساخت ہی مادیت پسند ہے۔ ہم مادے اور کلوں کو استعمال کرنے کے عادی ہیں اور جب تک ہم ان سے کنارہ کش ہو کر اپنے اندر نہ دیکھیں، ہم ہر چیز کو مادی مشین سمجھیں گے۔ پھر بھی اوسٹوالڈ مادہ کو محض قوت کی ایک صورت سمجھتا ہے۔ رتھرفورڈ ذرہ کو سلبی اور ایجابی برق کے عناصر کہتا ہے۔ لوج سمجھتا ہے کہ برقیہ میں برقی لہر کے علاوہ کوئی مادی مرکز نہیں ہوتا اور لے بون صرف یہ کہتا ہے کہ مادہ قوت کی ایک قسم ہے۔ جے، بی، ایس ہالڈین کہتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے چند قابل ترین اشخاص مادہ کو محض برقی حرکت کی ایک خاص قسم سمجھتے ہیں۔ ایڈنگٹن کہتا ہے کہ مادہ ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے مرکب ہے۔ ایک تختہ دراصل خالی جگہ ہے جس میں چند برقی لہریں بکھری ہوئی ہیں۔ وائٹ ہیڈ کا خیال ہے کہ کمیت کے تصور کو بحیثیت ایک مستقل صفت کے جو اہم مقام حاصل تھا، وہ اب اسے کھو رہا ہے۔ کمیت اب قوت کی اس مقدار کا نام ہے جسے ہم اس کے چند قوی اثرات کے تعلق سے دیکھتے ہیں۔

کیا ماہرین طبیعیات کے اس اعلان سے زیادہ کوئی چیز ناقابل فہم ہو سکتی ہے کہ مادہ بحیثیت ایک مکانی مادہ کے وجود نہیں رکھتا؟ ہمیں بتایا گیا ہے کہ برقیوں میں مادہ کی کوئی صفت موجود نہیں۔ وہ نہ ٹھوس ہیں نہ رقیق اور نہ گیس کے بنے ہوئے، نہ ان میں کمیت ہے نہ ایئت۔ اور ریڈیائی بجلی میں ان کے تجزیہ سے جدید سائنس کے اس عزیز ترین عقیدہ کو مشتبہ نظر سے دیکھا جانے لگا کہ مادہ ناقابل تحلیل ہے۔ دیکھیں ایک ماہر طبیعیات کا اس کے متعلق کیا خیال ہے:

ذرات کے عناصر جو الگ الگ ہو جاتے ہیں، برباد ہو کے رہتے ہیں۔ وہ مادے کی ہر صفت کو کھو دیتے ہیں، جن میں سب سے بنیادی صفت وزن کی ہوتی ہے۔ پیمانہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کوئی چیز انہیں مادہ کی حالت پر دوبارہ نہیں لا سکتی۔ وہ "اثیر" کی وسعتوں میں کھو گئے ہیں۔ حدت، بجلی، روشنی وغیرہ، مادے کے وہ آخری مراحل ہیں جن کے بعد وہ اثیر میں غائب ہو جاتا ہے۔ وہ مادہ جو تقسیم ہو جاتا ہے، مختلف مراحل عبور کرنے کے بعد بتدریج اپنی مادی صفات کھو دیتا ہے، حتی کہ وہ اس غیر قابل ادراک اثیر میں غائب ہو جاتا ہے، جس سے وہ پیدا ہوا تھا۔

اثیر؟ لیکن یہ اثیر کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ اس کے متعلق لارڈ سالسبری نے کہا کہ اثیر محض لہروں کے زیر و بم کا بیان ہے۔ یہ ایک افسانہ ہے جس کے پردے میں جدید سائنس کی جہالت چھپ جاتی ہے۔ یہ اسی طرح ناقابل فہم ہے جس طرح کہ بھوت اور روح۔ آئن شائن نے قوت ثقل کی نئی تعبیر کر کے اثیر کو معزول کر دیا تھا، لیکن حال ہی میں اس نے اسے محدود طاقت کے ساتھ بحال کر دیا ہے۔ جب کبھی کوئی ماہر طبیعیات کسی الجھن میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے "اثیر"۔ پروفیسر ایڈنگٹن ہے کہ اثیر مادہ کی کوئی قسم نہیں۔ وہ غیر مادی ہے یعنی وہ غیر مادی چیز جو چند حیرت انگیز تبدیلیوں سے اپنے آپ کو مادہ میں تبدیل کر لیتی ہے۔ وہ چیز جو بغیر ابعاد یا وزن کے ہے اور چند اجزا کو ملا کر مکان میں مادہ کی صورت اختیار کرتی ہے۔ کیا یہ فلسفہ مذہب کی بحالی ہے یا نئی میکی سائنس ہے یا یہ روحانی تحقیق کی ایک شکل ہے؟ جس وقت کہ نفسیات ہر تدبیر سے یہ کوشش کر رہی ہے کہ شعور سے نجات حاصل کرے اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر دے، طبیعیات افسوس کے ساتھ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مادہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ نیوٹن نے کہا تھا "او طبیعیات! مجھے مابعد الطبیعیات سے بچانا"۔ لیکن افسوس کہ اب یہ ممکن نہیں۔

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ طبیعیات اس منزل پر پہنچ رہی ہے جب وہ مکمل ہو جائے گی۔ شواہد اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ہنری پوان، کارے کے قول کے مطابق جدید طبیعیات انتشار کی حالت میں ہے۔ وہ اپنی بنیاد از سر نو استوار کر رہی ہے اور یہ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں طبیعیات کے مادے اور حرکت کے بارے میں تصورات بالکل بدل گئے ہیں۔ مادام کیوری،

رتھرفورڈ سوڈی، آئن سٹائن اور من کوسکی کی تحقیقات نے نیوٹن کی طبیعیات کے کلاسیکی خیالات کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ لیپلس کو نیوٹن پر رشک آتا تھا کہ اس نے دنیا کا ایک نظام دریافت کر لیا ہے اور اسے اس بات کا دکھ تھا کہ دنیا کبھی کی اوپر تلے ہو چکی، ثقل اب "کشش" کی ایک صورت نہیں رہی اور نظریہ اضافیت نے حرکت کے قانون ہر طرف سے بدل ڈالے ہیں۔ کبھی فلسفہ "سایوں" اور "خیالات" سے شغف رکھتا تھا اور سائنس حقیقت اور واقعیت سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اب طبیعیات نظریوں کا ایک انبوہ ہے اور سائنس کی دنیا میں "ذرات" کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ فلسفہ کو بالائے طاق رکھا جاتا۔ (کچھ لوگ یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ وہ پچاس سال کے اندر مر جائے گا) تو سائنس ہمارے مسائل حل کرتی، اب جبکہ ایک عام آدمی سائنس اور سائنس دانوں پر پورا یقین رکھنے لگا ہے، ہمیں یہ نہایت انکسار بتایا گیا ہے کہ سائنٹیفک تحقیق ہمیں چیزوں کی اصلیت کا علم نہیں دے سکتی۔ اس کی بجائے ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک گھڑی اس رفتار کے مطابق تیز چلتی ہے، جس کے ساتھ اسے مکان میں سفر کرنا پڑے۔ اور یہ کہ ایک پیمانہ جب زمین کی حرکت کے رخ پر زاویہ قائمہ بناتا ہے تو وہ لمبا ہو جاتا ہے۔ ہمیں ان ناقابل فہم فارمولوں کے سامنے، جن کی جگہ قدیم طبیعیات کی صفائی اور وضاحت نے لے لی ہے، انکسار سے کام لینا چاہیے۔ شاید یہ فارمولے صحیح ہوں۔ بہرحال انسان اس سائنس کی صحت پر شک کرتا ہے جو روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے اور ہر نیا دن گزشتہ دن کی تردید کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ پہلے ہمارے سامنے "ذرات" پیش کرتا ہے اور اس کے بعد برقیات اور پھر مقادیر برقیات اور بالآخر مادی دنیا کی ایک مقدس تصویر جو برقی لہروں سے اعجاز آبنی ہے اور جس کا کوئی مادی مرکز نہیں ہے۔ صرف سپینگر ہی میں یہ کہنے کی جرات ہے کہ "ذرات کا ہر تصور ایک افسانہ ہے اور تجربہ نہیں ہے"۔

ہمیں جہاں کہیں بھی دینیات نظر آئے، اس سے دامن بچا کے رکھنا چاہیے، خواہ وہ مکمل سائنسوں ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو۔ شاید باوجود ہماری غیر مستقل ہمہ دانی کے مادہ کا وجود قطعی ہو۔ ہم چاہے سائنس کی نئی دینیات سے شغف رکھیں، لیکن روزمرہ زندگی میں ہم "قوت" کو "مادہ" سے متعلق دیکھتے ہیں۔ وہ چیز جو مکانی اور مرئی ہے، وہ چیز جو کہ "ہم" نہیں ہے اور احساسات کا سبب ہے۔

مادہ کیا ہے؟ ہمیں بے باکانہ طور پر یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم ابھی تک نہیں جانتے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ یہ نیا مادہ انیسویں صدی کی سائنس کا قدیم مادہ نہیں ہے۔ نیا مادہ لامتناہی قوتوں کی ایک صورت ہے۔ یہ مادہ ارتباط، تناقر، کیمیاوی اور نفوذی اعمال، حدت برق، چھلکتے نور اور برقیوں کے بے تاب رقص سے زندہ ہے۔ حرکت، قوت اور طاقت ہر جگہ ہے۔ ہم اب کسی چیز کو

بے جان نہیں کہہ سکتے۔ فولاد کا ایک ٹکڑا جو بظاہر بہت جامد ہے دراصل اندرونی اور بیرونی قوتوں (مثلاً حدت دباؤ) وغیرہ کا توازن ہے۔ جب ہم کسی دھات کے ٹکڑے کے قریب اپنا ہاتھ رکھتے ہیں تو اس کے سالمات کی حرکت میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لیوکریٹس کی وہ پرانی تشبیہ اب زیادہ معنی خیز معلوم ہوتی ہے:

> "جب کثیر فوجیں جنگ کا کھیل کھیلتی ہوئی میدانوں میں اترتی ہیں تو ان کی چمک دمک آسمانوں تک پہنچتی ہے اور تمام روئے زمین تانبے کی طرح درخشاں نظر آتا ہے اور زمین سے انسانی انبوہوں کے قدموں کی آوازیں اٹھتی ہیں اور کوہسار اس شور و غوغا سے ہراساں ہو کر اس کی گونج کو ستاروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اونچے پہاڑ پر پھر بھی کوئی نہ کوئی جگہ ایسی ہوگی جہاں سے یہ چلتے پھرتے آدمی ساکن اور میدانوں میں محض ایک روشنی کا نقطہ معلوم ہوتے ہیں"۔

ہم "مادہ" کا جتنا مطالعہ کرتے ہیں، اس کی حیثیت ہماری نظروں میں اتنی ہی کم بنیادی معلوم ہو رہی ہے۔ اور ہم اسے قوت کی خارجی شکل سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا جسم زندگی اور ذہن کی خارجی ہیئت ہے۔ ایڈنگٹن کہتا ہے "جہاں تک "حرکت" کا تعلق ہے، طبیعیات نے اس کی اہمیت پہچان لی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یہی سب سے بنیادی چیز ہے۔ ایک ہندو ماہر طبیعیات سر جگدیش چندر بوس نے دھاتوں میں "تھکن" کی کیفیت کو ثابت کر دکھایا کہ دھاتوں میں کچھ عرصہ کے بعد کچھ چیزوں کا ردعمل عام حالت سے بدل جاتا ہے۔ اور اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دھاتیں محرکات، مسکنات اور زہروں سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ تجربات انہی نتائج کے ساتھ تین براعظموں میں دہرائے گئے ہیں۔ "مادہ کی زندگی" یہ الفاظ بیس برس پہلے بے معنی تھے۔ لیکن آج یہ روزمرہ میں شامل ہوگئے ہیں۔ اب ہم ماہرین طبیعیات اور کیمیا کو حیاتیاتی تصورات سے دوچار ہوتے دیکھتے ہیں۔ حیاتیاتی تصورات کا ساری کائنات پر تسلط آج اتنا بعید از امکان نہیں جتنا کہ چند برس پہلے تا۔ اب ہم مادہ کے ارتقا کا چرچا بھی سنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ پیدا ہوتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، اپنی طاقت کھو دیتا ہے اور مرجاتا ہے۔

قوت کی جدید طبیعیات ہمیں مادیت اور روحانیت کے مسئلہ کی از سر نو تشکیل کی دعوت دیتی ہے۔ خارجی دنیا کا کون سا پہلو زیادہ حقیقی ہے۔ مکانی جسے بیس برس گزرے طبیعیات نے مادہ کا نام دیا تھا یا وہ حرکت افروز پہلو جسے ہم "قوت" کہتے ہیں؟ اس کا جواب "قوت" ہی ہو سکتا ہے۔ یہی "قوت" "نامعلوم" "ذات" اور "مطلق" ہے۔ کیا یہی قوت بذات خود مکانی چیز ہے؟ ہم ایسا تصور نہیں کر سکتے، جس طرح ہم خیال کو مکانی چیز نہیں سمجھ سکتے۔ "مادہ" کی جان جو زندگی اور خود

اختیاری کی صفات سے آراستہ ہے اور یہ باریک پنہاں قوت جس کے جلوے ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں، ہر چیز کی جان ہے۔

لیکن یہ الفاظ "جان" اور "اندر" محض استعارے ہیں۔ اگر ہم انہیں استعارے نہ سمجھیں تو یہ ہمیں فکر کی الجھنوں میں پھنسا دیں گے۔ ہمیں "مادہ" کا اس طرح تصور نہیں کرنا چاہیے کہ یہ "قوت" سے کوئی علیحدہ چیز ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر رہتی ہے جس طرح پارہ۔ ڈیڈالس کے اقسام کے اندر رہتا ہے اور انہیں استحکام اور ظاہری زندگی بخشتا ہے۔ یہ حیاتیاتی عنصر، یہ فعال قوت، کوئی الگ چیز نہیں، جسے مادہ سے الگ کیا جا سکے۔ اس کا وجود مادہ کے وجود کے ساتھ اسی طرح منسلک ہے جس طرح بدن کا وجود ذہن کے ساتھ۔ قوت اور مادہ ایک ناقابل تحلیل حقیقت کے داخلی اور خارجی مظہر ہیں۔ مادہ پرست ٹھیک کہتا تھا۔ اس نے مادہ کی حقیقت کو تفوق بخشتے ہوئے اس ایمان کا اظہار کیا کہ کائنات کا تسلسل ارتقا کہیں نہیں ٹوٹتا اور یہ کہ مفکر بندروں سے، بندر حیوانات ابتدائی سے اور موخر الذکر بے جان مادہ سے اور بے جان مادہ سادہ ترین ذرات سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن ہم اس خیال کو صحیح تبھی مان سکتے ہیں، جب ہم یہ سمجھیں کہ بے جان مادہ کے اندر زندگی کا ایک اصول کارفرما ہے۔ ایک ایسی طاقت جو اسے ارتقا پر مجبور کر رہی ہے۔ مادہ اور ذہن کے درمیان جو خلیج ہے، ہم اس کو ذہن کی تحلیل سے نہیں بلکہ مادہ کو اعلیٰ مرتبہ دے کر عبور کرتے ہیں۔ اس دنیا کی حقیقت وہی ہے جو مادہ پرست کہتا ہے۔ اس کا ہر ذرہ مادہ سے بنا ہوا ہے۔ لیکن مادی دنیا کے ہر ذرہ میں ایک خود اختیار قوت کام کرتی ہے، جو زندگی اور ذہن کی ضامن ہے۔ ہم بے کیف حقائق کے بارے میں وہی کچھ کہہ سکتے ہیں جو ہر یکلٹس ممتاز مہمانوں کو اپنے مطبخ میں دعوت دیتے ہوئے کہا کرتا تھا "تشریف لایئے کیونکہ یہاں بھی دیوتا بستے ہیں"۔

۵- زندگی

ہم نے "روحانیت" اور "مادیت" میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف تو ہم نے اس نقطۂ نظر کو اپنایا ہے کہ تمام چیزوں کی اصلیت مادہ سے زیادہ ذہن کے قریب ہے اور دوسری طرف ہم نے یہ کہا ہے کہ زندگی اور ذہن مادہ کے ساتھ لازمی اور لابدی طور پر مربوط ہیں اور یہ کہ تمام اعلیٰ اشکال فطرت ادنیٰ اشکال سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہم نے پہلے نقطۂ نظر کی ماہرین طبیعیات کے اقوال کی مدد سے حمایت کی ہے۔ لیکن ہمیں ان مشکلات سے دوچار ہونا ہے جو دوسرے نقطۂ نظر کی حمایت سے پیدا ہوتی ہیں۔ آیئے پہلے ہم آخری مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں کہ اعلیٰ اور ادنیٰ اشکال فطرت کے درمیان تسلسل کی نوعیت کیا ہے؟

اگر اس تسلسل کا مطلب یہ ہے کہ ذی حیات موجودات بے جان موجودات سے پیدا ہوتی ہیں تو حیاتیات کی شہادت اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس قسم کے ارتقا کی کوئی مثال ہمارے علم میں نہیں ہے۔ پسیچر کے تجربات جو سات برس (۱۸۶۲-۶۹ء) تک جاری رہے تھے، اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ ابتدائی حیوانات بے جان مادے سے پیدا ہوتے ہیں اور جدید سائنس مختلف شکلوں میں سر ولیم ہاروے کے اس خیال کا اعادہ کرتی ہے، ہر انڈا، انڈے سے، ہر خلیہ، خلئے سے اور ہر ذی حیات، ذی حیات سے پیدا ہوتا ہے۔ جے ایس ہالڈین کہتا ہے کہ "بے جان مادہ سے ذی حیات کو اخذ کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں"۔ گستاف بونیئر کہتا ہے "ذی حیات کی تخلیق؟ سائنس کی موجودہ حالت میں لحہ بھر کے لیے کیا یہ امید کی جا سکتی ہے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کتنی صفات، کتنی وراثت، مستقبل کے کتنے امکانات ایک ذی حیات چیز میں موجود ہیں"۔

لیکن اس شعبہ کی ہیئت کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ متشککین کسی قدر لاشعوری طور پر بے جان مادے کا ذی حیات موجودات سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ مشکل کسی قدر کم ہو جاتی ہے اگر ہم اسے سادہ ترین ذی حیات اور نہایت پیچیدہ بستہ مادہ کے درمیان خلیج تک ہی محدود رکھیں۔ ترکیبی کیمیا، کوئلے کی اصل سے ۱۳۰،۰۰۰ مرکب پیدا کر سکتی ہے۔ کوئی ہٹ دھرم ہی، جس نے ابھی غیر ممکن کا ممکن ہونا نہیں دیکھا، یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ کیمیا کبھی زندگی نہیں پیدا کر سکتا، جو فطرت کرتی ہے۔ ممکن ہے شاید کسی دن انسان بھی فطرت کے کام کرنا سیکھ لے۔ لیکن جب ایک پودا سورج کی روشنی اور زمین کے کیمیاوی مرکبات کو اپنے رس میں تبدیل کرتا ہے تو یہ بے جان موجودات کی جاندار موجودات میں تبدیل ہونے کی مثال ہے۔ ہاں اس میں ایک ذی حیات کا وجود پہلے لازمی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی پھر بھی ایک حقیقی تبدیلی ہے اور اس ناقابل فہم حقیقت کی ضد ہے، جس کے ذریعے ذی حیات منتشر ہو کر بے جان بن جاتا ہے۔ بے جان اور جاندار، ارتقا اور انحطاط کے ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ ممکن ہے جیسا کہ فیکنر نے کہا تھا کہ مادہ کسی ذی حیات وجود کی انحطاط یافتہ شکل ہو اور "بے جان" اور "میکانکی" موجودات کسی بیتی ہوئی زندگی کے آثار ہوں۔

غالباً کسی زمانہ میں یہ زمین جاندار موجودات کے لیے موزوں نہیں تھی اور غالباً اس پر زندگی نے اس وقت جنم لیا جب زندگی کے لیے سازگار فضا پیدا ہو چکی تھی۔ ہمیں آرہنئس کے خیال کی پیروی سے کوئی فائدہ نہیں کہ دور دراز کے ستارے زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ کسی مسئلہ کو ملتوی کرنا اس سے دوچار ہونا نہیں۔ آیئے ہم یہ تصور کریں کہ کوئی حادثہ تمام نباتات اور حیوانات کو مٹا دیتا ہے۔ اور پھر یہ تصور کریں کہ ایک لمبے عرصہ کے بعد ایک ایسی آب و ہوا دوبارہ پیدا ہوتی ہے

جو آج کل کی طرح معتدل اور مرطوب ہے اور آج کل کے سے تمام طبیعیاتی اور کیمیاوی حالات بھی موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ زمین پھر جراثیم' نباتات اور زندگی کی لاکھوں اشکال پیدا کرے گی؟ ایک مرتبہ ہم ارتقا کے اصول کو تسلیم کرلیں تو ہم اس کی حدبندی نہیں کر سکتے۔ ارتقا کی صف میں شیکسپیئر سے لے کر ایک ابتدائی حیوان تک' کوئی جگہ نہیں جہاں ہم رک جائیں اور تسلسل کی جگہ کسی معجزے کا دخل قبول کرلیں۔ جس طرح ھکسلے نے کہا تھا کہ انسان اور بندر کا فرق اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ ادنیٰ اور اعلیٰ بندروں کا باہم فرق۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترکیبی لمیوں اور بدلو کے درمیان فاصلہ تھوڑا ہے' بہ نسبت اس مسلسل صف کے جو "بدلو" اور کسی خدا پرست انسان میں تعلق پیدا کرتی ہے۔

مادہ کا یہ نیا تصور کہ وہ "زندہ" ہے "بے جان" اور "ذی حیات" کے درمیان تقابل کو اور مسلسل ارتقا کا تصور باندھنے کی مشکل کو کسی قدر کم کر دیتا ہے۔ زندگی حقیقت کے اس خارجی پہلو کی تخلیق نہیں ہے جو ہمیں وزن' ٹھوس پن اور مکانی صفات دیتا ہے' بلکہ اس داخلی پہلو کی تخلیق ہے جو ہمیں ذرے کی قوت' اثیر کی برقی بے تابی اور خلیہ کی بے قرار توانائی سپرد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کی طبیعیات اور کیمیا کے سیدھے سادے تصورات نے "بے جان" اور "جان دار" چیزوں کے تفاوت کو قطعی بنا دیا ہے اور سپنسر بھی اگرچہ ارتقا کو مکمل بنانا چاہتا تھا' اس مسئلہ سے پہلو بچانے اور یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا "ہم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ زندگی اپنی اصلیت میں طبیعیاتی اور کیمیاوی عناصر میں تحلیل نہیں ہو سکتی"۔ جب طبیعیات اور کیمیا زندگی کے تصور اور مادے کو مسلسل سمجھنا سیکھ لیں گی' حقیقت اور ارتقا کی دو متضاد حصوں میں تقسیم ختم ہو جائے گی اور وہ مادہ جس کی حقیقت قوت ہے' اور وہ زندگی جس کی ہیئت مادہ ہے' ان دونوں کا ربط ہمیں وہ مکمل اتحاد اور ہم آہنگی بہم پہنچاتا ہے جس کے بغیر نہ سائنس کو سکون حاصل ہو سکتا ہے نہ فلسفہ کو۔

۶۔ مادہ پرست کا نظریہ

لیکن اگر "بے جان" مادہ سے زندگی کا پیدا ہونا بعید از قیاس ہے تو وہ چیز جسے ہم "ذہن" کہتے ہیں' اس کے فطری ارتقا کا تصور باندھنا کس قدر مشکل ہو گا۔ نیطشے نے کہا تھا کہ مادہ کا کسی ایسی ذات میں تبدیل ہونا' جو فکر و تدبر کی اہلیت رکھتی ہو' ناممکن ہے۔ ہم یہاں بے جان مادہ کے تصور میں وہی مشکلات دیکھتے ہیں جو ارتقا کے تسلسل کو قربان کر کے ہی دور ہو سکتی ہیں۔ روحانیت اور مادیت پھر اپنے ناقابل تردید دلائل پیش کرتی ہیں اور ہمیں دو متضاد نظریوں کے درمیان حیران چھوڑ جاتی ہیں' جو ایک مکمل اور مربوط وحدت کے اجزا بننے سے گریز کرتی ہیں۔ آیئے ہم کچھ دیر

ان نیم حقائق کا تجزیہ کریں:

مادہ پرست تسلسل کے ثبوت سے ابتدا کرتا ہے۔ بوس کے تجربات مادہ میں ایک خاص قسم کی حساسیت کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ شعاع پیما میں نقریہ کی ایک پتلی سلاخ، حرارت میں ۱/۱،۰۰۰۰۰۰۰۰ درجہ کے اضافہ سے متاثر ہوتی ہے۔ یقیناً یہ حساسیت اس حساسیت سے بہت مختلف ہے جو جاندار چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ماحول پر قابو پانے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی۔ یہ محض اس راہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے ذریعے قدرت نے مادہ اور ذہن کے درمیان خلیج کو عبور کیا۔

ذہن کے ارتقا میں اگلی منزل پودوں کے ان تاثرات میں نظر آئی ہے جو وہ مقام تعلق، حرارت، نمی اور روشنی سے حاصل کرتے ہیں۔ لیرکز سمجھتا ہے کہ ذہن کی بڑی طاقت اور خصوصیت، سیکھنے اور تجربہ کی مدد سے مختلف طریقوں سے عمل کرنے کی صلاحیت ایک ادنیٰ ذی حیات کی ممیز صفات ہیں۔ بوس ہی نے "برطانوی مجلس ترقی سائنس" کو یہ ثابت کر کے متاثر کیا کہ انسان اور پودوں کے دوران خون کے نظام بہت متشابہ ہیں اور یہ کہ بہتا ہوا رس، محرکات، مسکنات اور زہروں سے تاثر حاصل کرتا ہے۔ ایڈورڈ مینگل نے پودوں کے خلیوں میں مادۂ حیات کے مہین دھاگے دریافت کیے، جنہیں اکثر ماہرین نباتات حیوانوں کے عصبی دھاگوں کے مشابہ سمجھتے ہیں۔ کچھ پودے روشنی سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہ گلستانی گھڑیاں بن گئے ہیں۔ کیڑے کھانے والے پودوں کی پانچ سو اقسام ہیں جن میں سے کچھ کے پاس جیسا کہ ہمیں ڈارون نے بتایا ہے، بہت حساس گومڑے ہیں، جو بہت معمولی دباؤ کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ ان مقاصد سے جو ذی حیات کے لیے مفید ہیں، سازگار اعمال کی یہ ابتدائی کوشش ہمیں ذہن کے آغاز کا پتہ دیتی ہے۔

حرکت کے ساتھ حساسیت بھی بڑھتی گئی۔ پودوں میں بے جان مادے کو غذا بنانے کی صلاحیت تو ہے مگر وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی جڑوں کو زمین میں زور سے دبا سکتے ہیں یا اپنے بوٹوں کو آسمان کی طرف اچھال سکتے ہیں، لیکن انہوں نے اس سادہ زندگی کے لیے بہت سے بامقصد اعمال کی صلاحیتیں قربان کر دیں۔ وہ پودے جنہوں نے حرکت کی، حیوان بن گئے اور انہوں نے اس عظیم الشان اور دردناک نظام عصبی کی طرح ڈالی جو آج معرکہ خیزی اور ضبط کا آلہ بن گیا ہے۔ ادنیٰ حیوانوں میں کوئی نظام عصبی نہیں ہوتا۔ ان میں حساسیت عمومی ہوتی ہے اور بدن کے ہر رگ و ریشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان ادنیٰ اقلیموں میں بھی تخصیص کار شروع ہوتی ہے۔ بعض ابتدائی حیوانات میں خارجی خلئے ایک خاص حساسیت رکھتے ہیں۔ لیکن اندرونی یا ہضمی خلئے خارجی ماحول سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ایک اور منزل اوپر آیئے اور حساسیت کی تخصیص کار بڑھ

جاتی ہے۔ جیلی مچھلی میں کچھ عصبی خلئے بیرونی حصے میں پھیلے ہوتے ہیں۔ وہ چند عملی خلیوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہاں تخصیص کار نے عصبی خلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہاں ہمیں نظام عصبی کی پہلی شہادت میسر آتی ہے جو کہ ذہن کا آلہ ہے۔

کسی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ جسم اور ذہن اگر وہ اتنے ہی مختلف ہیں تو ایک دوسرے پر کیونکر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ "کیونکہ جب روح" لیوکریٹس نے کہا' اعضا کو حرکت میں لاتی ہے یا جسم کو خواب سے ابھارتی ہے یا چہرہ بدل دیتی ہے یا ہدایت دیتی ہے یا سارے آدمی کو اوپر تلے کر دیتی ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی اثر بھی بغیر لمس کے' اور لمس بغیر جسم کے ممکن نہیں تو کیا ہمیں یہ تسلیم نہیں کرنا پڑتا کہ ذہن اور روح کی وہی حقیقت ہے جو بدن کی ہے"۔ دیکھو اس کے دو ہزار برس بعد مارک ٹوین کیونکر فلسفی کا روپ بھرتا ہے۔

بوڑھا آدمی (طنزاً): "ذہن کی حقیقت چونکہ روحانی ہے' وہ جسمانی اثرات قبول نہیں کر سکتا"۔

جوان آدمی: "نہیں!"

بوڑھا آدمی: "تو کیا ذہن صحیح رہتا ہے جبکہ جسم نشہ میں بدمست ہو؟"

دماغ کے مجروح ہونے سے جنون پیدا ہو سکتا ہے۔ تکان سے نیند آ سکتی ہے۔ دواؤں' بیماریوں' آکسیجن یا خون کی کمی سے بے ہوشی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعور کی بنیاد حواس ہیں۔ شڑنپل کا لڑکا' جو صرف بینائی کی حس رکھتا تھا' جب کبھی آنکھیں بند کرتا سو جاتا۔ آگہی میں شعور جبلتوں کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی کشمکش نہیں ہوتی' عمل بغیر توجہ کے ہو سکتا ہے۔ شاید شعور ایک ہنگامی مصیبت ہے۔ ایک حیوان جس کی جبلتیں اور حواس اس کی ضروریات کے عین مطابق ہیں' شعور سے ناآشنا ہو گا۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ جب انسان ماحول سے حاصل کی ہوئی عادات کو فطرت ثانیہ بنا لے گا' شعور ختم ہو جائے گا۔

جہاں تک "خودی" یا "روح" کا تعلق ہے' یہ فقط موروثی صفات اور سیکھے ہوئے اوصاف کے مجموعہ کا نام ہے۔ جب تجربہ بدلتا ہے تو روح بھی بدل جاتی ہے۔ آدمی اپنے بچپن پر ایک اجنبیانہ خارجیت کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ چند المناک حالات کی شرط ہے اور ایک انسان دو شخصیتوں میں بٹ جاتا ہے۔ تجربہ کا کوئی مرکز' دماغ کے اعصاب کا کوئی حصہ اگر باقی حصوں سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ اپنی الگ ہی مملکت قائم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خودی یا روح' وراثت' حافظہ اور مقصد کی ایک نازک وحدت ہے جو لافانی سے زیادہ ناتواں ہے۔

فکر عمل کا امکان ہے۔ توجہ ایک تناؤ ہے۔ نفرت ایک گریز ہے۔ اشتہا ایک جستجو ہے۔

جذبہ ایک حرکت ہے۔ خیال عمل کی پہلی منزل ہے۔ ہم اسے خیال اس لیے کہتے ہیں کہ عمل کے کسی اور رجحان نے اسے تکمیل سے پہلے ہی روک دیا تھا۔ تدبر میں جسم ممکن اعمال، جذبوں اور آرزوؤں کی رقابت کے بس میں آجاتا ہے۔ جیسا کہ کینن نے بتایا تھا کہ جذبات خون کے کوائف ہیں جو غدودوں کے رس سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایڈرنیل کے بغیر ہمیں غصہ نہیں آسکتا۔ غدود درقیہ کے بغیر ہم احمق بن جاتے ہیں۔ تمام فکر و عمل آرزو کا رہین منت ہے، جو خود جسم کی ایک حالت ہے۔ بھوک چند خلیوں کے خالی ہونے کا نام ہے، محبت چند خلیوں کے لبریز ہونے کا۔ جنسی تصورات جسمانی بلوغت سے پیدا ہوتے ہیں اور دنیا کی نصف شاعری خلیوں کے باعث معرض وجود میں آئی ہے۔ ذہن اپنے تمام فریضوں میں جسم کا ایک حصہ ہے۔ وہ اس کی نشوونما کے ساتھ بڑھتا ہے اور اس کے انحطاط کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔ یہ ہاضمہ، تنفس اور اخراج کی طرح جسم کی دنیا ہی سے متعلق ہے۔ یہ محض بدن کا عظیم ترین وظیفہ ہے۔

۷۔ عینیت پرست کا جواب

عینیت پرست کہتا ہے کہ یہ استدلال شرمناک ہے۔ اس سادہ لوح مادیت سے زیادہ کیا چیز مضحکہ خیز ہو سکتی ہے؟ کیا یہ بات سوچی جا سکتی ہے کہ مادہ اپنی تبدیلیوں کے ذریعہ مشاہدے، علم اور تسلط کے لیے اپنے آپ کا رخ کر سکتا ہے؟ ذہن کی ادنیٰ کیفیتیں بھی مادی اصطلاحوں میں ادا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً مادہ کس طرح الم کا احساس کر سکتا ہے؟ انسان مادہ کو یاد کرتے تصور کر سکتا ہے لیکن مادہ کو مستقبل کا تصور کرتے یا شناخت کرتے تصور کرنا محال ہے۔ اگر ذہن، دماغ ہے تو حافظہ کی ہر کوتاہی کے لیے دماغ میں ایک کاٹ ہونی چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ذہن اور دماغ کے فریضوں میں مکمل متوازیت قائم کرنے کی ساری کوشش ناکام رہی ہے، سوائے اس کے ذہن حاوی اور آقا ہے اور دماغ آلہ اور مشین۔ کیا ہمارے زمانہ کی کوئی اور علمی شکست بدنیاتی نفسیات کی شکست سے بڑھ سکتی ہے؟

لیکن یہ معمولی باتیں ہیں۔ ذرا فکر پر غور کرو۔ یہ صحیح ہے کہ ولیم جیمز نے داخلی مشاہدہ کر کے ہمیں یہ بتایا تھا کہ مجھے "میں سانس لیتا ہوں" کے علاوہ شعور میں کچھ اور نظر نہیں آتا۔ لیکن یہاں "میں" اہم ہے، "سانس لیتا ہوں" نہیں۔ ہمیں داخلی مشاہدے میں کچھ نظر نہیں آتا کیونکہ ہماری نگاہیں کسی مکانی اور مرئی چیز کو ڈھونڈتی ہیں۔ ہم جو کچھ "دیکھتے" ہیں اسے بیان کرنا مشکل ہے، کیونکہ ہم مرئی تصورات کی جستجو کرتے ہیں اور "دیکھنا" بھی تو ایک مادی فعل ہے۔ لیکن کسی نے خارجی دنیا کے مکانی روابط اور ذہنی دنیا کی لامکانی کے مابین جو مسافت ہے، اسے عبور کرنے کے

لیے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ ہم بڑے فاصلوں کے بارے میں بھی اسی طرح سوچ سکتے ہیں، جس طرح کہ چھوٹے فاصلوں کے بارے میں۔ ہمارا ایک میل کا تصور ایک انچ کے تصور سے زیادہ جگہ نہیں روکتا۔ یا اس کے لیے زیادہ کوشش درکار نہیں ہوتی۔ ہم وقت کی طویل مدتوں کے بارے میں اسی طرح سوچتے ہیں جس طرح کہ ایک لمحہ کی یاد کے متعلق۔ ہم اپنی مرضی کے مطابق تصورات کو بڑھا، گھٹا اور جوڑ سکتے ہیں۔ تجربے میں چاہے وہ کسی طرح آئے ہوں، اور تصور فکر نہیں ہے۔ بہت سے لوگ کبھی کبھی اپنے فکر میں تخیل کا عنصر نہیں پاتے۔ ہمارے تصورات بنیادی نہیں ہیں بلکہ ضمنی حقیقت رکھتے ہیں۔ ایک مثلث ٹوپی اور ابھری ہوئی توند پر ہاتھ، نپولین کی سینکڑوں پہلوؤں اور نقطہ ہائے نظر سے نمائندگی کرتے ہیں۔ جس چیز کے بارے میں ہم بار بار سوچیں، اس کے لیے ہمیں کم تخیل درکار ہے۔ تخیل عمل کی تیاری کے طور پر اہم ہے۔ جہاں عمل نہ ہو، فکر کم سے کم تخیل کے ساتھ رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس وقت یہ عمل کسی مادی تصور یا استعارے کی حد سے باہر چلا جاتا ہے۔

مادہ پرست کے لیے شعور کا مسئلہ حل کرنا بہت دشوار ہے۔ وہ دیانت کم اور جرات زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اور یہ کہہ کر کہ "شعور کا کوئی وجود نہیں" فرض کر لیتا ہے کہ اس نے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے۔ اس کا مرتبہ اخلاقی اور ذہنی طور پر اس عینیت پرست کے برابر ہے، جو خارجی دنیا کی حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ فلسفی ہمیشہ کسی حقیقت کا انکشاف عام لوگوں کے بعد کرتے ہیں۔ انہیں یہ جاننے میں کہ خارجی دنیا موجود ہے، تین سو برس لگے۔ اور جب نئے حقیقت پسندوں نے شادیانے بجا کر اعلان کیا کہ خارجی دنیا کا وجود کسی قدر یقینی ہے، تو اقلیم فلسفہ حیرت اور تشکک سے گونج اٹھا کہ شاید خارجی دنیا موجود ہے۔ ممکن ہے تین سو برس بعد کردار پرست اور مادہ پرست داخلی دنیا کی حقیقت اور شعور کی حقیقت اور فعالیت دریافت کر لیں۔ اس وقت وہ ایک عام آدمی کے مبلغ علم تک رسائی حاصل کر لیں گے۔

ھکسلے نے اپنی مصدقہ دیانت کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ مادیت شعور کی توجیہ نہیں کر سکتی اور وہ اپنی منطق اور مفروضوں سے مجبور ہو کر یہ کہتی ہے کہ شعور ایک نتیجہ ہے، جو سبب نہیں بن سکتا۔ وہ دماغ اور اعصاب میں ایک بے سود اضافہ ہے، جس طرح چراغ میں حدت یا آگ میں روشنی۔ یہ صحیح ہے کہ ارتقا میں بہت سے بے سود اعضا پیدا ہوئے۔ غالباً اس لیے کہ وہ بے ضرر تھے یا کبھی کسی زمانہ میں سودمند تھے۔ مادہ پرست کو اس خیال کی اجازت نہیں کہ شعور کبھی بھی سودمند یا مضرت رساں تھے، جیسا کہ بہت ممکن ہے۔ اگر وہ ایک شرمیلا مفکر ہونے کی وجہ سے یہ مان لے گا کہ خود مرکزیت Self Conciousness وبال جان ہے۔ ہم میں سے کون ٹانگوں کے متعلق

سوچتے ہوئے ٹھیک طرح چل سکتا ہے؟ اور مادہ پرست کس طرح اس شہادت کو نظرانداز کر سکتا ہے کہ شعور نے زندگی کی طاقت اور لچک کے ساتھ ساتھ نشوونما پائی ہے اور وہ حیوان، جن میں شعور بدرجہ اتم موجود ہے، تخلیق پر حاوی ہیں۔

۸- ترکیب

وقت آگیا ہے کہ ہم ان رشتوں کو جوڑیں اور ان نیم حقائق کو وحدت میں مربوط کریں۔ لائیبنز نے نہایت سادگی سے وحدت پیدا کرنے کے لیے "معینہ ہم آہنگی" کا تصور پیش کیا۔ اس کے نزدیک ذہن اور جسم متوازی تھے لیکن ایک دوسرے سے مستغنی۔ وہ دوش بدوش چلتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کو چھو نہیں پاتے، نہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا ہر لمحہ ارتباط، کبریائی رحمت کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس نظریہ کا فقط یہی فائدہ ہے کہ یہ اکثر نظریوں سے زیادہ احمقانہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت تقریباً وہی ہے جو فلسفے کے تازہ ترین فیشن "ناجانبدار حقیقت" کی ہے۔ ہمارے "غیر جانبدار وحدت پرستوں" کے لیے (جن میں برٹرینڈ رسل کا فلسفہ سب سے زیادہ قابل قبول ہے) طبیعیات نے مادہ کو روابط اور واقعات کا نظام بنا دیا ہے اور نفسیات نے ذہن کو روابط اور واقعات کا نظام بنا دیا ہے اور مشاہدہ ان دو دنیاؤں کا ہنگامی تصادم ہے۔ ان دو قدیم ضدین کا یہ میل بھی خدا ہی عمل میں لایا ہوگا۔ اس "غیر جانبدار حقیقت" کے سمندر میں روابط اور واقعات کے اس مہین گودے میں سے مادہ اور ذہن پیدا ہوتے ہیں۔ جسم اور روح یہ مہین حقیقت بن گئے ہیں۔

ہم تو اسی بات میں یقین رکھتے ہیں کہ خارجی دنیا کے واقعات ہمیں ایک مرئی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں، جسے ہم بجا طور پر مادہ کہہ سکتے ہیں اور جو افسوسناک حد تک ہماری آرزوؤں اور ہمارے احساسات سے مستغنی ہے۔ چونکہ مادہ "بے جان" نہیں "جاندار" ہے؟ ذہن اور مادہ کا مسئلہ غلط مفروضوں کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً مادہ پرستوں کے مادہ کے لیے ذہن بننا مشکل ہے۔ لیکن جن لوگوں نے جدید طبیعیات کے ہنگاموں کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آج کل کی سائنس کا مادہ ذہن کی طرح زندہ اور غیر مرئی ہے۔ اس قسم کے مادہ سے ذہن کا پیدا ہونا کوئی معجزہ نہیں۔ لیکن سوال یہ ایک کے دوسرے سے پیدا ہونے کا نہیں ہے۔ اب یہ سوال اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ذہن مادے کی ادنیٰ اشکال اعلیٰ اشکال کیونکر بن سکتی ہیں؟

کیونکہ ذہن مادہ نہیں ہے اور مادہ ذہن نہیں ہے، مادہ ذہن حقیقت ہے۔ ذہن مادہ کے اندر کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے۔ زندگی جسم میں اس طرح نہیں رہتی جس طرح کوئی شخص اپنے مکان میں رہتا ہے۔ ذہن ایک اسم مجرد ہے۔ ایک اجتماعی نام ہے، جو ہم زندہ حقیقت کے اعمال کو تب

دیتے ہیں جب وہ سوچتی ہے۔ جس طرح بینائی حقیقت کے اعمال کا نام ہے، جب وہ دیکھتی ہے یا محبت حقیقت کے اعمال کا نام ہے، جب وہ ملکیت یا سپردگی کی طلب رکھتی ہے۔ ذہن اور مادہ ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس طرح نہیں کہ دو علیحدہ چیزیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں، بلکہ محض اس طرح کہ جسم کا ایک عضو اور وظیفہ (اعصاب، خیال) دوسرے اعضا اور وظائف کو (سینہ، تنفس، پیٹ، ہاضمہ، اعضا، حرکت، جنس، تناسل، غدود، رس) کس طرح متاثر کرتا ہے اور کیونکر ان سے متاثر ہوتا ہے؟ زندہ حقیقت کا نشوونما یافتہ حصہ نظام عصبی کے ترکیبی اعمال سے باقی ماندہ حصوں کو یکجا کرتا اور ان کے اعمال کی رہنمائی کرتا ہے۔ ذہن کی اعلیٰ شکل ادنیٰ ترین اشکال حیات اور ذرہ کی قوت سے فطری طور پر مماثل ہے۔ حتیٰ کہ شعور جس کی ہم شکلوں اور خاکوں سے وضاحت نہیں کر سکتے، ارتقاء کے اس اصول کے ماتحت آتا ہے۔ کیونکہ ہم اسے "بے جان" مادے سے نہیں بلکہ اس بے پناہ قوت سے اخذ کرتے ہیں جو کہ مادہ کی جان ہے۔

اگر ہم "فکر" کا ذکر اس طرح کریں کہ وہ جسم کا ایک وظیفہ ہے تو یہ جان لینا چاہیے کہ ہم جسم کو مادہ نہیں سمجھتے بلکہ زندگی سمجھتے ہیں۔ ایک سادہ ترین خلیہ میں بھی قوت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور مادہ ہیئت (اگر استعارہ سے کام لیں) تو محض ایک خول ہے۔ زندگی ہیئت کا وظیفہ نہیں، بلکہ ہیئت زندگی کا وظیفہ ہے۔ مادہ کا وزن اور ٹھوس پن ایٹمی قوت کا اظہار ہے اور جسم کا ہر عضو اور ہر عصب آرزو کا آلہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ ذہن کی ابتدا احساسات سے ہوتی ہے، جو خود بخود فکر بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ آرزو کی قوت ذی حیات موجودات کی جان ہے۔ خارجی مداخلت سے قطع نظر آرزو ہمارے مقاصد، میلانات اور اعمال کی ذمہ دار ہے اور وہ احساسات اور تجربہ کا انتخاب کرتی ہے۔ تجربہ حقیقت مطلق نہیں ہے، کیونکہ اسے ہماری آرزوئیں انتخاب کرتی ہیں۔ اگر حقیقت مطلق کا تصور لازمی ہے تو وہ قوت ہے جو ذرہ کی منتشر توانائی سے ابھر کر بالغ ذہن کے مربوط اعمال تک پہنچتی ہے۔ وہ بالغ ذہن جو اس کے مقاصد میں وحدت پیدا کرتا ہے اور تمام اجزاء کو کل کے رشتہ میں دیکھتا ہے؟ اس زندہ حقیقت کی قوت تھی۔ یہ جس نے اعصاب اور دماغ کی تشکیل کی۔ اب ہم سوچ سکتے ہیں، کیونکہ ہمارے پاس دماغ ہیں۔ لیکن کبھی زندگی نے دماغ سوچنے کی کوشش میں بنایا تھا۔ اب بھی دماغ کا نشوونما اس طرح ہوتا ہے کہ آرزو سے برمائے ہوئے خیالات کی آزمائشوں میں الجھے۔ زندگی اول ہے اور داخلی حقیقت ہے۔ مادہ زمان میں ہے اور مکان سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس کی حیثیت منطق اور اہمیت میں ثانوی ہے۔ مادہ زندگی کی ہیئت اور مرئیت ہے۔

یہ ہے قوتیت، لیکن موحد قوتیت۔ یہ زندگی کو اساسی حقیقت سمجھ کر قبول کرتی ہے۔ مادہ

اس کا ظاہری لباس ہے۔ لیکن یہ برگساں کی طرح یہ تسلیم نہیں کرتی کہ مادہ اور زندگی کبھی علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ یہ دونوں ایک ہیں۔ کوئی ہمیں یہاں تصوف کا طعنہ نہ دے۔ مادے اور ذہن کی حاضر و ناظر وحدت اس حقیقت سے زیادہ متصوفانہ یا ناقابل فہم نہیں کہ ایک ہی انسان میں بامقصد فکر اور بے تاب بدن مل جاتے ہیں۔ زندگی کو بنیادی حیثیت دینا "تصوف" کیونکر بن گیا، جبکہ ہم کسی اور چیز سے زیادہ زندگی کو قریب سے اور باقی سب چیزوں کو زندگی کے توسط سے جانتے ہیں۔

مادی میکانکیت مذہب کے خلاف ایک یورش تھی اور داخلی عینیت لامذہبی کے خلاف ایک جہاد تھا۔ اگر ہم اپنے خیالات اور اپنے زمانہ سے خوف زدہ نہیں، تو ہم دونوں کو مسترد کر سکتے ہیں۔ اور ذہن اور بدن کی وحدت میں مادیت، روحانیت، عینیت رد نہیں کیے گئے، بلکہ وہ سب ایک رشتہ میں منسلک ہو گئے ہیں۔ مادیت، جہاں تک وہ کائنات کو ارتقاء اور نشو ونما کی وحدت میں بندھا دیکھتی ہے--- عینیت، جہاں تک وہ معلوم حقیقت کو تجربہ تک محدود رکھتی ہے--- روحانیت، کیونکہ وہ حقیقت کو مکان، دبازت اور وزن میں تلاش نہیں کرتی بلکہ ایک "فعال قوت" میں، جو کہ ایٹم کی زندگی بھی ہے اور صاحب تخلیق کی طاقت اور راز بھی" "یہ وہ تحریک اور وہ روح ہے جو ہر صاحب فکر، فکر کے تمام موضوعات اور دنیا کی تمام چیزوں میں جاری و ساری ہے" سائنس نے اس شاعرانہ وجدان کی تصدیق کر دی ہے۔

ہم نے ایک ایسا فلسفہ وضع کرنے کی کوشش کی ہے جو جامع ہو اور دنیا کی متنوع پیچیدگی پر حاوی ہو۔ یقیناً ہم اس کوشش میں ناکام رہے ہیں اور اپنے مشاہدے اور احساس کو ہم نے زیادہ الجھا دیا ہے۔ سمندر کا ایک قطرہ، سمندر کی حقیقت پر کیونکر عبور پا سکتا ہے؟ ہمارا منطق اور ہمارے فلسفیانہ نظام اس لیے درماندہ ہیں کہ رواں اور دواں چشموں، قدرتی مناظر اور گھمبیر بادلوں میں بے پناہ زندگی موجزن ہے۔

* * *

باب چہارم

کیا انسان ایک مشین ہے؟

۱۔ تناظر

اب ہم خارج دنیا سے داخلی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ لیکن ہم ذہن کی حقیقت پر نہیں بلکہ اس کے عملی پہلوؤں پر غور کریں گے اور غور و فکر کے اس عمل میں ہم خارجی اور داخلی دنیاؤں کو الگ نہیں کریں گے، کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں یہ دنیائیں محض خیال میں علیحدہ ہو سکتی ہیں ورنہ در حقیقت مکان اور زمان میں وہ ایک ہیں۔ ہر ایٹم کا ایک زندہ مرکز ہے اور ہر ذہن کی ایک مادی ہیئت۔ بلند ترین ذہن ارتقا کے سلسلہ میں ادنیٰ ایٹم سے متعلق ہے اور ایک کے قانون دوسرے کے قانون بھی ہیں۔ اگر ایٹم ایک کل ہے تو انسان ایک مشین ہے۔

جبریت قدیم ترین فلسفہ ہے، جس طرح روحیت مظاہر قدیم ترین مذہب ہے۔ سادہ ترین مذہب، ہر چیز میں ایک بے ربط عزم دیکھتا ہے اور ابتدائی فکر اس شفاف عقیدہ کے خلاف اس طرح احتجاج کرتا ہے کہ فرد کائنات کے قانون کے سامنے بے بس ہے۔ ان مختلف ابتدائی مراحل سے ابھر کر فلسفہ اور مذہب شاید ایک ہی مقام اور منزل پر پہنچ جائیں۔ عالمگیر عزم کی بے ربطی شاید کبھی دور ہو جائے اور وہ دنیا کے اٹل قوانین کے مطابق نکل آئے۔ مشرق میں جہاں انسانوں کی زرخیزی زمین کی سہل انگار پیداوار سے بڑھ گئی ہے اور جہاں روح مصائب تلے کچلی گئی ہے اور فرد اجتماع میں گم ہو گیا ہے، عزم میں ابتدائی عقیدہ، مذہب اور فلسفہ سے ختم ہو رہا ہے۔ وہاں مذہب اور فلسفہ یہ سمجھتا ہے کہ آرزو کے خاتمے اور قدرت کی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے ہی سے سکون قلب حاصل ہو سکتا ہے اور وہاں کے مفکر اور مذہبی پیشوا تقدیر میں ایک اداس ایمان رکھتے ہیں۔ انسانیت کے اس وسیع سمندر میں فرد کی کوئی قدر و اہمیت نہیں۔ ایک لامتناہی اور المناک ماضی کے

پس منظر میں فرد اپنے آپ کو ایک بیکار ذرہ سمجھتا ہے جو عدم سے وجود میں آیا اور جو کچھ دیر بزعم خود تگ و دو کرنے کے بعد بالاخر تاریکی کی طرف یوں کھنچا چلا آتا ہے جیسے کوئی جابر دشمن اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔ عمر خیام نے بھی فرد کی حالت کے متعلق یہی اندازہ لگایا تھا اور اس خیال کو اشعار میں یوں ادا کر دیا ہے کہ ہر سرکش نوجوان نے انہیں اپنا ورد بنا لیا ہے۔

لیکن فعال اور ترقی پذیر تہذیبوں میں جہاں تدبیر کا چراغ تقدیر کے سامنے روشن ہو کر کائنات پر کسی قدر تسلط پاتا ہے اور دیوتاؤں کے لیے خوبصورت عبادت گاہیں اور فلسفہ کی عالی شان عمارتیں بناتا ہے، فرد اپنی شخصیت کے تخلیقی پہلوؤں پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ اپنے اندر خود اختیاری کے شعلہ کو محسوس کرتا ہے اور اولمپس کے دیوتاؤں کو بھی اپنے تصور کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ یونانیوں نے کائنات میں ارتقا کے اصول کو کارفرما دیکھا۔ ہر جگہ دیوتا تھے !ور متضاد حقائق کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ افلاطون اور ارسطو یہ سمجھتے تھے کہ یہ کائنات اس طرح کسی کامل مقصد کی طرف رواں ہے جس طرح عاشق کی نظر کی کشش محبوب کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن یہ زندہ دل تہذیب جو فتح و دولت کی پیدا کی ہوئی تھی، چند دنوں کی مہمان تھی۔ جب سپارٹا نے پریکلیس کے ایتھنز کو تباہ کیا اور سکندر نے تھیس کو تو انسان باقی و لافانی معلوم نہیں ہوتے تھے اور فلسفہ شرقی زینو کے فکر میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ وہ نتیجہ جسے سفوکلیس کئی نسلوں پہلے یوں ادا کر چکا تھا کہ خداؤں اور انسانوں کی زندگی ایک تاریک قسمت کے ہاتھ میں ہے۔

تھکی ہوئی تہذیبیں پیرانہ سال انسانوں کی طرح قسمت پر یقین رکھتی ہیں۔ انحطاط کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو کر وہ اپنی تکان کو قسمت اور اپنی شکست کو تقدیر کا حسین نام دے کر تسکین حاصل کرتی ہیں۔ حزن و یاس کی اس تاریک مٹی میں سے مسیحیت کا وہ پودا پھوٹا جس کی حیثیت ایک منتشر دنیا میں امید کی آخری کرن کی سی تھی اور نئے مذہب کے قلب میں جو ابھی تاریک خیال، رسوم اور عشرتوں سے الجھا نہیں تھا، وہ یاسیت تھی جس میں اس نے جنم لیا۔ جنت میں ایمان کا ایک اور پہلو زندگی کا خوف اور مستقبل پر بداعتمادی تھی۔ یہ اداس بداعتمادی، غمگین کیلون کے فلسفہ میں کمال پر پہنچ گئی۔ خدا کو مستقبل کا علم تھا اور ہر انسان کے انجام سے واقف تھا۔ ہر روح کی نجات یا عاقبت اس کی پیدائش سے پہلے ہی متعین ہو چکی ہے کیونکہ مستقبل خدا کے علم کو جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ مسیحیت جس نے مظلوموں کو سکون قلب دینے کا بیڑا اٹھایا تھا، کئی فرقوں میں بٹ گئی، جن میں بعض کسی ارضی تقدیر سے بھی زیادہ ظالم اور جابر تھے۔

جدید اذہان نے سائنس کے نئے کمال کے ذریعہ اس بے درد مذہب کی پشت پناہی کی۔ گلیلو نے، جو سیاروں کی باقاعدہ گردش سے مسحور ہو چکا تھا، ہر سائنس کا یہ مقصد متعین کیا کہ اسے

اپنے علم کو ریاضی اور مقدار کے قوانین تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔ نیوٹن کی شہرت اور میکانکیت میں اس کے کمال نے ہر طالب علم پر جادو کا کام کیا۔ علم الابدان اور علم نفسیات کے ماہرین خلیہ کی نشوونما اور آرزو کی بے تابی کے لیے میکانکی توجیہیں اور ریاضی کے اصول تلاش کرنے لگے۔ فلسفہ ریاضی کے نشہ میں چور ہوگیا۔ ڈے کارٹ نے محتاط ابہام سے کام لے کر یہ بتایا کہ تمام دنیا ایک مشین ہے اور سپنوزا نے کائنات کی ترتیب کے نمونہ پر اپنے خیالات کی تشکیل کی۔ نئی روشنی کے باغیوں کو جنھوں نے اپنے عہد میں انسان کے ہاتھوں اور ارادوں کی جگہ لینا شروع کردی تھی، یہ بات پسند آئی کہ انسان خدا کی صورت کے مطابق نہیں بنا بلکہ مشینوں کے نمونہ پر بنا ہے۔

صنعتی انقلاب نے حریت کا قدیم فلسفہ برباد کردیا۔ سب سے پہلے اس نے ذہن کو مشین چلانے کے عمل سے آشنا کیا اور اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اسباب کو میکانکی سمجھے۔ مزدور جو کارخانہ کی چاردیواری سے خوگر ہوگیا تھا، جب اس نے دیکھا کہ اس کے گرد دھڑکتی زندگی پہیوں اور آلوں پر گھومتی ہے تو اس نے زرعی زندگی کو فراموش کردیا، جس میں بیج زمین میں سے یکایک پھوٹ پڑتے تھے اور ہر کھاد کا خیر مقدم کرتے اور زرخیز فراوانی سے پیدا ہوتے تھے۔ وہ دنیا جو اگتے پودوں اور ضدی بچوں، شفیق ماؤں اور اولوالعزم باپوں کی دنیا تھی، جدید ذہن کے لیے کلوں کی دنیا بن گئی۔ ان سیاروں سے لے کر جو میکانکی طور پر سورج کے گرد چکر لگاتے تھے، اس خوردبینی زندگی تک، جو روشنی کی ایک کرن کی طرف انبوہ در انبوہ کھنچی آتی تھی، ہر چیز مشین تھی۔ سائنس کو یقین تھا کہ اسے آخرکار کائناتی تمثیل کا راز معلوم ہوگیا ہے۔ وہ اس مشینری پر حیران تھی، جس نے ہزاروں فریب نظر پیدا کیے تھے اور ہزاروں منظر بدلے تھے۔ اس نے احتراماً "یہ نتیجہ نکالا کہ صاحب جائیداد صحیح تمثیل نگار ہے اور اس کے تار تمثیل ہیں۔

لیکن صنعتی تہذیب نے شہر بنائے اور شہروں نے لوگوں کے ہجوم بنائے اور ہجوموں نے افراد کی انفرادیت کو ختم کردیا۔ ایک بار پھر جدید شہر میں وہی حالات پیدا ہوگئے جنھوں نے مشرق میں فرد کی شخصی اور انفرادی اہمیت ختم کردی تھی۔ اس طرح پھر تقدیر اور یاس کے فلسفہ کی طرح پڑ گئی۔ آبادی کے اس اژدحام میں فرد محض ایک عدد یا ایک آلہ کار بن گیا۔ ذہن ناپنے اور گننے کا ایک آلہ اور انسان اپنی بنائی ہوئی کلوں کا ایک جزو بن گیا۔ جمہوریت جس نے انسان کو آزاد کرنے کی ٹھانی تھی، خود ایک کل بن گئی، جس نے بے ذہن اجتماع کو رائے دہندگی کا حق عطا کیا۔ ان کلوں اور آلوں کے خلاف فرد کا احتجاج اسی قدر بے سود تھا جتنا کہ مشرق میں اجتماع کے خلاف فرد کی آواز۔ حتیٰ کہ "قائدین" بھی کلوں کے بے جان اور بے روح اجزا بن گئے، جو اپنے فریب خوردہ

پیرووں کی طرح، جنہیں انتخابات میں فقط گنا جاتا تھا، بے حس ہو کر رہ گئے۔

جب غلاموں نے اس مشین کے خلاف بغاوت کی تو اسی فلسفہ کی رہنمائی میں جو کلوں کے تسلط اور غلبہ کو تسلیم کرتا تھا، اشتراکیت نے بھی بے باکی سے جبریت اور میکانکی سائنس کی حمایت کی۔ اس نے اپنے پیرووں کو بخز اور ہیگل، سپنسر اور مارکس کی کتابیں پڑھائیں۔ اس فلسفے کے نزدیک نہ صرف دنیا بلکہ تاریخ بھی ایک مشین تھی، جس میں ہر انقلاب کا سبب روٹی کی قیمت تھی اور ایک اچھا ماہر اقتصادیات، جسے حال اور ماضی سے واقفیت ہو، مستقبل کے ہر پیچ و خم کے متعلق پیش گوئی کر سکتا تھا۔ انسان اب وراثت اور ماحول کا بندہ تھا۔ اس کے تمام اعمال موروثی اور مادی اسباب کا نتیجہ تھے، جو اس کے اختیار سے باہر تھے۔ وہ محض ایک حیران کن ذی حیات کل تھا۔ اس لیے جب وہ کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو حقیقت میں وہ خود بے قصور تھا۔ یہ سماج کی خرابی تھی۔ اگر وہ احمق تھا تو یہ اس کل کا قصور تھا جس نے اسے بناتے ہوئے کوئی پرزہ ٹھیک طرح نہیں جڑا۔ اس وجہ سے اسے رائے دہندگی یا صدر حکومت بننے کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا کو ضرورت ہے ایک بڑی اور بہتر مشین کی، ایک قوی مشین کی، جس میں ایک منظم مشین، کروڑوں کلوں کی نگہداشت کرتی ہو، جو میکانکی طور پر صدارتی بٹن دبا دے۔

کسی امارت پسند عہد میں قائدین شاید یہ اجازت دے دیتے کہ مظلوم عوام بس اسی خواب آور فلسفہ کو اپنا سکتے ہیں لیکن ایک جمہوری صدی میں عظیم ترین مفکر وطن پرستی کے احساس سے مجبور ہو کر عوام کے فلسفے میں شریک ہو گئے۔ قادر مطلق اور حاضر ناظر مشین پر شک کرنا رواج اور مصلحت کے عین خلاف تھا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم بھی کلیں ہیں اور ہمارے خیالات لاکھوں صدیوں پہلے ہم میں داخل کر دیئے گئے تھے کہ بروقت ان کا اظہار کر دیا جائے۔ ٹیسن نے نئے دیوتا کو تسلیم کیا اور اس کے اعزاز میں ایک فلسفہ تنقید تیار کیا۔ زولا نے یہ دکھانے کے لیے طویل المئے لکھے کہ آباؤ اجداد رکھنے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ طامس ہارڈی نے حالات کے مقابلہ میں انسان کی بے بسی دکھائی، اناطول فرانس نے لاثانی حسن کے ساتھ روح کی غلامی اور زندگی کی رائیگانی کا رونا رویا اور ڈانزیو کو ہر جگہ موت، فتح یاب اور خندہ زن نظر آئی۔

غالباً شخصیت کی یہ بے قدری اس خاموش اندوہ کی ایک وجہ ہے جو جدید ذہن کی درخشانی اور چالاکی کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ جس شخص نے "انسان کیا ہے" پڑھی ہے، اسے مارک ٹوین کی یاسیت عجیب معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ ناشاد مزاح نگار پکا جبریت پرست تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے مذاق ابتدائی سدیم کی گیسوں نے شروع ہی سے متعین کیے ہوئے تھے (یہ بے چاری گیس بھی کن کن گناہوں کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے) اور وہ ٹام سائیر کی بے تاب توانائی کو ایک کاربن مرکب

کے ابال سے منسوب کرتا تھا۔ فلسفہ کا ادھورا علم خطرناک ہوتا ہے اور ذہن کو یاسیت کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ دل کل (مارک ٹوین) جس نے "ہیکل بری فن" لکھا' اس کے تعلقات اپنی بیوی سے ناخوشگوار تھے۔ لیکن کون عورت اطمینان سے اپنے بستر اور اپنی خوراک میں ایک ایسی کل کو خوشی سے شریک کر سکتی ہے جو اسے محض کل پرزوں کا ایک آلہ سمجھتا ہو' جسے زمانہ کے آغاز میں جوڑا گیا تھا اور جو اب بیکار شور و غوغا کے ساتھ کام کر رہا ہو اور اس کا انجام خاموشی اور بے بسی ہو؟

یقیناً ہمارے بچپن کے ایمان کی موت نے ہمیں اداس کر دیا ہے۔ ہر بالغ روح کو یہ دوہرا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس سے بچپن کے الہیاتی مقاصد اور بعد میں جوانی کے سماجی مقاصد چھن جاتے ہیں۔ اور جوان دل اس ناقابل فہم کائنات کے بوجھ سے گراں تر ہو جاتا ہے لیکن ہماری سطحی زندہ دلی کی تہہ میں جو غمناک لے موجود ہے' وہ ہمارے افکار کی میکانکیت کا نتیجہ ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ ہم اس فلسفہ مذہب سے تو کنارا کر لیتے جو وجود کے فطری اسباب کی تضحیک کرتا ہے اور ایک ایسے فلسفہ کی آغوش میں جا گرتے جو زندگی کے تخلیقی پہلوؤں اور ذہن کی خود اختیاری کو نظرانداز کرتا ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ جہاں ہم اپنے اس طفلانہ خیال کو ترک کریں کہ ہم ساری دنیا کی تاریخ کا مرکز اور کمال ہیں' وہاں ہم اپنے آپ کو اپنے کارخانوں کی کلوں کے سامنے ذلیل کر دیں اور انہیں افلاطونی اعیان سمجھ کر قبول کر لیں' جن کے اعلیٰ نمونہ پر بے ربط ارتقا نے ہماری روحوں کی تربیت کی ہے۔ یہ لازمی نہیں تھا کہ ہم دنیا کی قوت' زندگی کے بے قرار پھیلاؤ یا فکر کی متصل تخلیق میں شرکت کرنے سے انکار کر دیں لیکن جنگ کے ایک ہی محاذ پر شکست کھا کر ہم ہتھیار پھینک کر میدان کو چھوڑ بھاگے۔

کیا یہ ضروری تھا کہ ہم اس طرح مکمل طور پر اعتراف شکست کر لیتے؟ کیا انسانی کردار کی وہی حیثیت ہے جو پہاڑوں کے پھٹنے' ہوا کے سیلاب یا سمندر کے مدوجزر کی ہے؟ کیا ماں کی ماتا' جوانوں کی جنسی ہوس یا محبت کی خاموشی دردمندی محض کیمیاوی عناصر اور طبیعیاتی طاقت کی میکانکی تقسیم ہے؟ کیا زندگی کی زرخیز فراوانی محض فریب نظر ہے؟ کیا کمال کی آرزو ایک اندھی تلاش ہے اور عزم کی حقیقت ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟

کیا انسان واقعی ایک مشین ہے؟

وقت تک تو برابر چلتی رہتی ہے، جب تک اس کا سپرنگ بھرا ہوا ہو۔ اس کے اوپر ایک ربڑ کا مربع ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ہم اس کھلونے کو کسی دیوار سے کس قدر دور ایک ہموار زمین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دیوار، زمین اور کھلونے کی نسبتیں ریاضی اور میکانکیت کے اصولوں کے مکمل طور پر مطابق ہیں۔ ان حالات میں کار، دیوار سے اسی راہ پر مڑے گی جس راہ سے گئی تھی۔ فکری نقطۂ نظر سے وہ بار بار یہی کچھ کرے گی۔ ہمیشہ دیوار کے مخالف سیدھی راہ پر یہاں تک کہ اس کی مصنوعی طاقت بالکل خرچ ہو جائے گی۔ یہ میکانکی عمل کی ایک مثال ہے۔

اب ایک مستطیل گلاس میں پانی بھرو۔ اس کے مرکز میں ایک شیشے کی دیوار کھڑی کر دو۔ اس طرح کہ اس کے دونوں طرف پانی کے آنے جانے کے لیے ایک باریک شگاف رہ جائے۔ گلاس کے ایک حصے میں غذا کا ایک ٹکڑا پھینک دو اور دوسرے حصے میں ایک نہایت حقیر حیوان مثلاً پیرامیسیم کو ڈال دو۔ اب اسے خوردبین کے ذریعہ دیکھو۔ وہ فورا غذا کی طرف جائے گا۔ وہ گلاس کی دیوار سے ٹکرا کر سیدھا واپس لوٹے گا۔ بظاہر یہ محض مشین ہے لیکن جلد ہی سیدھی راہ سے انحراف کرتا ہے اور زاویہ بنا کر چل نکلتا ہے۔ وہ دوبارہ گلاس سے جا ٹکراتا ہے، وہ لوٹتا ہے، گھومتا ہے اور پھر دیوار سے ٹکراتا ہے، لوٹتا ہے، راہ بدلتا ہے اور آخر کار شگاف میں سے نکل کر غذا تک جا پہنچتا ہے۔ کسی مشین کی ساخت یا میکانکس کے اصولوں میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس حقیر ترین حیوان میں اس عاقلانہ جستجو اور مقصدیت کے وجود کی توجیہ کر سکے۔

ایک اور حیوان سٹنٹر کے کردار پر غور کرو۔ ایک نازک آبی جانور جس کی شکل ترم کی مانند ہوتی ہے اور جو دلدل میں پودوں کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ اس کے منہ پر پانی انڈیلو تو یہ فورا سکڑ کر اپنے نرم خول میں گھس جائے گا۔ ایک منٹ کے بعد وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا۔ اس پر پھر پانی انڈیلو کیڑا اس پانی سے قطعی بے نیاز رہے گا۔ جس چیز سے وہ چمٹا ہے اسے چھیڑو، وہ فورا اپنی نلکی میں سکڑ جائے گا۔ کچھ دیر بعد پھر چھیڑو، لیکن اب سٹنٹر کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہوگا۔ اس فوری مطابقت کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ تکان ہے؟ رد عمل کی شدت کی مخستگی ہے؟ نہیں۔ کیونکہ جہاں سٹنٹر پانی کے چھینٹے سے بے نیاز رہتا ہے، وہ مضر چیزوں کی موجودگی میں پر زور طریقہ سے سکڑتا ہے لیکن بے ضرر چیزوں کی موجودگی میں یہ حیوان خاموشی اور بے پروائی سے اپنے آپ کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ ذرا میکانکیت پرست، حیوانی دنیا کی اس حقیر مخلوق کے مخصوص اور حیاتیاتی اعمال کی توجیہ کر کے دیکھے، لیکن ہمیں وہ ایک مرد مومن کی طرح یقین دلائے گا کہ کسی نہ کسی دن ہم ان چیزوں کی میکانکی توجیہ بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اناطول فرانس نے کیا خوب کہا تھا کہ سائنس دان شک کرنے کا فن بھول گئے۔

ہاضمہ کے عمل پر غور کرو۔ چند حساس پودے خوراک کے ان ذرات کو، جو ان کی سطحوں پر ہوتے ہیں، پکڑ کر ہضم کر لیتے ہیں۔ لیکن جو چیزیں کہ ان کی خوراک نہیں بن سکتیں، انہیں نہیں کھاتے۔ بدبو عموماً اس چیز کو ٹھکرا دیتا ہے جو اس کی غذا نہیں ہے۔ ایک بطخ نما حیوان اپنی پھولی ہوئی گردن محض موزوں شکار دیکھ کر ہی مارتا ہے۔ ہماری انتڑیاں اپنے عمل میں انتخاب سے کام لیتی ہیں۔ خلیوں کا ہر گروہ چند خوردنی اشیاء پر ہی عمل کرتا ہے۔ انسانی جسم کا ہر خلیہ خون میں سے وہی کچھ لیتا ہے جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ باقی کو وہ نظرانداز کر دیتا ہے اور خون میں بچی کھچی غذا پھینک دیتا ہے۔ یہ منتخب غذا کو عناصر میں توڑ پھوڑ دیتا ہے اور انہیں پھر مرکبات میں جوڑتا ہے جن کی اسے توانائی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سانس لیتا ہے، کھاتا ہے، خارج کرتا ہے، بڑھتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے اور مرجاتا ہے، جیسے اسے انفرادیت ودیعت کی گئی ہو۔ یہ خلئے جو کام ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں کر گزرتے ہیں، ان کا راز ترقی یافتہ سائنس بھی نہیں پا سکتی۔ وہ عالم جو اپنی ذہانت سے ان مسائل کو حل کر دے، جو حقیر ترین مخلوق کے خلئے ہر لمحے حل کرتے ہیں، دوسرے انسانوں کی نظر میں دیوتا بن جائے گا۔

اب ذرا نشوونما کے مسئلے پر غور کرو۔ ایک مشین کیونکر پھل پھول سکتی ہے؟ وہ پھلنا کیوں چاہے؟ کیا کبھی آپ نے ایسی کل دیکھی ہے جو اپنے اعمال میں زندگی کی وسعتوں کے مماثل ہو؟ ذرا باغ میں سوسن کے پھولوں پر غور کرو۔ وہ کون سی ساحرانہ قوت ہے جو انہیں زمین کے قید خانہ سے نکال کر آہستہ آہستہ سورج کی طرف ابھارتی ہے؟ ذرا ہوا میں ابابیلوں پر غور کرو۔ ان میں نہ کوئی کل ہے نہ پرزے، نہ پہیے۔ لیکن ان کی شادماں زندگی پر انسان بھی رشک کر سکتا ہے۔

ایک بچہ کی مثال لو۔ وہ غذا کے لیے کیوں بھوکا پیاسا رہتا ہے؟ اور اپنی نرم انگلیوں سے دنیا پر تسلط جمانے کی کیونکر کوشش کرتا ہے؟ اسے بڑھتے ہوئے دیکھو۔ اسے محض غذا کی ضرورت ہے جو اس کے رخساروں کو بھرے، اس کے بالوں میں فراوانی پیدا کر دے اور اس کی آنکھوں کو متبسم کر دے۔ اسے پہلی مرتبہ سہمے ہوئے مگر جرات سے زمین پر سیدھا کھڑا ہوتے دیکھو۔ وہ کیوں کھڑا رہنے اور چلنے کے لیے بیتاب ہے؟ وہ ایک مستقل تجسس اور خطرناک اور ناقابل تسکین آرزوؤں کی وجہ سے کیوں لرزہ براندام ہے؟ وہ چھوتا ہے، چکھتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے۔ چیزوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے، تجربہ کرتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے، تدبر کرتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، حتی کہ وہ زمین کا وزن کرنے لگتا ہے اور سیاروں کی پیمائش شروع کر دیتا ہے۔ عنفوان شباب کس قسم کا انقلاب ہے، جو لڑکے کو توازن اور وسعت دے کر مرد بنا دیتا ہے اور لڑکی کو کسی معجزۂ فن سے زیادہ حسین عورت بنا دیتا ہے۔

ذرا احیاء کی حقیقت پر غور کرو۔ کسی تازہ مچھلی کی ایک کرن کاٹ دو۔ وہ کرن دوبارہ پیدا ہو جائے گی۔ سب کرنوں کو کاٹ دو۔ مرکز انہیں دوبارہ پیدا کرے گا۔ مرکز کو کاٹ دو۔ کرنیں خود ایک نیا مرکز تخلیق کرلیں گی۔ ایک بگڑی ہوئی کل اپنے حصوں کی خود مرمت نہیں کرتی۔ وہ بے جان کھڑی رہتی ہے اور کسی زندہ ہاتھ کے لمس کا انتظار کرتی ہے کہ وہ اس کے حصوں کو دوبارہ جوڑے۔ لیکن یہ واقعات جنہیں برگساں نے بیان کیا ہے، اہم ترین نہیں ہیں۔ ایک معمولی سا زخم خود بخود مندمل ہو جاتا ہے یقیناً حیرت انگیز ہے۔ کس کمال سے نئے خلئے مجروح بدن پر پھیل جاتے ہیں جیسے کوئی ذہانت اس کارخیر کی ہدایت کر رہی ہے۔ ہم عمل حیات کے ان مظاہر کی میکانکی اور کیمیاوی امداد کرتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان مظاہر کی قدرت کو صحت بخشنے کی طاقت سے وہی نسبت ہے جو پتھر یا مٹی کو فنکار کے ہاتھوں سے ہم جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح جس کی میکانکیت توجیہ نہیں کر سکتی، زندگی کی قوت اور ابھار، ہزاروں جراحتوں اور ہزاروں جنگوں میں ہماری وسعت گیری کرے گی، حتی کہ یہ لچکیلی توانائی ختم ہو جائے اور اپنے لیے کوئی تازہ ہیئت تلاش کرے۔

ذرا شعور پر غور کرو۔ وہ کون ایسی ناقابل فہم صفت ہے جو ہمیں اس بات کی آگاہی دیتی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں یا کیا کرنا چاہتے ہیں یا ہم نے کیا کیا ہے؟ یا ہم اپنے خیالات اور آرزوؤں کے درمیان تصادم دیکھتے ہیں اور دوسرے خیالات اور آرزوؤں کے ذریعے ایک پر تنقید کرتے ہیں؟ یا ان ممکن اعمال اور حافظہ کے ذریعہ ممکن نتائج کا تصور کرتے ہیں اور پھر فکر اور آرزو کی تمام طاقتوں کے ساتھ ایک تحلیل شدہ حالت کو ایک تخلیقی عمل میں تبدیل کرتے ہیں۔ کوہلر کے تجربات نے جو میکانکی عمل کے تصور کے خلاف مکمل وجدان کی شہادت دیتے ہیں، ذہنی اعمال کی میکانکی توجیہ کی تردید کر دی ہے۔ ہم غیر شعوری طور پر کتنے بددیانت ہو گئے ہیں کہ آج اگر ہم زمانے کے فیشن کے مطابق چلنا چاہیں تو ہمیں ایک میکانکی فلسفہ کو قائم رکھنے کے لیے شعور کے وجود کو مسترد کرنا پڑے گا۔

ہم ابتدا ان چیزوں سے کرتے ہیں جنہیں ہم محض خارجی اور سطحی طور پر جانتے ہیں (جس طرح کی جدید طبیعیات میں مادہ سے ابتدا کرتے ہیں جو کہ قوت کی سطحی شکل ہے) اور قدرتی طور پر ہم اپنے آپ کو ان سطحی مشینوں سے اس داخلی شعور تک پہنچتے ہوئے دیکھتے ہیں جو تمام علم کا فوری موضوع ہے۔ لیکن نظریہ کردار کا پیرو ایک بین حقیقت کو ایک مشکوک نظریہ پر قربان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا۔ وہ دلاوری سے اعلان کرتا ہے کہ یہ شعور، میکانکیت جس کی توجیہ نہیں کر سکتی، ایک فاضل چیز ہے۔ اس کی دراصل کوئی حقیقت نہیں۔ ایک اچھے فلسفی، مفکر مذہب کی طرح

وہ اپنے بنیادی اصول، طبیعیات سے اخذ کرتا ہے اور اس بات کا دھیان رکھتا ہے کہ کوئی ایسے واقعات تسلیم نہ کیے جائیں جو اس کے کلیات کے خلاف ہو۔ نظریہ کردار کے پیرو کی نفسیات مستند ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ کمزور ہے مگر وہ اپنی کبریائی سادگی میں یہ کہتا ہے کہ فلسفہ بے سود چیز ہے اور وہ ایک نسل کے اندر ختم ہو جائے گا۔ جدید فکر کی آوارہ سطحیت اس امر سے ظاہر ہے کہ یہ دینیات معکوس اسی طرح لوگوں میں مقبول ہو رہی ہے جس طرح مسیحی سائنس۔ ہم کس مشکل منزل پر آ پہنچے ہیں کہ ہم میں سے نصف لوگ تو مادہ کی حقیقت سے منکر اور نصف شعور کی حقیقت سے۔ ہم اس اداس تبسم کا تصور کر سکتے ہیں جس کے ساتھ ایک گوئٹے یا ایک والٹیئر ہمارے عہد کے علمی انتشار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

آخر میں آئیے ہم تناسل کے مسئلہ پر غور کریں۔ ایک چھوٹی سی فرج، جسے ہم دیکھ نہیں سکتے اور ایک بیتاب قطرۂ منی ان اقالیم میں حرکت کر رہے ہیں، جن پر ابھی ہم نے تسلط نہیں پایا۔ ان میں سے ہر خلیہ لاانتہاہی طور پر موروثی اوصاف سے آراستہ ہے جو ہزاروں نسلوں کی یادیں اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ ان میں سے ہر ایک جسم اور ذہن کی لاثانی صفات جبلتوں، رجحانات اور میلانات، اشتہا، شدت اور محبت کا حامل ہے، غالباً ان کی ساخت میں مردانا کا جذبہ اور استقامت موجود ہے۔ قطرۂ منی اور انڈا مل گئے۔ یکایک یہ امکانات حقائق بن گئے اور ایک نئی زندگی کا معجزہ شروع ہو گیا۔ کسی داخلی ضرورت کے ماتحت جس کی خون سے آبیاری کی گئی ہے، زرخیز خلیہ اپنے آپ کو دو خلیوں، چار خلیوں، آٹھ خلیوں اور کروڑوں خلیوں میں تقسیم کرتا ہے، جوں جوں تعداد میں بڑھتے ہیں، ان کی وحدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک دل بن کر دھڑکنا شروع ہوتا ہے، ایک دماغ بن کر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں، ماں کے رحم میں حرکت کرنے لگتے ہیں اور پھر یہ نیا معجزہ دنیا میں آتا ہے۔ ہوا، خنکی، آواز اور روشنی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھیں، ہونٹ اور کان کھل جاتے ہیں اور اس کے تمام اعصاب احساس سے جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ زندگی نے پھر موت کو شکست دی ہے اور نئی ہیئت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایک بار پھر شاداں، قوی اور جوان۔

کیا یہ میکانکی عمل ہے؟ ژاک لوئب نے یہ دیکھا کہ وہ ایک مچھلی کے انڈے کو حل کیے ہوئے نمک اور پن کی چبھن سے باردار کر سکتا ہے۔ اس نے فوراً یہ نتیجہ نکالا کہ اس نے تناسل کی میکانکی نوعیت کو ثابت کر دیا ہے۔ درحقیقت اس نے محض یہ دکھایا تھا کہ بعض حالتوں میں مادہ، نر کی مدد کے بغیر بچے پیدا کر سکتی ہے۔ اس نے مصنوعی تولید کے اصول کو پھر دریافت کر لیا تھا جسے ماہرین حیاتیات مدتوں سے جانتے تھے۔ اس حقیقت میں کہ مادہ پن کی طرح میکانکی نہیں ہے یا نمک کی طرح سادہ نہیں ہے، اب غالباً شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ صرف بغیر خارجی امداد کے تولید اس

تولید سے کسی قدر زیادہ حیرت انگیز ہے جو نر اور مادہ کے وصول کے باعث رونما ہوتی ہے۔ اس میں ایک خطرہ بھی مضمر ہے کہ صنف نازک کی حریت کہیں ناخوشگوار حد تک نہ پہنچ جائے۔

لویب کے ان تجربات سے کہیں زیادہ نظر افروز' ہانس ڈریش کی دریافتیں ہیں۔ ڈریش کی تربیت جینا میں ارنسٹ ہیگل کے دارالعمل میں ہوئی تھی۔ اس کے پاس میکانکیت پرستی کی تمام ترغیبات موجود تھیں لیکن اس نے ایسے ایسے واقعات کا مشاہدہ کیا جو اس کے استاد کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے تھے۔ اس نے ایک زرخیز بیضہ کو دو نیم کر دیا۔ پھر بھی اس کی نشوونما ٹھیک ہوئی۔ اس نے دوسری تقسیم کے بعد خلیوں کے نظام کو بے ربط طریقہ پر بکھیر دیا۔ پھر بھی اس کی نشوونما صحیح طریقہ پر ہوئی۔ اس نے تیسری مرتبہ بیضہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے خلیوں کو منتشر کر دیا۔ پھر بھی بیضہ نے اسی طرح نشوونما پائی جیسے کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب ذرا دو مشینوں کے وصال کا تصور کرو تاکہ وہ ایک تیسری مشین پیدا کریں۔ تصور کرو کہ ہر مشین کا ہر پرزہ تناسل کی طاقت اور عادت سے مزین ہے اور مستقل طور پر اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ پھر تصور کرو کہ والدین کے کچھ حصے مل کر ایک نئی مشین بنا لیتے ہیں اور یہ کہ یہ ڈھانچہ خود اختیاری سے دو دو' چار چار' آٹھ آٹھ میں بٹ کر ایک مکمل مشین پیدا کر لیتا ہے۔ جتنی زیادہ تقسیم ہوتی ہے' اتنی ہی اس میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ تصور کرو کہ کوئی ڈریش اس مشین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس کے حصوں کو منتشر کر دیتا ہے اور یہ تصور کرو کہ مشین پھر بھی بدستور کامیابی اور صحت سے اپنا کام کیے جاتی ہے' جیسے کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کیا سائنس اور فلسفہ میں اس سے زیادہ مضحکہ خیزبات تصور کی جا سکتی ہے؟ کیا کسی قدیم یا جدید مذہب کا کوئی معجزہ اس عظیم الشان واہمہ کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

۳۔ جبریت

لیکن میکانکیت پرست ہمیں یہ بتائے گا کہ ہم اس سے ناانصافی برت رہے ہیں کہ ہم نے اس کی "اصلاح" کو غلط سمجھا ہے اور اس کے اس نظریہ کی تردید کی ہے جس کی اس نے کبھی حمایت نہیں کی۔ ہم اس کی مدافعت کا تصور کر سکتے ہیں:

"ہمارا مقصد انسانی کردار کو مشین نما بنانا نہیں بلکہ ذہنی اور جسمانی دنیا میں اسباب و نتائج کے کڑے سلسلہ کی تائید کرنا ہے۔ انسان قدرت کا ایک حصہ ہے اور غالباً قدرت کے قوانین اس پر عاید ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ جائے' اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس شکست کا مطلب یہ ہو گا کہ قوت تباہ یا تخلیق کی جا سکتی ہے۔ لیکن قوت کا تسلسل اور اس کی مقدار کی بقا ایک بین

حقیقت ہے۔ کسی انسان کو غذا دینا بند کر دو تو اس کی قوت عمل فوراً ختم ہو جائے گی۔ اس کو صحیح غذا دو تو وہ نیک اور وطن پرست بنے گا۔ اسے غلط خوراک دو تو تم اسے بیمار، مجرم، یاس پسند، احمق اور حریت عزم کا علمبردار بنا دو گے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ایک انسان کے اعمال دیکھو۔ یہ یقیناً اس غذا کی طاقت کے مطابق ہوں گے جو اس نے حاصل کی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کی ذہنی طاقت اس کی غذا کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے لیکن یہ طاقت آخر کار اس نباتاتی عمل سے پیدا ہوتی ہے جو زمین اور ہوا کے بے جان مادوں کی رہین منت ہے۔ غیر جاندار دنیا میں علیت کے اصول کو مان لینا اسے انسانی زندگی اور فکر کے باریک ترین پہلوؤں کے لیے تسلیم کر لینے کے برابر ہے۔

”پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا زیادہ ہم انسانی کردار کو جانتے ہیں، اتنی ہی کامیابی سے ہم اس کے متعلق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ غالباً ہم اگر ان تمام حالات سے واقف ہوں، جو ہمارے دوستوں کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ہم مکمل صحت کے ساتھ اس کے کردار کے بارے میں اسی طرح پیش گوئی کر سکتے ہیں جس طرح ہم چاند گرہن اور اس کے ادوار کے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن اگر جبریت غلط ہوتی، اگر انسانی اعمال قوانین کے تابع نہ ہوتے تو علم کے اضافہ سے انسانی کردار کے متعلق پیش گوئی کرنا ناممکن ہوتا!

”انسانی کردار، انسان کی شخصیت اور اس ماحول کا نتیجہ ہے جو عمل کے لیے اسے میسر آتا ہے۔ اس کی شخصیت، اس کی وراثت اور اس کے ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہم وراثت کی زنجیر کا آخری سرا ہیں۔ ہم کسی چیز کی ابتدا نہیں کرتے، ہم کسی بات کا فیصلہ نہیں کرتے، ہم ان خارجی طاقتوں سے، جن پر ہمارا کوئی اثر نہیں، مجبور اور متاثر ہوتے ہیں۔ انتخاب فریب نظر ہے۔ یہ محض جبر کی طاقتوں کا امتزاج ہے۔ انسان اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ارادوں اور اپنی آرزوؤں کا شعور رکھتے ہیں۔ لیکن ان اسباب سے بے خبر ہوتے ہیں جن سے ان آرزوؤں اور ارادوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ در حقیقت ہمارا کردار ان طاقتوں سے بنا ہوتا ہے جو ہمیں معرض وجود میں لاتی ہیں اور ہم پر حاوی ہیں، جس طرح ایک پتھر زمان و مکان میں اپنی کمیت، رفتار اور رخ کے مطابق گرتا ہے۔ ان معنوں میں انسان ایک مشین ہے“۔

جبر پرست اپنے فلسفہ کے نتائج پر اگر ذرا دیانت سے غور کرے، اگر ہر عمل لازمی طور پر دراصل مادی حالات کا اثر ہے تو ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ جبریت اور میکانکیت حقیقت میں ایک ہی چیز ہے اور یہ کہ مائیکل ا-نجلو کی پارسائی اور شیکسپیئر کا تخلیقی جذبہ، سقراط کی ناک اور کلوپیٹرا کا تبسم --- ابتدائی سدیم کی میکانکی اور کیمیادی ساخت کا اثر ہیں۔ یہ ایک قابل اعتراض مفروضہ ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ٹین، رینان اور اناطول فرانس جیسے متشککین نے کس طرح جبریت کو ہضم

کرلیا۔ لیکن "ایمان کے اس نئے عہد" میں شک کرنے والے بھی مومن ہیں۔ وہ بڑے تفاخر سے ایک نظریہ حیات کو سائنٹیفک طریقہ پر مسترد کرتے ہیں اور اس کے فوراً بعد کسی اور عقیدہ پر "ایمان بالغیب" لے آتے ہیں۔ "میکانکیت پرست" کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے بے قاعدہ شک کی تہہ میں کس قدر بے بنیاد مفروضے ہیں۔

مورخین اسے معجزہ تصور کریں گے کہ اس عظیم سدیم نے کبھی یقین کو ختم نہیں کیا۔ وہ کون سا ایسا جادو تھا جس کی وجہ سے ایک نسل تک ہم نے طبیعیات کے ہنگامی تصورات کو اپنی زندگی کے قوانین اور علائم بنائے رکھا؟ ہم میں سے کون درحقیقت یہ مانتا تھا کہ میں ایک مشین ہوں اور دیانت دارانہ اس مضحکہ خیز مفروضہ پر عمل کرتا تھا؟ کیا ہم خفیہ طور پر یہ جانتے تھے کہ حواس اور ذہن فعال بھی ہیں اور منفعل بھی اور ہم قوتوں کے اس بہاؤ میں خود اختیاری کے چھوٹے چھوٹے مرکز ہیں؟ ہم زندگی کے تنوع اور زرخیزی، اس کے لامتناہی تجربات اور اشکال، اس کی غیر محدود زیرکی اور اس کی مستقل تسخیر مادہ کو کس طرح دیانت داری سے جبریت اور میکانکیت کے اصولوں کے مطابق ڈھال سکتے ہیں؟

یہ جبریت پیدا ہوئی لاک کے اس تصور سے کہ ذہن ایک صاف سلیٹ ہے، جس پر احساسات اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک موم ہے، جسے خارجی اشیاء اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتی رہتی ہیں۔ لیکن آج ہمیں ایک نئی نفسیات کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ لیکن اپنی روح کی تہہ میں ہم آرزو کو پاتے ہیں۔ وہ آرزو جو "انسان کی اصلیت ہے"۔ ہم اپنے احساسات، مشاہدات حافظہ اور فکر پر آرزو کا انتخابی اور ترتیبی عمل دیکھتے ہیں۔ زندگی نے اپنی عظیم اشتہا کو جبلتوں اور صلاحیتوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ جبلتیں اور صلاحیتیں ہمارے اعمال، ہمارے رویے اور ہمارے مشاہدے کے انداز کی ترتیب و تنظیم کرتی ہیں۔ ہم ان گنت احساسات سے بے خبر رہتے ہیں، کیونکہ ہم ان احساسات کا انتخاب کرتے ہیں، جو ہماری آرزوؤں کے مطابق ہوں۔ ہم وہ آوازیں سنتے ہیں جن سے ہمیں دلچسپی ہو اور ہزاروں آوازوں کو سامعہ انداز کردیتے ہیں۔ ہم بظاہر ایک غیر دلچسپ چیز کو دیکھتے ہیں لیکن فوراً ہی اس پر اپنا کوئی مقصد چسپاں کردیتے ہیں۔ ہمارے مقاصد ہی ہمارے احساسات کو مشاہدے اور فکر میں تبدیل کرتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ چند عددوں کو جمع کرو۔ فوراً ہمارا ذہن ایک خاص رویہ بنالیتا ہے اور اسی رویہ کی وجہ سے ہم سوال سنتے ہی جواب دے ڈالتے ہیں۔ ۷ اور ۷ سن کر ہم فوراً جواب دیتے ہیں ۱۴، لیکن اگر ہمیں ضرب دینے کو کہا جاتا تو ہم بعینہ اسی احساس (یعنی ۷ اور ۷) کا جواب ۴۹ دیتے۔ حالیت اعادہ یا شدت، خیالات کے بندھنوں کی توجیہ نہیں کرسکتے، فقط مقصد ہی ان کی وضاحت کر سکتا ہے۔ ہم اپنے احساسات کے بے بس

شکار نہیں ہیں۔ ہم انتخاب کرتے ہیں۔ رہی مخترعانہ قوت، جس نے ہمارے کارخانوں میں کلیں تیار کی ہیں، اس نظریہ کی عدم صحت کا بہترین ثبوت ہیں کہ مخترع کا ذہن اس کے دماغ کی ایک منفعل تخلیق ہے۔

اس تخلیقی ارتقا میں ہمارا ذہن وہ نادر کام کرتا ہے، جنہیں میکانکی کہنا آسان نہیں۔ ہم کل کو اجزا میں تحلیل کرتے ہیں اور اجزا کو نئے مرکبات میں دوبارہ متحد کرتے ہیں۔ ہم مشاہدے میں خیالات کو الگ الگ اور استدلال میں انہیں دوبارہ جوڑتے ہیں۔ ہم مقاصد پر غور کرتے ہیں، اقدار کی پیمائش کرتے ہیں، نتائج کا تصور کرتے ہیں اور اپنی دلی آرزوؤں کی تسکین کے لیے نئے نئے ذرائع وضع کرتے ہیں۔ ہم پچھلے اعمال کے نتائج کو یاد کرتے ہیں۔ ان حالات میں ان کے مماثل کا تصور کرتے ہیں اور اپنے مقاصد کی روشنی میں ان کا محاکمہ کرتے ہیں۔ علم مختلف طریقہ ہائے عمل کے نتائج کی یادگار ہے۔ جتنا زیادہ ہمارا علم ہوگا، اتنے زیادہ ہم دور اندیش ہوں گے۔ جتنے زیادہ ہم دور اندیش ہوں گے، اتنی زیادہ ہماری آزادی ہوگی۔ شعور، متخیلہ اعمال کے ریہرسل کے لیے ایک سٹیج ہے۔ ہم حافظہ، تخیل اور عقل کے ذریعہ غیردانشمندانہ اعمال کو کم کردیتے ہیں اور اپنے آخری نصب العین کا کسی قدر کامیابی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ آزادی عقل کی طرح ایک "دیر آید" عمل ہے، جو ایک مکمل عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جس طرح عمل کو ملتوی کرنے سے ہم پیچیدہ حالات میں سب متعلقہ محرکات کو ابھارتے ہیں اور پھر تخیل کے ذریعہ ہم ان نامکمل محرکات کو ایک مکمل عمل میں جوڑ دیتے ہیں جو ہماری مکمل اور بالغ شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔

میکانکیت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جو کچھ ہم بنیادی اور فوری طور پر سمجھتے ہیں، جو کچھ ہم اپنی روزمرہ زندگی کے حقیقی فلسفہ میں تسلیم کرتے ہیں، یہ ہے کہ ہر ذی حیات اپنی ساخت کی لچک کے مطابق، رہبرانہ قوت کا اور کسی حد تک خود اختیاری عمل کا ایک مرکز ہے۔ زندگی تخلیق ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ عدم میں سے نئی قوت پیدا کرتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی توانائی خارجی طاقتوں میں شامل کرتی ہے۔ عزم آزاد ہے، محض اس حد تک کہ زندگی جس کی وہ ایک ہیئت ہے، فعال طریقہ پر دنیا کی ازسرنو تشکیل کرتی ہے۔ دنیا کی تشکیل کے لیے زندگی اختراع سے کام لیتی ہے اور ریاضی اور میکانکیت کی اس لیے تعمیر کرتی ہے کہ وہ خارجی اشیاء سے دوچار ہوں۔ وہ اپنے ذہن اور اپنے عزم کی مخلوقات کا مضحکہ اڑا کر انہیں نظرانداز کر دیتی ہے، جو زندگی کی انہیں تصورات کے ذریعہ گستاخانہ توجیہ کرتی ہے جو زندگی نے خود پیدا کیے ہیں۔

کیا آزادی کا یہ تصور اہل جبریت کے حملوں کی تاب لا سکتا ہے؟ اگر وہ ہوشیار ہیں تو وہ ہمیں بتائیں گے کہ "عزم" محض اسم مجرد ہے اور وہ دانستہ یہ حقیقت فراموش کر دیں گے کہ

"طاقت" بھی ایک اسم مجرد ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ "عزم" سے ہماری مراد کوئی مجرد حقیقت نہیں، بلکہ یہ زندگی کو ابھارنے اور پھیلانے والا کردار ہے۔ زندگی کیا ہے، یہ ہم بیان کر آئے ہیں لیکن ہمیں ایک حقیقت کو افسانہ تو نہیں بنانا چاہیے۔

یا اہل جبر قوت کی بقا کا ذکر کریں گے۔ ذی حیات اس قوت سے زیادہ دے نہیں سکتا، جو اسے حاصل ہوئی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی خود ایک قوت ہے جو اپنے مقابل طاقتوں کو فکر و تدبر کے ذریعہ بدل دیتی ہے تاکہ ماحول کی تسخیر کر سکے اور کبھی کبھی وہ اس ارادے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ جو نتیجہ عمل سے پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ اس کی مقدار احساس عمل جتنی ہو۔ لیکن وہ صفت میں کتنا مختلف ہے؟ زندگی کی یہ تبدیل کرنے والی طاقت اعلیٰ قسم کی قوت ہے۔ ہمیں اس کا براہ راست علم ہے اور یہی ہماری آزادی کا سرچشمہ اور پیغام ہے۔

اہل جبر یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی فریب نظر ہے کیونکہ طاقتور آرزو ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ وہ آرزو جو اتنی طاقتور ہے کہ کامیاب ہو سکے، یقیناً ان آرزوؤں سے زیادہ طاقتور ہے جو ناکام رہتی ہیں۔ لیکن وہ کونسی اور بات تھی جس نے اسے کامیاب بنایا، سوائے عزم تمنا اور روح کی اصلیت کے ساتھ مطابقت کے؟ "پھر بھی کوئی عمل بے سبب نہیں ہو سکتا"۔ یقیناً۔ لیکن عزم، سبب کا ایک حصہ ہے۔ عمل کے اسباب میں زندگی کی آگے بڑھنے والی قوت بھی شامل ہے۔ ذہن کی ہر کیفیت قدرتی طور پر تمام گزشتہ حقیقت کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن اس کیفیت اور اس کیفیت میں زندگی اور عزم کی انقلاب آفریں قوت بھی موجود ہے۔ "ایک سبب کا ہمیشہ ایک ہی اثر ہوتا ہے"۔ لیکن سبب کبھی ایک سا نہیں ہوتا۔ کیونکہ شخصیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور حالات کبھی یکساں نہیں رہتے۔ "اگر میں تمہارے تمام ماضی اور حال سے واقف ہوتا تو بغیر کسی غلطی کے میں تمہارے اعمال کے متعلق پیش گوئی کر سکتا"۔ غالباً اگر تم میرے اندر قوت حیات سے آشنا ہوتے، غالباً اگر تم میکانکی اصولوں کو تج کے اپنے آپ سے یہ سوال کرتے کہ تم یعنی زندگی ان حالات میں کیا کرتے؟ پھر بھی تم غالباً کامیابی سے پیش گوئی نہ کر سکتے۔ غالباً زندگی میں خود اختیاری کا ایک عنصر ہے جو ہمارے تصورات اور ہمارے قوانین کے مطابق نہیں ہے جو ارتقا اور انسانی اعمال کو ایک خاص قسم کا جوش اور کردار بخشتا ہے۔ آئیے ہم دعا کریں کہ ہمیں ایک مکمل طور پر مجبور دنیا میں نہ رہنا پڑے۔ کیا ایسی دنیا کا نقشہ زندگی کے تناقض معلوم نہیں ہوتا؟ جیسا کہ برگساں نے کہا تھا: زندگی میں میکانکیت ایک ہنگامی مذاق ہے۔

"لیکن ہر عمل وراثت اور ماحول کا نتیجہ ہے" یہ بات پوری طرح صحیح نہیں۔ اہل جبر انکسار سے اس محاسبہ میں اپنے وجود کو شمار نہیں کرتے۔ وہ پھر یہی فرض کرتے ہیں کہ زندگی خارجی طاقتوں

کا ایک منفعل نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کی قوت اور زندہ دلی کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ہم محض اپنے آباؤ اجداد اور اپنے حالات نہیں ہیں، ہم انقلابی طاقت کے سرچشمے ہیں۔ ہم بامقصد قوت اور تخلیقی انتخاب اور فکر کے سمندر کے قطرے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی اس کے اجزا تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد در حقیقت ہم میں زندہ ہیں۔ لیکن وہ عزم اور زندگی جو کبھی ان میں تھی، اب ہم میں سے ہر ایک میں ہے جو میری ”خود اختیاری خودی“ کی تخلیق کرتی ہے۔ حریت، قدیم تصور آزادی سے زیادہ فراخ بھی ہے اور زیادہ تنگ بھی۔ وہ یقیناً موروثی اور فضائی حالات سے محدود ہے۔ لیکن وہ زندگی کی طرح عمیق اور شعور کی طرح وسیع ہے۔ وہ تجربہ کے تنوع، نقطۂ نظر کی وسعت اور فکر کی صفائی کے ساتھ ساتھ طاقت اور احاطہ میں بڑھتی ہے۔ عزم اسی حد تک آزاد ہے جہاں تک کہ زندگی تخلیق کر سکتی ہے۔ عزم اسی حد تک آزاد ہے، جس حد تک وہ انتخاب اور عمل کا ایک سبب بن جاتا ہے۔ اس آزادی میں قدرتی قانون کی کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ زندگی خود ایک قدرتی عنصر و عمل ہے۔ کائنات کی اقلیم سے باہر کوئی طاقت نہیں۔ قدرت وہ زندہ طاقت ہے جس سے تمام چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ غالباً اس ساری دنیا میں یہ خود اختیاری اور یہی جذبہ نمو موجود ہے جو ہم زندگی میں دیکھتے ہیں ورنہ زندگی کو یہ صفات کیونکر میسر آ سکتی تھیں؟

یہ کہنا کہ ہماری شخصیتیں ہمارے اعمال کی ترتیب کرتی ہیں، درست ہے لیکن ہم ہی اپنی شخصیتیں ہیں، ہم انتخاب کرتے ہیں۔ ہکسلے کے ہم زبان ہو کر یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہم اپنی آرزوؤں پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن اپنی آرزو کا انتخاب کرنے میں آزاد نہیں ہیں۔ لیکن یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہم ہی اپنی آرزوئیں ہیں اور آرزو زندگی ہے۔ اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے ہم اپنی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ خارجی اور موروثی طاقتیں ہمیں مسخر کرتی ہیں۔ حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زندگی خود ایک قوت ہے، جس کا اپنا طریق کار ہے جو محدود اور مجبور ہے۔ لیکن حیرت انگیز حد تک وہ ادنیٰ جانداروں سے مرد دانا کی تنہا رفعتوں تک ابھرتی ہے اور دنیا پر اپنی اشکال اور اپنی فتوحات سے چھا جاتی ہے۔ اگر زندگی ایک افعال قوت نہ ہوتی تو ارتقا ممکن نہیں تھا۔

ہماری رہبرانہ قوت کا احساس ہمیں اپنی ذمہ داری اور اپنی شخصیت سے آگاہی بخشتا ہے اور ہمارے فکر کو ہماری زندگی سے مربوط کرتا ہے کیونکہ جب ہم جبریت کا ذکر کر رہے تھے، ہمیں معلوم تھا کہ یہ فلسفہ غلط ہے۔ ہم نے کبھی اپنے آپ کو یا اپنے بچوں کو مشین نہیں سمجھا۔ آزادی کے فلسفے بار بار پیدا ہوتے ہیں، اس لیے کہ مشاہدے کو فارمولوں اور احساس کو استدلال کے ذریعہ کچلا نہیں جا سکتا۔ در حقیقت میکانکیت ایک بزدلانہ فلسفہ ہے، کیونکہ وہ انسان کے گناہ کو وراثت

اور سماج سے منسوب کرتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے آج کی شخصیتوں کی ناتوانی اور کمزوری، فلسفہ اور زندگی میں مشین کے تسلط سے متعلق ہو۔ مشین قدرت کو تسخیر کرتی چلی جاتی ہے اور قدیم اور متضاد مقاصد کی تکمیل کے لیے ہماری قوت بے انتہا بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم بادلوں کے اوپر اور سمندروں کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم کروڑوں اشیا بناتے ہیں جو قیمت اور فن دونوں کے نقطۂ نظر سے سستی ہیں۔ آہستہ آہستہ مشین، استعداد کی، مقدار، صفت کی، صنعت فن کی اور دولت، شخصیت کی جگہ لے رہی ہے۔ بہت جلدی انسان خود بھی غائب ہو جائے گا اور صرف کل پرزے باقی رہ جائیں گے۔ تو پھر یہ کون سی حیرت کا مقام ہے کہ ہماری نسل سینما کو تمثیل پر، فلیٹ کو گھر پر، بجلی کے کھمبے کو مکان پر اور سیاستدانوں کو ارباب سیاست پر ترجیح دیتی ہے۔ ہم نے شخصیت اور خود اختیاری کو کھو دیا ہے اور مشینوں کا نام پایا ہے۔

میکانکیت پھیلتے ہوئے شہروں اور ظالم جمہوری ریاستوں کے فرد پر تسلط کا بھی اظہار ہے۔ گروہ یا انتخاب میں شخصیت یا خود اختیاری کو قائم رکھنا مشکل ہے اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ جبریت اس سرمستی کا نام ہے جو طبیعیات کو اپنے ظاہری شان و شکوہ سے حاصل ہوئی۔ اس سرشاری میں اس نے سوچا کہ اپنے خطرناک اور جانبدار اصولوں کے ذریعہ، ذہن، فن اور محبت کی اقلیم کا احاطہ کر لے۔ آہستہ آہستہ جب ہم مشینری کے عہد سے تخلیقی ثقافت کے عہد تک پہنچیں گے، ہم دنیا کی سطحی مشینری کے پیچھے زندگی کی رو کو دیکھ سکیں گے۔ بہت سی غلطیوں اور بہت سے شکوک کے بعد ہم یہ سمجھ جائیں گے کہ ہم اپنی حقیر بساط کے مطابق دنیا کے اعمال میں شریک ہیں اور اگر ہم چاہیں تو تخیل اور علم کے ساتھ اس ناقابل فہم تمثیل میں چند سطور لکھ ڈالیں۔

۴۔ حیاتیات کا عہد

آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فلسفہ، حیاتیات، نفسیات، بدنیات حتی کہ طبیعیات میں میکانکی طرز توجیہ ختم ہو رہی ہے۔ لوسیان پوان کارے کہتا ہے کہ آج اس خیال کو بالائے طاق رکھا جا رہا ہے کہ تمام واقعات کی میکانکی توجیہ ہو سکتی ہے۔ کیسرر کہتا ہے کہ جدید طبیعیات میں دنیا کے میکانکی تصور کی جگہ برقی فعال تصور لے رہا ہے۔ لے بان کہتا ہے کہ "ہزاروں محققین کی کوششوں کے باوجود علم الابدان ہمیں ان طاقتوں سے روشناس نہیں کرا سکا، جو زندگی کا باعث بنتی ہیں"۔ ان طاقتوں کا ان طاقتوں سے کوئی تعلق نہیں جن کا طبیعیات مطالعہ کرتی ہے۔ جس طرح علم کیمیا کو مقدار کے تصور کے علاوہ صفت کے تصور کی ضرورت ہے اور جہاں طبیعیات مقدار کے تصور پر قانع ہے، علم الابدان کو صفت اور مقدار کے تصورات کے علاوہ "ذی حیات" اور "کل" کے

تصورات کی بھی ضرورت ہے۔ طبیعیات اور کیمیا کو ان اجزا کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

حیاتیات میں میکانکیت کی ہر روز تردید ہوتی ہے۔ ڈریشن پیولود اور ہالڈین وہ نام ہیں جو کسی میکانکیت پرست کے لیے بھی فکر انگیز ہیں۔ نفسیات میں گیشٹالٹ تحریک، میکانکی نقطۂ نظر کے خلاف احتجاج ہے اور حیاتی نقطۂ نظر کی تائید۔

جے۔ ایس۔ ہالڈین کہتا ہے کہ میکانکی تصور کامیاب نہیں رہا۔ شوان کا سادہ میکانکی تصور مدت ہوئی مسترد کر دیا گیا تھا۔ ہم اب یہ جانتے ہیں کہ خلیوں کی تقسیم سے نئے خلئے پیدا ہوتے ہیں اور خلیہ کی نشوونما اور غذا کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کی توجیہ میکانکی نظریہ کے مطابق کی جا سکے۔ اخراج اور جذب کے مسائل کچھ ایسے مختلف نہیں۔ تنفس اور دوسرے حیاتیاتی اعمال کے بارے میں سادہ میکانکی نظریے بھی مٹ چکے ہیں۔ یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ بدنی حرکات کے متعلق طبیعیاتی، کیمیاوی تصورات کافی نہیں ہیں۔ علم الابدان کی ترقی کے ساتھ ہم کسی میکانکی حل کے امکان سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شیرنگٹن اور دوسرے سائنس دانوں کا کام یہ امر واضح کر رہا ہے کہ ہمیں نظام عصبی میں سادہ اور متعینہ اضطراری حرکات کے تصور کو ترک ہی کرنا پڑے گا۔ ماہر علم الابدان کی حیثیت سے میں اس مفروضہ کو بیکار سمجھتا ہوں کہ زندگی ایک میکانکی عمل ہے۔ یہ مفروضہ میرے کام میں مدومعاون نہیں ہے اور اب تو میرا خیال ہے کہ یہ علم الابدان کی ترقی کی راہ میں بری طرح حائل ہے۔ اب میکانکی علم الابدان کی طرف لوٹنا، اپنے سیکسن آباؤ اجداد کے اساطیر کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ شوپنہار اور نیٹشے، روایتی دینیات کے مخالف ہو کر بھی میکانکیت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ نیٹشے نے میکانکی ماہر طبیعیات سے کہا:

"تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دنیا کی تفسیر کے ذریعہ ہی تحقیق اور تجسس کا کام جاری رہ سکتا ہے۔ وہ تفسیر جو تعدد، پیمائش، وزن، بینائی اور عمل کو ہی ذریعہ علم تصور کرتی ہے اور کسی عمل کو نہیں؟ یہ نظریہ اگر جنون اور دیوانگی نہیں تو بے وقوفی اور درشت فکری تو ضرور ہے۔ میں اپنے دوستوں، میکانکیت پرستوں سے (جو فلسفیوں کی صف میں بیٹھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ علم میکانکیت وہ بنیادی قوانین بناتا ہے جو تمام حقیقت پر حاوی ہیں) یہ بات رازدارانہ طور پر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہارے نظریہ کی ضد زیادہ قرین قیاس نہیں کہ وجود کی سطحی اور خارجی صفات پہلے دیکھنے میں آتی ہیں؟ آج حیاتیات تعطل کی حالت میں ہے کیونکہ وہ ابھی تک زندگی کا نہیں، موت کا مطالعہ کرتی رہی ہے۔ الکحل میں رکھے ہوئے نمونے، مردہ تتلیاں، لاشیں، خوردبین پر تیار کیا ہوا جسم، یہ ہے اس کی ساری کائنات۔

شاید حیاتیات بھی جلدی ہی طبیعیات کے طرز فکر اور تصورات کی مدد سے میکانکیت کے تصورات کے خلاف بغاوت کرے گی۔ وہ یہ معلوم کرے گی کہ زندگی جس کے مطالعے کا اسے فخر حاصل ہے، حقیقت کے کہیں زیادہ قریب ہے بہ نسبت طبیعیات اور کیمیا کے مادہ کے۔ اور جب حیاتیات بالا خر میکانکی طرز فکر کے مردہ ہاتھوں سے آزاد ہو جائے گی تو وہ دار العمل سے نکل کر کھلی دنیا کا رخ کرے گی۔ جس طرح طبیعیات نے دنیا کا چہرہ بدل دیا ہے، وہ انسانی مقاصد کو تبدیل کرنا شروع کر دے گی اور انسانیت پر مشینری کے ظلم کو ختم کر دے گی اور پھر فلسفیوں پر بھی، جو دو ہزار برس تک ریاضی اور طبیعیات کے غلام رہے ہیں، زندگی کی با مقصد وحدت، تخلیقی فراوانی اور عظیم الشان خود اختیاری آشکار ہو جائے گی۔

* * *

حصہ چہارم

مسائل اخلاق

باب پنجم

ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق

۱۔ اخلاق کی اضافیت

اخلاق جو عموماً بہت آہستہ آہستہ بدلتے ہیں، آج کل ان بادلوں کی طرح بدل رہے ہیں جو تند ہوا کی زد میں آ گئے ہیں۔ وہ رسوم اور وہ ادارے جو قبل از تاریخ زمانہ سے چلے آ رہے ہیں، ہماری آنکھوں کے سامنے یوں دم توڑ رہے ہیں جیسے وہ کوئی سطحی عادتیں ہوں جنہیں ہم نے عارضی طور پر اپنا کر ترک کر دیا ہو۔ بہادری جو نیطشے سے متفق تھی کہ عورتوں کے ساتھ جتنی نرمی برتی جائے کم ہے اور دلاوری جو بدن کے ساتھ ساتھ ذہن کی تہذیب کرتی تھی، عورتوں کی آزادی کے بعد ختم ہو گئی ہے۔ مردوں نے مساوات کا چیلنج قبول کر لیا ہے اور اب ان کے لیے اس جنس کی پرستش کرنا آسان نہیں رہا جو ان کی بے طرح نقالی کرتی ہے۔ حیا اور عزت، جو عاشق کو کارہائے نمایاں کرنے کی ترغیب دیتیں اور ہر عزم کی قوت کو دوچند کر دیتیں، آج غیر مقبول صفات ہیں اور جوان لڑکیاں، مردوں پر اپنے حسن و جمال کا جادو اس فراخدلی سے بکھیرتی ہیں کہ تجسس تولید کی مدد نہیں کرتی۔ شہری زندگی نے کروڑوں مردوں کو یکجا کر دیا ہے تاکہ وہ اعصابی تحریک کے سوداگروں کا آسان شکار بنیں۔ ڈرامہ، آج ایام بحالی کی بیباکی کا رقیب ہے اور جدید ادب قدیم پارسائی کی مانند

جنسی ہیجانات سے لبریز ہے۔ شادی جو کبھی محض جسمانی وصل کا نام تھا اور جو اوائل عمر میں انسانی زندگی اور کردار کو استحکام بخشتی تھی، غیر مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ شادی کے فوائد اس کے آلام کے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں۔ آج کل اس کی ابتدا دیر سے ہوتی ہے اور انتہا جلدی۔ پہلے ہم اسے غیر فطری حد تک ملتوی کرتے رہتے ہیں، پھر طلاق کے شور و غوغا میں وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خاندان جو کبھی اخلاق کی تربیت گاہ اور سماجی نظام کی بنیاد تھا، شہری صنعت کی ذاتیت میں گم ہو گیا ہے اور ہر نسل کے بعد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اولاد کی عافیت کے لیے جانفشانی سے بنائے ہوئے مکان خاموش اور ویران ہیں۔ بچے، پریشان مقصدوں میں الجھے ہوئے، والدین اپنے اداس گھروں میں تنہا اور ہر کمرہ آشنا آوازوں کی غیر موجودگی سے گونجتا ہے۔

اب دیکھیں کہ ہمارے اخلاق میں یہ انقلاب کیونکر آیا؟

آج نفسیات کا یہ نازک مسئلہ ہے کہ ہمارے نوجوان گناہوں کی نمائش سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں یا ہمارے آباؤ اجداد ان گناہوں کی مذمت سے زیادہ محظوظ ہوتے تھے؟ اخلاقی نقطۂ نظر سے زندگی کو دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمانے میں ہم لذت اندوزی کرتے ہیں۔ دوسرے میں ہم نیکی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ احتیاط جذبات کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ آرزو کی عظیم موجیں مٹ جاتی ہیں اور تکلم کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ زندگی کی رفتار سست ہو جاتی ہے، کیفیت بدل جاتی ہے اور پیری جوانی کو آسانی سے معاف نہیں کر سکتی۔ ان معنوں میں حقیقت عمر کا وظیفہ ہے اور بداخلاقی دوسرے لوگوں کا کردار۔ ہم میں سے وہ لوگ جو اب نہ جوان ہیں نہ بوڑھے، کسی قدر کامیابی سے یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ اپنی اولاد کو سمجھیں۔ اس ضمن میں مناسب طرز فکر تاریخی ہے۔ ہمیں "نیکی" کے تصور کے تنوع اور اخلاق کی اضافی حیثیت پر غور کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اخلاقی تصورات کا سرچشمہ ارضی اور غیر مکمل ہے اور وہ انسانی زندگی کی بدلتی ہوئی اساس کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اخلاق، تاریخی اور لسانی نقطہ نظر سے "رسوم" سے پیدا ہوا ہے۔ ابتدا میں اخلاق ان رسوم سے مطابقت کا نام تھا جو اجتماع کی صحت اور بقا کے لیے لازمی تھیں۔ بعض رسوم، محض رواج ہیں۔ جس طرح میز پر چھری کانٹے سے کھانے کی رسم اور ان کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں ہوتا۔ اپنے سلاد کو چھری سے کاٹنا، کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی سزا کڑی ہے لیکن بعض رسوم مثلاً یک زوجگی اور چند زنی، ازدواج داخلی اور ازدواج خارجی قبیلہ کے اندر قتل سے احتراز اور اس سے باہر قتل پر آمادگی، اجتماعی بہبودی کے لیے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ یہی رسوم مطلق اخلاقی کلیے بن جاتے ہیں اور انہیں پند و نصیحت، پابندیوں اور جلاوطنی کے ذریعہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ رواج وہ

رسوم ہیں جن کی تبلیغ کم ہوتی ہے اور ان پر عمل زیادہ ہوتا ہے اور اخلاق وہ فرائض ہیں جن کی ادائیگی کی توقع ہم اپنے ہمسایوں سے رکھتے ہیں۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اخلاقی نظام بدلتے رہتے ہیں۔ سینٹ آگسٹین کو ابراہم کی بہت سی بیویاں ناگوار تھیں۔ لیکن اس نے یہ درست کہا کہ قدیم یہودیوں کے لیے بہت سی بیویوں کے اخراجات برداشت کرنا کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ یہ اس زمانہ کا رواج تھا اور اجتماع کے لیے مضرت رساں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یقیناً جنگ کے زمانہ میں کثرت ازدواج ایک رحمت ہے کیونکہ یہ کثرت اولاد کی ضامن ہے۔ اس سے پہلے کہ سماجی نظام قبائلی پیکار کی جگہ لیتا، مردوں کی شرح اموات عورتوں سے کہیں زیادہ تھی اور کثرت ازدواج ان حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ ایک عورت مرد کے بغیر رہنے کی بجائے مرد کے کچھ حصہ پر کفایت کر لیتی تھی۔ یک زوجگی، قبائلی امن کا ایک نتیجہ ہے۔

اخلاقی اضافیت کی چند مثالوں کا تصور کیجیے۔ اہل مشرق سر ڈھانپ کر کسی کا احترام کرتے ہیں۔ اہل مغرب سر کو ننگا کر کے، ایک جاپانی عورت (اگرچہ ممکن ہے آج یہ بات صحیح نہ ہو) ایک مزدور کی برہنگی کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس کے باوجود شرم و حیا کی دیوی بھی ہو سکتی ہے۔ ایک عرب عورت کے لیے چہرہ سے نقاب اٹھانا، ایک چینی عورت کے لیے پاؤں کو برہنہ کرنا "فحش" کے مترادف تھا۔ ان دونوں حالتوں میں پردہ داری، تخیل اور آرزو کو بھڑکاتی تھی اور نسل انسانی کے لیے مفید تھی۔ میلانیشیا کے باشندے اپنے بیماروں اور بوڑھوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک ان بیکار لوگوں کو ختم کر دینا ہی رحم دلی کا اظہار تھا۔ لباک کہتا ہے: چین میں ایک بوڑھے عزیز کے لیے کفن ہی موزوں تحفہ ہوتا تھا بالخصوص جبکہ اس کی صحت گر گئی ہو۔ سمنر کہتا ہے نیو برٹین کے جزیرہ میں "انسانی گوشت اس طرح فروخت ہوتا ہے جس طرح ہمارے قصابوں کے ہاں حیوانوں کا گوشت۔ کم از کم چند جزائر سلمان میں انسان (بالخصوص عورتیں) سوروں کی طرح کسی ضیافت کے لیے پالی جاتی ہیں"۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں آسانی سے جمع کی جا سکتی ہیں، جن میں وہ باتیں جو ہمارے ہاں "بداخلاقی" تصور کی جاتی ہیں، کسی اور عہد یا سرزمین میں سراسر اخلاق ہیں۔ "اگر" ایک قدیم یونانی مفکر نے کہا تھا تم کسی جگہ کی مقدس اور اخلاقی رسوم کو جمع کرو اور ان میں سے وہ رسوم نکال لو، جو کسی اور سماج کے لیے غیر مقدس اور غیر اخلاقی ہوں تو باقی کچھ بھی نہیں بچے گا۔

۲۔ زراعتی نظام اخلاق

اخلاقی نظام بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کونسی طاقت ہے جو انہیں بدلتی رہتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ

وہ اعمال جنہیں کسی ایک زمانہ یا جگہ میں اچھا سمجھا جاتا ہے، کسی دوسرے عہد یا مقام پر برا خیال کیا جاتا ہے؟

غالباً زندگی کی اقتصادی بنیادوں کی تبدیلی سے اخلاقی تصورات میں تبدیلی آتی ہے۔ تاریخ میں اس قسم کے دو اہم انقلاب آئے ہیں۔ ایک شکاری طرز زندگی سے زرعی طرز زندگی اور دوسرے زرعی طرز زندگی سے صنعتی طرز زندگی کی نمود، انسانی ارتقا میں یہ دو اہم اور مرکزی واقعات ہیں، جن پر دوسرے بنیادی واقعات کا انحصار ہے اور ان میں سے ہر ایک عہد میں وہ اخلاقی نظام جو قدیم طرز زندگی میں اجتماعی فلاح و بہبود کا امین تھا ناسازگار سمجھا گیا۔ اور نئے عہد میں آہستگی اور بے ربطی سے بدلتا گیا:

تقریباً تمام انسانی نسلیں کبھی وحشی جانوروں کا شکار کر کے زندہ رہتی تھیں کیونکہ اقتصادی فراوانی اور تحفظ کے معنوں میں تہذیب ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور حرص بقائے نسل کے لیے لازمی تھی۔ وحشی انسان آج کل کے کتوں کی طرح کھاتا تھا کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کو پھر کھانا کب ملے گا؟ خطرہ حرص کی ماں ہے، جس طرح ظلم خوف کی اولاد ہے۔ ہمارا ظلم اور ہماری حرص، ہمارا تشدد اور جنگ کے لیے اشتیاق، انسانی زندگی کے شکاری عہد کے آثار ہیں۔

ہر گناہ کبھی نیکی تھا اور شاید پھر کبھی قابل احترام عمل بن جائے۔ جس طرح نفرت جنگ میں قابل احترام جذبہ بن جاتی ہے، ظلم اور حرص جہد للبقا کے لیے کبھی لازمی تھے اور اب وہ مضحکہ خیز طور پر غیر ضروری متصور ہوتے ہیں۔ انسان کے گناہ، اس کے ہبوط کا نتیجہ نہیں ہیں، وہ اس کے صعود کے آثار ہیں۔ والدین، ہمسائے اور مبلغ ہم پر مدح و مذمت کی بوچھاڑ اس لیے کرتے ہیں کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنی محرکات کا انتخاب کریں۔ جس طرح ہم شکر اور تازیانے کے ذریعہ کتوں کو سدھاتے ہیں، ہماری شخصیت کی ان صفات کا دل بڑھایا جاتا ہے جنہیں ودیعت کرنے میں فطرت نے فراخدلی سے کام نہیں لیا اور ان چند صفات کی قطع و برید کرنے کا سلسلہ مدرسہ کی مار سے لے کر پھانسی تک چلتا ہے۔ کوئی عمل آج کل مدح یا مذمت کا سزاوار ہے۔ اگر شدت میں کم یا ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو مدح یا مذمت، ہمت افزائی یا تشنیع میں بدل جاتی ہے۔ جب تک امریکہ کو داخلی تصرف کی ضرورت تھی اور خارجی حملہ کا خوف نہیں تھا، وہ توسیع ملکیت کی محرکات کی ہمت بڑھاتا رہا اور فوجی صفات کی مذمت کرتا رہا۔ اب توسیع ملکیت کی ضرورت کم ہے اور (کہتے ہیں کہ) خارجی طاقتوں سے حفاظت درکار ہے۔ اب کروڑپتی کی پہلی سی عزت نہیں رہی اور ہمارے امراء البحر شان و شوکت سے اٹھلائے پھرتے ہیں۔ اشیا کی طرح، اخلاق میں بھی طلب و رسد کا معاملہ ہے۔ اگر طلب ایک میدان میں دوسرے میدان سے زیادہ ست رفتاری سے رسد کی

تخلیق کرتی ہے، تو وہ اس لیے کہ انسانی روح زمین سے زیادہ زیرک اور ناقابل تسخیر ہے۔ لیکن اس میں بھی مختلف انواع کے بیج بوئے جائیں گے اور یہ بھی میٹھے یا کڑوے پھل پیدا کرے گی۔

ہم نہیں جانتے کہ کب اور کس طرح زندگی ارتقا کی منزلیں طے کر کے شکاری عہد سے زرعی عہد تک پہنچتی؟ لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ اس عظیم انقلاب نے نئے اخلاق کے لیے طلب پیدا کی اور بہت سی قدیم خوبیاں کھیت کی پرامن زندگی میں برائیاں بن گئیں۔ محنت، بہادری سے زیادہ اہم --- کفایت شعاری، تشدد سے زیادہ عزیز اور امن، جنگ سے زیادہ مفید بن گیا اور سب سے اہم بات یہ کہ عورتوں کی سماجی حیثیت بدل گئی۔ وہ شکار سے زیادہ کھیت پر مفید ثابت ہوئی کیونکہ وہ گھر کے سینکڑوں کام کر کے روزی کمانے میں شریک ہو گئی۔ ان مختلف کاموں کے لیے کسی عورت کو ملازم رکھنا مہنگا پڑتا تھا۔ شادی کرنا سستا سودا تھا۔ مزید برآں ہر بچہ اپنی غذا اور لباس کے اخراجات کی نسبت سے کہیں زیادہ جلدی ہی خاندانی روزی کمانے میں مدد کرنے لگتا تھا۔ بچے بلوغت کے عہد تک کھیتوں پر اپنے والدین کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ ان کی تعلیم پر کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا حتی کہ لڑکیاں بھی کسی حد تک مفید ثابت ہوتی تھیں، اس لیے مامتا مقدس تھی۔ ضبط تولید غیراخلاقی اور بڑے خاندان خدا کو پسند تھے۔

اس دیہاتی فضا میں ہمارے موروثی اخلاقی نظام نے نشوونما پائی کیونکہ ایک کھیت پر ایک مرد جلدی ہی ذہنی اور اقتصادی طور پر سن بلوغ تک پہنچ جاتا تھا۔ بیس برس میں وہ زندگی کے امور کو اس طرح سمجھنے لگتا تھا جس طرح کہ موجودہ زمانہ میں چالیس برس کا آدمی۔ اس کو فقط ضرورت تھی ایک ہل اور ایک مددگار کی اور موسموں کے نشیب و فراز کو جانچنے کے لیے حساسیت کی۔ اس لیے جونہی فطرت اشارہ کرتی، وہ شادی رچا لیتا۔ وہ زیادہ دیر ان پابندیوں پر جھنجلاتا نہیں تھا جو اخلاقی نظام نے ناجائز جنسی تعلقات پر عائد کی تھیں۔ ناجائز جنسی تعلقات پر پابندی کو وہ معقول سمجھتا تھا، اس وقت بھی جبکہ وہ اس پابندی سے انحراف کرتا تھا۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، ان کے لیے پاکیزگی لازمی تھی کیونکہ پاکیزگی کے نہ ہونے سے مامتا خطرہ کی زد میں آتی تھی۔

اور جب مسیحیت کی تعلیم نے پوری یک زوجگی اور طلاق کی ممانعت کی پابندی عائد کی تو لوگوں نے اسے بھی معقول سمجھا، کیونکہ کسان کی بیوی بچے جنتی تھی اور یہ مناسب تھا کہ جب تک بچے بالغ نہ ہو جائیں، ماں اور باپ اکٹھے رہیں جبکہ آخری بچہ بڑا ہوتا، جسم کے ڈھلنے اور دو روحوں کے اتفاق کی وجہ سے تنوع کی خواہش مدھم پڑ جاتی۔ کھیتی پر عیسائیوں کا سخت گیر اخلاقی نظام قابل عمل اور مفید ثابت ہوا۔ اس نے ایک صدی کے اندر وہ مضبوط اور مستحکم نسل پیدا کی جس نے ایک پورے براعظم کو تسخیر کر لیا۔ اخلاق نے ہمیشہ اپنی توقعات سے زیادہ مطالبات کیے ہیں تاکہ

جس چیز کی اسے ضرورت ہو، وہ حاصل ہو جائے۔

پندرہ سو برس تک پاکیزگی، بچوں کی شادی، طلاق بغیر یک زوجگی اور کثرت اولاد کا یہ زرعی اخلاقی نظام یورپ اور یورپ کی نوآبادیات میں قائم رہا۔ وہ زیادہ آسانی سے قائم رہ سکتا تھا کیونکہ کھیت پر خاندان، پیداوار کی اکائی تھی۔ خاندان کے افراد مل کر زمین پر ہل چلاتے اور اس کی پیداوار کھاتے یہاں تک کہ جب صنعت پیدا ہونی شروع ہوئی تو وہ گھریلو صنعت تھی جس نے گھر کو نیا شعور اور نئی مصروفیتیں، نئے وظائف اور نئی اہمیت عطا کی اور جب دن کا کام ختم ہو جاتا تو یہ خودمختار گروہ شام کو ایک میز یا الاؤ کے گرد جمع ہوتا۔ کھیل کھیلتا، یا دور دراز ممالک کے متعلق کتابیں پڑھتا۔ ہر کام، ہر واقعہ، بھائی بھائی، ماں، بچہ، شوہر، بیوی کے درمیان ربط و محبت کے رشتے استوار کرنے کی مقدس سازش میں شریک تھا۔۔۔ مسیحی تہذیب کی خوبیاں۔

۳۔ صنعتی نظام اخلاق

یکایک کارخانے نمودار ہوئے اور مردوں، عورتوں اور بچوں نے گھر، خاندان، اتفاق اور خاندانی روایات کو چھوڑ کر، انفرادی طور پر کام شروع کیا۔ ان کچی عمارتوں میں جو انسانوں کے سر ڈھانپنے کے لیے نہیں بلکہ مشینوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بنی تھیں، شہر پھیلنے لگے، کھیتوں میں بیج بونے اور فصلیں کاٹنے کی بجائے لوگوں نے کارخانوں میں تقابل کی جان توڑ جدوجہد میں شرکت شروع کی۔ ایجادات اور اختراعات کی مقدار، مزدور طبقہ کی طرح بڑھتی گئی۔ ہر سال نئی مشینیں ایجاد ہوتیں اور زندگی کو زیادہ پیچیدہ اور زیادہ ناقابل فہم بنا دیتیں۔ ذہنی بلوغت اب اس سے کہیں زیادہ دیر میں حاصل ہونے لگی، جتنی دیر میں زراعتی زندگی میں حاصل ہوتی تھی۔ اس پیچیدہ اور بدلتی ہوئی دنیا میں بیس برس کے جوان کی حالت بھی ایک طفل نوخیز کی سی تھی۔ مردوں، عورتوں اور قوموں کے بارے میں وہ اس عمر میں حق فریبوں کا شکار ہوتا، انہیں دور کرنے کے لیے اسے ابھی مزید دس برس کی ضرورت ہوتی۔ شاید چالیس برس کی عمر میں (اسے) ذہنی پختگی حاصل ہوتی۔ عنفوان شباب کا زمانہ طویل تر ہو گیا اور تعلیم کا ایک طویل عہد لازمہ حیات بن گیا تاکہ ذہن موجودہ زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

زراعت سے صنعت تک انتقال، انسانوں کے اخلاقی کردار پر اثر انداز ہونے لگا۔ اقتصادی بلوغت بھی قریب قریب ذہنی بلوغت کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتی۔ صرف ہاتھوں سے کام کرنے والے مزدور اکیس برس کی عمر میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو سکتے اور شادی کے قابل ہوتے۔ ان مراتب سے اوپر خود کفالتی، ہر آرام اور جگہ کے ارتقاع کے ساتھ دور ہوتی گئی۔ عہدوں میں

بالخصوص مالی پختگی ملتوی ہوتی گئی۔ تجارت اور صنعت میں ہزاروں ایسے نئے عناصر پیدا ہوئے جو انفرادی تصرف سے باہر تھے اور انسانوں کے کام پر اثرانداز ہوتے تھے اور کسی وقت بھی اس سے کام چھنوا سکتے تھے۔

اور آدمی نے جو پہلے کبھی زندگی کے تقاضوں اور اس کی دشواریوں سے دوچار نہیں ہوا تھا‘ کارخانوں کی نشوونما کے بعد پہلی مرتبہ عورت کو اپنے پرانے اسلوب زندگی کو ترک کرتے دیکھا۔ اگر وہ شادی کرتا تو زرعی نظام اخلاق کی روایات سے مجبور ہو کر وہ اپنی بیوی کو گھر کی چاردیواری میں مقید رکھتا۔ لیکن اب گھر کی وہ اہمیت نہیں رہی تھی۔ گھریلو عورت اب ایک حسین حاشیہ بردار‘ ایک اندرونی زینت کی حیثیت رکھتی تھی‘ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کام جو وہ پہلے گھر میں کرتی تھی‘ اب کارخانوں میں کیے جاتے تھے اور ان کا معاوضہ مرد کی کمائی سے ادا ہوتا تھا۔ اگر بیکاری سے نجات پانے کے لیے عورت ماں بن جاتی تو مشکلات میں اضافہ ہو جاتا کیونکہ اب زچگی میں ڈاکٹروں‘ نرسوں‘ ہسپتالوں اور اوزاروں کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ کافی مہنگا سودا ہے اور جدید عورت اپنی بڑی بوڑھیوں کی طرح آسانی سے بچے نہیں جن سکتی۔ اگر اسے زیادہ بچے جننے پڑتے تو اور بھی دشواری ہوتی۔ ان میں سے ہر بچہ وبال جان بن جاتا۔ انہیں خاصی عمر تک تعلیم دینا پڑتی۔ مکان کا کرایہ اور سفر کا خرچ بڑھ جاتا۔ وہ تھیٹر اور رقص گاہوں میں والدین کی تفریح میں مخل ہوتے۔ انہیں تازہ ترین فیشن کے لباسوں کی ضرورت ہوتی تاکہ وہ دوسرے بچوں سے کمتر نظر نہ آئیں۔ جب وہ کچھ کمانے لگتے تو غیر ذمہ دار انفرادی زندگی بسر کرنے کی خاطر والدین کی نگرانی سے بھاگ جاتے اور اگر وہ اپنی مرضی سے نہ بھی بھاگیں تو ملازمت کے تقاضے کارخانوں اور تجارتی مرکزوں کا انتقال گھروں سے ان کا رشتہ یوں توڑ دیتا جس طرح کسی پھٹتے ہوئے بم سے ذرات علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے شہروں میں ماں بننا ایک قسم کی غلامی اختیار کرنے کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ نسل کی خاطر ایک ایسی قربانی جو ایک ہوشیار عورت ملتوی کرتی رہتی اور کبھی تو اس کی نوبت ہی نہ آنے دیتی۔ ضبط تولید کا وقار جلدی ہی قائم ہو گیا اور آلات ضبط تولید فلسفہ کا ایک مسئلہ بن گئے۔

آلات ضبط تولید کی عمومیت ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق کا ایک فوری سبب بن گئے۔ پرانے اخلاقی نظام کی رو سے جنسی تعلقات فقط شادی تک ہی محدود تھے کیونکہ جنسی تعلقات ولدیت سے الگ نہیں کیے جا سکتے تھے اور ولدیت کو صرف شادی کے ذریعہ ہی ذمہ داری دی جا سکتی تھی۔ لیکن آج جنس اور تناسل کی علیحدگی سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ مرد و زن کے باہمی تعلقات محض ایک اسی عنصر کی وجہ سے بدل رہے ہیں۔ مستقبل کے اخلاقی نظام کو ان سہولتوں کا جائزہ لینا ہو گا جو نئی اختراعات نے قدیم

آرزوؤں کی تسکین کے لیے مہیا کی ہیں۔

ان تمام حالات سے ہمارے اخلاق کے بدلنے کا بڑا سبب پیدا ہوا یعنی شادی کا التوا۔ ۱۹۱۲ء میں پیرس میں شادی کی اوسط عمر تیس برس تھی۔ انگلستان میں چھبیس برس تھی۔ غالباً پچھلے سترہ برس میں انگلستان میں شادی کی اوسط عمر بڑھ گئی اور باقی صنعتی ممالک بھی اسی راہ کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔ کیونکہ فیشنوں کی طرح ہمارے اخلاق بھی پیرس سے آتے ہیں۔ شہری سماج کے اعلیٰ طبقہ میں شادی کے التوا کا منظر زیادہ دیکھنے میں آتا ہے حالانکہ یہی لوگ ہیں جو بچوں کو بہترین ذہنی اور جسمانی تربیت دینے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ بہت سے لوگ کبھی شادی کرتے ہی نہیں۔ ۱۹۱۱ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی تین کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔ ان میں دو کروڑ بالغ افراد تھے۔ ان دو کروڑ بالغ افراد میں سے ستر لاکھ ایسے تھے جو شادی کے بندھنوں سے آزاد تھے۔ جوں جوں دیہات کم اور شہر زیادہ ہو رہے ہیں، شادی کی عمر بڑھ رہی ہے اور طوائف کی ہدایت کاری کی مدت طویل تر ہو رہی ہے اور بالغ مرد محبت کی اہلیت سے بعد حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

متوسط طبقہ کا مرد شادی کو ایک مصیبت سمجھنے لگا ہے۔ اس کی جسمانی تسکین کے لیے ہزاروں عورتیں اس کی راہ تک رہی ہیں اور آج کل جبکہ بچے ایک وبال ہیں اور گھر فلیٹوں میں تبدیل ہوگئے ہیں، شادی اس سے زیادہ اور دیتی بھی کیا ہے؟ غیر شادی شدہ مرد اپنے شادی شدہ احباب کی مشقت کی رفتار کو دیکھتے ہیں جو وہ اپنی بیویوں کو عشرت آفریں اور شر آموز بیکاری میں بحال رکھنے کے لیے کرتے ہیں کیونکہ بیکاری ان کے مرتبہ کا تقاضا ہے۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ آخر ان مردوں کو کس بات نے یہ غلامی قبول کرنے پر مجبور کیا ہے؟ وہ دیکھتے ہیں کہ متوسط طبقہ کے والدین اپنی لڑکیوں کو زندگی اور شرافت کے اعلیٰ معیار کے مطابق تربیت دیتے ہیں تاکہ ان کی شادی کسی امیر گھرانے میں کی جا سکے۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ اپنی محدود آمدنی کے ساتھ وہ کس طرح ایک مستند خاندان کی برابری کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی جیب دیکھتے ہیں اور کچھ دیر اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

شہر میں شادی سے اجتناب کرنے کی ہر تحریص اور جنس کی تحریک اور تسکین کے لیے ہر آسانی موجود ہے۔ جنسی بلوغت پہلے کی طرح اب بھی جلدی رونما ہوتی ہے۔ لیکن اقتصادی بلوغت کے حصول میں اب دیر لگتی ہے۔ آرزو پہ جو پابندیاں زرعی اخلاقی نظام میں معقول اور مفید معلوم ہوتی تھیں، صنعتی نظام میں مشکل اور غیر فطری معلوم ہوتی ہیں کیونکہ مرد اب تیس برس کی عمر تک شادی نہیں کر سکتے۔ لازمی طور پر جسم بغاوت کرتا ہے اور ضبط نفس کی باگیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ عفت جو کبھی ایک اخلاقی خوبی سمجھی جاتی تھی، اب ایک مضحکہ خیز صفت بن گئی ہے۔ حیا جو حسن کو

زیادہ حسین بنا دیتی تھی، ختم ہو گئی ہے۔ مرد اپنے گناہوں کے تنوع پر ناز کرتے ہیں اور عورتیں ایک واحد معیار کا مطالبہ کرتی ہیں جس کی رو سے ہر زن و مرد کو غیر محدود جنسی آزادی حاصل ہو۔ شادی سے پہلے جنسی تجربہ ایک عام چیز ہے۔ پیشہ ور جنسی تحریک زنان بازاری سے چھٹ گئی ہے۔ پولیس کی لاٹھی سے نہیں بلکہ غیر پیشہ ور عورتوں کے تقابل سے۔ پرانا زرعی اخلاقی نظام پارہ پارہ ہو گیا ہے اور صنعتی دنیا اعمال کو اس کے معیار سے نہیں پرکھتی۔

لا ئبنز کی یہ رائے تھی کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کسی مرد کو شادی کرنی چاہیے یا نہیں۔ ایک پوری زندگی درکار ہے اور ہمارے نوجوان مرد اس سے اتفاق کرتے ہیں کچھ لوگ بہت دیر تک غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور غیر شادی شدہ زندگی کی اکتاہٹ سے وابستہ رہتے ہیں۔ انہیں پارکوں میں دیکھئے۔ اخباروں کے ذریعہ وہ زندگی کو دوسروں کی نظر سے دیکھتے ہیں یا کیبرے میں دیکھیے بے جان اپنی ٹانگوں کے جنجال سے تھکے ہوئے ہر رقاصہ کو ایک سا پاتے ہیں اور آخر گناہوں سے بھی اکتا جاتے ہیں۔ ایک عام غیر شادی شدہ مرد کی بے کیف زندگی کے مقابلہ میں شادی کی مصیبتیں صفر معلوم ہوتی ہیں۔ غیر مکمل ہونے کے بڑھتے ہوئے احساس اور تنہا سڑتے ہوئے بانجھ عفو سے تو ہزار درجہ بہتر ہیں وہ ذمہ داریاں اور وہ مسائل جن کے الجھاؤ میں شخصیت کے پھیلاؤ کے اسرار مضمر ہیں۔

یہ معلوم نہیں کہ "سماجی خرابیاں" کہاں تک شادی کے التوا سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے کچھ یقیناً ہماری حرص تنوع کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ فطرت نے ہماری تخلیق یک زوجگی کے لیے نہیں کی۔ ان میں سے کچھ خامیوں کی ذمہ داری ان شادی شدہ مردوں کے کندھوں پر ہے جو ایک تسخیر شدہ قلعہ کے مسلسل محاصرہ پر جنسی تنوع کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن غالباً ان میں سے اکثر شادی کے التواء سے ظاہر ہوتی ہیں اور شادی کے بعد جنسی بے راہ روی بھی شادی سے پہلے کے جنسی معرکوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس پھلتی پھولتی صنعت کے حیاتیاتی اور اجتماعی اسباب کو سمجھ سکتے ہیں اور اسے انسانوں کی دنیا میں ایک لابدی حقیقت سمجھ کر نظر انداز بھی کر سکتے ہیں اور ترقی یافتہ اذہان کا آج عام رویہ بھی یہی ہے لیکن اطمینان سے اس حقیقت کو قبول کر لینا بھی ایک شرمناک بات ہے کہ آج کوئی پانچ لاکھ امریکی لڑکیاں جنسی بے راہ روی کا شکار ہیں اور ہمارا تھیٹر اور ہمارا ادب صنعتی انتشار میں الجھے ہوئے شادی کی صحت مند زندگی سے ناآشنا جوانوں کی جنسی ناآسودگی کو زرگری کا ذریعہ بنا رہا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی تقریباً اسی قدر ویران ہے۔ ایک باعصمت لڑکی ہر اس مرد کی منتظر ہے جو شادی کو معرض التوا میں ڈال کر بازاری عورتوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ مرد اپنی محرکات کی

تسکین کے لیے اس عہد التوا میں ایک بین الاقوامی ادارہ کی خدمات حاصل کرتا ہے جو تازہ ترین اختراعات سے آراستہ اور سائنٹیفک طریقہ سے منظم ہے۔ دنیا نے اس کی آرزوؤں کی تحریک اور تسکین کے لیے ہر ممکن طریقہ وضع کر رکھا ہے لیکن اس لڑکی کو، جس کے ساتھ اسے دس برس کے تجربہ کے بعد شادی کرنا ہے، معصوم اور باعفت رہنا ہوگا، جب وہ اس کے تجربہ کار بازوؤں میں سمٹنے کے قابل ہوگی۔ (بالزک نے کہا تھا کہ ایک عام دولہا اس بندر کی مانند ہے جو وائلن بجانے کی کوشش کر رہا ہو)۔ معاشرہ کی یہ تنظیم یقیناً کسی قدر غیر فطری ہے۔ یقیناً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں جب لڑکیاں نیلام کی جاتی تھیں، باعصمت لڑکیوں کے دام زیادہ ملتے تھے اور یہ اس غیر منصفانہ اخلاقی معیار سے بھی متعلق ہے جو عورت سے مکمل وفاداری کا طالب ہے تاکہ جائیداد صحیح اولاد کے ہاتھ آئے لیکن عقل محض اسے صریحاً ناانصافی سمجھتی ہے اور اس نظام کی زندگی اب یقیناً تھوڑی ہی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلوغت کے بعد جنسی تعلقات سے احتراز غیر فطری ہے کیونکہ اس سے ہزاروں ذہنی خرابیاں اور جنسی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس زمانہ میں جبکہ انہیں مکمل صحت کی ضرورت ہے، جسم اور ذہن پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اگر کوئی اخلاقی مدرس شادی سے پہلے کے جنسی تعلقات کی مذمت کرے تو یہ ایک مضحکہ خیزبات ہے۔ اس میں معقولیت تبھی پیدا ہوگی جب وہ ان طاقتوں کا پرزور مقابلہ کرے جو شادی کے التوا کا باعث بنتی ہیں۔ ہم جب تک وہ حالات بحال نہ کر لیں، جن میں یہ اخلاقی مطالبے معقول تھے، ہم زیادہ دیر یہ اخلاقی مطالبے نہیں کر سکتے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس مسئلہ سے دوچار ہوں یا ہم شادی سے پہلے کے جنسی تعلقات کی مکمل آزادی دے دیں یا ہم شادی سے فطری عمر پر لوٹ آنے کو کہیں۔

۴۔ ہمارے بداخلاق بزرگ

جنسی تلون کو جوانی کے ساتھ وابستہ کرنا ایک عام رسم ہے۔ لیکن یہ تمام عمروں میں جو ابھی تک بالکل بے جان نہیں ہوئیں، موجود ہے۔ شادی کے التوا سے ہمارے شہران مردوں اور عورتوں سے بھر گئے ہیں جو تنوع کی خارجی تحریک کو ولدیت اور گھر کی بھرپور ذمہ داریوں کی جگہ دے رہے ہیں۔ یہ اکثر و بیشتر یہی قسم ہوتی ہے جو ان نائٹ کلبوں میں جاتے ہیں، جہاں تنہا لوگ شراب سے اپنے آپ کو بدمست کر دیتے ہیں، تاکہ وہ حسین آدم خور جن میں وہ محبت کا بدل ڈھونڈنے آئے تھے، انہیں لوٹ لیں۔ اس گروہ کی عادتیں بہت جلدی ہر گروہ میں سرایت کر رہی ہیں۔ جنسی تلون ایک فیشن بن گیا ہے اور کوئی مرد یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی بیوی سے وفادار ہے یا وہ شعور کو

سرمستی پر ترجیح دیتا ہے۔ رومانی نوجوان نہیں بلکہ متوسط عمر کا جنسی طور پر متلون آدمی ہمارے موجودہ مزاج کا ذمہ دار ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہمارے اخلاقی انقلاب کا ماخذ، جدید اجتماعی نظاموں میں شادی کا التوا ہے اور یہاں بھی جہاں تک شخصی اثرات کا تعلق ہے، جوان نسلوں پر نہیں بلکہ والدین کے کندھوں پر اس کی ذمہ داری ڈالنی چاہیے۔ جوانوں کی آرزوئیں صحت مند ہیں اور جلدی ہی اسے کامیابی اور بلوغت کی طرف لے جا سکتی ہیں۔ صرف حاسد او [illegible] اط ماں باپ غصہ میں لڑکے سے پوچھتے ہیں کہ تم کیا کماتے ہو، جو محبت کے جنون میں گرفتار ہونے کی جسارت کر رہے ہو؟ حکمت زر اندوزی متوسط عمر والدین کا بنیادی فلسفہ ہے۔ وہ اپنی قدیم سرمستیاں فراموش کر دیتے ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ جوان دل میں شاید وہ تمنائیں موجزن ہوں جنہیں ایک بوڑھا دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ بوڑھی نسل ہے جو بنیادی طور پر بداخلاق ہے۔ یہی لوگ قوم یا نسل کے مفاد سے بے نیاز فطرت کے معقول تقاضوں کی تسکین نہیں ہونے دیتے اور درحقیقت جنسی تلون کی تلقین کرتے ہیں جو کامیاب شدی اور تندرست اولاد کے لیے تیاری کی منزل سمجھی جاتی ہے۔ وہ والدین، جن کا نظریہ حیات وسیع تر ہے، یہ جانتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی راحت اور صحت کے مقابلے میں مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ فطرت سے تعاون کرتے ہیں اور اپنی اولاد کی اوائل شباب میں شادی کو ممکن بنانے کے لیے ایثار سے کام لیتے ہیں۔ جب تک یہ زاویہ نظر پیدا نہیں ہوتا، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوانوں کی بداخلاقی کی وجہ متوسط عمر کے لوگوں کی کاروباری ذہنیت ہے۔

یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جوانوں کی جنسی بے راہ روی متوسط عمر کے لوگوں کی غیر مستحکم شادیوں سے زیادہ قبیح ہے؟ طلاق آہستہ آہستہ شادی کو تسخیر کر رہی [illegible] ۱۹۲۱ء میں ڈینور میں "علیحدگیوں" کی تعداد شادیوں کے برابر تھی۔ اس سے پہلے چار سالوں میں [illegible] اور شادی کی نسبت ۲۵ فی صد سے ۵۰ فی صد تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں شکاگو میں ۳۹۰۰۰ شادیاں ہوئیں اور ۱۳۰۰۰ طلاقیں دی گئیں۔ ۱۹۲۴ء میں نیویارک کی ریاست میں شادیاں ۱۹۲۳ء سے ۴ء۶ فی صد کم ہو گئیں، طلاق ۸ء۲ فی صد بڑھ گیا۔

عدالتوں نے شادی کے اس قتل عام کو جن اسباب سے منسوب کیا ہے، وہ نہایت سطحی ہیں۔ مثلاً فرار، ظلم، بے پروائی، بدمستی وغیرہ۔ جیسے طلاق کی عمومیت سے پہلے یہ افعال سرزد نہیں ہوتے تھے، ان سطحی اسباب کی تہہ میں ولدیت سے تنفر پایا جاتا ہے اور وہ ذوق تنوع جو اگرچہ آدم کی طرح قدیم ہے، جدید طرز زندگی کی ذاتیت شہری زندگی میں جنسی محرکات کی فراوانی اور جنسی تسکین کے کاروباری ذرائع سے دس گنا زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

عورت کی جاذبیت اب فقط حسن رہ گئی ہے۔ مرد فقط حسن کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ کبھی حسن صحت مند ولدیت کی ضمانت تھا۔ لیکن شادی ایک مستقل ربط ہے اور حسن فانی ہے۔ ایک حسین عورت اپنے شوہر کے لیے مستقل خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ مرد کی جاذبیت اس کی شخصیت اور توانائی ہے، لیکن ایک ذہین ترین شخصیت اور بے پناہ توانائی بھی مجبور رفاقت اور وفا کے چند برسوں بعد مرجھا جاتی ہے۔ مرد روزانہ غیر حاضری سے اپنے آپ کو محفوظ کرتا ہے۔ عورت ولدیت کے التوا سے اپنے حسن کو قائم رکھتی ہے اور اپنی جلد کے تحفظ کے لیے وہ کیمیاوی مرکبات کا امتزاج استعمال کرتی ہے جس کے سامنے سائنٹیفک زراعت ایک طفلانہ حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شادی کی بقا کے لیے عورت کو جنسی جاذبیت کی اس قدر ضرورت نہیں جتنی بچے جننے کی اہلیت کی۔ اس اہلیت سے اس میں وہ نادر محاسن پیدا ہوتے ہیں، جو مرد کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ وہ بدل جاتی ہے، پھلتی پھولتی ہے اور ایک نئی شخصیت بن جاتی ہے اور وہ قدیم معجزہ بچہ، اسے ایک نئے حسن اور کشش میں مزین کر دیتا ہے۔ بچہ نہ ہو تو گھر فقط ایک مکان ہے، جس کی دیواریں محبت کی لاش کی حفاظت کرتی ہیں اور جلدی ہی جہاں ایک خاندان ہونا چاہیے تھا وہاں بکھرے ہوئے افراد نظر آتے ہیں۔

۵- خاندان

خاندان اجتماعی اداروں میں سب سے زیادہ فطری ادارہ ہے، جو نہ صرف جنسی اختلاط کے، بلکہ بچے پیدا کرنے کے قدرتی میلانات پر مبنی ہے۔ یہ ادارہ اتنی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر حالات صحت مند ہوں تو اسے اخلاقی حکم کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ "جبلت تناسل" رجحانات، محرکات اور خواہشات کا ایک گورکھ دھندا ہے اور شاید جنسی آرزو تناسل کی ان آرزوؤں سے ممتاز ہے جو بچے پیدا کرنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے سے متعلق ہیں، اگرچہ چند عورتیں اور بہت سے مرد اپنے آپ کو بچے پیدا کرنے کی خواہش سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ بہت کم مرد اور عورتیں ایسی ہوں گی جو ایک تکلیف دہ بچہ کو بھی ایک قابل تحسین و محبت مخلوق نہ پائیں۔ ایک سرد مہر مفکر بھی اپنے بچہ سے پیار کرتا ہے۔ اگرچہ بچہ بیمار رہتا ہے تو اس کی تیمارداری سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس طرح ایک فنکار اس تصویر سے محبت کرتا ہے جو اس کے ہاتھوں میں بنتی ہے۔ اگر بچہ بدصورت ہے تو رحم دل فطرت والدین کو اندھا کر دیتی ہے اور تخیل کو حواس پر حاوی کر دیتی ہے۔ "خدا مرض کے ساتھ علاج بھی بھیجتا ہے"۔ یہ رحم دل فطرت کی بخشش ہے کہ اس نے ہمیں یہ اہلیت نہیں دی کہ ہم دوسروں کی آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھ سکیں۔

بچے والدین کے لیے زندہ نہیں رہتے بلکہ والدین بچوں کے لیے زندہ رہتے ہیں اور بچہ کی بے بسی ہی خاندان کی اساس اور اہمیت ہے۔ خاندان ان رسوم اور فنون، روایات اور اخلاق کو محفوظ کرنے والا ادارہ ہے، جو انسانی وراثت کی جان اور اجتماعی تنظیم کی نفسیاتی بنیاد ہیں۔ بچہ ایک نزاجی مخلوق ہے۔ وہ کسی قانون یا رسم کا احترام نہیں کرتا اور وہ فطری طور پر پابندیوں اور ممنوعات کی مخالفت کرتا ہے لیکن خاندان دوسرے بچوں اور والدین کے ذریعے اس ننھے انفرادیت پسند کو رشوتوں اور مار دھاڑ سے، مٹھائیوں اور احکام سے ایک اجتماعی فرد بنا دیتا ہے جو تعاون پر آمادہ ہے اور کچھ عرصے کے لیے ایک اشتراکی کی طرح تقسیم کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ خاندان پہلی اجتماعی اکائی ہے۔ بچہ، جس کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے اخلاقی نشوونما کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وسیع اداروں سے وفا کا ربط قائم کرے، حتیٰ کہ اس کے وطن کی حدود بھی اس کی روح کو تنگ معلوم ہونے لگیں۔ لیکن گھر کی محفوظ اور مستحکم بنیادوں کو چھوڑ کر جب نوجوان تقابل کے طوفان میں کودتے ہیں تو تھوڑے عرصے کے بعد اس تعاون کے جذبہ کو کھو دیتے ہیں، جس کی گھر میں آبیاری کی گئی تھی۔ بعض متوسط عمر کے لوگ جو خوش حال ہیں مگر ناخوش، کبھی کبھی آرام اور سکون پانے کے لیے پرانے گھر کا رخ کرتے ہیں جو اس نفسی نفسی کے سمندر میں ایک اشتراکی جزیرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

خاندان ایک اخلاقی اور اجتماعی مرکز اس لیے بنا کہ وہ انسانیت کی ایک خلاق اکائی تھا۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ خاندان کی یہ مرکزی حیثیت ختم ہو گئی ہے اور ہماری صنعتی آبادیاں اس غیر مامون دور میں سے گزر رہی ہیں جو اخلاقی بنیادوں کو خاندان سے جدا کر رہی ہیں، کیونکہ وہ اپنا سیاسی اور اقتصادی مقام کھو بیٹھا ہے۔ صنعت گھر اور کھیت سے نکلی اور کارخانہ اور راہگذر پر آ کر رکی۔ فرد کی زندگی میں جا بجا بھٹکانے والا پیشہ معرض وجود میں آیا۔ سرمایہ کے بہاؤ یا قدرتی ذخائر کے ظہور سے مزدوری کا مقام غیر مستقل ہو گیا۔ ان سب اسباب کی بنا پر باپ اور بیٹے کے وہ تعلقات منقطع ہو گئے جو گھر کے اتحاد میں پروان چڑھے تھے۔ وسیع پیمانہ پر صنعت اور ریاست کی کڑی مرکزیت سے گھر کا تانا بانا ٹوٹ گیا اور اس کا الزام محض نظریوں کے سر تھوپا گیا ہے۔ خاندانی وفا اور محبت کے سرچشمے خشک ہو رہے ہیں اور ان کی جذباتی دولت وطن پرستی میں سما رہی ہے۔ جس طرح والدین کا اختیار ہر سال ریاست کے وسیع اور اعلیٰ وظائف کے سامنے ختم ہو رہا ہے۔ ہر جگہ فطری انسانی تعاون کے رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور ان کی جگہ امن و قانون، تبلیغ و جبر کے خارجی اور مصنوعی بندھن لے رہے ہیں۔ بالآخر یہ اقصادی اور سیاسی فردیت ایک ایسی اخلاقی نفسی نفسی میں ظاہر ہو رہی ہے جس کا نفع کی جنگ میں کوئی مقابلہ نہیں اور جوان زمانوں میں رونما ہوتی ہے، جب بڑی بڑی تہذیبیں

فنا ہو جاتی ہیں۔

۶۔ اسباب

جس طرح یہ تجدید علم کے عہد کی دولت تھی جو اس کی آزادی، اس کی بے راہ روی اور اس کے فن کا موجب بنی، اسی طرح یہ ہمارے زمانہ کی دولت ہے (کوئی ادبی بغاوت نہیں) جس نے مذہب کے سخت گیر اخلاقی نظام کی جگہ ایک آزاد روح کی آزاد لذتوں کو دے دی ہے۔ ہماری تعطیل کا دن جواب آرام و سکون اور عبادت کا دن نہیں رہا، بلکہ آوارگی اور لامحدود فطری لذتوں کا دن بن گیا ہے، ہمارے بدلتے ہوئے اخلاق اور ہماری آزاد خیال زندگانی کی ایک واضح علامت ہے۔ مفلسی میں نیک بننا آسان ہے، اس لیے کہ انسان کبھی کبھی تحریص و ترغیب پر قابو پا لیتا ہے، اگر اس کی تسکین پر زیادہ خرچ آئے۔ لیکن ہماری جیبیں دولت سے پر ہوں تو جہاں ہجوم میں تنہائی ہمیں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گی، وہاں ہر حسین چہرہ میں خود فراموشی کی تلاش کریں گے اور اپنے دلوں کو، جو خود اعتمادی سے محروم ہیں، اپنی مردانگی کے ثبوت بہم پہنچائیں گے۔ آرائش اور مزاج کے اس جدید تعیش کے مقابلہ میں ہمارے مدرسین اخلاق کا وعظ بیکار ہے، کیونکہ یہ تعیش ازلی اور ابدی محرکات پر مبنی ہے اور اب انہیں تسکین کے غیر معمولی مواقع میسر آ گئے ہیں۔ جب تک اقتصادی حالات نہیں بدلتے، نتیجہ یہی ہو گا۔ جب تک مشینری لمحات فرصت کو فراواں کرتی رہے گی اور ذہنی مصروفیتیں عضلاتی کاموں کی جگہ لیتی رہیں گی، وہ قوتیں جو کبھی جسمانی مشقت میں صرف ہو جاتی تھیں، لہو کو اسی طرح گرماتی اور جنسی محرکات کو یوں ہی غیر معمولی طور پر اکساتی رہیں گی۔

شاید اس ''احیائے لذت'' نے ڈارون کی تردید مذہب کے ساتھ غیر متوقع طور پر تعاون کیا ہے۔ جب جوانوں نے، جنہیں دولت کی بے باکی میسر تھی، یہ دیکھا کہ مذہب ان کی لذت اندوزی کی مذمت کرتا ہے تو انہوں نے سائنس میں مذہب کی مذمت کے لیے ہزاروں دلائل تلاش کر لیے۔ پارسائی نے جنس کو پس پردہ رکھا اور اسے برا بھلا کہتی رہی، لیکن نفسیات اور ادب نے اب جنس کو ساری زندگی پر پھیلا دیا۔ قدیم مفکرین مذہب یہ بحث کرتے تھے کہ آیا کسی لڑکی کا ہاتھ ہاتھ میں لینا گناہ ہے؟ آج ہم یہ سوچتے ہیں کہ ایسا لذیذ موقع ہاتھ سے جانے دینا تو گناہ نہیں؟ لوگ ایمان کی دولت سے محروم ہیں اور بے باک تجربیت کو قدیم حزم و احتیاط پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ واجب سزا ہے اس جرم کی کہ ہمارا اخلاق مافوق الفطرت عقائد کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ قدیم اخلاقی نظام سزا اور جہنم کے خوف پر مبنی تھا۔ لیکن علم خوف کے لیے مہلک ہے اور علم پھلتا پھولتا ہے۔

تعلیم کی

توسیع کے سامنے پرانا اخلاقی نظام نہ پنپ سکا۔ ہماری غیر معتدل زندگیاں ایک نئے نصاب اخلاق کی متمنی ہیں۔ وہ نصاب جس کی بنیادیں ہماری فطرت اور اس دنیا کی قدروں پر رکھی جائیں تاکہ وہ تہذیب جو خداؤں کے فرار کے بعد کروٹیں لے رہی ہے، پھر کوئی راہ نجات حاصل کرسکے۔

زراعت اور مذہب کے انحطاط میں اینگلو سیکسن نسل کے انحطاط کا اضافہ کیجیے۔ مذہب پیورٹین فطری آرزوؤں پر کڑی پابندیاں عائد کرنے کی وجہ سے تنزل پذیر نہیں ہوا، بلکہ اس لیے بھی کہ جو نسلی گروہ قدیم نظام کو اپنی حمایت اور عمل سے اپنا چکے تھے، ہمارے شہروں میں ایک غیر اہم اقلیت بن چکے ہیں۔ ہجرت اور شرح پیدائش میں انقلابات نے غریبوں کو اعلیٰ اور ارفع کردیا اور اصحاب ثروت سے جاہ و ثروت چھین لی۔ آئرلینڈ، روس اور جنوبی یورپ کے غیر نارڈی لوگ ہی ہمارے بڑے بڑے شہروں کی سیاست پر حاوی ہیں اور ادب اور زندگی میں اپنے بے ربط اخلاقی نظام کی روح پھونک رہے ہیں۔ زندہ دل آئرش، گرم جوش اطالوی اور آرام طلب سلیو کو اینگلو سیکسن نسل سے بھی اوصاف پسند نہیں آتے، جس طرح ہمارے ادب میں نیو انگلینڈ عہد ختم ہوگیا ہے اور بعد کے مہاجر اپنے حقیقت پسند اور یاس آفرین فلسفہ کے لیے نئی ہیئت اور نئے اسالیب وضع کرنے کے تجربے کررہے ہیں۔ اس طرح ہمارے اخلاق انتشار کی حالت میں ہیں اور چند مظلوم اقلیتیں ہمارے ادب، تھیٹر، کلیسا اور ریاست پر قابض ہیں۔ امریکہ کے اخلاق نے اپنی نسلی اور اقتصادی بنیادیں بدل دی ہیں۔

اس انقلاب کا آخری سبب پہلی جنگ عظیم تھا۔ اس جنگ نے تعاون اور امن کی وہ روایات توڑ دیں، جو صنعت اور تجارت کے زیر سایہ پھلی پھولی تھیں۔ اس جنگ نے لوگوں کو بربریت اور آوارگی کا خوگر بنا دیا اور ہزاروں سپاہی جب وطن لوٹے، تو وہ اخلاقی امراض کا منبع بن چکے تھے۔ اس جنگ نے لوگوں کے قتل عام سے زندگی کی قدر و اہمیت کو کم کردیا اور جرائم پیشہ گروہوں کی نفسیات کو مرتب کیا۔ اس نے ایک مشفق تقدیر میں ایمان کو تباہ و برباد کردیا اور ضمیر سے مذہبی عقیدہ کی پشت پناہی چھین لی۔ ایک مایوس نسل کلیت، ذاتیت اور بے باک بداخلاقی میں مبتلا ہوگئی۔ ریاستیں ایک دوسرے کی دشمن ہوگئیں۔ طبقاتی جنگ از سرنو پیدا ہوگئی۔ صنعتوں نے اجتماعی افادہ کو ذاتی منافع پر قربان کرنا شروع کردیا۔ مرد شادی کی ذمہ داری سے جی چرانے لگے۔ عورتیں اخلاق کش غلامی میں جھونک دی گئیں اور جوان نئی آزادیوں سے مزین سائنسی اختراع کی مدد سے جنسی تعلقات کے نتائج و عواقب سے محفوظ ہوکر فن اور زندگی کی لاکھوں جنسی ترغیبات میں محصور کردیے گئے۔

یہ ہیں ہمارے اخلاقی انقلاب کے مختلف اسباب۔ گھروں اور کھیتوں سے کارخانوں اور

شہروں تک کے انتقال کے تصور کے ذریعے ہی ہم اس پرخروش نسل کو سمجھ سکتے ہیں، جو ہماری جگہ لے رہی ہے۔ ان کی زندگیاں اور ان کے مسائل نئے اور مختلف ہیں۔ صنعتی انقلاب نے انہیں شکنجہ میں کس رکھا ہے اور ان کے رسم و رواج لباس، کام، مذہب اور اخلاق کو بدل رہا ہے۔ انہیں پرانے اخلاقی نظام کے نقطۂ نظر سے جانچنا اور پرکھنا، اسی طرح غیر تاریخی اور غیر منصفانہ امر ہے جس طرح انہیں قدیم زمانہ کا لباس پہنا دینا۔ اخلاق اور بداخلاقی، یہ الفاظ اپنا مفہوم بدل رہے ہیں۔ ان کے پرانے مرکز مٹ چکے ہیں اور نئے مراکز ابھی بنے نہیں۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ ان کا کیا مطلب ہونا چاہیے یا انہیں کس طرح نئے مطالب دینے چاہئیں کہ ہم ایک صنعتی اور شہری عہد میں انسانی کردار کو سمجھ سکیں۔

ہم دو عہدوں کے درمیان معلق ہیں۔ ایک ختم ہو چکا ہے اور دوسرے نے ابھی تک پوری طرح جنم نہیں لیا اور ہماری تقدیر ایک نسل کے لیے انتشار ہے۔ ہم سقراط اور کنفیوشس کی طرح اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ ضبط اور خوف کے اخلاق کا جادو ٹوٹ چکا ہے اور ہم ایک فطری اخلاقی نظام پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خوف نہیں، ذہانت ہو اور ہم اس کے ذریعے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی قائل کر سکیں۔ ہم میں سے جن لوگوں کے بچے ہیں، انہیں اخلاق اور نفسیات کے ہزاروں مسائل درپیش ہیں، جنہیں سلجھانے کے لیے کوئی پرانا نسخہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم فکر کریں، اپنی عادات اور اپنے مفروضوں پر نکتہ چینی کریں اور اپنے لیے زندگی اور فکر کا ایک ہم آہنگ نظام تعمیر کریں، جو ہمارے عہد کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ ہم تقدیر کے موڑ پر اس طرح برہنہ کھڑے ہیں کہ ہمارے جسم مافوق الفطرت عقائد اور موروثی اخلاقی نظام سے عاری ہیں۔ ہر چیز کی ازسرنو تعمیر ہونی چاہیے، چاہے ہمیں پھر وحشت کے عہد میں ہی کیوں نہ لوٹا دیا جائے اور ہم تہذیب کی تعمیر پر پھر مجبور ہو جائیں۔

ہم ایک ایسا اخلاقی نظام کہاں سے لائیں جو نئے حالات کے مطابق ہو اور ہمیں پھر اعلیٰ اقدار زندگی یعنی شرافت، نجابت، حیا، نیکی، عزت، دلاوری اور محبت کی طرف ابھارے، جس طرح قدیم اخلاقی نظام لوگوں کو ارفع منازل پر پہنچاتا تھا۔ ایسا اخلاقی نظام جو ایسی نئی اقدار کی طرف لے جائے جو اسی قدر مشفق ہوں، جس قدر کہ یہ ہیں؟ ہم نیکی کو ازسرنو کیا مفہوم دے سکتے ہیں؟ ہم اعلیٰ سماج کی اخلاقی بنیادیں آخر کس نہج پر رکھیں؟

* * *

باب ششم

اخلاق اور بد اخلاقی

۱۔ اخلاق ذہانت کی حیثیت سے

آیئے اب ہم چند لمحوں کے لیے فلسفیوں کے ان اقوال پر غور کریں جو اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اقوال ہمارے فکر کو اور زیادہ پریشان کریں گے۔ لیکن حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے ہی ہم ایسے نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں جو ہمارے مسئلہ کی پیچیدگیوں پر حاوی ہو۔

یورپی اخلاق کے بانیوں یعنی یونانی سوفسطائیوں نے ہمیں ابتدا ہی میں اخلاقی الجھنوں کے خاردار مرکز سے دوچار کر دیا ہے۔ کیونکہ ان کا فکر اور تجزیہ اس قدر گہرا ہے کہ اس کے سامنے نیٹشے کا فلسفہ ثانوی اور بے جان معلوم ہوتا ہے۔ سوفسطائیوں نے دو ہزار برس پہلے نیٹشے کے فلسفے کا آدھا خروش چرا لیا تھا۔ افلاطون کے گورجیاز میں کیلیکلیز کہتا ہے کہ کمزور لوگوں نے طاقتوروں کو نیچا دکھانے کے لیے ایک اختراع کی ہے۔ اس اختراع کا نام "اخلاق" ہے۔ اس "اخلاق" کا مقصد یہ ہے کہ "مرد دانا" کو ایک عام انسان کی پابندیوں میں جکڑا رہنے دیا جائے۔ دانا انسان "نیکی" اور "بدی" کے بارے میں غیر جانبداری برتے گا۔ اس کے مقاصد جلیل ہوں گے اور وہ ان کی تکمیل کے لیے توانائی‘ جرات اور استعداد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور یہی اس کے لیے بہترین اوصاف ہوں گے۔ اور "ریاست" میں "تھریسی میکس" کہتا ہے کہ طاقت نیکی ہے اور انصاف محض طاقتوروں کا مفاد‘ غیر منصف انصاف پسندوں کا آقا ہے اور انصاف پسند ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ میں وسیع پیمانے پر ناانصافی کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ ناانصافی غالباً ناکام رہتی ہے جو اعلیٰ پیمانے پر نہ کی جائے۔

یہ امر غور طلب ہے کہ "نیکی" پر یہ تنقید کتنی پرانی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نیٹشے کا فلسفہ‘

فکر کی پختگی کا نہیں بلکہ اس کے شباب کا زمانہ ہے۔ سوفسطائیت آزادی کی اس سرمستی کی علامت ہے جو یونانی فلسفے کو اس وقت میسر آئی جب اس نے متعدد معبودوں اور روایات کی زنجیروں کو توڑ دیا تھا۔ یونانیوں کا قدیم اخلاقی نظام مذہبی بنیادوں پر کسی قدر غیر محفوظ انداز میں قائم تھا، اس انسان کی طرح جس کی ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی ہوں۔ اس انکشاف نے کہ اخلاق کی بنیادیں کمزور ہیں، اخلاق کو صدمہ پہنچایا۔ اس عدم اخلاق کی حیثیت، دہریت، مادیت اور جبریت کی طرح جوانی کی ہنگامی بغاوت سے زیادہ نہ تھی۔ یہی حال ہمارا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بچپن کا ظالم خدا کوئی حقیقی خدا نہیں، بلکہ ایک اختراع فکر ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں چیزیں چرانے اور اپنے استادوں کو سولی پر چڑھانے سے روکا جائے تو ہم وقتی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ یہ ظالم خدا ہے ہی نہیں، اس لیے ہر وہ چیز جو اس نے ممنوع قرار دی تھی، جائز ہے اور چوری، قتل اور اغوا، معزز اوصاف ہیں، بشرطیکہ ان کی صحیح پیمانے پر اور پولیس کی رائے کا احترام کرتے ہوئے تربیت کی جائے۔ جس طرح دوستوفسکی کے ایوان نے کہا تھا کہ اگر خدا نہیں ہے تو ہر چیز کی اجازت ہے۔ صرف محتاط رہنا لازمی ہے۔ اخلاقیات کا مسئلہ یہ ہے کہ آیا "نیک" بننا اور محتاط رہنا بہتر ہے۔ اگر ہے تو انسانوں کو کس طرح اس "نیکی" کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے؟

سوفسطائیت کے پس منظر ہی میں ہم سقراط کے اس اعلیٰ مرتبہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اسے فلسفہ اخلاق میں حاصل ہے۔ کیونکہ سقراط نے ایتھنز کو دو خطروں کے درمیان معلق پایا۔ جمہوری اکثریت کا پرانے عقائد کی طرف میلان اور وہ بے باک ذاتیت، جو پرانے مذہب سے مایوسی کی بنیادوں پر استوار تھی، جس نے انتشار زدہ ایتھنز کو سپارٹا کی منظم اشرافیت کا بے بس شکار بنا دیا۔ سقراط نے بتایا کہ فلسفہ کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ الہیاتی اخلاق کی جگہ (جسے فلسفہ ختم کر چکا تھا) فطری اخلاق کو کیونکر دی جائے۔ اگر ایک ایسا اخلاق مرتب کیا جائے جو مذہبی عقائد سے مستغنی ہو، تو یہ مذہبی عقائد آتے جاتے رہیں، لیکن وہ اخلاقی رشتے نہ ٹوٹنے پائیں جو مختلف افراد کو ایک پرامن دنیا کے شہری بناتے ہیں۔ مثلاً اگر نیکی کا مطلب ذہانت اور دانش ہو اور اگر انسانوں کو ان کے صحیح مفاد سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اپنے اعمال کے دور رس نتائج کو دیکھنے اور اپنی منتشر آرزوؤں کو ایک مربوط نظام میں ڈھالنے کی تعلیم دی جائے تو شاید اس طرح ایک مہذب انسان کو وہ اخلاق میسر آ جائے جو کہ جہلا کے لیے محض الہیاتی پابندیاں اور حکومت کے احکام ہیں۔ شاید گناہ جہالت ہے، نظر کی خامی ہے؟ کیا تربیت یافتہ ذہانت نیکی نہیں، جو سماجی نظام کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہے؟

اس نظریہ میں ایک چالاک ذاتیت مضمر ہے جو اشرافی سیاسی فلسفہ کا لازمی جزو ہے۔ سقراط کا خیال تھا کہ ایک نسل کی تربیت سے ایک باوقار اعلیٰ طبقہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کبھی اس

مسئلہ کا حل نہیں بتایا کہ ذہانت ایک بد فطرت انسان کو زیادہ شاطر بد فطرتی سکھا سکتی ہے۔ اس طرح پرانا مسئلہ جوں کا توں قائم رہا کہ ذہانت کو سماج پر حاوی کیا جائے یا اخلاق کو ذہانت اور عقل کے علاوہ کسی اساس پر استوار کیا جائے۔ افلاطون نے اول الذکر حل پسند کیا۔ اس نے کہا کہ ذہانت محض علم ہی پر حاوی نہیں، یہ انسانی فطرت کے مختلف عناصر کی فنکارانہ ترتیب اور نظام کا نام ہے اور سب سے اعلیٰ نیکی شوخ و شنگ فکر یا عدم اخلاق نہیں، بلکہ فرد اور ریاست میں اجزا کی کل میں ترتیب ہے۔ یہ تھی ایک مستحکم بنیاد، جس پر مزید اخلاقی تجسس کی عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی۔ لیکن فلسفہ نے اسے نظرانداز کر دیا اور اپنے معلمین اخلاق کے باوجود یونان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور جب مسیحیت کا دور دورہ ہوا تو تمام دنیا ایک ایسے اخلاقی نظام کے لیے تیار تھی جو حیات بعد ممات کے خطروں اور امیدوں سے نیکی اور راست بازی کی کمیوں کو پورا کرتا تھا۔ ایک ایسے اخلاقی نظام کے قیام کا مسئلہ جو مذہبی عقائد سے بے نیاز ہو، جوں کا توں رہا۔

۲۔ فطری اخلاق

یہاں بھی، جیسے کئی اور مسائل کے ضمن میں سر فرانسس بیکن نے ایک حل سجھایا، ''ترقی علم'' میں ایک ایسا فقرہ نظر آتا ہے جو ایک غیر مذہبی اخلاق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ بیکن نے کہا کہ تمام چیزوں میں دو طرح کی نیکی کے رجحانات موجود ہیں۔ ایک اپنی ذات کو قائم رکھنے کا رجحان، دوسرے اپنی ذات کو ایک وسیع کل میں مربوط کرنے کا رجحان۔ اور یہ رجحان پہلے رجحان سے زیادہ قابل احترام اور قوی ہے، کیونکہ اس کا مقصد ایک زیادہ وسیع کل کی بقا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بداخلاقی کی طرح اخلاق بھی انسانی فطرت کا ایک جزو ہے۔ ہمارے اندر خودی اور اجتماع دونوں کو قائم رکھنے کی جبلتیں موجود ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ اجتماعی جبلتیں خودی کی جبلتوں سے زیادہ قوی ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو دلچسپ ہے اور ہمیں فطری اخلاق کی بنیادیں تلاش کرنے کے لیے اسی راہ پر چلنا ہو گا۔

ڈارون کے زمانے میں بیکن کی سجھائی ہوئی راہ کو سائنٹیفک جواز میسر آ گیا۔ پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ڈارون کے فلسفے کے اخلاقی مطالب نیٹشے کے فلسفے کے حامی ہیں۔ اگر ارتقا جہد للبقا اور بقائے ارفع کا نام ہے تو بقا ہر شعبہ زندگی میں، حتیٰ کہ اخلاق میں بھی برتری کی دلیل ہے۔ کامیاب انسان ہی نیک ہے اور طاقت واحد نیکی ہے۔ ہکسلے نظریۂ ارتقا کے ان نتائج سے خوفزدہ ہوا۔ اسے ٹینی سن سے اتفاق تھا کہ فطرت خون آشام اور تمام اخلاقی اقدار کی دشمن ہے۔ بظاہر ارتقا کا یہی مطلب تھا کہ طاقتور کمزوروں کو ختم کر دیں۔ لیکن اخلاق کا تو یہ مطلب ہے کہ طاقتور کمزوروں کی مدد

کریں۔ ارتقا کا یہ مطلب تھا کہ جس طرح ہو سکے، ہر ممکن طریقہ سے کامیاب بنو۔ اخلاق کہتا تھا کہ ضرور کامیاب بنو، لیکن انسانیت اور شرافت کی حدود میں رہ کر۔ اخلاق کا نصب العین امن ہے۔ بقا کی آزمائش جنگ ہے۔ ہکسلے اس نتیجہ پر پہنچا کہ سماج کی اخلاقی ترقی کا انحصار قانون قدرت کی نقالی پر نہیں، بلکہ اس کے خلاف جنگ کرنے پر ہے۔

یہ ایک خطرناک نظریہ تھا، کیونکہ اگر اخلاق فطرت کے خلاف ہے تو اس کا انجام موت ہے۔ ہکسلے نے خود یہ محسوس کیا تھا کہ اس نظریہ کا نتیجہ یہی ہو گا۔ وہ کہتا ہے 'ہماری فطرت جو بہت حد تک ہماری بقا کے لیے لازمی ہے، لاکھوں سالوں کی کڑی تربیت کا نتیجہ ہے اور یہ تصور کرنا حماقت ہو گا کہ چند صدیوں میں ہم اس کی شدت اور انانیت کو اخلاقی مقاصد کے تابع کر سکیں گے اور اخلاقی مسئلہ، یعنی طاقت اور واہمے کے استعمال کے بغیر انسانی خلق پیدا کرنے کا مسئلہ لاینحل ہے' اگر اخلاق اور فطرت دو متضاد حقیقتیں ہیں۔

ڈارون نے اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ فلسفیوں نے یہ نہیں دیکھا تھا جب تک کہ کروپونکن نے انہیں یہ بات نہیں سمجھائی کہ "ارتقائے آدم" کے چوتھے باب میں ڈارون نے ایک اخلاقی نظام کی طرح ڈالی تھی، جس کی نوعیت مذہبی عقائد نہیں بلکہ حیاتیاتی واقعات تھے۔ ارسطو اور بیکن ٹھیک کہتے تھے۔ انسان فطری طور پر اجتماعی شعور رکھتا ہے، کیونکہ سماج انسان سے پہلے موجود تھا اور انسانیت نے اجتماعی شعور ورثہ میں حاصل کیا ہے۔ حیوانی زندگی کے ادنیٰ مراتب میں بھی اجتماعی تنظیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں وہ باہمی تعاون نظر آتا ہے جو انسانوں میں بھی موجود نہیں۔ اجتماع کے ارتقا میں خارجی خطرہ کے پیش نظر داخلی استحکام کی خاطر انفرادی تقابل پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ قدرتی انتخاب فرد کی جگہ اجتماع کی زندگی کا قانون بنتا گیا۔ کمزور افراد اپنے ہمعصروں کے اجتماعی رجحانات کی وجہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہسپانیہ کی طرح کمزور اقوام، تسمانیوں کی طرح کمزور نسلیں اور بھینسوں کی طرح کمزور اجناس جنگوں یا جماعتوں کے تقابل میں مٹ جاتی ہیں۔ ارتقا کی محض مادی نوعیت ختم ہو گئی۔ اب اسے اجتماعی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بقا، محض انفرادی طاقت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اجتماعی ربط اور استعداد کا۔ اجتماعی تنظیم کی وجہ سے اس گراں دفاعی جسمانی نظام کی ضرورت نہیں رہی تھی جو غیر اجتماعی حیوانوں کو میسر تھا کیونکہ انہیں فقط اپنی انفرادی طاقت اور چالاکی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں، جن میں اجتماعی تنظیم درجہ کمال تک پہنچ گئی تھی، انفرادی اسلحہ 'دانت' پنجے اور دبیر جلدیں مٹ چکی تھیں۔ خارجی خطرے اور تقابل کے ارتقا نے ایک اجتماع کے افراد میں ہمدردی، دوستی اور امداد باہمی کی صفات پیدا کر دیں۔ یہ سادہ خوبیاں جنہیں اجتماع دشمن نیٹشے نسائی صفات سمجھتا تھا،

دراصل بقائے اجتماع کے لیے لازمی اوصاف تھے۔ گروہوں کے درمیان تقابل اور پیکار باہمی تعاون اور داخلی امن کا باعث بنے۔ جنگ یا جنگ کے امکان نے اخلاق کی طرح ڈالی۔

یہ امر واضح ہے کہ حیاتیاتی نقطہ نظر سے اخلاق کی فطری اور لابدی بنیاد یہ ہے کہ جزو کل سے تعاون کرے۔ یہ وہ جامع نظریہ ہے جس کی رو سے ہر آرزو، آرزوؤں کے نظام سے، ہر فرد خاندان سے، ہر خاندان، ریاست سے، ہر ریاست، انسانیت سے اور انسانیت، زندگی کے ارتقا سے تعاون کرے۔ جوانی میں ہم "اخلاق" کو باغی فرد کی بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم "ذہانت" کو دیوتا بنا لیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عقل آرزو کی ادنیٰ لونڈی بھی بن سکتی ہے، جو ہر معیوب عمل کے لیے دلائل تلاش کرنے کے کام پر مامور ہے۔ ہم خود اعتمادی، بغاوت اور جرات کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم تنہا انسان کی مدح میں گیت گاتے ہیں اور ابلسن کی طرح یہ کہتے ہیں کہ مضبوط ترین انسان وہ ہے جو تنہا ہے۔ یہ رویہ خاندان کے اجتماعی اثر کے خلاف ایک صحت مند بغاوت ہے، اور یہ ایک لڑکے کے سن بلوغ پر پہنچنے کا بہترین اعلان ہے۔ بعد میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اجتماع جسے ہم فرد کی ضد سمجھتے تھے، افراد ہی کا مجموعہ ہے، جس میں ہر فرد ہماری ہی طرح اہم ہے۔ آخر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اخلاق کو "فرد" کی انفرادیت ہی میں نہیں ڈھالا جا سکتا اور یہ کہ ہمیں کل کی فلاح و بہبود کو وہ قطعی کسوٹی بنانا پڑے گا، جس کے ذریعے ہم جزو کے کردار کو پرکھ سکتے ہیں۔

جس طرح بہترین حکومت وہ ہے جو کم سے کم حکومت کرتی ہے، اسی طرح بہترین اخلاق وہ ہے جو کم سے کم ممانعت کرتا ہے۔ زندگی کی آزادی ایک ایسی نعمت ہے کہ جو لوگ اپنے ہمسایوں کے لیے اخلاق تجویز کرتے ہیں، صحیح طور پر انسانی نسل کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر اخلاقی حکم کتنا خطرناک ہوتا ہے؟ کس طرح ایک "بداخلاقی" دراصل ایک اخلاقی نظام سے دوسرے اخلاقی نظام تک کے انتقال کی ایک منزل ہو سکتی ہے؟ ان لوگوں کے بارے میں اخلاقی حکم لگانے سے ہمیں بالخصوص احتراز کرنا چاہیے جو دماغی اور فنی خصوصیات میں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں۔ قدرت ان لوگوں کو علیحدہ کر دیتی ہے تاکہ وہ عمل، احساس اور فکر کے نئے اسالیب سے تجربہ کریں اور اپنے روزمرہ کے اجتماعی اخلاق کو ان پر عائد کرنا ان کے پیدائش کے مقصد کو برباد کرنا ہے۔ جب پاپائے پولوس سوم کو یہ مشورہ دیا گیا کہ سیلینی کو اس کے قاتلانہ عزائم کی بنا پر قید کر دیا جائے تو اس نے جواب دیا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بینونوٹو جیسے انسان، جو اپنے فن میں یکتا ہیں، قانون سے بالاتر ہیں"۔ ہمیں وہ مراعات، جو ہم اپنے کروڑپتیوں کو دیتے ہیں، اپنے فنکاروں کو بھی دینی چاہئیں۔

ہم ایک ٹیڑھے راستے سے اس پرانے نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اخلاق کی کسوٹی اجتماعی فلاح و

بہبود ہے۔ لیکن اس حیاتیاتی تصور سے ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہماری جبلتیں عقل و خرد کے مطابق ہیں۔ قدرت کسی اجتماع کو تسلیم نہیں کرتی سوائے بھڑوں کے چھتوں اور خاندانوں اور شکاری دستوں کے۔ بیکن، ڈارون اور کروپوتکن یہ سمجھنے میں ضرورت سے زیادہ امید آفرینی سے کام لے رہے تھے کہ اجتماعی جبلتیں خود حفاظتی کی جبلتوں سے زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ یہ امر شاید خاندان کے معاملے میں صحیح ہو، جہاں دوسروں کے لیے ایثار سے کام لینے کے لیے محبت اور تعریف کے علاوہ کسی اور خارجی محرک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن خاندان کے احاطہ سے باہر آیئے تو انفرادی جبلتوں کا دور دورہ ہوتا ہے اور شجاعت اور تہور اپنی ندرت کی وجہ سے قابل داد صفات بن جاتی ہیں۔ اسی لیے اجتماع، اجتماعی جبلتوں کو مذہب، تعلیم، اخبار اور بازاروں میں اصنام نصب کر کے مستحکم اور قوی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم سب سے زیادہ اجتماعی جنس بھی نہیں ہیں۔ ہم جنگل کی ذاتیت اور چیونٹوں کی اجتماع پرستی کے درمیان کھڑے ہیں اور بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی جبلتیں آہستہ آہستہ تعاون کی قدر بقا بڑھنے سے مضبوط ہو رہی ہیں۔ شاید ایک زمانے کے بعد وہ لوگ، جو ذاتی ملکیت اور طاقت کے بھوکے ہیں، ان لوگوں کی بدولت ختم ہو جائیں گے جنہوں نے دوسروں کے ساتھ ربط اور ہم آہنگی میں کام کرنا سیکھا ہے، لیکن ہم شاید وہ زمانہ نہ دیکھ پائیں۔

اگر رجعت پسند اس اخلاقی اصول سے خوش ہے تو اسے اس کے چند نتائج پر غور کرنا چاہیے۔ کوئی فعل غیر اخلاقی نہیں ہے جب تک کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے اذیت کا باعث نہ بنے۔ اس لیے بعض حالات میں خودکشی کوئی گناہ نہیں۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ موت ایک نعمت ہے، اگر اس نے اپنی نسل کے فرائض ادا کر دیے ہیں، اگر اس نے کسی بھی ذی حیات کو محتاج یا مظلوم نہیں بنایا تو اس کی اپنی زندگی اپنی ہے۔ اس کے ساتھ وہ جو چاہے کرے، پھر اگر جبلت یا خوشی ہمیں پکارے تو ہم اس کی صدا پر لبیک کہہ کر کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے، بشرطیکہ اس سے کوئی اور انسان مغموم نہ ہو اور ہم کوئی ذہنی یا جسمانی نقصان نہ اٹھائیں جس سے نسل کو صدمہ پہنچے۔ گناہ کا تصور نسل کے افادہ کے تصور کے بغیر لایعنی ہے۔

آخر میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تعاون، جو اخلاق کی جان ہے، روح کی نشوونما سے اتنا نہیں جتنا اقتصادی زندگی کے لوازم سے پیدا ہوتا ہے۔ پھول زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق اجتماعی اور اقتصادی اکائیوں کی افراط سے پھیلتا ہے۔ وہ کل جس کے ساتھ اجزاء کو بقا کی خاطر تعاون کرنا ہے، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے توسط سے وسعت پکڑتا ہے۔ کبھی تجارت اور کاروبار نے قبیلوں کو قوموں میں منسلک کر دیا تھا اور قبائلی اخلاق، بدمعاشوں کی آخری آماجگاہ بن گیا تھا۔ آہستہ آہستہ تجارت اور مشترکہ مفاد قوموں کو بین الاقوامی رشتوں میں جوڑ دیتا ہے اور بین الاقوامی مفاد کی

طرح ڈالتا ہے۔ جلدی ہی ساری دنیا اس بات پر متفق ہوگی کہ قوم پرستی کافی نہیں ہے۔

۳۔ اخلاق کی کسوٹی

تو یہ ہے ہمارے اخلاق کی کسوٹی، جو ہر جگہ اور ہر وقت کے لیے صحیح ہے۔ لیکن ہر حل نئے مسائل پیدا کرتا ہے اور اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس اجتماع سے تعاون کریں۔ خاندان کے ساتھ، ریاست کے ساتھ، یا انسانیت اور زندگی کے ساتھ؟ اور اگر ہمارے مختلف "تعاون" آپس میں ٹکرا جائیں تو؟

جب ایک آدمی چالیس برس کا ہوتا ہے تو اس کے نزدیک اخلاق کا مطلب ہوتا ہے اپنے خاندان سے محبت۔ یہ نہیں کہ وہ اس تصور پر عمل بھی کرتا ہے۔ اگر وہ کرتا، تو جیسے کنفیوشس نے کہا تھا اسے کسی اور اخلاق کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ریاست کے اختیارات بڑھنے سے والدین کے اختیارات کم ہوگئے ہیں اور صنعت کی ذاتیت نے والدین کے اختیارات کا شیرازہ بکھیر کر خاندان کو اپنے قدیم وظائف سے محروم کردیا ہے۔ جب ہر خاندان اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو سکتا تھا، اپنی غذا خود پیدا کرتا تھا، اپنے کپڑے خود بنتا تھا، اور شاذونادر ہی دوسرے خاندانوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی تھی، تب اخلاق کا یہ تصور کافی تھا۔ اگر والدین شفیق تھے اور بچے فرمانبردار، تو ریاست ایک ایسی حقیر حقیقت تھی جسے نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن آج جبکہ خاندان کا ربط منتشر ہو چکا ہے اور ہر فرد ریاست کے دوسرے افراد کے ساتھ اقتصادی اور اخلاقی روابط میں منسلک ہو چکا ہے تو قدیم فطری اخلاق کیونکر پنپ سکتا ہے؟ ایک شخص اپنے بچوں کے لیے فیاض ہے تو ان ملازموں کے ساتھ بے رحم، جنہیں اس نے شاید کبھی دیکھا بھی نہیں۔ ایک شخص اپنے ملک کو کوڑیوں کے دام فروخت کر دیتا ہے لیکن ایک اچھے شوہر اور اچھے باپ کی حیثیت سے اس کا شہرہ ہے۔ ایک شخص اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے مالی معاملات میں فریب سے کام لیتا ہے لیکن کلیسا میں اسے بنظر احترام دیکھا جاتا ہے۔ ان حالات میں خاندانی اخلاق کافی نہیں ہے۔

تو کیا ہم ہمہ گیر ریاست کی اطاعت کریں؟ سیاست دان تو یہ کہتے ہیں کہ ریاست کے ارباب حل و عقد کی فرمانبرداری کرو۔ اور یہ جواب اتنا غیر معقول بھی نہیں کیونکہ جب تک ایک بین الاقوامی نظام قائم نہیں ہوتا اور ہر فرد، تمام انسانیت کا جزو نہیں بنتا تب تک جو نظام موجود ہے، اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اس سیارہ پر جہاں آبادی بے طرح بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہے اور ہر سمت سے روزینہ کے اعلیٰ معیار کی طرف رخ کر رہی ہے اور جہاں افلاس ایک معمہ ہے، جو کسی طرح حل نہیں ہو پاتا، یہ اچھی بات ہے کہ زیادہ منظم اجتماع ایک کم منظم اجتماع کے مقابلہ میں

محفوظ رہے، جس طرح انسان اپنے آپ کو حیوان کے مقابلہ میں محفوظ رکھتا ہے کیونکہ ارتقا کے لیے یہ لازمی ہے کہ دنیا میں کہیں تو ایسا اعلیٰ طرز زندگی ہو کہ دوسرے لوگ اس تک پہنچنا چاہیں۔ جب تک صنعت کوئی بین الاقوامی ادارہ قائم نہیں کرتی تب تک ریاست کی اطاعت کرنا فرد کا اخلاقی فرض ہے۔

لیکن اس اجتماع کے اندر بھی ہمارا ضمیر ابھی تک ناپختہ ہے۔ ہمارے ہاں صنعت اور سیاست کا ایک اخلاق ہے تو محبت اور شادی کا ایک اور۔ اور جو لوگ جنسی بے راہ روی کی مذمت کرتے ہیں، ممکن ہے وہی لوگ منافع باز اور غدار ہوں۔ ہم ایک بداخلاق دوشیزہ کو دیکھ کر کانپ اٹھتے ہیں لیکن جو لوگ ہمارے اخلاق کی خرابی کے ذمہ دار ہیں، انہیں ہم جیل نہیں بھیجتے۔ ہم کتابوں کو سنسر کرتے ہیں، لیکن اسلحہ سازوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جو جنگوں کا باعث بنتے ہیں۔ تمام غیر جنسی مسائل میں سے جو مسئلہ ہمارے ذہن پر حاوی ہے، شراب حاصل کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ اہم ہے لیکن یہ ہماری ناپختگی ہے کہ ہماری گفتگو اور ہماری منصوبہ بندی شراب سے تعلق رکھنے والے دلائل سے لبریز ہو، لیکن زیادہ اہم معاملات ہماری عدم توجہی سے بگڑ جائیں۔

ہمارا نظام تاریخ میں پہلا عظیم ترین صنعتی نظام ہے۔ لیکن کیا اس کی تنظیم! اس کی صنعتی، تجارتی اور مالی منصوبہ بندی، ملک اور قوم اور انسانیت کے مفاد کے مطابق ہے؟ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کاروبار پر اخلاقی حکم عائد نہیں ہوتا، تو کیا ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہمارا صنعتی نظام بے رحم اور فروکش ہے؟ ایک مشین ہے جو سستے داموں خرید کر مہنگے داموں بیچتی ہے۔ مدرسوں کو کارندے اور سپاہی بنانے کے کارخانوں میں بدل دیتی ہے۔ جو ملازمت کے لیے عورتوں کو مردوں پر اور بچوں کو عورتوں پر ترجیح دیتی ہے، جو لوگوں کی جسمانی اور اخلاقی صحت کو برباد کرتی ہے اور نفع حاصل کرتی ہے۔ اقتصادی زندگی کا یہ تصور مزدوروں میں بھی ہے اور سرمایہ داروں میں بھی۔ مزدور بھی اپنا اور اپنی جماعت کا فائدہ سوچتا ہے، ساری قوم کا فائدہ نہیں سوچتا۔ ہر جماعت کا اپنا نصب العین ہے۔ سیاست اور تجارت میں نصب العین محض دبی ہوئی آرزوؤں کا معقول لباس ہوتا ہے اور ہمارے اکثر نظام اخلاق یہ بتاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کا کردار کس طرح کا ہونا چاہیے۔

نسو سینئر نے کہا تھا کہ اقتصادیات دولت کا علم ہے، فلاح و بہبود کا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صنعت کا مقصد زیادہ سے زیادہ مقدار میں اشیا پیدا کرنا ہے، چاہے سرمایہ دار اور خریدار کے لیے اس کے نتائج کچھ ہی ہوں۔ قدیم علم اس علم سے بہتر تھا، اگرچہ کارلائل کے لیے وہ ناخوشگوار تھا۔ اسے "سیاسی اقتصادیات" کہتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس زمانہ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا تھا کہ اقتصادیات کا سیاست سے کچھ تعلق ہے۔ کبھی ہمیں یہ اجازت تھی کہ ہم انسانی

حقوق کا ذکر کریں۔ اگرچہ یہ لفظ آج بدنام ہے، اس میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ فرد، اجتماع سے کچھ مطالبے کر سکتا ہے۔ اگر وہ پورے ہو جائیں تو ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر کسی ملک کے لیے زراعت لازمی ہے تو کسانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت سے امداد طلب کریں۔ انگلستان میں یہ شعور پیدا ہو رہا ہے کہ اگر کیمیاوی صنعت مزدوروں کی صحت کے لیے مضرت رساں ہے تو مزدوروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت سے اپنی حفاظت کے سامان طلب کریں۔ اگر اپنے پیشوں کی نوعیت کی وجہ سے عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں، تو یہ عین اخلاق ہے کہ حکومت ان عورتوں کی حفاظت کرے، جو مائیں بننا چاہتی ہیں۔ اگر سرمایہ دار ایسے اسالیب اختیار کریں، جن سے دوسرے ممالک امریکہ کے دشمن بن جائیں، تو ہمارا یہ حق ہے کہ ہم ان پر پابندیاں عائد کریں۔ ہر قدم پر اقتصادی حالات، قوم کی تقدیر اور اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ صنعت پر پابندیاں عائد کرنے کا ہمارے پاس ایک ہی آلہ ہے، اور وہ ہے حکومت۔ اور حکومت کوئی اخلاقی ادارہ نہیں ہے۔ وہ تو لوگوں کے نمائندوں کا ایک ایسا مرکب ہے جس کی ترکیب ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بہتر ہے کہ لوگ حکومت کی مدد کے بغیر تعاون اور امداد باہمی کی صفات سے آراستہ ہو جائیں۔ شاید سرمایہ دار اور مزدوروں کے درمیان فاصلہ کو عبور کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے، اسی میں نئے عہد کی امید پوشیدہ ہو۔ شاید لوگ ذاتیت کو ترک کر کے اکٹھے کام کرنے لگیں، مل کر کارندوں اور منظموں کی تقرری کی ذمہ داری لیں۔ نفع نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ یہ تصویر اتنی ہی غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے جتنی کہ موجودہ اجارہ داری، اس وقت معلوم ہوتی تھی جب صنعت ابتدائی مراحل میں سے گزر رہی تھی۔

ہماری جبلتیں خود غرض ہیں، لیکن اجتماعی لوازم ہمیں تعاون کی طرف مائل کرتے ہیں۔ آج کل کی صنعت، اس صنعتی نظام سے زیادہ رحم دل ہے جو سو برس پہلے رائج تھا۔ صنعت کا سرمایہ اپنے نفع کا ایک معقول حصہ ہسپتالوں، کالجوں، کتب خانوں اور سائنسی تحقیق پر صرف کرتا ہے۔ پارسا لوگ اب بھی ہم میں پیدا ہوتے ہیں۔ رحم دل لوگ اب بھی ہر قدم پر ہمیں ملتے ہیں۔ باحیا لڑکیاں اگر ہم ان کی جستجو کریں تو اب بھی مل جاتی ہیں۔ ہزاروں گھروں میں صابر مائیں بھی نظر آئیں گی اور اخباروں میں جرائم کی خبروں کے ساتھ ساتھ ہمیں نیکی اور شجاعت کی مثالیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو ہزاروں لوگ سیلاب زدوں کی مدد کے لیے جا پہنچتے ہیں۔ لاکھوں مالی معاونت کرتے ہیں۔ ایک قوم فاقہ زدہ ہے تو اس کے دشمن اسے خوراک بہم پہنچاتے ہیں۔ سیاح کھو جاتے ہیں تو دوسرے سیاح انہیں بچانے کی خاطر جانیں دے دیتے ہیں۔ ابھی تک انسان میں نیکی کی جو ممکنات مضمر ہیں، ان کا اندازہ کسی نے نہیں لگایا۔ ہمارے انتشار اور ہمارے جرائم کی تہہ میں انسانی روح

کی فطری خوبیاں موجود ہیں۔ جب یہ انتشار ختم ہو گا اور ایک نیا اخلاقی نظام جنم لے گا تو ہماری فطرت کے محاسن درخشاں ہوں گے۔

۴۔ عالمگیر اخلاق

غالباً اس وقت جبکہ ہم کشاکش حیات سے علیحدہ ہو کر خردہ گیری کر رہے ہیں، ایک بین الاقوامی نظام زندگی کی تہوں میں سے ابھر رہا ہے۔ نیا سرمایہ دار اور نیا مالی نظام اسے بنا رہا ہے، کیونکہ اب وہ چاہتا ہے کہ خریدار متمول اور خوش حال رہیں۔ اب مزدور نہیں بلکہ سرمایہ دار جنگ کے خلاف ہیں۔

دنیا اسی دن کی منتظر تھی۔ تجارتی مبادلہ اور مالیات، جس نے ریاستوں کو استعماریت میں متحد کیا تھا، اب ایک بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم کر رہی ہے۔ جس طرح ہمارے اعلیٰ جذبات صحیح جسمانی بنیاد کے بغیر غیر مستحکم رہتے ہیں، اسی طرح اخلاقی اور سیاسی نصب العین فقط مستحکم اقتصادی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتے ہیں۔ جب ہم ایک بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم کر لیں گے تو ہم بین الاقوامی سیاسی نظام بھی قائم کر سکیں گے اور یہ سیاسی نظام عالمگیر اخلاق کا پیش خیمہ ہو گا۔ ضمیر حکومت کی پیروی کرتا ہے۔ وہ ضبط و نظم میں ابھرتا ہے اور اس سے خوگر ہو کر پھلتا پھولتا ہے۔ آج ایک بین الاقوامی نظام پیدا ہو رہا ہے، اس لیے آج جب قومی مفاد انسانیت کے مفاد سے ٹکرائے تو ہمیں ہر حالت میں انسانیت کی حمایت کرنی چاہیے کیونکہ یہی نیک زندگی کا راز ہے، حکمت کا رہبر اور حقیقت کا سرچشمہ ہے۔

اس لیے عالمگیر نظام کو حاصل کرنے کی خاطر ہمیں ہر تجربہ کی پشت پناہی کرنی چاہیے۔ سائنس کو ملکی حدود کو نظرانداز کر کے پھیلنا چاہیے۔ مزدوروں کو جنگ کے خلاف متحد ہو جانا چاہیے۔ آیئے ہم اپنی بے نیازی کو ختم کر دیں۔ میرابو نے کیا خوب کہا تھا کہ "ادنیٰ اخلاق اعلیٰ اخلاق کا دشمن ہوتا ہے"۔ جب تک جنگ کا خطرہ موجود ہے، ہم اپنے بچوں میں عالمگیر ضمیر کی تربیت نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم آزاد خیال لوگوں کو کون سی چیز اس بات سے روکتی ہے کہ ہم عالمگیر اخلاق کو قبول کریں اور زندگی سے وفا کا پیمان باندھیں؟

لیکن آزاد خیال لوگوں کی ذاتیت انہیں متحد نہیں ہونے دیتی۔ امریکہ کا بہترین وکیل کلیرنس ڈیروڈر تا ہے کہ عالمگیر نظام بھی ایک آمریت میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ ملکوں کی علیحدگی اور کبھی کبھار کی جنگ ہزار درجہ بہتر ہے اس آمریت سے جو لوگوں کے خیالات اور اعمال پر مکمل طور پر حاوی ہو جائے۔ یہ اندیشہ بجا ہے لیکن جس طرح ہم نے یہ خطرہ نو آبادیات کو متحد

کرنے میں اٹھایا تھا، اسی طرح ہمیں قوموں کو متحد کرنے میں بھی اٹھانا پڑے گا، کیونکہ فقط ایک دن کی جنگ میں ہی سائنس فوجوں، شہروں اور زندگی کو برباد کردے گی اور نظام، آزادی اور فکر سب کو بربریت کے درجہ پر لے آئے گی۔ کمزور حکومتوں میں نہیں بلکہ مستحکم حکومتوں میں آزادی کا خطرہ مضمر ہے۔ جب ایک ریاست مخدوش حالت میں ہوتی ہے تو وہ آزادی کو ختم کردیتی ہے۔

۵۔ جنس اور اخلاق

ذاتیت پسند افراد کو اخلاق کی یہ بدنیاتی تعریف پسند نہیں آئے گی کہ اخلاق جزو کے کل سے ربط کا نام ہے۔ وہ احتجاجاً" کہے گا کہ اخلاق ذہانت ہے اور یا شاید وہ اناطول فرانس کی طرح یہ کہے کہ حفظان صحت واحد اخلاق ہے۔ لیکن ایک مجرم ہر طرح صاف رہ کر بھی منشیات فروخت کرکے دولت جمع کرسکتا ہے۔ صحت مند بد معاشی شادی کی جگہ تعیش، بچوں کی جگہ کتوں اور قومی طاقت کی جگہ قومی انحطاط کو دے سکتی ہے۔ ذہانت جبھی کافی ہوسکتی ہے جب وہ مکمل ہو اور حکمت بن سکے۔ لیکن ہم اس کی تکمیل کا کب تک انتظار کریں؟ لوگ فلسفی بننے سے پہلے ہی چوری کرکے، قتل کر کے مرجاتے ہیں۔ نہیں، ہمیں جوانوں سے ابتدا کرنا ہوگی اور انہیں تعاون کا سبق دینا ہوگا۔ ہمیں نوجوانوں کی عادات میں تعاون کو راسخ کرنا ہوگا۔ ہمیں ذہین نوجوانوں کو بھی "کل" کا سبق سکھانا ہوگا۔ غالباً، بالاخر اس کا نتیجہ بھی ذہانت سے مختلف نہیں ہوگا۔ فکر، اجتماع کو احاطہ میں لے گا اور سوجھ بوجھ سے کل کے ساتھ وفاداری کا احساس پیدا ہوگا۔

نوجوان سمجھ جائیں گے کہ اجتماع کی نوعیت، نسل کی خصوصیات اور بچوں کی تربیت پر منحصر ہے اور ہماری جنسی آرزوؤں کو اخلاقی پابندیاں سہنی پڑیں گی۔ ہم اپنی بداخلاقی کو برداشت کرسکتے ہیں۔ ہم امرد پرستی، حیوانوں کی جنسی زندگی میں دلچسپی لے سکتے ہیں اور انہیں ایک نئے اخلاقی نظام کے تجسس اور جستجو کی ایک منزل سمجھ کر نظرانداز کرسکتے ہیں۔ لیکن وہ اخلاق جو اجتماع سے بے نیاز ہے، ہمارے دلوں میں کبھی راہ نہیں کرسکتا۔ ہم ہر اجتماع دشمن فعل کے بعد ایک پاکیزہ اور مستحکم اخلاقی نظام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہم وہ زندگی چاہتے ہیں جس میں جسمانی لذتوں کے علاوہ رفاقت اور تعاون کی خاموش تسکین بھی ہو۔ ہم صحت مند حیوان بننا چاہتے ہیں، لیکن ہم اس کے ساتھ اچھے شہری بھی بننا چاہتے ہیں۔

کیا ہمارے اخلاقی انتشار اور بے راہروی کو ضبط و نظم اور ذمہ داری میں تبدیل کرنے کی کوئی سبیل موجود ہے؟ ہمیں خیالات کے اثر کے بیان میں مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔ جنسی تعلقات کی نوعیت میں یہ تبدیلیاں ہمارے فکر کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں اور نہ یہ ہمارے استدلال سے دور

ہوں گی۔ ہم اقتصادی انقلاب کے غیرذاتی عمل سے دوچار ہیں، جو ہماری اخلاقی زندگی کو متاثر کر رہا ہے اور اگر ہمارا فکر ان اسباب تاریخ کے مطابق نہیں ہو گا تو ہم اپنی نیک نیتی کے باوجود تغیر کے اس سیلاب میں تن تنہا اور بے اثر کھڑے رہ جائیں گے۔

لیکن چیزوں کی تھاہ پانے کی تمنا ہمیں کب چین لینے دیتی ہے؟ ہمیں اس اخلاقی انقلاب کے اسباب و نتائج کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ ہم اس امید کو ترک نہیں کر سکتے کہ اس شعبہ زندگی میں بھی علم طاقت ہے۔ آیئے! ہم ابتدا سے شروع کریں اور شعلہ عشق کو سمجھنے کی کوشش کریں جو فرد کی فنا اور نسل کی بقا کا باعث بنتا ہے۔ آیئے! ہم جنس کا مطالعہ کریں کہ مرد اور عورت کے درمیان محبت اور نفرت کے جذبات کس طرح اخلاقی مسائل پیدا کرتے ہیں۔ آیئے! ہم آزاد منش عورت کو دیکھیں کہ اس کی آزادی نے ہمارے زمانہ کے اخلاق اور نسل انسانی کے مستقبل کو کس طرح متاثر کیا ہے؟ تب ہم شادی کی ناکامی کے مسئلہ پر غور کر سکیں گے اور اسے انسانی مسرت اور اجتماعی فلاح کے مطابق بنانے کے متعلق چند تجویزیں پیش کر سکیں گے۔ آخر میں ہم اخلاق کو زمین پر لا کر بچوں کی تربیت اور شخصیت کے نشوونما پر غور کریں گے۔ اس طرح یہ مہم پایہ تکمیل تک پہنچے گی۔

◆

باب ہفتم

عشق

۱۔ ہم عشق کیوں کرتے ہیں؟

عشق کو ہر ایک نے متفقہ طور پر انسانی تجربہ کا دلچسپ ترین پہلو تسلیم کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ تعجب خیز ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کے ماخذ اور اس کے ارتقا کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ موضوع ہر ادب کی جان ہے اور تقریباً ہر شخص نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ شعر، افسانہ، تمثیل، یہ ہر صنف ادب کا موضوع ہے۔ لیکن اس موضوع کا معروضی مطالعہ بہت کم کیا گیا ہے کہ فطرت میں اس کا سرچشمہ کیا ہے اور ابتدائی حیوان کے سادہ وصال سے لے کر ڈانٹے کی سپردگی، پیٹراک کی سرمستی اور ہیلویز کی ابی، لارڈ سے وفاداری تک اس نے ارتقا کی منزلیں کیونکر طے کیں۔

ہاں، مرد، عورتوں کی آرزو کرتے ہیں اور محبت "جو سورج اور دوسرے سیاروں کی محرک ہے" ہر روح کو موت سے پہلے ایک ہنگامی سرور سے آشنا کرتی ہے لیکن کیوں؟ شاعری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محبت ہر سینہ میں بیدار ہوتی ہے لیکن اس کے شباب کا پوشیدہ سرچشمہ کہاں ہے؟ ایک نوجوان ان زلفوں سے کیوں متاثر ہوتا ہے جو نوکیلی آنکھوں پر لہراتی ہیں یا کسی دوشیزہ کے لمس سے کیوں چونکتا ہے؟ اس لیے کہ دوشیزہ حسین ہے؟ لیکن کیا محبت حسن پیدا نہیں کرتی، جس طرح حسن محبت پیدا کرتا ہے؟ نوجوان محبت کیوں کرتا ہے؟

انسانی زندگی میں اس سے زیادہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ مرد بڑھاپے سے پہلے عورتوں کے پیچھے بھاگنے پر مائل رہتے ہیں۔ یا یہ کہ عورتیں، موت سے پہلے پیچھا کروانے پر مائل رہتی ہیں۔ انسانی کردار میں اس سے زیادہ کوئی مستقل صفت نہیں کہ مرد کی نگاہ ہر لحہ عورت پر پڑتی رہتی

ہے۔ اس عیار حیوان، مرد کو دیکھو کہ بظاہر تو اخبار پڑھ رہا ہے لیکن اس کی نظر اپنے شکار پر ہے۔ اس کی باتیں سنو۔ وہ اس دائمی تجسس کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔ اس کے تخیل کا تصور کرو، کتنی بے تابی سے وہ اس مقناطیسی شعلہ کا طواف کرتا ہے۔ کیوں؟ یہ سب کیونکر ہوا؟ اس شدید آرزو کا آغاز کیا ہے اور کس منازل کو طے کر کے یہ اپنی موجودہ سربلندی اور دیوانگی تک پہنچی ہے؟

آیئے ہم جرات رندانہ کے ساتھ ان سوالوں کے جواب دریافت کریں، جنہیں محبت کرنے والے کبھی نہیں پوچھتے۔ آیئے ہم سٹینڈ ہال، ایلس، مول، بولش، ڈی گورمون، فرائیڈ اور سٹینلے ہال کے خیالات جمع کر کے دیکھیں کہ وہ کوئی مربوط خاکہ بناتے ہیں کہ نہیں۔ ایک ایسا خاکہ، جس میں محبت کا وظیفہ اور اہمیت واضح ہو جائے۔ آیئے ہم اس گزر گاہ پر دوبارہ چلیں جسے طے کر کے محبت ہم تک پہنچی ہے۔

۲۔ ایک حیاتیاتی نظریہ

جس طرح بھوک اور محبت ایک فرد کی زندگی میں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح زندگی کی گردش دو محوروں، یعنی غذا اور تناسل کے گرد ہوتی ہے۔ ہم غذا کھاتے ہیں تاکہ ہم زندہ رہیں، بلوغت حاصل کریں اور ولدیت کے ذریعہ زندگی کی تکمیل کریں۔ اور تناسل میں ہم اپنے فانی جسم سے نئی زندگی کی تخلیق کرتے ہیں تاکہ وہ پھلے پھولے اور ہم سے بہتر زندگی بسر کرے۔

غالباً یہ نشو و نما کا جذبہ ہے جو ایک سادہ ترین خلیہ کو دو حصوں میں بٹ جانے پر مجبور کرتا ہے۔ خلیہ کا جثہ اس سطح سے زیادہ جلدی پھلتا پھولتا ہے، جس کے ذریعہ اسے غذا میسر آتی ہے۔ اس تناسب کو بحال کرنے کے لیے وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور سطح تقسیم کے ذریعہ پھر جثہ کے مطابق ہو جاتی ہے۔ یہ توجیہ ایک نظریہ ہے، لیکن تقسیم ایک حقیقت ہے۔ جراثیم، جو کہ حقیر ترین حیوان ہیں، اس سرعت سے اپنے آپ کو تقسیم کرتے ہیں کہ انسانی ذہن اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ایک بدلو بھی پر اسرار طریقہ سے دو بدلو بن جاتے ہیں۔ یہ تناسل تو ہے لیکن اس منزل پر جنسی تفریق عمل میں نہیں آئی اور غالباً ابھی محبت کا آغاز نہیں ہوا۔

حیوانوں کی دو میں تقسیم ہی کے ذریعہ 'قدرت' زندگی کو قائم رکھتی ہے اور اگرچہ وہ اس اصول میں ہزاروں پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے، وہ اسے پوری طرح ترک نہیں کرتی۔ ابتدائی حیوانوں میں یہی اصول کارفرما ہے۔ غنچے اسی اصول کے مطابق کھلتے ہیں۔ ایک ننھا پھول ایک پرانی شاخ سے چمٹتا ہے اور پودے کی زندگی سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بالغ ہوتا ہے تو اسی پودے کے تقابل میں غذا کی طرف جھپٹتا ہے جس کی شاخ پر وہ پھلا پھولا ہے۔ آخر وہ شاخ سے علیحدہ ہو جاتا

ہے اور کسی اور جگہ نئی جڑیں پکڑتا ہے۔

کبھی کبھی ابتدائی حیوانوں کے خلئے ایک جلاطینی مادہ میں دبے رہتے ہیں اور ایک نو آبادی قائم کرتے ہیں اور پھر ایک نہایت عجیب و غریب تقسیم کار رونما ہوتی ہے۔ خارجی خلئے غذا حاصل کرنے میں اور داخلی خلئے تناسل کے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ نو آبادی ایک اجتماعی تنظیم بن جاتی ہے، جس میں مختلف حصے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ زندگی کے آغاز ہی میں ہمیں "مادۂ حیات کی علیحدگی" کی مثال ملتی ہے جس پر وائیزمین نے اپنے نظریہ وراثت کی بنیاد رکھی۔

اگرچہ تقسیم عالمگیر ہے، وہ کافی نہیں ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب کئی نسلوں کے بعد وہ ابتدائی حیوان، جس کی کئی بار تقسیم ہو چکی ہو، اس طاقت سے محروم ہو جاتا ہے، جو نئے حیوانات پیدا کرتے ہیں۔ اس منزل پر ایک نیا واقعہ رونما ہوتا ہے۔ ایک ہی قسم کے دو کمزور ابتدائی حیوان آپس میں ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک مادۂ حیات بہاتا ہے جو دوسرے میں جذب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس اتصال کے بعد وہ پھر تنومند اور طاقتور ہو جاتے ہیں اور پھر وہی تقسیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حیوان بھی انسانوں کی طرح اور انسانوں کے اجتماعوں کی طرح زندہ رہتے ہیں۔ جب مرد شادی کرتا ہے تو وہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب نسلیں ملتی ہیں تو وہ زندہ تر ہو جاتی ہیں۔

یہ معمولی اتحاد چاہے کتنا ہی اہم ہو۔ یہ مختلف افراد کے اس وصال سے بہت مختلف ہے جو شجر محبت کی جڑ ہے۔ کیا ہم حقیر ترین حیوانوں میں اس کا مماثل پا سکتے ہیں؟ پینڈورینا میں اس کا مماثل ملتا ہے جو کہ سولہ خلیوں کا جانور ہے۔ ہر خلیہ دو مختار خلیوں میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ کئی ایک مہین ذروں میں تقسیم ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور جب ان ذروں میں سے دو ذرے آپس میں ملتے ہیں تو ایک نیا حیوان وجود میں آتا ہے۔ ایک اور ابتدائی حیوان یوڈورینا کی طرف توجہ کیجئے۔ اس نسل میں ہر خلیہ دو غیر مماثل ذروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ ان میں سے بڑے اور خاموش ہوتے ہیں اور کچھ چھوٹے اور چست ہوتے ہیں اور جب تک چھوٹا ذرہ بڑے ذرے سے نہ ملے، ایک نیا حیوان وجود میں نہیں آتا۔ یوڈورینا میں قدرت جنس کو دریافت کرتی ہے۔

کچھ وقت کے لیے وہ جھجھکتی رہی اور دول دوکس میں ہمیں تناسل کے پرانے طریقے اور نئے طریقے کا امتزاج ملتا ہے۔ ایک نسل میں نو آبادی کے خلئے ذرا روایتی تقسیم کے ذریعہ بڑھتے ہیں لیکن دوسری نسل کے خلئے یوڈورینا کی طرح غیر مماثل حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور اس نسل کے دو غیر مماثل حصے مل کر تیسری نسل پیدا کرتے ہیں۔ نئی چیزیں جب تک قدیم سانچوں میں ڈھالی

نہ جائیں، مستقل طور پر قائم نہیں ہو سکتیں۔ (ہمارے نوجوان یہ سبق اس وقت سیکھتے ہیں جب وہ جوانی کھو چکتے ہیں) اس طرح قدرت نے ارتقا کی مختلف منازل میں دو جنسوں کو علیحدہ کیا اور ان کے وصال کے لیے جذبہ محبت تخلیق کیا۔

اس حیاتیاتی نظریہ کی رو سے مسئلہ محبت کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ افلاطون کا ”ارسطو فینز“ سموزیم میں مزاحا“ کہتا ہے: ”ایک زمانہ وہ تھا جب دونوں جنسیں ایک تھیں لیکن مردوں کی بدطینتی کی وجہ سے خدا نے انہیں دو حصوں میں کاٹ دیا۔ اس کچے سیب کی طرح جسے اچار کے لیے دو حصوں میں، کاٹا جاتا ہے یا اس انڈے کی طرح جسے ایک بال کے ذریعہ دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس مرد کا نصف ہے اور ہمیشہ دوسرے نصف کی تلاش میں سرگرم ہے۔ تکمیل کی آرزو اور تجسس کا نام محبت ہے“۔ یہ ایک جامع تعریف ہے اور اس عظیم تمثیل نگار کی اس تمثیل کی ایک عالمانہ توجیہ کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا، جب دونوں جنسیں ایک ہی جسم میں آباد تھیں۔ پھر فطرت نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور آج ہر حصہ اپنے آپ کو نصف محسوس کرتا ہے اور وصال اور تکمیل کا آرزومند ہے۔

لیکن یہ ”محبت کیا ہے؟“ کا ایک تصوف آمیز جواب ہے۔ یہ جواب ایک حقیر ترین حیوان میں ایک اعلیٰ حکیمانہ شعور کے وجود کو فرض کر لیتا ہے۔ غالباً جب ایک علیحدہ حیوان میں تذکیری صفات پیدا ہوئیں تو بہت کم حیوان دوسرے نصف کی تلاش کرتے تھے اور وہ حیوان جو دوسرے نصف کی تلاش کرتے اور اس تلاش میں کامیاب رہتے، نئی نسلوں کی تخلیق کے ذمہ دار بنتے اور ہر نسل میں فقط عشاق یعنی وہ افراد جو اپنے بہتر نصف سے ربط کے ساتھ تکمیل حاصل کرتے تھے، زندگی کے سرچشمہ میں اپنے جذبہ وحدت کو سمو دیتے۔ وہ حیوان جو اپنے اندر یہ نادر تحریک محسوس نہ کرتے یا تھوڑی شدت سے کرتے، بغیر اولاد کے فنا ہو جاتے۔ اس لیے یہ تحریک ہر نئی نسل کے ساتھ شدید تر ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ موت سے زیادہ قوی جذبہ غالب بنتی گئی۔ یہ جذبہ اپنے تنوع پسند تسلسل کے ساتھ موت کو بھی فریب دیتا رہتا ہے۔ غالباً، غالباً یہی وہ راہ تھی جس کے ذریعے محبت ہم تک پہنچی۔

۳۔ بدنیاتی بنیاد

یہ تو رہا سلسلہ حیات میں محبت کا ارتقاء، اب ہم فرد کی زندگی میں اس کی نشوونما کا مطالعہ کریں گے۔ ارسطو نے کہا تھا اگر تمہیں کسی چیز کو سمجھنا ہو تو اس کی ابتدا اور نشوونما کا مشاہدہ کرو۔

کیا بچوں میں کوئی ایسی تحریک ہے جو جوانوں کے جذبہ محبت سے ملتی جلتی ہے؟ فرائیڈ نے

اس سوال کا جواب حتمی طور پر اثبات میں دیا ہے اور انگوٹھا چوسنے اور ماں کے سینے لگ کر دودھ پینے کے جنسی امکانات پر ذہنی امراض کے عجیب و غریب محلات تعمیر کیے۔ لیکن جب حقائق کو نظریوں سے الگ کیا جائے تو حقائق کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر رہ جاتی ہے۔ واٹسن اور اس کے رفقا نے سینکڑوں بچوں کو خاصی مدت کے لیے زیر مشاہدہ رکھا لیکن انہیں ان میں کسی قسم کا جنسی کردار نظر نہیں آیا۔

لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد ہی بچہ جنس مخالف میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے، وہ جنس مخالف کی جسمانی خصوصیات معلوم کرنے کی کس قدر خواہش رکھتا ہے اور وہ خواہش پردہ پوشی سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ ہر جنس دوسری جنس کے لیے طلسم بن جاتی ہے اور ایک حجاب آمیز کشش کا باعث بنتی ہے۔ غالباً اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا اور اگر محبت عنفوان شباب سے پہلے پیدا ہو جائے تو وہ ایڈی پس الجھن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لڑکا ماں سے محبت کرنے لگتا ہے اور لڑکی باپ سے۔ لیکن یہ محبت وہ ہولناک چیز نہیں جو فرائیڈ کے ذہن میں تھی۔ یہ کوئی الجھن نہیں ہے، اس لیے کہ نہ یہ غیر شعوری ہے اور نہ ایک مریضانہ کیفیت۔ قدرت اس طریقے سے بچے کو صحت مند محبت کے لیے تیار کرتی ہے۔ اگر یہ تعلق غلط ہو جائے یعنی لڑکا باپ سے محبت کرنے لگے، یا لڑکی ماں سے، تو اس حالت میں ماہرین امراض ذہنی واقعی تشویش میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

عنفوان شباب میں محبت اپنا پہلا واضح گیت گاتی ہے۔ عنفوان شباب میں مرد کے جسم پر بال اگتے ہیں۔ بالخصوص اس کے سینے پر جن پر وہ وحشیوں کی طرح ناز کرتا ہے۔ بالوں کی نوعیت اور ان کی مقدار، تناسل کی طاقت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے اور جسمانی طاقت کے عروج کے زمانے میں یہ کمال حاصل کرتی ہے۔ عنفوان شباب میں بالوں کے وفود کے ساتھ مرد کی آواز میں گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان صفات کو ہم ثانوی جنسی صفات کہہ سکتے ہیں۔ برعکس اس کے نوجوان لڑکی کو فطرت جسم کا وہ نرم اور گداز زیر و بم عطا کرتی ہے، جو ہر نظر کو مسحور کرتا ہے۔ اس عمر میں لڑکی کے کولہے بھر جاتے ہیں تاکہ اسے بچے جننے میں سہولت ہو، سینہ ابھر آتا ہے تاکہ بچے اس سے اپنی غذا حاصل کریں۔

ان ثانوی صفات کا سبب کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا لیکن پروفیسر اسٹارلنگ کا یہ خیال قابل قبول ہے کہ عنفوان شباب میں خون میں ایک ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو جسمانی اور ذہنی انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ اس زمانے میں محض جسم ہی کو نئی طاقتیں میسر نہیں آتیں بلکہ ذہن اور شخصیت بھی ہزار طریقے سے متاثر ہوتی ہے۔ رومین رولاں نے کہا تھا کہ ”زندگی میں بعض منازل ایسی آتی ہیں جب مرد کے اندر ایک خاموش جسمانی انقلاب رونما ہوتا ہے“۔ یہی حالت عورت کی ہے۔ عنفوان

شباب اہم ترین انقلاب ہے۔

نئے احساسات جسم اور روح میں موجزن ہوتے ہیں۔ تجسس ذہن کو آگے لے جاتا ہے اور حیا اسے پیچھے کھینچتی ہے۔ نوجوان لڑکے، لڑکیوں کی محفل میں شرماتے ہیں اور لڑکی کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑنے لگتی ہے۔ بیوقوف بچے یکایک شوخ بن جاتے ہیں۔ وہ بچے جو پہلے فرمانبردار ہوتے ہیں، یکایک بغاوت پر آمادہ ہیں۔ خودنگہی کے دور آتے ہیں اور تفکر اور خوابوں کی کیفیتیں امڈتی ہیں، تخیل میں پھول کھلتے ہیں اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا ہے۔ اس عمر میں ہر نوجوان گویا ایک فنکار ہو جاتا ہے اور غیر فانی شہرت کے خواب دیکھتا ہے۔ ذہن کی ہر طاقت بیدار ہوتی ہے اور عقل از سرنو کائنات کے مسائل پر یلغار کرتی ہے۔ اگر عقل اپنی جستجو جاری رکھے تو فرد ایک سائنس دان یا فلسفی بن جاتا ہے۔ اگر وہ یہ جستجو ترک کر دے تو وہ ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ اس وقت ممکن ہے کہ وہ کوئی اعلیٰ منصب حاصل کر سکے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب محبت کی سرشاری فن اور اجتماعی سپردگی کی آبیاری کرتی ہے۔ محبت حسن کا تصور کرتی ہے، حسن کی جستجو کرتی ہے اور کبھی کبھی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ محبت نیکی کا تصور کرتی ہے، نیکی کی جستجو کرتی ہے اور نیکی کی تخلیق میں عزم بالجزم سے کام لیتی ہے۔ اگر اس وقت مذہب اپنے فرسودہ عقائد پیش کرے تو بہت ممکن ہے کہ نوجوانوں کا جوش استدلال ان کو پارہ پارہ کر دے۔ اگر مذہب اپنے آپ کو نیکی کی جستجو کے روپ میں ڈھالے تو وہ ایک نوجوان روح کی عینیت کو متاثر کرتا ہے اور شخصیت کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عنفوان شباب ایک شاندار زمانہ ہے۔ یہ عقل کا عہد ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جذبات کا زمانہ ہے۔ ذہن اور قلب کی نئی دولتیں ہر طرف خیالات کے چھینٹے اور محبت کا وفور بکھیرتی ہیں۔ فقط اسی عہد میں دنیا اجنبی مگر حسین اور بعید مگر قابل تسخیر معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانے کے بعد ہر زمانہ اس زریں عہد کو یاد کرتا ہے۔ یہ ہر طاقت کا عہد بہار ہے اور ہر ارتقا کا عہد تخم ریزی۔ اس زمانے میں تمام اعلیٰ جذبات تربیت پاتے ہیں۔ یہ احیائے حیات ہے۔

وہ کونسی غیر مرئی طاقت ہے جو لڑکے کو ہراساں مگر کشاں کشاں لڑکی کی طرف لے جاتی ہے اور لڑکی کو طلب اور کشش کے باوجود لڑکے سے دور رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہمارے گوشت پوست کے نہاں خانوں میں وہ کونسا طلسم کارفرما ہے جو ہماری زندگی کے حسین ترین پھول کی تخلیق کرتا ہے یعنی مرد اور عورت کی محبت۔

بدن کا ریشہ ریشہ توانائی سے ابلا پڑتا ہے۔ تمام جسم رکی ہوئی نشوونما کی خلش اور زندگی کی بے تاب وسعت پسندی کو محسوس کرتا ہے اور دل ایک شیریں مگر گراں اداسی سے معمور ہے۔ غالباً

وہ اپنے نامکمل ہونے کے احساس تلے دبا ہوا ہے اور تکمیل کا آرزومند ہے۔ اس خلش کی حالت میں نوجوان ان ہزاروں چیزوں کے متعلق حساسیت رکھتا ہے جنہیں وہ پہلے نظرانداز کر دیتا تھا۔ کچھ آوازیں اسے متاثر کرتی ہیں۔ نغمہ اور موسیقی اسے بے حد مسحور کرتے ہیں اور آواز میں ایک نئی نرمی اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے جو عاشق کے لیے باعث نشاط بنتی ہے۔ چند خوشبوئیں بھی دل کو لبھاتی ہیں۔ پھلتے پھولتے جسم کی حلاوت، صفائی کی مہک، عطر کی جوش آفریں تندی، یہ سب محبت کے نشے کو تیز کرتی ہیں۔ چند حرکات دل کو موہ لیتی ہیں۔ رقص کا ترنم اور شدت، کھلاڑیوں کی پراعتماد حرکات کا بہاؤ، دوشیزاؤں کی پرکیف ادائیں اور سب سے زیادہ چند منظر دل پہ نقش ہو جاتے ہیں۔ محبت کے عہد میں رنگ طوفان لاتے ہیں اور سرخ رنگ طلب اور ہوس کو شدید تر کرتا ہے۔

نوجوان محبت کے عہد میں اپنے جسم کو آراستہ کرتا ہے جس طرح پرندے اور حیوان عہد محبت میں حسین اور رنگین بن جاتے ہیں۔ وحشی انسان اپنے جسموں پر رنگ ملتے اور انہیں مجروح کرتے ہیں تاکہ اپنے حواس کو برانگیختہ کریں اور جنس مخالف کی توجہ اپنی طرف جذب کریں۔ لباس محض افادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس زمانے میں ایک سامان ترصیع، ایک کنایہ اور ایک محرک احساس بن جاتا ہے۔ شجاعت و تہور کے کارنامے نازک دلوں کو برماتے ہیں اور ہر گداز جسم کی خمیدہ لہریں آرزو کو تڑپاتی ہیں۔ خوشبو، آواز، لمس، دید، نغمہ، رقص اور متنوع نمائش کے یہ نئے تجربات جوانوں کے خیالات میں بستے ہیں اور محبت کی تحریک کرتے ہیں۔

یکایک یہ تمام تجربات اور کیفیات یکجا ہو جاتی ہیں۔ نسل کی ضروریات جسم اور روح کی پیاس میں ظاہر ہوتی ہیں اور محبت جنم لیتی ہے۔ محبت دل میں یوں ابھرتی ہے جیسے صبح کے وقت آسمان پر روشنی اور ہر شخص کو حرارت اور نور سے مالا مال کرتی ہے اور لیوکریٹس یہ گیت گاتا ہے:

> "اے وینس! اے حسن کی دیوی، تو فطرت عالم کی ملکہ ہے۔ تیرے بغیر کوئی شے زندگی کے کبریائی ایوانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ تیرے بغیر کوئی جاندار حسین اور شادماں نہیں بن سکتا۔ کوہساروں اور سمندروں، سرکش دریاؤں اور پرندوں کی برگ آلود آماجگاہوں، خمیدہ پودوں کے وسیع و عریض میدانوں میں، تو ہر سینے میں محبت کو بیدار کرتی ہے اور ہر جنس میں سرگرم آرزو پیدا کر کے افزائش نسل کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ جونہی بہار فضا کو درخشاں کرتی ہے تو وحشی گلے حسین مرغزاروں پر اچھلنے کودنے لگتے ہیں اور تند و تیز ندیوں میں تیرتے ہیں۔ ان میں ہر فرد تیرے حسن کا اسیر ہے اور محبت سے تیری قیادت قبول کرتا ہے"۔

۴۔ روحانی ارتقا

اس مستحکم اور فطری بنیاد پر وہ محبت استوار ہوتی ہے جو جان سخن اور غذائے روح ہے۔ اس زندگی کے جذبہ تناسل سے عاشق و معشوق کے درمیان وفا کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ جسم کی یہ بھوک ایک روح کا دوسری روح سے حسین ربط پیدا کرتی ہے۔ غار میں وحشی کے جذبہ شہوت سے آخر کار شاعر کی سپردگی رونما ہوتی ہے۔

وحشی لوگوں میں جذبہ محبت بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کی زبان میں اس جذبہ کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا۔ جب وہ شادی کرتے تو ان کا مقصد بچے پیدا کرنا اور خوراک کا باقاعدہ انتظام کرنا ہوتا۔ لیوک کہتا ہے کہ یوروبا میں وحشی لوگ نہایت بے اعتنائی سے شادی کرتے ہیں۔ کوئی مرد بیوی حاصل کرنے کے متعلق اس قدر کم سوچتا ہے جس قدر کہ جوار کے بھٹے کو کاٹنے کے بارے میں۔ محبت بالکل عنقا ہے۔ نیطشے کا یہ خیال تھا کہ رومان پروونس کے شاعروں کی اختراع ہے۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ جہاں کہیں تہذیب ابھری جذبہ تناسل میں ایک روحانی عنصر داخل ہو گیا۔ یونانی رومان سے آشنا تھے۔ اگرچہ ان کا رومان امرد پرستی تک محدود تھا۔ الف لیلیٰ اس امر کا ثبوت ہے کہ محبت زمانہ وسطیٰ کے نغموں سے پہلے معرض وجود میں آچکی تھی۔ لیکن کلیسا نے جنسی پاکیزگی کے احترام سے عورت کو ناقابل حصول بنا کر محبت کی شاعری کو تقویت بخشی۔ روشفوکو کہتا ہے کہ ”اس قسم کی محبت کا محبت کرنے والے سے وہی تعلق ہے جو روح کا اس جسم سے ہے جس کے اندر وہ زندگی پیدا کرتی ہے“۔ ڈی فو سے کہتا ہے کہ ”تمام مرد جھوٹے، غدار، بے ہودہ گو، منافق اور متکبر ہوتے ہیں۔ تمام عورتیں خود پسند، تصنع پرست اور بے وفا ہوتی ہیں۔ لیکن دنیا میں فقط ایک ہی چیز مقدس ہے اور وہ ہے ان دو نامکمل ہستیوں کا وصال“۔ اور نیطشے بت شکنی کے بعد محبت کا یوں احترام کرتا ہے ”میں نے اس سے زیادہ مقدس بات کبھی نہیں سنی کہ سچی محبت میں روح جسم سے بغلگیر ہوتی ہے“۔

ہم جسمانی آرزو سے رومانوی محبت تک ارتقا کی کیونکر توجیہ کر سکتے ہیں۔ یہ کیونکر ہوا کہ شہوت نرم دلی میں تبدیل ہو گئی اور جسم کی بے تابی روح کا گداز بن گئی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ تہذیب نے وصال کی عمر کو ملتوی کر دیا اور جسم میں ناکام آرزو کی خلش پنپنے دی۔ یہ خلش تصورات میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے محبوب کو عینی رنگوں میں ملبوس کیا۔ وہ چیز جس کی ہم تلاش کرتے ہیں مگر پا نہیں سکتے، زیادہ قیمتی بن جاتی ہے۔ کسی چیز کا حسن ہماری آرزو کی توانائی میں مضمر ہے اور آرزو تکمیل سے کمزور اور ناکامی سے مستحکم ہوتی ہے، اس لیے محبت فرد کی جوانی اور تہذیب کی پختگی میں سب سے زیادہ روحانی کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی حالت میں آرزوئیں دبائی جاتی ہیں اور

یہ دباؤ جسمانی آرزو کو نغمے اور شاعری میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ذرا محبت کے نفسیاتی ارتقا پر غور کیجئے۔ اکثر و بیشتر اس کی ابتدا لڑکی کے باپ سے خاص تعلق خاطر اور لڑکے کی ماں سے خاص تعلق خاطر سے ہوتی ہے۔ پھر یہ کسی اور شخص سے جو کہ عمر میں عاشق کے قریب ہوتا ہے، شدید التفات کی صورت اختیار کرتی ہے۔ مدرسہ کی ہر جماعت میں ایسے بہت سے بچے ہوتے ہیں جو جنس مخالف کے استادوں کی محبت میں مبتلا رہتے ہیں۔ گوئٹے نے اپنی ایک محبت کی بنیاد پر ایک لافانی افسانہ لکھا ہے کہ ایک عورت نے اسے "میرا بچہ" کہہ کر اس کا دل توڑ دیا۔ ان ہنگامی محبتوں میں بھی رومانوی آرائش تخیل کمال پر ہوتی ہے۔ پھلتے پھولتے بدن میں تخیل بیتاب ہو جاتا ہے۔ یہ تخیل حسین تصورات بناتا ہے اور اپنے منظور نظر کو اپنے تصورات کے دلکش رنگ عطا کرتا ہے۔ اس عمر میں جسمانی عنصر شعوری طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ گوئٹے کہتا ہے کہ "ایک بے داغ جوان میں محبت کی پہلی تحریک ہمیشہ روحانی مقاصد لیے ہوتی ہے"۔

اس کے فورا بعد عنفوان شباب کی محبت کا آفاقی تجربہ شروع ہوتا ہے۔ یہ محبت بالعموم خفیہ رکھی جاتی ہے اور اس کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ حتی کہ وہ چھوٹے چھوٹے تحفے جو اس کے نام پر بھیجے جاتے ہیں گمنام ہوتے ہیں۔ اس منزل پہ لڑکیاں اکثر لڑکوں سے زیادہ جرات کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اگرچہ بظاہر اپنی پختگی کے زمانہ میں وہ اپنی جرات کسی قدر کھو دیتی ہیں، وہ آخر تک محبت کے فن میں مردوں سے زیادہ ہنرمند رہتی ہیں۔ لڑکا شرمایا رہتا ہے لیکن لڑکی خود اعتمادی کے ساتھ اس کیفیت پر غالب رہتی ہے۔ لڑکا کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کوشش کر کے اپنی محبوبہ سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ وہ رات کی تاریکی میں تنہا لمحے گزارتا ہے یا دن کو پہروں آوارہ و سرگرداں پھرتا ہے۔ محبوبہ کے حضور میں جو نازیبا حرکات اس سے سرزد ہوئیں یا ناروا کلمے اس کی زبان سے نکلے، ان کی تلخ یادیں اسے ستاتی ہیں۔ کچھ نوجوان جنہیں ماں کی شفقت اور تحفظ ضرورت سے زیادہ حاصل ہوا ہو، انہیں یہ حساسیت ہمیشہ کے لیے جنسی طور پر مفلوج بنا سکتی ہے۔ بعض لڑکوں میں نمائش کی آرزو تسکین پاتی ہے۔ جب ان کے خوابوں کی دیوی قریب ہو تو وہ کھیلوں میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تاکہ محبوبہ کے قدموں میں اپنی فتح کے پھول بکھیر سکیں۔ کھیل کے میدانوں میں نوجوان ان خونی جنگوں کا اعادہ کرتے ہیں جو نر حیوان مادہ کی تسخیر کے لیے کیا کرتے تھے۔ یہ جنگیں پیش خیمہ ہیں اس اقتصادی مبارزہ کا جو کہ پختہ عمر لوگ ایک حسینہ کی محبت حاصل کرنے کے لیے برپا کرتے ہیں۔

ان ابتدائی مظاہروں سے، جو عنفوان شباب کے وفور کے فورا بعد رونما ہوتے ہیں، محبت مختلف مراحل میں سے گزرتی ہے جو اگر ہنگامی ہیں تو صحت مند ہیں اور اگر مستقل ہیں تو غیر صحت

مند۔ جنسی بے راہ روی کسی قدیم طرزِ عمل کی طرف مراجعت کا نام ہے، جس کی موجودہ زمانہ میں کوئی ضرورت نہیں۔ ایک صحت مند انسان ان ہنگامی مراحل سے گزر جاتا ہے۔ وہ اس تجربہ سے اپنی روح میں گہرائی اور عمق پیدا کرتا ہے اور پھر پختہ اور صحت مند محبت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

پھر کورٹ شپ کا دور آتا ہے جو انسانی تقدیر کا حسین ترین دور ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کورٹ شپ بلوغت سے پہلے موجود نہیں ہوتی۔ ہمارے بچپن کے بہت سے کھیل محبت کے کھیل ہوتے ہیں اور ایک پانچ برس کی لڑکی ہنرمندی کے ساتھ ایک لڑکے سے چہلیں کر سکتی ہے۔ کورٹ شپ اہم مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ محبت میں وفور اور شدت پیدا کرتی ہے اور اس انتخاب احسن کے لیے مہلت دیتی ہے جو زندگی کے معیار کو بلند کرتا ہے۔ بالغوں میں کورٹ شپ اکثر یہ صورت اختیار کرتی ہے کہ مرد تسخیر کے لیے آگے بڑھتا ہے اور عورت دلربائی کے ساتھ پیچھے ہٹتی ہے۔ اس اصول میں کبھی کبھی استثنا بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ نیوگنی میں لڑکیاں لڑکوں کو کورٹ کرتی ہیں اور انہیں تحفے تحائف پیش کرتی ہیں۔ لیکن یہ ”قابل تعریف“ رسم ابھی ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوئی اور کبھی کبھار لڑکی مرد کا پیچھا کرتی ہے۔ کم سے کم برنارڈ شا کی تمثیلوں میں بالعموم مرد ہی اظہار محبت میں پہل کرتا ہے کیونکہ وہ فطرتاً” جانباز صیاد ہے۔ عورت اس کے لیے ایک شکار کی حیثیت رکھتی ہے جس کی اسے تسخیر کرنا ہے۔ تمام کورٹ شپ ایک جنگ ہے اور تناسل ایک معرکہ تسخیر۔

سٹینلے ہال کہتا ہے کہ ”اکثر حیوانوں کی زندگی میں جنگ کا زمانہ محبت کا عہد ہوتا ہے“۔ انسانوں میں جنگ تجارتی تقابل اور نمائش کی صورت اختیار کرتی ہے۔ ہم دانتوں سے نہیں بلکہ سرمایہ کے ذریعے جنگ لڑتے ہیں اور کاروباری خوش خلقی کے پردے میں پنجے تیز کرتے ہیں۔

عقلمند عورتیں، حیا اور فرار سے مسلح ہو کر جنگ کرتی ہیں۔ حیا ایک شاطرانہ پسپائی ہے جو خوف اور صفائی پسندی سے پیدا ہوتی ہے اور نرم دلی اور درایت سے پھلتی پھولتی ہے۔ یہ انسانوں کی نسل ہی کا خاصہ نہیں، اس کی ایک واضح مثال اور ماخذ یہ ہے کہ مادہ حیوان موسم کے علاوہ مجامعت کرنے سے گریز کرتی ہے۔ مہذب لوگوں میں حیا محبت کی ایک حسین ترین نفسیاتی صفت ہے۔ یہ صفت ایک لاثانی عظمت حاصل کر سکتی ہے اور بعض اوقات روح کی بنیادی محرکات پر قابو پا لیتی ہے۔ قدیم ملائیشیا میں جب عورتوں کی خودکشی کی وبا پھیلی تو عقلمند آئین سازوں نے یہ فرمان جاری کر کے اسے روکا کہ جو عورتیں اپنی جان لیں گی، ان کی لاشیں گلیوں میں برہنہ لے جائی جائیں گی۔

ولیم جیمز کا یہ خیال تھا کہ حیا فطری نہیں بلکہ اکتسابی جذبہ ہے۔ عورتوں نے جب یہ دیکھا

کہ سخاوت سے حقارت پیدا ہوتی ہے تو انھوں نے اپنا یہ انکشاف اپنی بہو بیٹیوں تک پہنچا دیا۔ ڈڑرو ایک قدم اور پیچھے گیا اور اس نے حیا کی یہ توجیہ کی کہ حاسد شوہروں نے اپنی ملکیت قائم رکھنے کے لیے اپنی بیویوں میں جبراً حیا کا جذبہ پیدا کیا۔ بہت سے قبائل میں فقط شادی شدہ عورتیں ہی کپڑے پہنتی تھیں۔ ان کے شوہر یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کے حقوق ملکیت محفوظ رہتے ہیں۔ جب شادی تسخیر کی بجائے کاروباری معاہدہ بن گئی اور والدین نے دیکھا کہ پاکیزہ دوشیزاؤں کے زیادہ دام ملتے ہیں تو انھوں نے لڑکیوں میں حیا کی پرورش شروع کر دی۔ ان مختلف سرچشموں سے حیا ابھری اور عورت کا دل فریب حسن بن گئی۔ بے حیا عورتیں مردانہ قسم کے مردوں کے لیے فقط ہنگامی کشش رکھتی ہیں، نمائش میں احتیاط اور حسن و خوبی کے اظہار میں اختصار اس صید کے بہترین اسلحے ہیں۔ جب بدن کے مخصوص جزئیات کے بارے میں عام لوگ گلیوں میں بات چیت کرتے ہیں تو ہماری توجہ تو مائل ہوتی ہے لیکن جذبات بہت کم متحرک ہوتے ہیں۔ جوان آدمی جھکی ہوئی نگاہوں کی طرف کھنچتا ہے اور غیر شعوری طور پر یہ جانتا ہے کہ اس حیا میں وہ روحانی سپردگی مضمر ہے جو عورت کی ایک بلند صفت ہے۔ حیا اپنے انعامات میں کسی قدر بخل سے کام لے کر مرد کی ہمت اور جرات کو آزماتی ہے۔ اسے نادر کارناموں کی ترغیب دیتی ہے اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتی ہے جو عام لوگوں کی زندگی کی تہہ میں چھپی رہتی ہیں۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ مردوں کے تعمیری کارنامے پرندوں کی رنگین شوکت کی طرح جنس تقابل اور نمائش کی وجہ سے ظہور میں آئے ہوں۔

محبت اپنے آپ کو ولدیت کی صورت میں مکمل کرتی ہے۔ غالباً ہم میں بچے پیدا کرنے کی کوئی جبلت نہیں۔ فقط جنس اور والدانہ شفقت کی جبلتیں ہیں۔ فطرت براہ راست کبھی اپنے مقاصد پورے نہیں کرتی اور انسان اس کی بہترین تخلیق ہے۔ ہسپتالوں میں چلاتی ہوئی عورتوں کی صدائیں اور بچوں کی چیخیں سنیے۔ لیکن کس سادہ ہنرمندی کے ساتھ بچہ ماں کے درد کو سرور میں تبدیل کر دیتا ہے اور باپ میں وہ جذبہ تفاخر پیدا کرتا ہے جو ہنسی خوشی بچے کی نگہداشت اور تربیت کے کڑے اخراجات برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین کے درمیان محبت عود کر آتی ہے۔ لیکن یہ محبت اس شعلے سے خاصی مختلف ہوتی ہے جو پہلے دلوں میں مشتعل رہتا تھا۔ درحقیقت اس ہنگامہ پرور زمانہ میں یہ شعلہ اس وقت تک قریب قریب بجھ چکا ہوتا ہے اور وہ محبت، جس نے ماں باپ کو ہنگامی طور پر ایک کر دیا تھا، اس کا بیشتر حصہ اب بچے کو میسر آتا ہے۔ ماں بچے کی محبت میں باپ کو اکثر نظر انداز کر دیتی ہے اور باپ اگر بچہ لڑکی ہے تو اپنی محبت لڑکی کی نذر کرتا ہے لیکن آخر میں یہ ہنگامی کیفیتیں اپنی کشش کھو دیتی ہیں اور میاں بیوی پھر سے ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔

وقت آخر دو روحوں کے درمیان مکمل شادی کا باعث بنتا ہے کیونکہ ولدیت کے اس عہد میں کتنی ہی آزمائشیں ہوتی ہوں، تقدیر کے کتنے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہوگا اور جسم کی کتنی اذیتیں اور روح کے کتنے آلام برداشت کرنے پڑتے ہوں گے۔ مرض بے وفا تخیل میں ایک گہرائی اور متانت پیدا کردیتا ہے اور محبت موت کے قرب کی وجہ سے ایک نئی زندگی حاصل کرتی ہے۔ مل کر منصوبے بنانا اور ان پر عمل کرنا، فتح و شکست میں اشتراک، دو ہم آہنگ ذہنوں کو اس طرح ایک روحانی یگانگت میں منسلک کرتا ہے کہ گویا دو شخصیتیں ایک ہوگئی ہیں حتیٰ کہ ان کی شکلیں بھی ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ مل کر بچوں کی نگہداشت کرنا، انہیں پھلتے پھولتے دیکھنا اور پھر با دل ناخواستہ انہیں ایک نوجوان عاشق کے سپرد کردینا، شخصیتوں کے مکمل اتحاد کی صورتیں ہیں۔

جب وہ گھر، جو کبھی بچوں کے قہقہوں سے جگمگا اٹھتا تھا، ان قہقہوں کی خاموش یادگار بن جاتا ہے تو محبت ان کئی سالوں کے ساتھیوں کو پھر اپنی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ یہ دور پورا نہیں ہوتا جب تک کہ محبت بڑھاپے کی تنہائی اور موت کے قرب میں دلوں کو حرارت نہ بخشے۔ جو لوگ محبت کو فقط آرزو سمجھتے تھے، وہ فقط اس کے گوشت پوست اور جوڑوں سے آشنا تھے۔ آج جبکہ ہر جسمانی عنصر راکھ ہوچکا ہے، فقط اس کی روح باقی ہے۔ بوڑھے دلوں کے اس تازہ وصال میں ہی جسمانی بھوک سے روحانی محبت تک ارتقا مکمل ہوتا ہے۔

یہ ہے محبت کا چکر۔ اس پر پھر ایک نظر ڈالیے۔ حقیر ترین حیوان کی جسمانی ساخت میں، درندے کے تند جذبے میں، وحشی کی شہوت میں، نوجوانوں کی متفکر اور گداز نگاہوں میں، شعرا کے نغموں میں اور داستان گویوں کے افسانوں میں اسی محبت کی جلوہ گری ہے۔ اس بڈھے جوڑے میں بھی محبت موجود ہے جو خوشی سے لرز جاتا ہے جب اس کے بیٹے پوتے اور نواسے پچاس سالہ محبت کے اعزاز میں یکجا ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کائنات میں اور کیا معجزہ ہوگا کہ عناصر کی باہمی کشش، محبت اور وفا کی شاعری کا روپ دھارتی ہے۔ پھر ہمیں ستیانہ کے وہ دل فریب الفاظ یاد آتے ہیں کہ ”ہر عین فطری بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور قدرت کی ہر چیز عینی نشوونما پاتی ہے“۔ محبت کو اپنی حقیر ابتدا پر شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ آرزو قابل نفرت ہے جو روحانی سپردگی میں اپنا کمال نہیں ڈھونڈتی۔

حکیم محبت افلاطون نے کہا تھا ”وہ جسے محبت نے نہیں چھوا، تاریکی میں سرگرداں رہتا ہے“۔ مرتے وقت لیپلیس نے اپنے ان دوستوں کو برا بھلا کہا جو اس کے انکشافات اور تصنیفات کی شہرت کا ذکر کررہے تھے۔ اس نے کہا کہ ”یہ زندگی کی اہم چیزیں نہیں ہیں“۔ انہوں نے پوچھا تو کیا چیز اہم ہے؟ تو اس سائنس دان نے آخری سانس لیتے ہوئے کہا ”محبت!“

ہر شے فانی ہے فقط محبت کو بقا حاصل ہے۔ محبت موت کے خلا کو تناسل کے ذریعے عبور کرتی ہے۔ ناکامی کی تلخی میں یہ کس قدر مختصر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انسانیت کے نقطۂ نظر سے اسے دوام حاصل ہے۔ آخر میں یہ ہمارے ایک حصے کو انحطاط سے بچالیتی ہے اور ہماری زندگی کو ازسرنو بچے کی توانائی اور زندگی میں محفوظ کر دیتی ہے۔ ہماری دولت ایک تکان ہے اور ہماری حکمت ایک مختصر اور سرد روشنی۔ لیکن محبت ہمارے دلوں کو ایک ناقابل بیان سکون سے گرماتی ہے۔ وہ سکون، محبت حاصل کرنے سے اتنا نہیں، بلکہ محبت دینے سے بڑھتا ہے۔

⁂

باب ہشتم

مرد اور عورت

۱۔ محبت کی جنگ

گورکی اور چیخوف کرائیمیا میں ٹہل رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ساحل پر پہنچے جہاں ٹالسٹائے فکر و تدبر میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئے اور عورتوں کی باتیں کرنے لگے۔ ٹالسٹائے خاصی دیر تک ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر کہنے لگا: "اور میں عورتوں کی حقیقت اس وقت بتاؤں گا جب میرا ایک پاؤں قبر میں ہوگا۔ میں حقیقت بتا کر فوراً اپنے کفن میں کود جاؤں گا اور اسے بند کر کے کہوں گا 'اب میرا جو کچھ بگاڑنا ہے بگاڑ لو'"۔ جب کونٹ کیسرلنگ نے اپنی "کتاب شادی" کے لیے برنارڈ شا کو ایک مضمون لکھنے کی دعوت دی تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ "کوئی مرد جب تک کہ اس کی بیوی زندہ ہے شادی کی حقیقت بیان نہیں کر سکتا"۔ تاہم، ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے، لیکن اپنی گفتگو اور تجزیہ کو روایتی اور معمولی قسم کی مثالوں تک محدود رکھیں گے۔

اس موضوع کے متعلق دنیا کا ادب نہایت دلچسپ مگر حد درجہ ناقابل اعتبار ہے۔ دلچسپ اس لیے کہ اس کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے ہے۔ سوائے اس صورت کے جب وہ انسانوں کی خامیاں بیان کرتا ہے۔ یہ اس لیے ناقابل اعتبار ہے کہ اکثر و بیشتر یہ آپ بیتیوں پر مشتمل ہے اور آپ بیتی افسانہ ہوتی ہے۔ یہ بالعموم انتقام کی آواز ہوتی ہے اور شکست خوردہ سپاہی اسے بلند کرتے ہیں۔ جب کوئی مرد عورتوں کے متعلق کوئی کتاب لکھتا ہے تو یہ اس کے دل کے زخموں کی صدا ہوتی ہے اور جب کوئی مرد کسی عورت کے دل پر فتح پاتا ہے (اگر وہ طبعاً "شریف" ہے) تو اپنی فتح

کو شادی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک حکیمانہ خاموشی اختیار کرلیتا ہے۔ اس لیے دو شخص ایک ساتھ نہیں بول سکتے۔ اگر وہ ناکام رہتا ہے تو کتابیں لکھتا ہے۔ جنس مخالف کے بارے میں شوپنہار، نیطشے، وائینگر اور دوسرے ناکام مردوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان سے کہیں زیادہ دلچسپ مردوں کا وہ تجزیہ ہو سکتا ہے جو عورتیں مردوں کے متعلق کریں۔ اس لیے کہ وہ فطرت انسانی کو مرد کے مقابلے میں کہیں بہتر سمجھتی اور ان کے متعلق زیادہ ذہانت اور آزادی سے اظہار خیال کر سکتی ہیں۔ لیکن عورتیں اتنی ہوشیار ہیں کہ ادب کے ذریعے اپنے دل کا بھید نہیں کھلنے دیتیں۔ وہ اس خیال سے مسرور اور مطمئن ہیں کہ ان کے دشمن کتابیں لکھتے ہیں۔

یہ لازمی ہے کہ اس موضوع پر کسی اوسط آدمی کا فیصلہ یکطرفہ ہو، اس لیے کہ داخلی طور پر وہ فقط اس موضوع کے نصف حصے سے واقف ہے بلکہ شاید اس نصف کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ قریب سے جانتا ہے اور اس قلیل حصے کو بھی دیانت اور خوبی سے نہیں جانتا۔ جنگ کے دوران میں غیر جانبدار ہونا مشکل ہے، اسی لیے اس موضوع کے ضمن میں سائنس خام ہے۔ پروفیسر تھورن ڈائیک کے کم کم اور منتشر مشاہدات اور ذہنی آزمائشوں کی ضخیم روئیدادیں محض ہنگامی شعبہ تحقیق کی حیثیت رکھتے ہیں، جس میں ترقی کرنے کی صلاحیت مشکل ہی سے ہے۔ انسانوں کا آخری مطالعہ انسان کا مطالعہ ہو گا۔ آخری سائنس نفسیات اور آخری موضوع عورت ہو گی۔

لیکن ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہم افادی نقطۂ نظر سے انسانی فطرت کو بنیادی جبلتوں میں تقسیم کریں گے اور ہر جبلت کی بحث کے ضمن میں یہ دیکھیں گے کہ عورتوں کا ذہن اور شخصیت مردوں کے ذہن اور شخصیت سے کیونکر مختلف ہے۔ ہم یہ فرض کریں گے کہ انسان چند بنیادی رجحانات اور عمل اور احساس کی محرکات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جنہیں شوپنہار کے وقت سے فلسفی اور ماہرین نفسیات جبلت کا نام دیتے آئے ہیں۔ ہم ان موروثی رجحانات کی وہ تقسیم قبول کریں گے جو پروفیسر مارشل نے مرتب کی تھی۔ یہ موروثی رجحانات تین مقاصد کے نقطۂ نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ چند جبلتیں، مثلاً بھوک، پیکار، فرار اور کھیل فرد کی بقا کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ کچھ اور جبلتیں مثلاً بزم آرائی اور مقبول ہونے کی آرزو، اجتماع کو قائم رکھتی ہیں اور کچھ اور جبلتیں مثلاً تناسل اور والدانہ شفقت نسل کی بقا کے لیے مفید ہیں۔ ہم یہاں یہ سوال پوچھیں گے کہ آیا مردوں اور عورتوں میں یہ جبلتیں نوعیت اور شدت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں؟ ہم ابتدا نسلی جبلتوں سے کریں گے، کیونکہ ان کے مختلف طرز عمل سے جنسوں کے درمیان جسمانی، ذہنی اور شخصی اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔

۲۔ شخصیت کے اختلافات

(الف) نسلی جبلتیں

نر بھی اس بات پہ حیران ہے کہ حیوانوں کی دنیا میں مادہ غالب ہے، محض جسم میں نہیں (جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں) بلکہ اس حیاتیاتی برتری میں کہ وہ نسل کی بقا کی براہ راست ذمہ دار ہے۔ زندگی کے حقیر درجوں میں بقائے نسل تقسیم بدن کے ذریعے ہوتی ہے اور اس لیے جنسوں کا وجود نہیں ہوتا۔ انسانی نسل میں تناسل کا حقیقی عمل مادہ کے اندر ہوتا ہے۔ مرد کی حیثیت محض ایک غیر ضروری حادثے کی سی ہے۔ قدرت اور تجربہ گاہ دونوں متفق ہیں کہ نر غیر ضروری ہے۔ یہ امر تلخ حد تک واضح ہے کہ کسی نسل میں مادہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور نر ثانوی۔ نر ان وظائف کی تجسیم و تخصیص ہے جو کبھی اس کے بغیر عمل میں آتے تھے۔ تناسل کی اس عظیم تمثیل میں، جس کے گرد تمام زندگی گھومتی ہے، نر ایک نہایت غیر اہم اور سطحی پارٹ ادا کرتا ہے۔ پیدائش کے نازک موقع پر وہ عجز اور بے بسی کی حالت میں ایک طرف کھڑا رہتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ نسل کی بقا کے سلسلے میں وہ کتنا غیر اہم آلہ ہے۔ اس وقت وہ جانتا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ نسل کے بہت قریب ہے اور یہ کہ زندگی کی عظیم الشان موج عورت کے جسم میں بے تابی سے دوڑتی ہے اور اسی کے گوشت پوست اور خون سے نئی نسل کی تخلیق ہوتی ہے اور یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ وحشی لوگ اور بڑے بڑے مذہب کیوں ماتا کی پرستش کرتے ہیں۔

عورت میں حیا کی افراط تناسل کے مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ اس کی باحیا پسپائی جنسی انتخاب میں مدد دیتی ہے۔ وہ اس میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے شریک زندگی کا سوجھ بوجھ کے ساتھ انتخاب کر سکے۔ کیونکہ یہی شریک زندگی بعد میں اس کے بچوں کا باپ بنے گا۔ نسل اور اجتماع کا مفاد اس کے وجود میں مضمر ہے، جس طرح فرد کا مفاد مرد کے ذریعے اظہار پاتا ہے۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے اور ماں بن کر اپنی شخصیت کی تکمیل کر لیتی ہے تو اس کی حیا بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس تفاخر میں کس قدر خوشگوار سادگی ہے جس کے ساتھ ایک دیہاتی ماں، جو حال ہی میں بہت شرمیلی تھی، منظر عام پر اپنے بچے کو دودھ پلاتی دیکھی گئی اور اس کی یہ حرکت بجا ہے۔ زندگی اور فن کے تمام مناظر اور تصاویر میں یہ منظر حسین ترین ہے۔

عورت محبت کے معاملے میں مرد سے اس لیے زیادہ سمجھدار ہے کہ بالعموم اس کی آرزو کم شدید ہوتی ہے اور اس کے فکر کو نہیں الجھاتی۔ یہی اس کی قدیم حکمت کا راز ہے۔ ڈارون کا یہ خیال تھا کہ اکثر نسلوں کی مادہ محبت سے کسی قدر بے نیاز ہوتی ہے۔ لومبروزو، کش، کرافٹ اینگ

اور دوسرے علماء کا یہ خیال ہے کہ انسانی نسل میں بھی چالیس فی صد عورتیں جنسی تعلقات سے بیزار رہتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت جسمانی لذت نہیں ڈھونڈتی بلکہ بے انتہا تعریف اور بے حد توجہ کی خواہشمند ہوتی ہے۔ اور اکثر اوقات محض یہ خوشی کہ کوئی اسے چاہتا ہے، اسے مطمئن کر دیتی ہے۔ ٹامس ہارڈی کہتا ہے کہ کبھی کبھی عورت کی یہ خواہش کہ اس سے محبت کی جائے، اس کے ضمیر کو بے بس کر دیتی ہے۔

جس چیز کو ہم نے محبت کا روحانی عنصر کہا تھا، یعنی محبت کا وہ عنصر جو بدن سے دلچسپی نہیں رکھتا، مرد سے زیادہ عورت کو پسند ہوتا ہے۔ عورت کی فطرت کے بعض مطالعہ کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ عورت کی محبت اتنی جنسی نہیں ہوتی جتنی کہ مادرانہ شفقت سے معمور ہوتی ہے۔ لومبروزو کہتا ہے کہ "عورت کی محبت دراصل اس کی مامتا کی ایک ثانوی صفت ہے اور محبت کے وہ تمام احساسات، جو عورت کو مرد سے متعلق کرتے ہیں، جنسی محرکات سے نہیں بلکہ سپردگی اور اطاعت کی جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں"۔ الفرڈ ڈیوائنی کا یہ خیال تھا کہ مرد کی محبت ماں کے سینے کی یاد اور آرزو ہے اور شاید ہر عاشق اپنی محبوبہ کے لیے محض ایک بچے کی حیثیت رکھتا ہے جسے وہ خوشی اور اطمینان بہم پہنچاتی ہے۔

عورت کا جذبہ محبت مرد کے مقابلے میں کم شدید ہوتا ہے لیکن اس میں وسعت اور گہرائی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اس کی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر کونہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ جبھی زندہ رہتی ہے اگر اس سے محبت کی جائے۔ فرانس کے ایک مجسٹریٹ نے جب ایک عورت کو ایک چور کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر مطعون کیا تو اس نے جواب دیا کہ "جب میں محبت میں مبتلا نہیں ہوتی تو میں زندگی سے محروم ہو جاتی ہوں"۔

غالباً وائیننگر کے ذہن میں عورت کی اس نفسیاتی ضرورت کا تصور تھا، جب اس نے کہا کہ عورت روح سے محروم ہوتی ہے اور یہ کہ اس کا وجود مرد کے وجود پر مرکوز ہوتا ہے۔

بسا اوقات وہ مرد کی شخصیت کو اپنا لیتی ہے لیکن اس کی تہہ میں بھی فریب ہوتا ہے۔ عورت، محض مرد کی آراء کی نقل کرتی ہے۔ اپنے آپ میں وہ اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مرد اپنی غیر محدود انانیت میں اس سے متنفر ہو جائے گا، اگر وہ اپنی شخصیت کا پوری طرح اظہار کرے۔

اگر عورت محبت کے فن میں مرد کو نیچا دکھاتی ہے تو مرد دوستی کے معاملے میں اس سے کہیں بہتر ہے۔ مرد دوست ہو سکتے ہیں لیکن عورتیں محض ملاقاتی۔ جب عورتیں دوسری عورتوں کی تعریف کرتی ہیں تو ستارے اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔ عورتوں کے لیے اپنے آپ کو خوش رکھنا

بہت مشکل ہے۔ انہیں ایک دوسرے کی موجودگی میں بے حد الجھن محسوس ہوتی ہے اور اس بیزاری کو مردوں کی باتوں سے بہلاتی ہیں اور یہ بات قدرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ مدت ہوئی، روشفو کو نے کہا تھا کہ اکثر عورتیں اس لیے دوستی کی اہل نہیں ہوتیں کہ دوستی محبت کے بعد پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ اور بقول شاعر، محبت مرد کی زندگی کا ایک حصہ ہے مگر عورت کا سارا وجود۔ ہمیں اپنی فطرتوں کے مطابق زندہ رہنا ہے۔

مرد کا حسد اس کی محبت کی طرح زیادہ شدید مگر غیر مستقل ہوتا ہے۔ مرد میں ملکیت کی ہوس مستحکم تر اور اس کی محبت کا نصف ہوتی ہے۔ محبت محض سپردگی نہیں ہوتی، وہ انا کی توسیع اور فتح بھی ہوتی ہے۔ حسد ملکیت کی جبلت ہے جو تقابل سے ڈر جاتی ہے۔ یہ "جملہ حقوق محفوظ" کی خلاف ورزی کی سزا ہے۔ "میں تمہارا آقا، تمہارا خدا ہوں۔ تم اجنبی خداؤں کو میرے مقابلہ میں لا کر کھڑا نہیں کرو گے"۔ عورت کے لیے یہ امر کسی قدر غیر اہم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب پہلے کسی اور کا بھی محبوب رہ چکا ہے، لیکن مرد کی حالت اس کے برعکس ہے۔ عورت کے حسد میں اگرچہ شدت اور گہرائی نہیں ہوتی لیکن اس میں وسعت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ فقط اپنے شوہر کی محبوباؤں کی حاسد نہیں ہوتی بلکہ اس کے احباب، اس کے پائپ، اس کے اخبار اور اس کی کتابوں سے بھی جلتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اسے دوستوں سے علیحدہ کر دیتی ہے اور اگر اس علیحدگی کی کوئی اور صورت نظر نہ آئے تو ان دوستوں کے ساتھ نظربازی شروع کر دیتی ہے اور اس طرح اپنی چالبازی کو گناہ کی رنگینی دیتی ہے۔ جب مرد عورت کے مداحوں سے جلنے لگتا ہے تو وہ مضطرب نہیں ہوتی۔ وہ مرد کے حسد کو بڑھاتی ہے اور اس میں لذت لیتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ مرد کو اسی حد تک پسند ہے جس حد تک کہ مرد کو اپنی ملکیت غیر محفوظ محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ مرتی ہوئی محبت کے لیے حسد سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ یہ حسین خامیاں قابل عفو ہیں۔ سماج میں عورت کو ادنیٰ مقام حاصل ہے اور اسے مرد کی جسمانی برتری کے مقابلہ کے لیے ان حیلوں کی ضرورت ہے۔ اسے ہر حالت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے کیونکہ نسل اپنی بقا اور استحکام کے لیے عورت کی محتاج ہے۔ وہ محبت میں اپنے مختصر حصے کی بہت بڑی قیمت ادا کرتی ہے۔ اس لیے اسے اس کی چالاکی پر مطعون کرنا بجا نہیں۔ عورتوں کے ساتھ جس قدر نرمی برتی جائے کم ہے۔

(ب) انفرادی جبلتیں

عورت کا وظیفہ نسل کی خدمت کرنا ہے اور مرد کا وظیفہ عورت اور بچے کی خدمت کرنا۔ ان کے اور وظائف بھی ہیں مگر وہ ان بنیادی وظائف کے تابع ہیں۔ ان بنیادی اور نیم غیر شعوری مقاصد میں قدرت نے ہماری اہمیت اور ہماری خوشی مضمر رکھی ہے۔

اس لیے مرد کا فطری کام حفاظت کرنا اور حصول اشیا کے لیے معرکہ آرائی کرنا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ خوراک کی تلاش میں گھر سے باہر جائے۔ وہ غذا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور عورت تناسل کا۔ غذا مرد کا مقصد ہے۔ اگر وہ کچھ اور چیزوں کی طلب بھی رکھتا ہے تو اس لیے کہ یہ چیزیں دولت کی علامت ہیں اور دولت زبوں حالی میں غذا کی ضامن ہے۔ مسٹر ڈورس نے کہا ہے کہ تمام اچھی چیزیں پیٹ سے تعلق رکھتی ہیں اور اگرچہ یہ بات کہنا بعید از اخلاق ہے لیکن یہ مرد پر صادق آتی ہے۔ مرد کو خوراک بے حد عزیز ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ آسانی سے مطیع ہو سکتا ہے۔ وہ عورت سے زیادہ کھانے اور پینے کا رسیا ہے اور جب سے حوا نے آدم کو سیب پیش کیا تھا، عورت نے مرد کے پیٹ کے ذریعے اس پر حکومت کی ہے، اور ایک ہی وار میں اس کے ہاضمے اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔

خوراک کی جستجو میں نر ایک سپاہی بن گیا۔ حیوانوں میں وہ دانتوں اور پنجوں سے لڑتا ہے، انسانوں میں سرمایہ اور دولت سے، قوموں میں بحری اور بری فوجوں اور اخباروں سے۔ کپلنگ کا یہ خیال تھا کہ مادہ نر سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ لیکن غالباً اس نے کوئی زخم کھائے تھے، جن سے اس کی نظر صائب نہیں رہی۔ عورت کی فطرت امن و تحفظ چاہتی ہے نہ کہ جنگ۔ اور بعض نسلوں میں تو مادہ میں لڑنے کی جبلت کا وجود ہی نظر نہیں آتا۔ جب کبھی وہ لڑتی ہے تو اپنے بچوں کے لیے۔ اگر اس میں تندی و تیزی کی صلاحیت موجود ہے تو یہ اسی وقت بروئے کار آتی ہے جب نسل کو کوئی خطرہ ہو لیکن بظاہر وہ جنگ کی خوگر نہیں ہوتی اور اس کے اکادکا جرائم اس کی جسمانی خرابیوں کی وجہ سے اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ مرد سے زیادہ صابر ہے اور اگرچہ مرد زندگی کے بڑے مسائل میں جرات سے کام لیتا ہے لیکن عورت چھوٹی چھوٹی مصیبتوں اور مشکلوں کو برداشت کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ بیماری کو خاموشی سے برداشت کرتی ہے، جیسے اس میں اسے کوئی خفیہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ (شاید روزمرہ کے کام کاج سے کچھ دنوں کے آرام کی لذت) اس کے برعکس مرد جو ساکن زندگی کا خوگر نہیں ہوتا، بیماری میں بے قرار رہتا ہے اور دنیا میں اپنی تکلیف کو مشتہر کرتا ہے۔

لیکن عورت ایک اور طرح پیکار پرست ہے۔ وہ سپاہی سے متاثر ہوتی ہے اور ایک جابر مرد کی اطاعت میں لذت حاصل کرتی ہے۔ اس کے اندر اذیت پسندی کا ایک عجیب عنصر ہے جو طاقت کے مظاہرہ سے مرعوب ہوتا ہے۔ چاہے اس طاقت کا شکار وہ خود ہی کیوں نہ ہو۔ ہر نسل میں وہ لڑاکو مرد کا انتخاب کرتی ہے۔ غیر شعوری طور پر وہ یہ جانتی ہے کہ اس کے گھر اور اس کے بچوں کو حفاظت کی ضرورت ہوگی۔ کبھی کبھی مردانگی میں یہ قدیم لذت اس کے حالیہ اقتصادی شعور پر قابو پا

جاتی ہے اور وہ ایک بہادر آدمی سے شادی کر لیتی ہے چاہے وہ آدمی بے وقوف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ پوری آمادگی سے ایک اولوالعزم مرد کی اطاعت کرتی ہے۔ اگر ہمارے زمانے میں وہ اتنی فرمانبردار نہیں رہی تو اس لیے کہ اس زمانے کے مردوں کی شخصیتوں میں پہلا سا دم خم موجود نہیں۔ غالباً صنعت کی عقل کش پابندیاں اور ذہنی زندگی کے جاں سوز تصنع نے مردوں کو غلامی کا خوگر بنا دیا ہے اور ان کی ہمت و جرات کو مضمحل کر دیا ہے۔

عورت لڑائی اور بہادری سے نہیں بلکہ استقلال سے اپنی فتوحات حاصل کرتی ہے۔ مرد کی جنگجوئی شدید تر اور کھلم کھلا ہوتی ہے۔ مگر وہ اتنی مستقل نہیں ہوتی۔ وہ امن کی خاطر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ چیخے چلائے، حتیٰ کہ اپنی بیوی کو زدوکوب کرے لیکن آخر میں فتح عورت ہی کی ہوتی ہے۔ کمزور نسلیں، عوام، اجناس اور افراد، صبر اور چالاکی خوب جانتے ہیں۔ نپولین جو ایک براعظم کی تسخیر کر سکتا تھا، اپنی بیوی کو مطیع نہ کر سکا۔ اس کی طاقت جوزوفین کی جسمانی کمزوری اور بزدلی کے سامنے بے بس تھی۔ کیونکہ جو اسلحے وہ استعمال کرتی تھی، اس کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ نپولین لکھتا ہے کہ ”میری شخصیت کی قوت کی اکثر تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اپنے بیوی بچوں کے لیے میں ہمیشہ ایک کمزور انسان رہا۔ اور وہ یہ جانتے تھے کہ پہلی لڑائی کے بعد ان کا استقلال اور ان کی ضد ہمیشہ فتح پاتی اور محض تکان کی وجہ سے وہ میرے ساتھ جو چاہتے کرتے“۔ آج ہر گھر میں یہی حالت ہے۔ اس عیاش زمانے میں، جبکہ ایک متوسط طبقے کی بیوی اس گھر میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتی ہے جس میں نہ کوئی کام ہے نہ کوئی بچہ۔ حالات مرد کے خلاف ہیں۔ جب وہ سارے دن کے کام اور مصیبت کے بعد گھر لوٹتا ہے تو اس کی قدیم دشمن نئی قوت سے تازہ دم اس کی منتظر ہوتی ہے۔ جنگ سے پہلے ہی اسے شکست ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی طرح اتفاقاً“ وہ جیت جائے تو عورت کے لیے فقط رونا کافی ہے اور وہ شکست کھا جاتا ہے۔ میریا لوئیسا کہا کرتی تھی کہ اگر وہ کسی چیز کے لیے دو مرتبہ رو دے تو وہ اسے مل جاتی تھی۔ عقل مند بیوی کو جنگ کا یہ بنیادی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ اگر پہلی مرتبہ تم کامیاب نہ ہو تو ایک دفعہ اور رو دو۔

جہاں تک عمل کی جبلتوں مثلاً رینگنے، چلنے، پھینکنے، کودنے، دوڑنے اور کھیلنے کا تعلق ہے، مادہ نر سے کم ہوشیار معلوم ہوتی ہے۔ مرد بیکار حرکت کی طرف مائل ہے اور عورت غیر ضروری سکون کی طرف۔ عورت مرد سے زیادہ ست ہوتی ہے اور اس لیے زیادہ خطرناک جنس۔ کیونکہ بیکاری زنا کو جنم دیتی ہے۔ نیکی، مسرت اور حسن حاصل کرنے کے لیے لازمی ہے کہ انسان کام میں مصروف ہے۔

(ج) اجتماعی جبلتیں

جن جبلتوں کا ہم نے جائزہ لیا ہے، یعنی انفرادی جبلتوں میں مرد کی برتری واضح اور قدرتی ہے۔ لیکن اجتماعی اور نسلی جبلتوں میں عورت کو تفوق حاصل ہے۔ عورت مرد سے زیادہ اجتماع پسند ہے۔ وہ محفلوں اور گروہوں کو پسند کرتی ہے اور بطیب خاطر کسی اژدحام میں اپنے آپ کو ایک بے نام حیثیت کے سپرد کر دیتی ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتی کہ بہترین ڈرامے، بہترین موسیقی اور بہترین جگہ کون سی ہے۔ بلکہ یہ کہ سب سے زیادہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟ اگرچہ اس سلسلے میں اس کے شوہر اور اس کے درمیان فرق بہت کم ہے (کم سے کم وہ بہترین چیز کو پسند کرنے کی کوشش کرتی ہے) لیکن ایک اوسط مرد موسیقی کی محفلوں، آرٹ کی نمائشوں اور ڈراموں میں مجبورا بیوی کے خوف سے جاتا ہے۔ عورت مرد سے کم تنہائی کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس لیے عورتیں بہت کم تارک الدنیا ہوتی ہیں۔ عورت مرد کے بغیر زیادہ نامکمل محسوس کرتی ہے اور مرد عورت کے بغیر اتنا نامکمل محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ عورت کو مرد کی حفاظت اور قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت ایک بزم پسند حیوان ہے۔

اس لیے وہ زیادہ باتونی ہے۔ افواہ ہے کہ وہ اپنے دل میں کوئی راز نہیں رکھ سکتی۔ فرینکلن کا یہ خیال تھا کہ "تین شخص ایک راز کو سربستہ رکھ سکتے ہیں اگر ان میں سے دو مر چکے ہیں"۔ لیکن اس بات کو دونوں جنسوں پر صادق کرنے کے لیے ہمیں شرح اموات بڑھانی پڑے گی۔ تاہم عورتیں مردوں سے زیادہ دیر تک خاموشی سے کوئی دکھ برداشت کر سکتی ہیں۔ عورت احساسات اور جذبات کے ہاتھوں اکثر و بیشتر بے بس ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ ذہنی خرابیوں کی زیادہ شکار ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سماج اس کی جنسی آرزوؤں پر کڑی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا چہرہ اس کی گفتار کی طرح اس کے جذبات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس نے تقدیر پسند فلسفی اور محتاط تاجر کی طرح یہ نہیں سیکھا ہوتا کہ نفع و نقصان، لذت و الم میں چہرے کو کیسے بے کیف بنایا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں دوسروں کے خیالات اور احساسات کا اندازہ لگانے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ عورت کو دھوکا دینا زیادہ مشکل ہے۔

جیسا کہ گالٹن نے ہمیں بتایا تھا کہ بزم پسندی، کم ہمتی اور نقل کی صلاحیت کے ساتھ بدلتی ہے۔ عورت بالعموم پہلا اقدام مرد پر چھوڑتی ہے اور اسی میں مرد کے غلبہ کا راز مضمر ہے۔ اور اگر آرزو کی تازہ شراب اسے سرمست نہ کر دے تو وہ برسوں تک اسے انتظار کی تلخ گھڑیاں گننے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ خود دولت جمع کرنے اور دوسری عورتوں کے ساتھ تجربہ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ عورت کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی کمزوری اور اقتصادی احتیاج اس کے

ذہن کو بوجھ کی طرح دبائے رکھتی ہے۔ اس کی جرات کے نشتر کو کند بنا دیتی ہے اور اسے بغاوت اور اولوالعزمی کے جذبات سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ رسم و رواج سے چمٹی رہتی ہے اور پارسائی کے ساتھ ماضی کی لکیر پیٹتی رہتی ہے۔ لباس، اطوار اور افکار کے تازہ فیشنوں کو اپناتی تو ہے لیکن سہم کر۔ وہ ہر نئے طرز فکر کو بغیر سوچ سمجھے مرد سے پہلے قبول کر لیتی ہے۔ ماہر تجزیہ نفس اس کی خوف زدہ روح کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ ماہر روحانیات اسے روحوں کی تصویریں دکھا کر تسکین دیتا ہے اور اس کے لجلجے واہمے سے کھیل کر دولت کماتا ہے۔

عورت مرد کی طرح اعتدال سے بہت زیادہ تجاوز نہیں کرتی۔ عورتوں میں سے بہت کم بے وقوف اور بہت کم فطین ہوتی ہیں۔ ایک مرد دوسرے مرد سے اتنا مماثل نہیں ہوتا جتنی کہ ایک عورت دوسری عورت سے۔ ایک بدلتے ہوئے ماحول، مختلف اور متنوع پیشوں کے تقاضوں نے مردوں کی ہزاروں قسمیں بنا دی ہیں۔ لیکن گھر کے روایتی کام کاج، شوہر کے ساتھ شرکت حیات اور بچوں کی تربیت، یہ امور تقریباً تمام عورتوں کی زندگی سے متعلق ہیں اور انہیں ایک ہی سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ظاہر اگرچہ مختلف ہوتے ہیں لیکن باطن ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مرد نہایت سہولت سے اپنی توجہ ایک عورت سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف کر دیتا ہے۔ اسے محض ایک نیا نام سیکھنا ہے، کوئی نیا ہنر نہیں سیکھنا۔ حتی کہ کبھی کبھی پرانے خطوط بھی کام آ سکتے ہیں لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ ایک عورت جو محبت میں ناکام رہی ہو، اپنی ناکامی کو کبھی برداشت نہ کر سکے۔ اس نے اپنی روح ایک خاص تصور کے ساتھ وابستہ کر دی ہے اور جہاں کہیں بھی وہ جائے گی، اس کا دل اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ رہے گا۔

عورت کو بزم آرائی کی آرزو کے ساتھ اجتماعی قبولیت حاصل کرنے کی بھی ہوس ہے۔ اسے ہمسایوں کی رائے، مرد کی رائے سے زیادہ متاثر کرتی ہے کیونکہ جو لمحے محبت اور مامتا میں صرف نہیں ہوتے، وہ اجتماعی تعلقات میں صرف ہوتے ہیں۔ وہ مرد سے زیادہ خودپسند ہوتی ہے۔ اسے اپنی خوبیوں اور حسن کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ناک پر پاؤڈر لگانے میں آدھ گھنٹہ لگا سکتی ہے۔ اگرچہ اس کی خودپسندی مرد کے تکبر سے بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کی اظہار پسندی بعض اوقات غیبت کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی نقالی اسے رسم و رواج کا پابند بنا دیتی ہے۔ اپنے شوہر سے زیادہ وہ دنیا میں عروج کی متمنی ہوتی ہے اور اس کی ترقی کرنے کی خواہش ہی مرد کی ترقی کی آدھی قوت ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے سے بہتر لوگوں کے سامنے بہت ہی حقیر اور کمتر لوگوں کے سامنے بہت برتر محسوس کرتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ بہت خوش اخلاق ہوتی ہے۔ اجتماعی حسیت اور مامتا کا امتزاج اسے مرد سے زیادہ نرم دل اور ہمدرد بنا دیتا ہے۔ اس کی دل فریب خودپسندی سے

قطع نظر اس میں ہمدردی اور رحم دلی کی صفات بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ وہ بیماروں اور کمزوروں کی نگہداشت اور امداد میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس کی فطرت ان اخلاقی خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہے۔

ذہن اور قلب کی ان صفات نے اسے مذہب کے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اپنے جذباتی تناؤ کی وجہ سے وہ مذہب کی پکار جلدی سنتی ہے۔ کیونکہ مذہب اس کے حواس اور احساسات کو بہت متاثر کرتا ہے۔ جنسی آرزوؤں پر کڑے دباؤ کی وجہ سے وہ ہر قابل پرستش چیز کی شکرگزاری سے پرستش کرتی ہے۔ وہ ان حوادث کو زیادہ محسوس کرتی ہے جو زندگی کو اداس بناتے ہیں۔ مرے ہوئے عزیزوں سے دوبارہ وصال کی آرزو اس میں بقائے روح کا یقین پیدا کرتی ہے۔ قدرت اس کے لیے ایک مقدس طلسم کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ اپنی اس نادانی میں وہ ہماری میکانکی سائنس سے کہیں زیادہ قدرت کے اسرار کے قریب ہو۔ وہ جبلی طور پر ان چیزوں کی پرستش کرتی ہے جنہیں مرد تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ جسمانی طور پر محتاج ہونے کی وجہ سے وہ قادر مطلق کی پناہ ڈھونڈتی ہے۔ دنیا کے مصائب کی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان ہو کر وہ آسمانی ہدایت کے لیے دعا کرتی ہے۔ تنہائی سے خوفزدگی اور بزم آرائی کی دلدادگی نے اس میں خدا کے حضور کی پیاس پیدا کی ہے۔ وہ فضا کو ان روحوں سے آباد کرتی ہے جو شاید اس کی تنہائی اور احتیاج میں اس کی رفیق بنیں۔ وہ نئے عقائد کا خیر مقدم کرنے میں پہل کرتی ہے اور پرانے عقائد کو ترک کرنے میں تامل کرتی ہے۔ مایوسی میں مرد خودکشی کر سکتا ہے۔ لیکن عورت ہر طرف سے ناامید ہو کر اپنے آپ کو آسمانی طاقتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے اور خدائے رحیم کی آرزو میں قوت اور تسکین پاتی ہے۔

۳۔ ذہنی اختلافات

تو یہ ہیں مردوں اور عورتوں کی جبلتیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ بنیادی محرکات تجربے اور تعلیم سے متاثر نہیں ہوتیں۔ دونوں جنسوں میں ان محرکات کی بنیاد پر عادت اور عقل کی تعمیر استوار ہوتی ہے۔ یہ تعمیر مردوں اور عورتوں میں کس طرح مختلف ہے؟

مردوں میں یہ زیادہ بلند اور زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ کئی نسلوں سے مردوں کو گھروں سے نکل کر اس متنوع دنیا میں زندگی کی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ انہیں نئے حالات پر قابو پانا پڑا ہے جن پر قابو پانے کے لیے ان کی قدیم جبلی محرکات ناکافی تھیں۔ اس لیے ان میں کامیاب نادر عمل کی لچک پیدا ہوگئی‘ جسے جبلت کی ذہانت کہتے ہیں۔ جبلت بھی ذہین ہو سکتی ہے۔ اگر حالات روایتی قسم کے ہوں تو جبلت کام آ سکتی ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ وہ عقل سے زیادہ کامیاب ثابت ہو۔ موجودہ

زمانے تک عورت کی زندگی کے مرکزی وظائف شوہر حاصل کرنا اور بچوں کی تربیت کرنا تھا اور یہ بات صنعتی طبقہ کی شہری عورتوں کے علاوہ آج بھی سب عورتوں پر صادق آتی ہے۔ یہ مرکزی وظائف بہت قدیم مسائل ہیں۔ ابتدائے تاریخ سے ہر عورت کو ان سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان مسائل کے لیے قدرت نے جبلی محرکات کی تعمیر کی تھی، جو بالعموم کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

اس لیے عورت (سوائے صنعتی طبقہ کی عورتوں کے) اپنی جبلتوں کے ربط، شدت اور کامیابی میں مرد سے کہیں برتر ہے۔ مرد کی تعمیر میں خردہ گیری، تشکک اور فکرمندی بسی ہوئی ہے۔ لچک کی خاطر اس کی جبلتیں پارہ پارہ ہو گئی ہیں۔ اور ان میں فوری عمل کی صلاحیت اور اعتماد باقی نہیں رہا۔ عورت کے سامنے مرد ہمیشہ بوکھلایا رہتا ہے۔ جہاں کہیں کسی مرد کو پھانسنے، کسی عاشق کو گرویدہ رکھنے یا گھر بنانے کا مسئلہ درپیش ہو، عورت زیادہ خود اعتمادی سے عمل کرتی ہے، بہتر منصوبے بناتی ہے اور انہیں فوراً عملی جامہ پہناتی ہے۔ محبت کی جنگ میں کوئی تیس سالہ مرد ایک بیس سالہ عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کسی مرد کو دیکھو (چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو) جو کسی عورت کی محبت میں مبتلا ہے (چاہے وہ کتنی ہی جوان کیوں نہ ہو) کہ کون کس کے اشارہ پر ناچتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو عورت ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آتی ہے، لیکن مرد کو وہ تلخ تجربے اور مایوسیوں کے بعد سیکھنی پڑتی ہیں۔ عورت دیکھتی زیادہ ہے مگر قوت بیان کم رکھتی ہے۔ مرد دیکھتا کم ہے مگر قوت بیان زیادہ رکھتا ہے۔ عورت بغیر سوچے سمجھے سوچتی ہے اور بغیر تدبر کے جھوٹ بولتی ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں مرد سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے اور جب وہ کوئی گناہ کرتے پکڑی جائے تو نہایت اطمینان سے اپنی صفائی پیش کرتی ہے۔

زندگی کے روزمرہ کاموں کے لیے عورت پیدائش ہی سے مسلح ہوتی ہے۔ عورت جلدی بالغ ہوتی ہے، اس لیے اس کے عنفوان شباب کا زمانہ مختصر ہوتا ہے۔ کچھ مردوں نے اس بنا پر اسے ایک ادنیٰ جنس قرار دیا ہے۔ لیکن یہ غلط استدلال ہے۔ اس طرح تو فاختہ خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ اس طرح تو ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عورت ذہنی طور پر مرد سے برتر ہے کیونکہ اس کے دماغ کا اس کے جسم سے تناسب مرد سے کہیں زیادہ ہے۔ غالباً اس کے مختصر عنفوان شباب کی وجہ یہ ہے کہ کسی قدیم زمانے میں اسے جلدی ماں بننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ مرد بھی اس عمر میں باپ بن سکتا ہے، جو آج کل شادی کی اوسط عمر کا نصف ہے۔ لیکن اقتصادی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ عنفوان شباب، جسم اور ذہن دونوں کا ہوتا ہے۔ اور مختلف حالتوں میں یہ بہت مختلف ہو سکتا ہے۔ کچھ مرد جلدی بلوغت حاصل کرتے ہیں، کچھ دیر سے اور کچھ کبھی نہیں۔ انسان کا عہد عنفوان شباب طویل تر ہوتا جاتا ہے کیونکہ یہ پیچیدہ تہذیب روز بروز ہمارے فطری رجحانات سے متصادم ہو کر

ہمیں زیادہ سے زیادہ بے بس بنا رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں بہت کم مرد نصف زندگی گزانے سے پہلے ذہنی بلوغت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عورت جس کی زندگی میں فطری رجحانات کی سادگی ہے، چھوٹی عمر ہی میں ذہنی اور جسمانی بلوغت حاصل کر لیتی ہے۔ وہ رسمی طرز عمل کے فوائد کو زیادہ جلدی سیکھتی ہے۔ وہ مدرسے میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے زیادہ ہوشیار ہوتی ہے۔ حال ہی میں ریڈ کلف کالج کی لڑکیوں نے ذہنی آزمائشوں میں ہارورڈ کے لڑکوں پر اپنی برتری ثابت کی لیکن یہ نشوونما مرد کی نشوونما سے بہت پہلے رک جاتی ہے۔ عورت اپنی پیدائشی حالت سے اتنی دور تک نہیں بڑھتی جتنا کہ مضطرب اور تجربہ پسند مرد۔ وہ موروثی رجحانات سے چمٹی رہتی ہے اور مرد نئی سے نئی کیفیتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ عورت نسلی استحکام کا ذریعہ ہے لیکن مرد انقلاب کا پیغمبر۔ عورت انسانی شجر کی جڑ اور اس کا تنا ہے جو زمین سے وابستہ رہتا ہے اور جب اس کی شاخیں آسمان کی طرف سربلند ہوتی ہیں تو یہ اپنی جڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔

اس استحکام کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عورت کا احساس قدامت پسند اور فکر نامکمل ہوتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں گھریلو اور بالعموم اس کا ماحول گھر ہوتا ہے۔ وہ فطرت کی طرح عمیق اور چاردیواری کی طرح تنگ نظر ہوتی ہے۔ جبلت اسے روایات پسند بناتی ہے اور وہ روایات کو فنکارانہ خلوص سے چاہتی ہے۔ وہ ذہنی اور اخلاقی شعبوں میں کم تجربے کرتی ہے۔ اگر وہ آزاد محبت کرتی ہے تو اس لیے نہیں کہ آزاد محبت میں اسے آزادی میسر آتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ایک ذمہ دار مرد کے ساتھ شادی کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ کتنی خوشی کے ساتھ وہ ایک مرد کو اپنے قریب لاتی ہے اور اسے گھر میں بسا لیتی ہے اور اگر نوجوانی کے زمانے میں وہ سیاسی اصلاح کی قائل ہو اور اپنی محبت کو تمام انسانیت پر پھیلا دے تو ایک ایماندار شوہر ملنے پر وہ ان ہنگامی دلچسپیوں کو ترک کر دیتی ہے۔ بہت جلد ہی وہ اپنے آپ کو اور اپنے شوہر کو کسی عالمگیر نصب العین کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اسے خاندان کے ساتھ وفا کے شدید جذبے سے آشنا کرتی ہے۔ نوجوان محبت کے سرور میں یہ کہتا ہے "میں تیرے لیے ساری دنیا کو ترک کر دوں گا"۔ اور جب وہ شادی کرتا ہے تو اپنے قول کو عمل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ عورت فطری طور پر یہ جانتی ہے کہ اصل اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے۔ جب وہ ایک آوارہ گرد مصلح کو اپنے بچوں کا شیدائی بناتی ہے تو وہ نسل کی نمائندگی کرتی ہے۔ فطرت کو قوانین اور ریاستوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ خاندان اور بچے سے شغف رکھتی ہے، اگر وہ ان کی حفاظت کر سکتی ہے تو وہ حکومتوں اور بادشاہتوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے اور ان لوگوں پر ہنستی ہے جو قوانین بدلنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر آج فطرت خاندان اور بچے کی

نگہداشت کرنے میں کامیاب نہیں ہے تو اس لیے کہ عورت نے فطرت کو بھلا دیا ہے لیکن فطرت زیادہ دیر تک شکست خوردہ نہیں رہ سکتی۔ وہ کسی وقت بھی اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سینکڑوں اور ذرائع استعمال کر سکتی ہے۔ دنیا میں اور لوگ بھی ہیں جو تعداد اور وسعت میں ہم سے زیادہ ہیں جن کے ذریعے وہ اپنا اٹل تسلسل قائم رکھ سکتی ہے۔

۴۔ عورت اور فطنت

عورتیں پیدائشی طور پر ذہین ہوتی ہیں۔ کچھ مرد ذہانت کا اکتساب کرتے ہیں اور اکثر مردوں پر ذہانت تھوپی جاتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے الجھے ہوئے نتائج کے زیر اثر مرد کی زندگی غیر متوقع اور کڑی ذمہ داریوں سے بھر گئی ہے۔ بہت سے مرد اس بوجھ کے نیچے کچلے گئے ہیں اور بہت سے مردوں نے ذہن میں وہ روشنی اور وہ وسعت پیدا کی ہے جو اعصابی نظام کی تمام قوتوں کو استعمال کرتی ہے۔ اس انقلاب سے پہلے مردوں میں اتنے صاحب فطنت اور دیوانے پیدا نہیں ہوئے۔ جوں جوں صنعت عورتوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ رہی ہے، ان میں بھی مجبوراً ذہنی ارتقا کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بدلتے ہوئے بھی مردوں سے ذہنی طور پر خاصی مختلف ہیں۔ عورت فکری تصورات کی اہل نہیں ہے۔ وہ واقعات کے لیے تیز نظر اور تیز حافظہ رکھتی ہے لیکن وہ کلیہ سازی اور نئی تعبیروں کی اہل نہیں۔ وہ اکثر تفاصیل میں کھو جاتی ہے۔ وہ چیزوں اور اصولوں سے زیادہ شخصیتوں سے دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ مسائل پر بحث نہیں کرتی بلکہ مردوں کے متعلق گفتگو کرتی ہے کیونکہ مرد اس کے لیے ایک مسئلہ ہیں۔ شخصیتوں یعنی شوہر اور بچوں سے دلچسپی رکھنا اس کی تقدیر ہے۔ مرد کی تقدیر یہ ہے کہ وہ تجارت اور صنعت کے طوفانوں کے تھپیڑے کھائے۔ اسباب و نتائج کی سنجیدگیوں میں الجھے، مرد اور عورت میں دلچسپی لے۔ مرد کے لیے اس کتاب میں دلچسپی لینا آسان ہے جو کسی خیال کی وضاحت کرتی ہو۔ عورت اسی کتاب میں دلچسپی لے سکتی ہے جو کوئی افسانہ بیان کرے۔ بالخصوص مرد کے متعلق افسانہ۔ عورت کائناتی، اجتماعی اور اقتصادی انقلابات کے غیر شخصی عمل کو کبریائی قوتوں اور بہادر انسانوں کے عزائم سے منسوب کرتی ہے۔

جنسوں کے درمیان ذہنی اختلافات کے مطالعہ کرنے والے مردوں کے لیے یہ امر ہمیشہ باعث تسکین رہا ہے کہ عورتوں میں فطین بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ فن میں بھی جس کا تعلق حسن سے ہے، اور موسیقی میں جو جذباتی حساسیت پر استوار ہے، عورت نے اپنی کوششوں اور مواقع کے باوجود کوئی خاص بات پیدا نہیں کی۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کو موسیقی سے شغف ہے لیکن زیادہ مرد زندہ موسیقی کی تخلیق کرتے ہیں۔ جب مرد عورتوں میں ذہنی اور فنی فطنت کو تسلیم کرتے ہیں تو

وہ انہیں مردانہ قسم کی عورتیں کہہ کر تعریف دراصل مردوں ہی کی کر جاتے ہیں۔ شوپنہار ہمیں یقین دلاتا ہے کہ فطنت اور مامتا آپس میں برسرپیکار ہیں۔ اگر ہم شوپنہار کی بات مانیں تو ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا کہ کوئی عورت شوپنہار کی طرح خطرناک حد تک ذہنی طور پر غیر معمولی ہوئے بغیر ذہنی برتری حاصل نہیں کر سکتی۔ جارج سینڈ ایک نہایت مردانہ قسم کا سگار پیتی تھی اور جارج ایلیٹ سپنسر کی سرد روح کے لیے بھی بہت مردانہ قسم کی عورت تھی۔ مادام جیراڈین کا یہ خیال تھا کہ جارج سینڈ کے ہر ناول میں اس کے تازہ ترین عاشق کا طرز، کردار اور اثر نظر آتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ہم عورتوں کی تصنیفات پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں اکثر بوفون کا ہم خیال ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ انداز تحریر مردانہ ہے۔

عورتوں میں فطنت کی کمی کے کئی اسباب ہیں۔ غالباً ہم فطنت کی تعریف کرتے وقت تعصب سے کام لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے ہیں کہ ممکن ہے سیاست، ادب اور جنگ کی طرح مامتا میں بھی فطنت کارفرما ہوتی ہے۔ ہر جنس اور ہر عمر کے فطری وظائف کو پورا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت ہی سے ہم فطنت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پچھلے زمانوں میں فطین زیادہ ہوتے تھے، اب کم ہوتے ہیں تو غالباً ہم یہی غلطی کرتے ہیں۔ ہم آج فطنت کی توقع انہی میدانوں میں کرتے ہیں جن میں وہ پہلے پھلا پھولا کرتی تھی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہماری وہ ذہنی قوت جو پہلے ادب اور فن کی تخلیق کیا کرتی تھی، اب سائنس اور صنعت کے وسیع شعبوں میں سما جاتی ہو۔ ہم آج اپنے نئے علم اور نئی طاقت کے ذریعے مادی دنیا کی ازسرنو تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے ہاں عظیم مخترع اور سائنس دان بین الاقوامی تجارت کے منظمین اور وہ سرمایہ دار ہیں جن کا اثر ساری دنیا پر پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانے میں افلاطون، شیکسپئر، لیونارڈو اور بیتھوون کی توقع رکھنا غلطی ہے۔

غالباً فطنت کے معاملے میں مرد اس لیے عورتوں سے بڑھ گئے ہیں کہ فطین عموماً ہر جنس کی تعلیم یافتہ اقلیت میں پیدا ہوتا ہے۔ جب تک کہ دونوں جنسوں میں اعلیٰ تعلیم پانے والوں کا تناسب برابر نہ ہو، مردوں اور عورتوں کا مقابلہ کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔ لاکھوں تعلیم یافتہ مردوں میں سے چند مرد فطین ہوتے ہیں اور سینکڑوں تعلیم یافتہ عورتوں میں سے چند عورتیں صاحب فطنت ہوتی ہیں۔ جب انہیں مواقع اور تربیت میسر ہو تو عورتیں سیفو جیسی عظیم شاعرات، جارج ایلیٹ جیسی عظیم ناول نویس، مادام کیوری جیسی عظیم ماہر طبیعیات، ہائی پیشیا اور سونیا کاوولوسکی جیسی عظیم ماہر ریاضی، اسپیشیا اور مادام ڈ سٹیل جیسی عظیم مفکر اور ملکہ الزبتھ اور کیتھرائن ڈی میڈیسی جیسی سیاستدان پیدا کرتی ہیں۔ یہ قابل تعجب بات ہے کہ ان ناخوشگوار حالات کے باوجود عورتوں میں بہت سی فطین عورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ غالباً عورتوں میں وہ جسمانی قوت محض نہیں ہوتی جو فنی تخلیق

کے لیے لازمی ہے۔ غالباً ان میں مردوں کا سادہ احساس حسن نہیں ہوتا جو روح کو تخلیق پر آمادہ کرتا ہے۔ بالعموم عورت اپنے شوہر میں حسن نہیں بلکہ قابلیت اور طاقت ڈھونڈتی ہے جو کہ پناہ کی ضامن ہوتی ہے۔ مرد اپنے انتخاب میں حسن کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، اس لیے نہیں کہ حسن مسرت کا ضامن ہے بلکہ اس لیے کہ وہ طاقت اور صحت کی علامت ہے۔ عورت اپنے جمالیاتی ذوق کو انتخاب شوہر کے وقت نظرانداز کر دیتی ہے کیونکہ وہ غالب نہیں بلکہ مغلوب بننا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ فن کی تخلیق نہیں کرتی، فن کی تحریک کرتی ہے۔ غالباً اسے مرد میں، مغرور اور مضحکہ خیز مرد میں وہ حسن نظر نہیں آتا جو اسے تخلیق پر اکسا سکے۔ وہ تخلیق حسن کیوں کرے جبکہ وہ خود پیکر حسن ہے۔ زندہ حسن حسین ترین فن سے بہتر ہے اور ذہانت سے زیادہ قابل تعریف ہے۔ وہ اول الذکر کا سرچشمہ اور موخر الذکر کا مقصد ہے۔ اگر زندگی حسین ہوتی تو اسے ذہانت کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور اگر وہ ذہین ہوتی تو وہ حسین بننے کی کوشش کرتی۔

۵- کیا یہ اختلافات فطری ہیں؟

اب فقط یہ سوال پوچھنا باقی ہے کہ آیا یہ ذہنی اختلافات فطری ہیں یا اکتسابی؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق سائنس فلسفہ کی طرح، علم کم اور مفروضے زیادہ بہم پہنچاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ یہ اختلافات ساخت اور وظیفے کے بنیادی اختلافات پر مبنی ہیں، یہ افراد میں زیادہ تر اجتماعی اثرات کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے اکثر حصوں میں وہ ان تصورات پر مبنی ہیں جو مردوں نے اپنے فائدے اور تسکین کے لیے عورتوں کے متعلق تیار کیے ہیں اور ماحول کے ہزاروں اثرات کے ذریعے ان پر حاوی کر رکھے ہیں، جیسا کہ ایک لیڈی پروفیسر نے لکھا ہے: "لڑکوں میں انفرادیت پیدا کی جاتی ہے۔ انہیں فکر و عمل میں آزادی کی تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں تجربہ کرنے اور خود چیزیں بنانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو اطاعت، احتیاج اور انکسار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ عورتوں میں فکر یا عمل کی آزادی ایک خامی ہے، ایک غیر نسائی صفت ہے۔ ایک لڑکے کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ زندگی میں اس کی کامیابی کا انحصار کسی نئے کام کے انجام دینے پر ہو گا۔ سماج لڑکیوں سے کوئی ایسی توقع وابستہ نہیں کرتا"۔

ایک خاص معنی میں ہم ایک وسیع تجربے کی بنا پر اس سوال کا ایک معقول جواب دینے کے قابل ہو گئے ہیں کہ کیا مردوں اور عورتوں کے ذہنی اور اخلاقی اختلافات موروثی ہیں۔ اقتصادی حالات نے ایک تجربہ کیا ہے اور زندگی خود ایک تجربہ گاہ بنی ہے جیسے قدرت نے اس سے ایک

عالمگیر تجربے کے ذریعے خود اس مسئلہ کو حل کرنے کی ٹھانی ہو۔ مرد ذہنی طور پر عورتوں سے بہتر ہیں۔ کیا یہ تفوق فطری ہے یا اکتسابی؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ عورتوں کو کثیر تعداد میں ان متنوع اور متحرک صنعتی حالات کے سپرد کر دیا جاتا جو مردوں کی تعمیر کر رہے تھے۔ ان حالات نے کتنی سرعت سے عورتوں کے ذہن اور شخصیت کو بدل دیا تھا۔ سارے انگلستان اور نصف امریکہ میں یہ تجربہ ہوتا رہا کہ کارخانوں، دفتروں اور دیگر پیشوں کے دروازے دونوں جنسوں پر کھول دیئے گئے۔ اقتصادی حالات نے لاکھوں کروڑوں عورتوں کو گھروں سے نکال کر صنعتی اور تجارتی دنیا میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ اس تجربہ کا کیا نتیجہ ہوا؟

نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد عورتوں میں ایک ایسا فوری انقلاب آیا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ تین نسلوں کے اندر اندر صنعت کے ان نئے کارندوں نے ہر اس میدان میں قسمت آزمائی کی جہاں جسمانی طاقت لازمی نہیں تھی، اور ہر میدان میں انہوں نے مردوں کی ذہنی اور اخلاقی صفات کا اکتساب کیا اور اس طرح کہ مسیحیت کا ہر معلم اخلاق صنف نازک کے مردانہ خصائل کے اکتساب پر افسوس کرنے لگا۔ قانون، طب، حکومت، ڈاکہ غرضیکہ ہر شعبے میں عورتوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ عورتیں اپنے محدود مواقع کے باوجود مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ کالجوں میں ان لڑکیوں نے تعلیم پائی جن سے کوئی مرد شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ان کے ذہنی تفوق کا یہ بھی تقاضا تھا کہ مرد کے غلبہ کو تسلیم نہ کریں اور یہ بات ہر مرد کو ناگوار تھی۔ جوں جوں دکانوں اور کارخانوں نے کھیتوں اور گھروں کی جگہ لینی شروع کی، جنسوں کے درمیان ذہنی اور اخلاقی اختلاف گھٹتا گیا۔

ہم بعد میں اس انقلاب کا زیادہ تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس وقت ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر عورتوں نے مرد کی پیشہ ور زندگی کی پوری نقل کرنے کی ٹھانی تو وہ اس کا مقابلہ کر سکیں گے، اور ذہنی اور اخلاقی صفات میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ لیکن غالباً عورتیں اچھے ذوق کا ثبوت دیں گی۔ نقالی کا یہ ہنگامی دور ختم ہو جائے گا۔ وہ سمجھ لیں گی کہ نقل خوشامد کی ایک قسم ہے اور مرد اس خوشامد کے مستحق نہیں۔ وہ یہ جان لیں گی کہ علم ذہانت نہیں ہے اور یہ کہ مسرت حسن اور کمال کی طرح فطری رجحانات کی تکمیل میں مضمر ہے۔ حریت پسند عورتیں نامکمل مرد نہیں بلکہ مکمل عورتیں بننا چاہیں گی۔ وہ ماستا کو ایک ایسا فن بنا دیں گی جس کے لیے اسی محنت اور ذہانت کی ضرورت ہے جو کل پرزوں کے جوڑ توڑ میں صرف ہوتی ہے، شاید وہ یہ بھی سمجھ لیں گی کہ یہ بہترین فن ہے۔

ان کی نئی آزادی اتنے ہی پیچیدہ اور اہم مسائل کا پیش خیمہ بنتی ہے جتنے کہ ان کے عہد غلامی سے وابستہ تھے۔ اس معاملہ میں مرد ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مرد کا ذہن اتنا میکانکی اور

درشت ہے کہ وہ ان نازک اور خطرناک تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتا جو عورت کی زندگی اور ذہن میں انتشار پیدا کر رہی ہیں۔ صرف اس کا نیا علم ہی نئے حالات پر قابو پا سکتا ہے۔ غالباً وہ کامیاب ہو گی۔ وہ قوت جس نے اسے آزادی دلائی تھی، آزادی کے پیدا کیے ہوئے مسائل بھی حل کرے گی۔ وہ کوئی ایسی سبیل نکال لے گی جس سے اس کی نرم مزاجی جو محبت اور مامتا میں کمال حاصل کرتی ہے۔ اس کی استعداد، بیدار مغزی اور لافانی حسن کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہو جائے!

◆

باب نہم

عصر حاضر کی عورت

۱۔ انقلاب عظیم

ہمارے جدید شہروں کی صنعت زدہ عورت ایک لاثانی جنس ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اگر ہم تصور میں اپنے آپ کو ۲۰۰۰ء میں لا کھڑا کریں اور پھر یہ سوال پوچھیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں انسانی نقطۂ نظر سے کون سا اہم واقعہ پیش آیا تھا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اس کا جواب نہ جنگ عظیم ہے نہ روسی انقلاب، بلکہ عورت کی حیثیت کی تبدیلی۔ تاریخ میں اتنے مختصر عرصہ میں شاید ہی کبھی ایسا عظیم انقلاب رونما ہوا ہو۔ مقدس خاندان جو اجتماعی نظام کی بنیاد تھا، مناکحتی نظام جو انسانی شہوت اور غیر مستقل مزاجی کے خلاف ہماری مدافعت تھا اور وہ پیچیدہ اخلاقی نظام جو ہمیں بربریت سے ابھار کر تہذیب اور خوش اخلاقی کی بلندیوں کی طرف لے جاتا تھا، اس مضطرب انقلاب میں گرفتار ہے جو ہمارے تمام اداروں کی زندگی اور فکر کی تمام راہوں میں نظر آتا ہے۔ ہم اس بے ربط عہد میں یوں ہی پریشان نہیں ہیں۔

عورت کی حیثیت ایک گھریلو کنیز، اجتماعی ترصیع یا جنسی سہولت کے وسیلے کے کچھ اور ہوتی جارہی ہے۔ یہ احساس ہماری صدی سے پہلے بھی موجود تھا لیکن اس احساس (یا بغاوت) کی حیثیت ایک غیر اخلاقی استثناء کی سی تھی جسے عبرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ افلاطون نے عورت پر تمام پیشوں کے دروازے کھول دینے کی اپیل کی تھی۔ لیکن ارسطو نے جو اپنے عہد کے تعصبات کا احترام کرتا تھا، عورت کی توجیہ یہ کی کہ وہ رکی ہوئی نشوونما ہے۔ وہ فطرت کی مرد بنانے میں ناکامی ہے۔ عورت غلاموں کی طرح ایک ادنیٰ حیثیت رکھتی ہے اور اس لیے سیاسی اور اجتماعی معاملات میں شرکت کرنے کی اہل نہیں ہے۔ یہودیوں کے خداوند کا بھی یہی خیال تھا۔ اس کے آخری حکم میں

بیویوں اور ماؤں کو وہی مرتبہ دیا تھا جو مویشیوں اور جائیداد کو دیا تھا۔ یہودیوں کا خدا یہودیوں کی شخصیت کا آئینہ دار تھا اور یہودی ہر جنگجو قوم کی طرح عورت کو مصیبت سمجھتے تھے۔ ایک لابدی مصیبت جو سپاہیوں کا واحد سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے برداشت کی جاتی تھی۔ قدیم یہودیوں کے ہاں جب بیٹی پیدا ہوتی تھی تو چراغ نہیں جلائے جاتے تھے۔ اس ماں کو جو لڑکی کو جنم دیتی تھی، دوچند تطہیر کی ضرورت ہوتی تھی اور ہر یہودی لڑکا باقاعدہ یہ دعا کرتا تھا "اے خدا! میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے مجھے کافر یا عورت نہیں بنایا"۔ لیکن یہودی اس معاملے میں دوسری قوموں سے مختلف نہیں تھے بلکہ کئی حیثیتوں سے اپنے زمانہ کے اخلاقی نظام سے بہت آگے تھے۔ اہل مشرق عورت کو جب تک کہ وہ بیٹوں کی ماں نہ بن جاتی، حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جب تک وہ بیٹے کسی جنگ میں شہید نہ ہو جاتے، ان ماؤں کا پورا احترام نہ کیا جاتا، حتیٰ کہ عورتوں کے بہی خواہ افلاطون نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے مرد بنایا۔

اس دن سے آج تک عورتوں کی حیثیت میں لاکھوں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہم ان سب کو یہاں بیان نہیں کریں گے۔ یونانی طوائفیں جو قدیم ایتھنز کی زندگی کو رنگین بناتی تھیں اور جدید زمانے کے بادشاہوں کی درباری رقاصاؤں نے جنسی جاذبیت کے فن کی پرورش سے مرد کے غلبے سے نجات حاصل کی تھی۔ اسپیشیا اور فرائن کا مفکروں اور فنکاروں سے میل جول تھا۔ ڈوباری اور پومپاڈور کی صحبتیں دنیا کے پختہ ترین تمدن کا ذہنی مرکز بن گئی تھیں۔ کچھ وقت تک انقلاب فرانس عالمگیر آزادی کا ضامن بنا رہا۔ کنڈورسے نے قومی اسمبلی میں عورتوں کے حق رائے دھندگی کی عرضداشت پیش کی اور میری وول سٹون کرافٹ نے مردوں کے حقوق میں عورتوں کے حقوق کا اضافہ کیا۔ لیکن جب کشت و خون ختم ہوا اور عورتوں نے فرانس کی آزادی پر اپنے پانچ لاکھ بیٹوں کو قربان کر دیا تو انہوں نے دیکھا کہ آزادی کے علمبردار آزادی اور مساوات کو اپنے گھروں کے اندر دیکھنے کے روادار نہیں۔ آزادی فقط مردوں کے لیے تھی اور محض قواعد کی رو سے مادہ تھی۔

یہی خیالات ہمارے زمانہ میں بھی موجود ہیں۔ ہم میں سے کس مرد کو جس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو اوٹو وائینگر کا یہ قول یاد نہیں کہ عورت ایک بے روح حیوان ہے۔ ہم میں سے کس مرد نے عورتوں کے بارے میں شوپنہار کے مضمون کا لطف نہیں اٹھایا۔ شوپنہار کہتا ہے کہ "عورت ایک کوتاہ قد، تنگ کندھوں، چوڑے کولہوں اور چھوٹی ٹانگوں والی جنس ہے"۔ جب نیطشے نے ہمیں یہ تلقین کی کہ "جب تم عورت کے پاس جاؤ تو اپنی چابک نہ بھولنا"۔ تو کیا ہم مردوں کو تفوق کا احساس نہیں ہوا۔ ہم اس امر کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ یہ دل فریب کتابیں جنسوں کی دائمی پیکار کا ایک حصہ ہیں۔ یہ کتابیں محصور سپاہیوں کی دفاعی تدابیر ہیں۔ شکست خوردہ مردوں کی

حکمت کی آواز ہیں۔ ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک حسینہ نے بائرن کے حسن اور رتبہ سے متاثر ہو کر شوپنہار کو ٹھکرا دیا تھا۔ نیطشے یورپ کے کئی ممالک میں لوسیلومے کا پیچھا کرتا رہا اور اسے اپنے علم و فضل سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ اسے حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ وہ مغرور فطین وائینگرو۔ ٹینا کے ایک ہوٹل کی ملازمہ کی محبت میں گرفتار تھا۔ جب اس ملازمہ نے اسے ٹھکرا دیا تو اس نے بیتھوون کے گھر میں خودکشی کر لی۔ ہم یہ کتابیں خوشی سے پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ہماری اس جنس سے پوشیدہ خصومت کی ترجمانی کرتی ہیں جس سے ہم ہمیشہ محبت کرتے رہیں گے۔

۱۹۰۰ء تک عورت کو کوئی آئینی حقوق حاصل نہیں تھے۔ انیسویں صدی میں افریقہ کی عورتیں زراعتی مشینوں کی طرح بکتی تھیں۔ تاہیتی اور نیو برٹین میں وہ سوروں کو دودھ پلاتی تھیں۔ انگلستان میں شوہر بیوی کو بری طرح زدوکوب کر سکتا تھا۔ وہ ہر رات زنا کر سکتا تھا اور بیوی کے پاس سوائے اس کی نقل کرنے کے اور کوئی علاج نہ تھا۔ اگر وہ پیسے کماتی تو وہ مرد کی ملکیت ہوتے۔ اگر وہ شادی میں جائیداد ساتھ لاتی تو وہ مرد کے تصرف میں چلی جاتی۔ یہ بات کسی مرد کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ وہ کبھی کارخانوں میں کام کرے گی یا اسے حق رائے دہندگی حاصل ہوگا۔

اور پھر یہ انقلاب عظیم آیا۔ ان حسین لونڈیوں نے آزادی اور مساوات کے نعرے بلند کیے۔ انہوں نے کھڑکیاں توڑ دیں، لیٹر بکس جلا دیئے، لمبے لمبے جلوس نکالے اور پر زور تقریریں کیں۔ انہوں نے عزم آہنی سے کام لیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ اب ہم انہیں زدوکوب نہیں کر سکتے۔ اب وہ ہمارے لیے کھانا نہیں پکاتیں۔ اب وہ شام کو ہمارے ساتھ گھر میں نہیں بیٹھتیں۔ اب وہ ہمارے گناہوں کی فکر کرنے کی بجائے اپنے گناہوں میں مصروف ہیں۔ انہیں اس وقت روحیں اور ووٹ حاصل ہوئے جبکہ مردوں نے اول الذکر کو کھو دیا اور ثانی الذکر کو بھلا دیا تھا۔ اب عورتیں سگریٹ پیتی ہیں، گالیاں بکتی ہیں، شراب خوری کرتی ہیں اور سوچتی ہیں۔ اور مغرور مرد کبھی ان فنون کا تنہا ماہر تھا، آج گھر میں بچوں کی نگہداشت کرتا ہے۔

۲۔ اسباب

ہم ان اداروں اور رسموں کے تنزل کی کیونکر توجیہ کر سکتے ہیں جو مسیحی عہد سے بھی زیادہ قدیم تھیں۔ اس انقلاب کی بنیادی وجہ مشینوں کا غلبہ تھی۔ عورتوں کی آزادی صنعتی انقلاب کا ایک حادثہ تھی۔

اس انقلاب نے ایک وسیع پیمانہ پر عورتوں کو صنعت میں شامل کر دیا۔ ان کی مزدوری مردوں کی مزدوری سے زیادہ سستی تھی کیونکہ مرد مزدور اجرت زیادہ مانگتے اور بات بات پر

جھگڑتے۔ پچھلی صدی میں انگلستان میں مردوں کو کام ملنا مشکل ہوتا تھا۔ لیکن ان کی بیویوں اور بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی صلائے عام تھی۔ سرمایہ دار محض منافع حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ اسے اخلاقی اداروں سے کوئی سروکار نہیں۔ انیسویں صدی میں انگلستان کے وطن پرست سرمایہ داروں نے گھروں کو تباہ کرنے کی غیر شعوری سازش کی تھی۔

ہماری بڑی بوڑھیوں کی آزادی کے سلسلہ میں پہلا آئینی قدم ۱۸۸۲ء میں اٹھایا گیا۔ اس سال برطانیہ میں فرمان جاری کیا گیا کہ عورتیں اپنی کمائی ہوئی مزدوری اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔ یہ ایک نہایت اخلاقی قانون تھا اور مسیحیت کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اسے کارخانہ داروں نے دارالعوام میں اس لیے پیش کیا تھا کہ انگلستان کی عورتیں مشینوں پر کام کر سکیں۔ تب سے لے کر آج تک منافع کی ترغیب عورتوں کو گھر سے نکال کر دکانوں کا غلام بنا رہی ہے۔ آج انگلستان میں ہر دو میں سے ایک عورت کسی دفتر یا کارخانے میں کام کرتی ہے۔ صنعتوں میں عورتوں کا تناسب مردوں کے تناسب سے چار گنا زیادہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔ مستقبل کے شہروں میں غالباً ہر عورت گھر سے باہر کام کرے گی۔ (سوائے زچگی کے نادر مواقع پر) ہم میں سے بعض لوگوں کے لیے یہ تصور ناخوشگوار ہے لیکن ہم بھی دس بیس برس کے اندر اس انقلاب کے خوگر ہو جائیں گے۔ ہر عادت معقول معلوم ہوتی ہے۔

عورتوں کی صنعت زدگی کا مطلب لازمی طور پر گھریلو زندگی کا خاتمہ ہے۔ جوں جوں نئی مشینوں کا سیلاب امڈا اور صنعت کے نئے طریقوں نے قیمتوں میں کمی پیدا کر دی، کارخانوں نے گھریلو دستکاریوں کو ختم کر کے عورتوں سے گھریلو دلچسپیاں چھین لیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے قدیم فرائض سے محروم کر دی گئیں۔ گھر کی فضا بے کیف ہو گئی اور عورت بیکار اور غیر مطمئن رہ گئی۔

عورت تعریف کی مستحق ہے۔ وہ گھر کو چھوڑ کر کارخانے میں گئی۔ اس نے اس کام کی تلاش کی، جو اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کام کے بغیر وہ ایک بے معنی طفیلی بن جائے گی جو کسی متمول گھرانے کی آرائش یا جسمانی طور پر کسی انحطاط پذیر شخص کی بیوی بن جائے گی۔ وہ اپنی تنخواہ اس خود پسندی اور شادمانی سے پاتی جس کے ساتھ کوئی لڑکا مدرسہ کو اس لیے خیرباد کہتا کہ صنعتی ملازمت کے ذریعے بلوغت حاصل کرے۔ عورتوں نے یہ نئی غلامی اس لیے قبول کی کہ انہیں کوئی کام کرنے کی خوشی حاصل ہو سکے۔

چونکہ گھر اب وہ جگہ نہیں رہی تھی جہاں کوئی کام ہو سکتا یا لوگ اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے۔ مردوں اور عورتوں نے اسے ترک کر دیا اور مشترکہ فلیٹوں میں رہنے لگے۔ ان کی زندگی صبح و شام گھر سے باہر گلی کوچوں کے شور و غوغا میں بسر ہوتی۔ ایک ادارہ جو دس ہزار برس سے قائم تھا،

ایک ہی نسل میں تباہ ہوگیا۔ ماہرین نفسیات اجتماع یہ کہا کرتے تھے کہ ادارے رسم و رواج اور اخلاق آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تاریخ تمدن کا ایک عظیم ترین انقلاب چشم زدن میں رونما ہوگیا۔ ہمارے مدبروں، مبلغوں اور سیاست دانوں نے ہمیں یہ تنبیہہ کی تھی کہ اشتراکی گھروں کو تباہ کردیں گے لیکن ان کے دیکھتے دیکھتے اقتصادی انقلاب کی غیر شخصی قوتوں نے اس المیہ کو مکمل کردیا۔

بچے اپنی شوخیوں اور شور و غوغا سے گھر کو زندہ کرسکتے تھے۔ لیکن صنعتی انقلاب اپنے ساتھ انہیں بھی بہا کر لے گیا۔ بچے جو وسیع کھیتوں میں مدد بہم پہنچاتے اور باعث مسرت بنتے، بھرے ہوئے شہروں اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں محض ایک مصیبت بن گئے تھے۔ دنیا میں مزدوروں کی افراط تھی۔ تولید کی زرخیزی ختم ہوگئی کہ کہیں لوگ ہمیشہ کے لیے مفلس اور جاہل نہ رہ جائیں۔ مشینوں کی آمد سے کارخانے بنے، کارخانوں کی بنا پر شہر تعمیر ہوئے اور شہروں سے جمہوریت، اشتراکیت اور ضبط تولید کو جنم دیا۔ یہ انقلاب کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ ضبط تولید کے سلسلے میں عورتوں کے حقوق کے متعلق شاندار کتابوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور پادریوں اور حاکموں کی پند و نصیحت اس کی روک تھام نہ کرسکی۔ اس کے نتائج سے دامن بچانے کی فقط یہی صورت تھی کہ یورپ اور امریکہ کی پچھلی صد سالہ تاریخ کو بدل دیا جاتا۔ لیکن تاریخ کبھی لوٹ کے نہیں آتی، وہ اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔

شہروں میں بچے فقط ایک سامان عیش تھے کیونکہ پانچ سال کا بچہ کوئی کام نہیں کرسکتا تھا اور خاندان میں ہر نیا اضافہ کرایہ کے بوجھ کو گراں تر کردیتا تھا۔ تولید اب ایک عام واقعہ نہیں رہی تھی بلکہ اس نے ایک خطرناک عمل جراحی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ کارخانوں میں کام کرکے عورت جسمانی طور پر ناتواں ہوگئی تھی۔ جدید مردوں کے انحطاط پذیر جمالیاتی شعور نے اور نازک اندام عورتوں کی مدح سرائی نے حالات اور بھی بگاڑ دیئے تھے۔ صحت مند عورتیں ہمارے فنکاروں اور کامیاب مردوں کے ذوق کی تسکین نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کے لیے حسن تندرست مامتا کی ممکنات کی بجائے ہنگامی جنسی کشش کا نام تھا۔ عورتیں بچے پیدا کرنے کے ناقابل ہوتی گئیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا، وہ تولید سے گریز کرتیں۔ ان کے شوہر ان سے اکثر و بیشتر اتفاق کرتے۔ وہ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ بچوں پر رقص و سرود سے کم خرچ ہوتا ہے۔

آلات ضبط تولید کی ایجاد نے عورت کی آزادی میں ہاتھ بٹایا۔ بچوں کی نگہداشت کے فرض سے آزاد ہوکر عورت دفتر اور کارخانوں میں سما گئی۔ وہ کارخانے میں مرد کے دوش بدوش کام کرنے لگی۔ وہ مردوں جیسے کام کرنے لگی، مردوں جیسی سوچ سوچنے لگی اور مردوں جیسی زبان بولنے

لگی۔ عورتوں کو آزادی نقالی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ جدید عورت نے روایتی مرد کی اچھی اور بری سب عادات اپنا لیں۔ اس نے سگریٹ پینے، غلاظت بکنے، لاادری بننے، بال کٹانے اور پتلونیں پہننے میں مرد کی نقل شروع کر دی۔ نئے حالات نے مردوں میں نسائیت اور عورتوں میں مردانہ صفات پیدا کر دیں۔ یکساں پیشے اور یکساں حالات نے دونوں جنسوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا۔ ایک نسل کے بعد افسوسناک پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے مصنوعی علامتوں کے ذریعے مردوں اور عورتوں میں فرق کرنا پڑے گا۔ اب بھی ان میں تمیز کرنا خاصا مشکل ہے۔

جب ہم اس دہشت کا خیال کرتے ہیں جو پچھلے زمانے کے لوگوں کو بانجھ پن کے تصور سے ہوتی تھی تو ہمیں اس انقلاب عظیم کا احساس ہوتا ہے کہ آج عورتوں کے لیے بانجھ ہونا یا ایک بچہ کی ماں بننا فیشن میں داخل ہے۔ ہمارے زمانے سے پہلے عورت کا احترام اس کے بچوں کی تعداد کے مطابق ہوتا تھا۔ عورت کا کام ماں یا طوائف بننا تھا اور اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے کام کو پوری طرح نبھائے گی۔ ہر روز مسیحی اور غیر مسیحی انسان اپنے خداؤں اور دیوتاؤں سے بچوں کے عطیہ کی دعا مانگتے تھے۔ لوگ وظیفے پڑھتے، مقدس مقامات پر جاتے اور دیگر رسوم ادا کرتے۔ مایا قوم کے لاولد لوگ بچوں کے لیے روزے رکھتے، عبادتیں کرتے اور ولدیت کی دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قیمتی نذرانے چڑھاتے۔ کسی نے ایک افریقی بادشاہ سے پوچھا کہ ”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“ تو اس نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ جواب دیا ”بہت کم، میرے فقط ستر بچے ہیں!“

ماؤں کی تصویریں ہمیں کیوں اس قدر متاثر کرتی ہیں؟ کیونکہ بڑے شہروں کے وجود میں آنے سے پہلے بچوں کی کثیر تعداد میں ضرورت ہوتی تھی اور ہمارے احساسات اس ضرورت کے مطابق پروان چڑھے تھے۔ اب شہریوں کو بچوں کی ضرورت نہیں رہی۔ شہر اپنی درخشاں روشنیوں اور طویل راتوں کی کشش سے صحت مند دیہاتیوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ نیا خداوند رنگین نور سے چمکتا دمکتا اپنے بازو پھیلاتا ہے اور دیہاتی بچے اس کے بازوؤں میں سمٹ آتے ہیں۔ ہر سال وہ لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں اور بہت جلد ہی عقلمند اور بانجھ ہو جاتے ہیں۔ شہری یہ نہیں مانتے کہ انہیں بچوں کی ضرورت ہے، اس لیے وہ عورتوں کو طوائف بننے کی تربیت دیتے ہیں اور ان کے دلوں کو مامتا سے داغدار نہیں کرتے۔ ولدیت کا شوق، جو کبھی کبھار ہماری متشکک اور سرد روحوں کو گرماتا ہے، ہماری آبائی دیہاتی زندگی کی یادگار ہے۔ جب عورتیں بچے جنتی تھیں، وہ حالات مٹ گئے ہیں۔ لیکن ہمارے احساسات اب بھی زندہ ہیں۔ ہم میں سے وہ لوگ جو انیسویں صدی میں پیدا ہوئے تھے اور کھیتوں کی فضا میں پروان چڑھے تھے، تادم مرگ اس بات پر یقین رکھیں گے کہ جن لوگوں کے ہاں بچے نہیں، انہیں خوشی میسر نہیں آ سکتی اور یہ کہ تندرست اور توانا بیٹوں اور نیک

اور رحم دل بیٹیوں کے ایک خاندان کی تعمیر کے لیے جدید آرٹ کی تصویریں بنانے‘ جدید موسیقی تخلیق کرنے یا جدید عورت پر مضامین لکھنے سے کہیں زیادہ جرات اور توازن شخصیت کی ضرورت ہے۔

۳۔ ہماری بیٹیاں

عورت کی آزادی ان اقتصادی تبدیلیوں کی رہین منت ہے جن کی وہ خود ذمہ دار نہیں ہے اور اس لیے وہ مذمت کی سزاوار نہیں۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ ہم عورت کا مطالعہ کسی قدر غیر جانبدار ہو کر کریں۔

وہ غیر معمولی لچک کے ساتھ صنعتی زندگی کے تقاضوں کے ساتھ مطابقت پیدا کر رہی ہے۔ ذہانت کے اکثر حربے جنہیں نئی نفسیات بنیادی طور پر مردانہ صفات سمجھتی تھی‘ عورتیں انہیں بڑی سرعت سے سیکھ رہی ہیں۔ ان دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو دیکھو‘ ان میں شاید کوئی نیا کام شروع کرنے کی ہمت کم ہوتی ہے (سوائے جنسی معاملات کے) لیکن ان کی خاموشی‘ قابلیت‘ ان کی مستقل خوش خلقی‘ بغیر نمائش کے دفتروں کا سارا کام کرنے کی صلاحیت ہم میں حیرت اور تعریف کے ملے جلے جذبات پیدا کرتی ہے۔ ایک دو نسلوں میں صنف نازک نے صنعت میں وہ مقام حاصل کیا ہے (اور سوائے محض جسمانی پیشوں کے ہر میدان پہ ایسے چھا گئی ہیں) کہ اگر آج جان سٹوئرٹ مل انہیں دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ اس نے جنس مخالف کے ساتھ کتنی کم توقعات وابستہ کی تھیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صنعت میں عورتوں کی شرکت کس حد تک بڑھے گی۔ غالباً وہ وقت آ جائے گا کہ عورتوں کی بہتر موقع شناسی اور تفاصیل پر قابو پانے کا ملکہ مردوں کی زیادہ طاقت کے ساتھ برابر کی اہمیت رکھے۔ جب برقی قوت صنعت میں سے غلاظت اور جسمانی تھکن کے امکانات دور کر دے گی تو مرد کو اقتصادی دنیا میں اپنی حیثیت قائم کرنے کے لیے زیادہ ذہانت سے کام لینا پڑے گا۔

سیاسیات میں ہماری بیٹیاں البتہ اتنی زیادہ خوش نصیب نہیں رہیں گی۔ صنعت زدہ عورت کو اس کھیل میں اس لیے الجھنا پڑا تھا کہ وہ مردوں کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف اپنی حفاظت کر سکے۔ کیا مردوں نے ہزاروں قانونی حد بندیوں سے اپنے جابرانہ حقوق کو محفوظ نہیں کر لیا تھا؟ ان حدود کو ٹوٹنا تھا اور اس جنس کی توانائی کو جذب کرنے کے لیے ہر راہ کو کھلنا تھا۔ کتنی یک سوئی اور قابلیت کے ساتھ انہوں نے اپنے حق رائے دہندگی کی جنگ میں شرکت کی۔ انہوں نے ہر مخالفت کی آواز کو دبا دیا۔ اسی زمانے میں انگلستان اور امریکہ کے باغی مزدوروں نے اسی ناانصافی کے خلاف سیاسی احتجاج کیا لیکن کچھ نہ حاصل کر سکے۔ عورتوں نے سپاہیوں کی طرح یہ جنگ لڑی اور

حکومت کے دروازوں پر دستک دی، حتیٰ کہ وہ دروازے ان پر کھول دیئے گئے اور جمہوریت انہیں اپنے بازوؤں میں پناہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ آج سے پچاس سال بعد انہیں معلوم ہو گا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا فریب کھیلا گیا ہے۔

چند عورتیں آج بھی یہ نکتہ سمجھتی ہیں کہ مردم شماری آزادی نہیں ہے اور یہ کہ آزادی کوئی سیاسی چیز نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ لاکھوں ہوشیار اور شاداں لڑکیاں کالجوں اور مدرسوں میں داخل ہیں۔ ہزاروں تعلیمی اداروں میں ان سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ ان کے چہروں پر سائنس اور ادب سے حاصل کی ہوئی سنجیدگی، ان کی شوخ آنکھوں میں تجسس علم کی تابانی اور ان کے بھرپور حسین جسموں میں زندگی کے احساس کی لچک، ان کا حسن ہماری نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے اور ہم ان کی بے فکری اور خوش باشی پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔ لیکن کیا آپ نے انہیں جماعت میں سوال کرتے دیکھا ہے؟ کیا آپ نے انہیں کسی نظریہ کی دھجیاں اڑاتے اور اپنی رضا کے مطابق دنیا کی از سرِ نو تعمیر کرتے دیکھا ہے؟

اس سب تعلیم کا کیا انجام ہو گا؟ کیا یہ لڑکیاں جدید عورت کی نئی مصروفیتوں اور نئے تجربوں میں نئی ذہانت شامل کر کے اس کے ساتھ تعاون کریں گی؟ کیا ذہن اور شغف کی یہ بوقلمونی، جبلت کی وحدت اور فراست کو منتشر نہ کر دے گی؟ کیا یہ نئی ذہانت شوہر حاصل کرنے کے امکانات کو کم نہ کر دے گی؟ سنا ہے کہ رومن شہری ایک تعلیم یافتہ بیوی کے خیال ہی سے کانپ اٹھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ مرد اس عورت کی صحبت میں ناخوش رہتا ہے جس کا دماغ اس کے دماغ کے ہم پلہ ہو۔ وہ صرف اس چیز سے محبت کر سکتا ہے جو اس سے کمزور ہو۔ جس طرح عورت صرف اسی چیز سے محبت کر سکتی ہے جو اس سے زیادہ طاقتور ہو۔ اس لیے وہ لڑکی، جس کی تہذیب فطری جاذبیت پر نہیں بلکہ علم اور خیالات پر مشتمل ہے، شوہر حاصل کرنے کے سلسلے میں ناکام رہتی ہے۔ کیونکہ وہ ان شعبوں میں بے جا مداخلت کرتی ہے جن پر صدیوں سے مرد بلا شرکت غیرے قابض رہا ہے۔ عورتوں کے کالجوں کی ساٹھ فی صد گریجویٹ لڑکیاں غیر شادی شدہ رہتی ہیں۔ ایک ممتاز سائنس دان سونیا کاوولوسکی نے یہ شکایت کی کہ کوئی مرد مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ "مجھ سے کیوں کوئی شخص محبت نہیں کرتا جبکہ میں دوسری عورتوں سے کہیں زیادہ ان کی زندگی کو بہتر بنا سکتی ہوں، اور پھر بھی لوگ نہایت گھٹیا قسم کی عورتوں سے محبت کرتے لیکن مجھ سے نہیں کرتے"۔ ایک سمجھدار لڑکی ایک خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے اپنے ذہنی تفوق کو چھپائے رکھتی ہے۔

کوئی پچاس برس کے عرصے میں عورتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنسوں کے ذہنی اختلافات فطری نہیں بلکہ اکتسابی ہوتے ہیں۔ اس کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ عورتیں بہت

جلدی ان ذہنی دشواریوں پر قابو پالیں گی جو وقت اور رسم و رواج نے پیدا کی ہیں۔ عورتوں کا تمدنی ارتقا حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ ان کے تمدن کے پیچھے کوئی قدیم روایت اور تحریک نہیں ہے۔ ان کے سامنے ایسی شاندار مثالیں نہیں ہیں جو خود اعتمادی پیدا کرنے میں انہیں مدد دیں۔ صرف ہمارے زمانہ ہی میں عورت کسی قدر مردوں جیسے تعلیمی مواقع سے فیض یاب ہوئی ہے۔ کئی نسلوں تک کالجوں میں مردوں اور عورتوں کا تناسب آبادی میں مردوں اور عورتوں کے تناسب سے کم رہے گا۔ شاید عورت کی قوت کا کچھ حصہ مامتا میں صرف ہو جائے۔ وہ شاید پھر مامتا کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ تصور کرنے لگے اور ادب اور فن کے عارضی ہنگاموں کو غیر جنسی مردوں کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائے‘ اسے شاید یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا میں چھپے ہوئے لفظ سے بھی زیادہ بہتر چیزیں ہیں اور شعور اور علم میں خاصا فرق ہے۔

جدید عورت کے جسم کی کیا حالت ہے؟ کیا گھر سے اس کے اخراج اور کارخانے کے کام سے اس کی جسمانی صحت خراب ہو گئی ہے؟ وہ اپنی دادی کی طرح‘ جو زراعت پیشہ تھی‘ اب اتنی تندرست و توانا معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے پر اصلی رنگ بہت کم ہے اور وہ بے بسی اور درد کی طویل مدت گزارنے کے بعد بچے پیدا کرتی ہے۔ لیکن صحت کی خرابی سے صرف عورت ہی کو دوچار نہیں ہونا پڑا بلکہ مرد بھی جب سے انہوں نے زراعتی زندگی کو خیرباد کہا ہے‘ ویسے تندرست و توانا نہیں رہے۔ جدید ذہن زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ پیچیدہ آلوں اور مشینوں کو اطمینان اور اعتماد سے حرکت میں لاتا ہے۔ لیکن جدید جسم اب وہ بوجھ اور وہ دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا جو کبھی وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اٹھایا کرتا تھا۔ لیکن ان تمام امراض کے باوجود اس زمانہ کی عورت اتنی کافی حسین ہے کہ فلسفی بھی اسے دیکھ کے کچھ وقت کے لیے سرمست ہو جاتے ہیں۔ ہم عورت کے جس قدر ممنون ہوں کم ہے کہ وہ کن کن حیلوں سے اپنی دل فریب کشش کو اس عمر تک برقرار رکھتی ہے جس عمر میں پہلے زمانہ کی عورتوں کو بوڑھا قرار دے دیا جاتا تھا۔ کسی زمانہ میں ایک چالیس برس کی عورت بوڑھی‘ مضمحل اور قابل اعتماد سمجھی جاتی تھی۔ اور آج دنیا میں اس سے خطرناک ہستی کوئی نہیں۔ گلگونہ لب و عارض اس نقطۂ نظر سے فن اور تہذیب کے لازمی نتائج ہیں۔ اگرچہ فطری رنگ غازہ کا قابل تعریف نعم البدل ہے۔

غالباً یہ حسین نزاکت‘ جدید عورت کی یہ جسمانی ناتوانی‘ ایک ہنگامی اور سطحی حالت ہے‘ جب دنیا کا مشینی کاروبار برقی طاقت سے چلنے لگے گا تو کارخانے بھی اتنے ہی صاف ستھرے ہو جائیں گے جتنے کبھی گھر ہوا کرتے تھے۔ شہر پھیل جائیں گے اور انسان پھر تازہ ہوا کھانے لگیں گے۔ سیر و تفریح‘ ٹینس اور باسکٹ بال کے ذریعے شاید پھر ان گلاب کے پھولوں کو اپنا لے جو شہری صنعت اس

کے رخساروں سے چھین کے لے گئی تھی۔ جدید لڑکی کا جسم کپڑوں سے ضرورت سے زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ مختصر سائے ساری دنیا کے لیے رحمت ہیں (سوائے درزیوں کے) ان کا فقط ایک ہی نقصان ہے کہ وہ مرد کے تخیل کو ختم کر رہے ہیں۔ اور اگر مردوں میں تخیل نہ ہوتا تو شاید عورتوں میں حسن بھی نہ ہوتا۔ الغرض جدید عورت نے جدید زندگی کی رنگینی اور تنوع میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ وہ اپنی نئی آزادی کی تحریک کی وجہ سے زیادہ شاداں اور مسرور نظر آتی ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لیے یہ مشکل ہے کہ اپنے آپ کو عورتوں کے کٹے ہوئے بالوں اور سگریٹ نوشی جیسی عادتوں کا خوگر کریں۔ لیکن آئندہ نسل ان سطحی تبدیلیوں کو برا نہیں سمجھے گی۔ حسین عورتیں جو کچھ بھی مستقل مزاجی سے کرتی چلی جائیں گی، ایک عام مرد کو وہ طرز کردار پسند آتا جائے گا۔ رسم و رواج کا احساس حسن پر خاصا اثر ہوتا ہے۔ پچھلے زمانے میں بوڑھی عورتیں حقہ پیتی تھیں اور مرد برا نہیں مانتے تھے۔ دنیا اسی طرح اپنا کاروبار چلاتی رہے گی۔ اب جبکہ بوڑھی عورتیں بدمعاش ہیں اور جوان عورتیں اپنے عاشقوں کی آنکھوں میں دھوئیں کے مرغولے پھونکتی ہیں، سگریٹ پینا نقصان دہ بھی ہے اور خوشگوار بھی۔ لیکن اگر مرد اور عورتیں ایک مختصر مگر شوخ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں تو ہم انہیں روکنے والے کون! ہم کس طرح یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شوخ مزاجی حکمت سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن ہم آخر جدید رقص کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہ عورتوں کی ایجاد ہے یا کسی نیوراتی مرد کی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ جب بے باک اور بے حیا والٹز نے عہد امارت کے رقص کی جگہ لی تھی تو ہمارے آباؤ اجداد اخلاقی طور پر ہماری ہی طرح غضب ناک ہوئے ہوں۔ پھر ڈاکہ زنی، قتل اور سیاسیات کے شریفانہ فنون میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی مہارت کے متعلق ہم کیا کہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک گمنام شخص نازک حالت میں ایک ہسپتال میں لایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین لڑکیوں نے اس کو بہت بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ وہ مرد پیدل جا رہا تھا کہ لڑکیوں نے اسے اپنی کار میں بیٹھنے کی دعوت دی، جو اس نے قبول کر لی۔ کچھ دور جانے کے بعد لڑکیوں نے کار کھڑی کر لی اور اس مرد کے ساتھ بوس و کنار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک لڑکی اس مرد کی سرد مہری پر غضبناک ہوئی اور لڑائی شروع ہو گئی۔ دو لڑکیوں نے اسے پکڑے رکھا اور تیسری نے ایک پن سے اسے مجروح کر دیا۔ اس کے بعد اسے زمین پر بے بس چھوڑ کر لڑکیاں بھاگ گئیں۔ کیا اس کے بعد بھی ہم عورتوں کی آزادی کے متعلق شک کر سکتے ہیں؟

غالباً ہکسلے نے ٹھیک کہا تھا کہ عورتوں کی نیکی مردوں کا سب سے بڑا تخیلی افسانہ ہے۔ عورتوں میں ہمیشہ سے یہ جذبات رہے ہیں لیکن کسی زمانہ میں وہ انہیں ہوشیاری سے چھپا لیا کرتی تھیں کیونکہ انہیں یہ خیال تھا کہ مرد حیا کو پسند کرتے ہیں لیکن آج کل جب مرد بے حیائی سے زیادہ

متاثر ہوتے ہیں، جدید لڑکی جسمانی اور ذہنی بے باکی سے کام لیتی ہے۔ وہ ہنگامی طور پر حواس کو لبھاتی ہے لیکن روح کو بے نیاز چھوڑ دیتی ہے۔ ایک بالغ مرد عورت کی مدافعت سے لطف اندوز ہوتا ہے اور عورتوں میں ایک لطیف کم سخنی کی عادت کو پسند کرتا ہے۔ لیکن جب مرد ناپختہ ہوں، جنسی تلون کا شکار بن جائیں، رفاقت اور وفا کی لذتوں سے ناآشنا رہیں اور سوائے جسمانی دل فریبیوں کے کوئی اور بات ان کے لیے کشش نہ رکھے تو ان کو رشتہ نکاح میں منسلک کرنے کے لیے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب شادی کے بعد خون کی حرارت کسی قدر سرد پڑ جاتی ہے تو شادی کے تواتر سے جذبات بجھ جاتے ہیں اور شادی کا انجام عموماً خراب ہوتا ہے۔ برنارڈ شا کا خیال غلط تھا کہ شادی زیادہ سے زیادہ ترغیب کے ساتھ تسکین کے زیادہ سے زیادہ مواقع کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مواقع تو باقی رہتے ہیں لیکن ترغیب بہت جلد کم ہو جاتی ہے۔

۴۔ ہماری بڑی بوڑھیاں

ایک جدید مزدور لڑکی کی تصویر، جو اپنے کام میں مصروف ہے اور توانائی اور جذبہ آزادی سے لبریز ہے، متوسط طبقہ کی شادی شدہ عورت کی تصویر سے زیادہ حسین ہے۔ متوسط طبقہ کی شادی شدہ عورت ایک ذریعہ آمدنی سے وابستہ ہے اور تاش کھیلنے، خرید و فروخت اور اجتماعی اصلاح کے کام میں منہمک رہتی ہے۔

آئیے ہم اپنے آپ کو ایک غیر ملکی کی نظر سے دیکھیں۔ کوئنٹ کیزرلنگ کہتا ہے "امریکہ میں شوہر اسی طرح مجبور و معذور ہے، جس طرح قدیم مشرق میں عورت بے بس و لاچار ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مرد میں لازمی نفسیاتی انحطاط پیدا ہو رہا ہے"۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امریکی عورتیں پستانوں کے بغیر مرد نما ہوتی جاتی ہیں اور "سرد مہری و درشتی کا تاثر پیدا کرتی ہیں"۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں کوئنٹ کیزرلنگ اور کس بات کی توقع رکھتا تھا۔ ہمیں ان خیالات کو اتنا زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ خیالات برینڈن برگ کی اشرافیت کے پس منظر میں پھلے پھولے ہیں۔ لیکن ان میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ یہ مردوں کی مغلوبیت کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ یقیناً بہت جلدی ہمارے ہاں چند شوہری کا ادارہ قائم ہو گا اور جابر عورتیں مخنتی مردوں کے حرم تعمیر کریں گی جن کی حفاظت مخنث عورتیں کیا کریں گی۔ غالباً مستقبل میں ہم میں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح تین جنسیں ہوا کریں گی۔ کچھ عورتیں نسل کی بقا کا کام سنبھالیں گی، باقی عورتیں اقتصادی معاملات میں اس طرح منہمک ہو جائیں گی کہ پہلے تولید کی آرزو اور پھر اس کی صلاحیت بھی کھو بیٹھیں گی۔ ارتقا کی رو سے ہمارے پاس یہ توقع رکھنے کا کوئی جواز نہیں کہ مستقبل ماضی کو

دہرائے گا۔

اس انقلاب کی کیا وجوہات ہیں؟ غالباً یہ کہ وقار کا تصور جسمانی تفوق سے وابستہ نہیں رہا۔ مرد کے جسمانی تفوق کی وجہ سے عورت محکوم تھی۔ مرد آقا تھا اس لیے کہ وہ عورت کو پیٹ سکتا تھا۔ آج بھی وہ عورت کو پیٹ سکتا ہے۔ اور یہ فلسفے کا ایک نہایت نازک مسئلہ بن گیا ہے کہ مرد نے یہ قدیم رسم کیونکر ترک کر دی۔ غالباً مرد کے اخلاقی شعور کی ترقی نے اس سے یہ رسم چھین لی اور عورت کی جنسی آرزوئے آزادی نے اسے ایک ایسی حیثیت بخش دی ہے کہ وہ اپنا آپ اپنے طالب کے سپرد کر دے۔ لیکن اس ثانوی حقیقت کے پیچھے یہ ایک بنیادی اقتصادی حقیقت پوشیدہ ہے کہ جدید حالات کی پیچیدگی نے، جو جسمانی طاقت سے زیادہ ذہانت کے مقتضی ہیں، محض جسمانی حجم کی اہمیت کم کر دی ہے اور متوسط طبقہ کے مرد سے اس کا تفوق چھین لیا ہے۔ اس کے بعد عورت بستر زیرکی اور مستقل مزاجی، مرد کی حیا، اس کی حساسیت اور اس کی تکان پر غالب آ گئی۔ جہاں کہیں جسمانی قوت کی اہمیت قائم ہے، (مثلاً مزدور طبقہ میں) مرد گھر کا آقا ہے اور عورت خود مختاری حاصل کرنے کے لیے اپنی روزی کماتی ہے۔

ذرا مفت خور عورت کی حیثیت پر غور کرو۔ گھر کے کام کاج سے آزاد ہو کر اور آلات ضبط تولید، نرسوں یا خادماؤں کی بدولت مامتا کی پابندیوں سے گریز کر کے وہ بیکاری کا شکار ہو گئی ہے۔ اجنبی تخم کے لیے زرخیز زمین بن گئی ہے اور وہ جتنا کام کرتی ہے، قدرتی طور پر اتنی ہی تساہل پسند ہوتی جا رہی ہے۔ وہ کام سے قطعاً جی چرانے لگی ہے، وہ کام جو کبھی اسے ایک حسین گڑیا کی بجائے مرد کا مددگار بناتا تھا۔

ہم کسی کام کرنے والی عورت کی، چاہے وہ گھر میں کام کرتی ہو یا دفتر میں، تذلیل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ وہ زندگی یا مفید اشیا کی تخلیق کرتی ہے۔ ہم صرف اس عورت کی مذمت کرتے ہیں جو اپنے حسن کی تجارت کرتی ہے، جو اپنی محبت، تعیش اور دولت کے عوض دیتی ہے، جو دن آرائش میں اور رات تفریح اور بدمعاشی میں گزارتی ہے۔ جدید زندگی کے متنوع ساز و سامان میں ان عورتوں کی تعیش پسندی سے زیادہ المناک کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے بچے یا تو ہوتے ہی نہیں یا کم ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں بہت سے ملازموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں کوئی کام نہیں ہوتا، لیکن ان کی ضروریات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ بیکاری کے فن میں ہزاروں دل فریب طریقوں سے مہارت حاصل کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد بے حد مشقت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی حیثیت محض ایک "زرساز" مشین کی سی ہو جاتی ہے۔

آج "عورتیں" شادی کی تجاویز کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ حالت ان مفت خور عورتوں نے پیدا

کی ہے کیونکہ اس قسم کی عورت اپنے شوہر کو جو کچھ دیتی ہے، وہ بہ آسانی اسے تھوڑی سی رقم دے کر خرید سکتا ہے۔ ان حالات میں ایک غیر شادی شدہ مرد کے لیے شادی شخصیت کی تکمیل کا وسیلہ نہیں بنتی، بلکہ اسے روحانی طور پر برباد کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لاکھوں عورتیں اپنی زندگیاں تنہائی میں بسر کر دیتی ہیں، کیونکہ لاکھوں بیویاں اپنا شکار پھانسنے کے بعد کھلم کھلا اسے اس طرح چباتی ہیں کہ سینکڑوں مرد گوشہ گیری کی زندگی کی طرف فرار کرتے ہیں۔ کٹے ہوئے بالوں یا مختصر سایوں میں نہیں، بلکہ ان حالات میں ہمارے زمانہ کی بداخلاقی کا راز پنہاں ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ شکلیں محض ہنگامی ہیں اور ہمارے ذہن اور اخلاق، سیاسیات اور فن کا انتشار، ایک نئے عہد درخشاں کا پیش خیمہ ہے۔ عنفوان شباب کے زمانے کی طوالت جو حقیقت میں تعلیم اور تربیت کے عہد کی طوالت ہے، شاید اعلیٰ معیاروں کی تعمیر کی علامت ہو۔ غالباً ہم ذہنی بیماروں کی ایک مختصر اقلیت ہیں لیکن ہمارے گرد و پیش لوگ بیاہ رچائیں گے اور بچے پیدا کریں گے اور زندگی کے تسلسل کو اس وقت تک قائم رکھیں گے جب تک ایک نیا اخلاقی نظام اور فکر و کردار کے نئے مستحکم ادارے، انسانیت کو ارفع و اعلیٰ مراتب کی طرف نہیں لے جاتے۔

* * *

باب دہم

شادی کی شکست

اور اب ہم شادی کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالباً برنارڈشا نے کہا تھا کہ دنیا کے کسی اور موضوع پر اتنی خرافات نہیں لکھی گئی، جتنی کہ شادی کے مسئلہ پر لکھی گئی ہے۔ محبت کے بارے میں بے وقوف بننا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ ابتدائے محبت میں احمق بننا ہے۔ ایک گوشہ گیر مفکر بھی یہ بات تسلیم کرے گا کہ اس کے باہمی تعلقات پر خیالات کا اثر بہت تھوڑا ہے اور یہ کہ اقتصادی تبدیلیاں، فلسفہ اور اخلاق کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ فکر کا کام فقط یہ ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا تجزیہ کرے اور کوئی ایسا موزوں طرز کردار وضع کرے جو فرد اور نسل کی بقا کا باعث بن جائے۔ ان معاملات میں تبلیغ کرنا بے سود اور سوجھ بوجھ سے کام لینا مفید ہے۔

ہم اپنی جنگوں اور مشینوں کے درمیان یہ بھول گئے ہیں کہ زندگی کی اساسی حقیقت، سیاست یا صنعت نہیں، بلکہ انسانی تعلقات ہیں۔ مرد اور عورت، زندگی، ماں اور بچے کے تعلقات کے گرد رقص کرتی ہے۔ اس باغی لڑکی کی کہانی یاد کرو، جس کا عاشق دسمبر ۱۹۱۷ء میں ماسکو کی بغاوت کے دوران میں مارا گیا تھا۔ جب لوگ اسے دفن کرنے لگے تو وہ قبر میں کود گئی اور اپنے عاشق کے کفن سے لپٹ کر کہنے لگی "مجھے بھی دفن کر دو۔ جب میرا محبوب مر گیا ہے تو مجھے انقلاب کی کوئی پروا نہیں"۔ وہ شاید یہ سمجھنے میں غلطی پر تھی کہ اس کا محبوب جواب دینے سے قاصر تھا اور اس کی جگہ کوئی اور پر نہیں کر سکتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ شکستہ دل اور شکستہ پیمان دونوں غیر معقول معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس حکمت کے ذریعہ جو ہر عورت کے خمیر میں بسی ہوتی ہے، یہ جانتی تھی کہ یہ عظیم انقلاب، محبت، ولدیت اور موت کے مقابلہ میں، جو انسانی زندگی کا مرکزی سرچشمہ ہے، ایک غیر اہم حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مبہم طور پر یہ سمجھتی تھی کہ خاندان، ریاست سے

زیادہ عظیم ہے، سپردگی اور مایوسی، اقتصادی پیکار سے کہیں زیادہ دلوں میں اتر جاتی ہے اور بالآخر ہماری مسرت، مملوکات، جائیداد اور طاقت پر نہیں بلکہ محبت کی داد و ستد پر مبنی ہے۔

۱۔ شادی کا ارتقا

شادی کا مطلب کیا ہے؟ اگر ہم اس کا ماخذ ڈھونڈ نکالیں تو ممکن ہے کہ اس کی اہمیت کو بہتر سمجھ سکیں۔ ذرا ایک تازہ مچھلی کا تصور کیجئے، جو اپنے بازو اپنے انڈوں پر پھیلا رہی ہے۔ یہ فطرت کی اس مرکزی حقیقت یعنی مادرانہ شفقت کی ابتدا ہے۔ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں بالعموم جنس مامتا سے نہیں، بلکہ وافر تناسل کے ذریعہ بقا حاصل کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ قدرت نے اس بیجا اسراف کی جگہ والدانہ شفقت کی تربیت شروع کی۔ جوں جوں خاندان کا حجم کم ہوتا والدانہ شفقت بڑھتی جاتی۔ انسانوں میں شادی کا ادارہ محبت کی تقدیس کے لیے قائم نہیں کیا گیا، بلکہ بچوں کی نگہداشت اور تربیت کی خاطر مرد اور عورت کو ایک مستقل رشتے میں مربوط کیا گیا ہے، تاکہ زندگی اپنی نوعیت کے اعتبار سے خوب تر بن سکے۔

شادی فقط ایک انسانی ادارہ نہیں ہے۔ پرندوں کی بعض اقسام انسانوں سے زیادہ یک زوجگی پر قائم رہتی ہیں۔ ڈی کرسپنی بورنیو کے انسان نما بندروں کے بارے میں لکھتا ہے "وہ خاندانوں میں رہتے ہیں۔ وہ درختوں پر کھلے اور فراخ گھروندے بناتے ہیں اور جہاں تک میں دیکھ سکا، ان گھروندوں میں فقط مادہ اور اس کے بچے رہتے ہیں۔ نر اسی یا کسی ہمسایہ درخت کے تنے پر رات بسر کرتا ہے"۔ ویسٹرمارک گوریلا کے متعلق لکھتا ہے کہ "گوریلے خاندانوں میں رہتے ہیں۔ نر گھروندا بناتا ہے اور خاندان کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی حال چمپنزی کا ہے"۔ سیویج کہتا ہے "اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گوریلا خاندان کے بزرگ درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل کھاتے اور گپیں ہانکتے ہیں اور ان کے بچے ان کے قریب اچھلتے کودتے ہیں اور پر خروش مسرت کے ساتھ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر لپکتے ہیں"۔

آہستہ آہستہ وہ اجناس جو اپنے بچوں کی نگہداشت نہیں کرتیں، ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہیں اور قدرت اکثر اجناس میں والدانہ شفقت کی جبلت پیدا کرتی ہے، جو فرد اور نسل کی بہتری کا باعث بنتی ہے۔ بعض اوقات بندریاں اپنے بچوں کی موت پر غم سے جان دے دیتی ہیں۔ بندروں کی ایک جنس میں ماں اپنے بچے کو مسلسل کئی مہینوں تک اپنے ایک بازو سے چمٹائے رہتی ہے۔ انسان میں یہ جبلت اکثر و بیشتر جذبہ غالب کی صورت اختیار کرتی ہے اور جذبہ محبت سے زیادہ قوی اور مستحکم ہوتی ہے۔ ہر عورت اپنے بچے کو اپنے شوہر سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ وحشی مائیں بعض

اوقات اپنے بچوں کو بارہ برس کی عمر تک گود میں اٹھائے پھرتی ہیں اور بعض قبائل میں (مثلاً نیو ہیزیڈیز) میں کچھ مائیں اپنے بچے کی موت پر خودکشی کر لیتی ہیں، تاکہ وہ موت کے بعد بھی بچے کی حفاظت کر سکیں۔

اس جبلت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ وہ مرکزی ادارہ قائم ہوا، جس کا نام خاندان ہے۔ خاندان کا ماخذ بچے کی بے بسی اور تعلیم و تربیت کے لیے حساسیت ہے۔ حیوانوں کا ارتقا بنیادی طور پر حیاتیاتی ہے کیونکہ اس کا تعلق نئے اعضا کی تخلیق سے ہے۔ لیکن انسانوں کا ارتقا اجتماعی نوعیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا تعلق ایک نسل سے علوم و فنون کے سرمایہ کو دوسری نسل تک منتقل کرنے سے ہے۔ قدرت نے خاندان کا ادارہ اس لیے پیدا کیا کہ نر مادہ کی خدمت پر مامور رہے اور مادہ بچہ کی نگہداشت کرتی رہے۔ فطری طور پر مرد عورتوں کے غلام ہیں اور عورتیں فطری طور پر بچوں اور نسل کی غلام ہیں۔ اس فطری غلامی میں ان کی حقیقت کے اسرار پنہاں ہیں۔

ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شادی مرد اور عورت کی جنسی آرزو کو آئینی جواز دینے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو والدین اور بچوں کے رشتہ پر استوار ہے اور اس کا مقصد نسل کو قائم اور مستحکم رکھنا ہے۔ اگر شادی فقط ذاتی معاملہ ہوتا تو اسے رسوم اور قوانین کی زد میں سب سے پہلے کیوں لایا جاتا۔ حکومتوں نے مرد اور عورت کی محبت کی تنظیم کے سلسلے میں اتنی احتیاط سے آئین کیوں بنائے ہیں؟ شادی کے رسم و رواج کا یہ ہنگامہ آخر کیوں؟ فقط اس لیے کہ شادی سب سے اہم اور بنیادی ادارہ ہے، جو زندگی کے سرچشمے کی حفاظت کرتا ہے اور تازہ تر پانیوں سے اس کے بہاؤ کو تیز تر کرتا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ شادی کا مقصد شوہر اور بیوی کی خوشی نہیں تھا، بلکہ تناسل اور بچوں کی نگہداشت۔ انسانی وجود پچھلے زمانے میں اتنا مختصر تھا کہ کسی نے فرد کی اہمیت پر غور نہیں کیا۔ جدید زمانے میں زندگی طویل تر ہوتی جا رہی ہے اور اللہ کی مخلوق بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے فرد نے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا کہ نسل کی بقا تو ہوئی، اس کی اپنی انفرادی خوشی کو قابل غور کیوں نہ سمجھا جائے؟ فرد کے عہد میں شادی کے خلاف بغاوت اپنی موجودہ معراج پر پہنچی ہے۔

شادی کا ارتقا نسلی افادہ کی صورت میں ہوا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے شوہر یا بیوی کے انتخاب کے ضمن میں فرد کی آزادی ہمیشہ اجتماعی ضروریات کے تابع رہی ہے۔ اولین جنسی پابندیاں والدین اور بچوں، پھر بہنوں اور بھائیوں کے جنسی تعلقات پر عاید کی گئیں۔ اس کے بعد یہ پابندی لگائی گئی کہ کوئی مرد اپنے قبیلہ کی عورت سے جنسی تعلقات قائم نہ کرے۔ پچھلے ماہرین اجتماعیات مثلاً لوئیس مورگن ان پابندیوں کی یوں توجیہ کرتے تھے کہ وحشی انسان قریبی رشتہ داروں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے حیاتیاتی نقصانات کو غیر شعوری طور پر جانتا تھا۔ ان کے بعد ویسٹرمارک اور

ایلس نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ قریبی رشتہ داروں کی باہمی شناسائی اور بے تکلفی سے آپس میں نفرت اور حقارت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے وحشی آباؤ اجداد کی ناقابلیت کے بیان میں مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ ان میں بھی حالات کا اندازہ کرنے اور اپنے اجتماعی نظام تعمیر کرنے کی صلاحیت تھی۔ غالباً جب انہوں نے فرد پر پابندیاں عاید کیں تو نسل کا مفاد ان کے پیش نظر تھا۔

اقتصادی رابطوں کے ساتھ ساتھ شادی کا ادارہ بھی بدلتا گیا۔ خانہ بدوشی کے عہد میں مرد ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے کسی اور قبیلہ میں چوری چھپے چلا جاتا اور کسی خیمہ سے کسی حسین دوشیزہ کو جبرا اٹھا کر لے آتا تھا۔ لیکن دولت اور امن کی ترقی کے ساتھ اخلاق بھی بہتر ہو گئے اور مرد مطلوبہ عورت کے باپ کے پاس ڈنڈا لے کے نہیں بلکہ کوئی تحفہ یا پیمان خدمت لے کے جاتا ہے۔ چھینا جھپٹی کی شادی کی جگہ کاروباری شادی نے لے لی۔ آج یہ ادارہ چھینا جھپٹی اور کاروبار کا ایک عجیب امتزاج بن گیا ہے۔

اس ابتدائی زمانے میں جنگ عام تھی اور خطرے زیادہ تھے۔ مرد عورت سے بہت پہلے موت کا شکار ہوتا تھا اور چند زوجگی باقی ماندہ مردوں کی اس کوشش کا نتیجہ تھی کہ عورتوں کی اکثریت کے مسئلہ کو حل کریں۔ چونکہ عورتیں کئی برس تک بچوں کی نگہداشت میں لگی رہتیں اور جب تک بچہ کا دودھ نہ چھڑایا جاتا، عورتیں شوہروں کے ساتھ ہم بستری نہ کرتیں۔ اس لیے مرد نے بیویوں کی کثرت اور تنوع کے ذریعہ اپنے مسلسل جنسی تقاضوں کی تسکین کی مفید اور آسان ترکیب سوچی۔ اس کے علاوہ چند زوجگی، یک زوجگی سے زیادہ بچوں کی پیدائش کا باعث بنتی اور بچوں کی فراوانی ایسے لوگوں کے لیے رحمت خداوندی سے کم نہ تھی، جو ہمیشہ جنگوں، حادثوں اور بیماریوں سے دہشت زدہ رہتے تھے۔

لیکن جب جنگوں کا زور کم ہو گیا اور زندگی اور صحت زیادہ محفوظ ہو گئیں، تو عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد کے لگ بھگ ہو گئی اور اس طرح یک زوجگی کا آغاز ہوا۔ یہ ادارہ بچوں کے لیے مفید تھا کیونکہ اب انہیں والدین کی متحدہ محبت میسر آئی اور کنبے کے بہت مختصر ہو جانے کی وجہ سے انہیں زیادہ کھانے کو ملا۔ یہ ادارہ مرد کے لیے بھی مفید تھا کیونکہ اب مرد اپنی جائیداد کو یکجا رکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی آزاد تھا کہ اپنی تنوع پسند جنسی محرکات کی پوشیدہ طور پر تسکین کرے، اگرچہ رواج اور طاقت کے ذریعہ وہ اپنی بیوی کی وفا کو ملوث نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس طرح اس کی جائیداد اس کے بچوں کو ہی پہنچتی۔ یک زوجگی عورت کے لیے بھی مفید تھی۔ اس نے وہ مسئلہ حسد کسی قدر حل کر دیا جس نے چند زوجگی کو ایک پاگل خانہ بنا رکھا تھا۔ اس ادارہ نے عورت اور مرد کو جنسی

مساوات عطا کر دی۔

شادی کی باقی تاریخ عورت اور جائیداد، دولت اور محبت کے درمیان آویزش پر مشتمل ہے۔ خیال تو یہ تھا کہ دولت شوہر یا بیوی کے انتخاب میں ایک فیصلہ کن سبب ثابت ہوگی اور عورت کی محکومی ایک دائمی رسم بن جائے گی، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دولت نے تعلیم کو جنم دیا۔ تعلیم نے مرد کے وحشی جذبات میں نرمی پیدا کی اور صدیوں کے ارتقا کے بعد جسم کے لیے جسم کی ہوس رومانی محبت میں تبدیل ہوگی۔ بعض ممالک میں والدین اپنی مرضی سے لڑکی کی شادی کسی دولت مند سے کر دیتے، لیکن انگلستان اور امریکہ میں اور ہر ملک میں کہیں کہیں رومانی شادی کا چرچا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ عورت نے، جو مرد کی بربریت کی وجہ سے نرم مزاج ہو گئی تھی، اپنی نرم مزاجی سے مرد کی بربریت میں تہذیب پیدا کی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی شرافت اور ایثار سے مرد کو وحشی کے مرتبہ سے بلند کیا اور اسے یہ تعلیم دی کہ وہ جسمانی کشش کے بجائے عورت کے اندر چند غیر مرئی صفات تلاش کرے۔ اس طرح آرزو کی جسمانی بنیاد پر تہذیب نے رومانی محبت کی نازک مگر حسین عمارت تعمیر کی۔

یقیناً رومانی محبت وجود میں آ چکی تھی۔ عنفوان شباب میں نوجوان خلوص سے لبریز شعر و سخن کی تخلیق کرتے۔ مرد عورتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتے، ان کے ہاتھوں پر بوسہ دینے کے لیے جھکتے اور ان کے گداز جسم کی ملائمت کے علاوہ ان میں کچھ اور صفات کی وجہ سے ان سے محبت کرتے۔ جب کئی دلوں میں آرزو نے جذبہ ملکیت کی بجائے جذبہ سپردگی کی صورت اختیار کی، اور جب مرد نے تادم مرگ محبت کرنے کا پر خلوص پیمان باندھا تو شادی اپنے ارتقا کی آخری منزل پر پہنچ گئی۔ غالباً ہم پھر اس کی معراج نہ دیکھ سکیں گے۔

۲۔ شادی کا تنزل

یہ عہد مشین کا عہد ہے اور اس میں ہر چیز کا بدلتا رہنا لازمی ہے۔ جہاں اجتماعی تحفظ بڑھ گیا ہے، انفرادی تحفظ کم ہو گیا ہے، جسمانی زندگی پہلے سے زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن اقتصادی زندگی ہزاروں پیچیدگیوں میں الجھ گئی ہے اور ہر روز نئے خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔ جوان لوگ، جو پہلے زمانہ سے زیادہ بہادر اور مغرور ہیں، اقتصادی طور پر بے بس اور جاہل ہیں۔ وہ محبت کرتے ہیں لیکن افلاس کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتے۔ کئی سال کے بعد وہ پھر محبت کرتے ہیں، لیکن پھر بھی افلاس انھیں شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کئی سال اور گزر جانے کے بعد ان کے دلوں میں جذبہ محبت پھر بیدار ہوتا ہے۔ گو ان میں پہلے جیسی تازگی اور توانائی نہیں ہوتی۔ اب مرد دولت مند ہے

اور شادی مرگ محبت کی رسم ادا کرتی ہے۔

اتنی دیر انتظار سے خستہ و پامال ہو کر شہری لڑکی پختگی کی عمر تک پہنچ جاتی ہے۔ داخلی مجبوریاں اسے ستاتی ہیں، جنسی نمائش یا سپردگی سے وہ مردوں کی توجہ حاصل کرتی ہے۔ مرد اسے تحفے دیتے ہیں، سیر و تفریح کے سامان بہم پہنچاتے ہیں، شراب پلاتے ہیں مگر ان سے شادی کبھی نہیں کرتے۔ کبھی کبھی اس کے کردار کی آزادی اس کی اقتصادی آزادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ مرد کی محتاج نہیں رہی۔ مرد بالعموم ایسی عورت سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جو جنسی معاملات میں تجربہ کار ہو (اگرچہ مردوں کا یہ میلان شدت سے کسی قدر کم ہوتا جاتا ہے) عورت اپنی اقتصادی خودمختاری کی وجہ سے اس میلان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کی اقتصادی خودمختاری ہی کسی مرد کو اس سے شادی کرنے سے روکتی ہے۔ مرد کی قلیل آمدنی دونوں کے موجودہ معیار زندگی قائم رکھنے کی کیونکر متحمل ہو سکتی ہے۔

بالآخر ایک مرد اس سے شادی کرنے کی تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شادی کر لیتے ہیں، کسی معبد میں نہیں کیونکہ وہ آزاد لوگ ہیں اور کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے اور وہ اخلاقی نظام جس کی بنیادیں ان کے بچپن کے مذہب پر استوار تھیں، ان کے دلوں سے اپنا اثر کھو چکا ہے۔ وہ کسی کارپوریشن کے دفتر میں شادی کرتے ہیں۔ ان کا پیمان کوئی مقدس پیمان نہیں ہوتا بلکہ ایک کاروباری معاہدہ جسے وہ جب چاہیں توڑ سکتے ہیں۔ ان کی شادی میں کوئی مقدس رسوم ادا نہیں ہوتیں، کوئی پر شوکت تقریر نہیں کی جاتی، موسیقی کی عظمت کا پس منظر نہیں ہوتا، جذبات کی گہرائی اور سرمستی نہیں ہوتی جو ان کے پیمان کے الفاظ کو ہمیشہ کے لیے ان کے دلوں پر ثبت کر دے۔ وہ ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں اور لاابالی انداز میں گھر چلے جاتے ہیں۔

نہیں گھر نہیں، کوئی پھولوں سے لدا ہوا اور سایہ دار درختوں میں گھرا ہوا مکان ان کے استقبال کے لیے ان کا منتظر نہیں ہوتا۔ کوئی باغ جو ان کے لیے پھل اور پھول پیدا کرے ان کی راہ نہیں تکتا۔ وہ تنگ و تاریک کمروں میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ کمرے، جن میں وہ زیادہ دیر تک نہیں سما سکتے اور جنہیں وہ آرائش و ترصیع سے اپنی شخصیتوں کا جزو نہیں بناتے۔ ان کا مکان کوئی روحانی وجود نہیں رکھتا، وہ محض ایک مادی حیثیت رکھتا ہے جو ایک پناہ گاہ کی طرح سرد مہر اور درشت ہے۔ وہ شور و غوغا پتھر کی سلوں اور فولاد کی سلاخوں میں محصور ہے۔ بہار اس کی فضا میں داخل نہیں ہوتی اور انہیں پھلتی پھولتی چیزیں عطا نہیں کرتی۔ وہ انہیں فقط بارش دیتی ہے۔ خزاں آسمانوں پر قوس قزح کے رنگ نہیں بکھیرتی اور پتے ہر روز نیا روپ نہیں دھارتے۔ خزاں میں انہیں فقط تساہل اور اداس یادیں میسر ہوتی ہیں۔

عورت مایوس ہو جاتی ہے۔ وہ اس چاردیواری کو خوشگوار بنانے کی کوئی سبیل نہیں پیدا کر سکتی اور کسی نہ کسی بہانے سے وہ اس سے فرار کرتی ہے اور صبح کے وقت اس میں واپس آتی ہے۔ مرد مایوس ہوتا ہے کیونکہ وہ دن بھر کی مشقت کے بعد اس میں گھر کا سا آرام اور اطمینان نہیں پاتا۔ آہستہ آہستہ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ کمرے بالکل ایسے ہی ہیں جیسے کبھی اس کے غیر شادی شدہ زمانہ میں ہوا کرتے تھے اور یہ کہ اس کے اپنی بیوی سے روابط بالکل اسی طرح بے کیف ہیں جس طرح کبھی سہل الحصول عورتوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ شادی سے کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی، بچے کی آواز رات کی نیند میں مخل نہیں ہوتی، بچے کے کھیل کود دن کو درخشاں نہیں بناتے، بچہ اپنے گداز بازوؤں سے خیرمقدم کر کے دن کی محنت اور مشقت کی تکان کو دور نہیں کرتا کیونکہ اگر بچہ پیدا ہو تو وہ کھیلے گا کہاں؟ وہ ایک اور کمرہ کیونکر کرایہ پر لے سکتے ہیں؟ اور بچہ کی تعلیم و تربیت کے اخراجات کیونکر برداشت کر سکتے ہیں؟ وہ یہ سوچتے ہیں کہ احتیاط بہتر ہے، وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ بچے پیدا نہیں کریں گے جب تک کہ وہ علیحدہ نہیں ہو جاتے۔

ان کی شادی، شادی نہیں ہوتی، وہ ماں باپ کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ ایک جنسی تعلق ہوتا ہے، اس لیے پھلتا پھولتا نہیں۔ وہ آبیاری سے محروم ہو کر مرجھا جاتا ہے۔ وہ اس لیے ختم ہو جاتا ہے کہ وہ نسل کی زندگی سے علیحدگی پر مبنی ہوتا ہے۔ میاں بیوی اپنے آپ میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ محبت کی فراخ دلی، ذاتیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مرد کی فطری تنوع پسندی عود کر آتی ہے، بے تکلفی نے ایک دوسرے کے لیے جذبہ تحقیر پیدا کر دیا ہے۔ اپنی سخاوت اور سپردگی میں عورت کوئی نئی چیز دینے کی اہل نہیں رہی۔

لاولد ہونے کی وجہ سے انہیں نفاق کے ہزاروں بہانے ہاتھ آ جاتے ہیں۔ آغاز محبت کے پیار بھرے کلمے اب استعمال تو ہوتے ہیں لیکن ان میں خلوص نام کو نہیں ہوتا۔ عورت ابتدائی زمانہ کی محبت کو یاد کرتی ہے۔ وہ گھر میں اپنے جسم، لباس، قول و عمل کی پروا نہیں کرتی، جس نے کبھی مرد کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اگر کوئی جنسی تناقض پیدا ہو جائے تو وہ ایک ناقابل عبور خلیج بن جاتا ہے کیونکہ وہ شادی کو محض ایک جنسی تعلق سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مفلس ہیں تو مرد اپنی ذمہ داریوں کے اضافے پر کڑھتا ہے اور عورت پرنس آف ویلز کے خواب دیکھتی ہے۔ اگر وہ دولت مند ہیں تو حرص اور خوف کی ذاتیت، محبت اور شادی کی مصنوعی مساوات سے متصادم ہوتی ہے۔ پیسے کے جھگڑے محبت کے خاتمے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مہذب لوگ ہیں تو مساوات کا دم بھرتے ہیں اور جب تک کہ ایک دوسرے پر غالب نہ آ جائے، ان کی جنگ ختم نہیں ہوتی۔ اگر عورت کام کرتی ہے تو وہ اپنی غلامی پر نالاں ہے۔ اگر وہ بیکار ہے تو وقت کاٹنا اس کے لیے وبال جان

بن جاتا ہے حتیٰ کہ شیطان اسے کوئی نہ کوئی مصروفیت بہم پہنچا دیتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ بچوں کی تربیت کی استطاعت نہیں رکھتے۔ وہ بالزک کی طرح یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ”بدی‘ کینہ پروری سے سستی ہوتی ہے“۔ اگر ان میں سے ایک کے بہت سے دوست ہیں تو دوسرا ان کا حاسد ہے۔ اگر دونوں کا کوئی دوست نہیں تو دونوں مجبوراً ایک دوسرے کی بے کیف صحبت میں وقت گزارتے ہیں۔ ملکیت اور تجسس کے جذبات کے باعث محبت کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ روح کو کہیں امن اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ محبت ایک مسلسل پیکار میں تبدیل ہو جاتی ہے‘ جس میں رات کا اختلاط ہنگامی صلح کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرد اور عورت دونوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ محبت کی شدت اور گرمی ان کی اپنی مسرت کے لیے نہیں بلکہ نسل کی بقا کے لیے تھی۔ عورت دیوی سے باورچن بن جاتی ہے (لیکن کبھی کبھی اسے کوئی ایسا شریف الطبع شوہر میسر آتا ہے جو باورچن کو دیوی بنا دیتا ہے۔) وہ مرد کی تنوع پسندی کو محسوس کرتی ہے اور اس کے اعمال پر کڑی نظر رکھتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ مرد پر زیادہ دیر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ وہ دیکھتی ہے کہ مرد کی توجہ کم ہوتی جا رہی ہے اور وہ حضور قلب کے بغیر محبت کرتا ہے۔ مرد اپنی بیوی کو ایک اجنبی کی نگاہ سے دیکھنے کا اہل نہیں رہتا۔ شوہر اور بیوی دونوں کو دور کے ڈھول سہانے معلوم ہوتے ہیں اور نیا محبوب حسین تر سمجھا جاتا ہے۔ جب عورت لاولد یا بیکار ہوتی ہے تو وہ کسی اجنبی مرد کی تمنا میں مبتلا ہو جاتی ہے جو اس کی آرزو کو دل فریب خوشامدوں سے بھڑکائے۔ دونوں زنا کا ارادہ نہیں رکھتے‘ وہ فقط زندگی کی آرزو رکھتے ہیں لیکن یکایک حواس شعور پر غالب آ جاتے ہیں۔ وفا غائب ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کے متعلق شکوک ابھر آتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی بے وفائی پر غیظ و غضب کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ اس کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح انہیں آسان راہ نجات مل جاتی ہے۔

اور وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں طلاق کی عدالت میں دیکھیے۔ جب دوسرے لوگ اپنی دکھ بھری داستانیں بیان کرتے ہیں تو وہ مغموم اور اداس ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ جب ان کی باری آتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے ظلم و ستم کو مبالغہ آمیزی سے بیان کرتے ہیں اور اپنے گزشتہ محبوبوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں جو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں محبت کے عہد و پیمان یاد ہوں۔ وہ جلدی ہی آزاد ہو جاتے ہیں‘ طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ از سر نو تجربہ کر سکتے ہیں لیکن حالات اور لوگ وہی ہیں‘ انجام کیونکر مختلف ہو گا؟

اکثر شادیوں کے فوراً بعد ہی علیحدگی ہو جاتی ہے اور بہت کم لوگ وفاداری کے متحمل ہوتے ہیں۔ لیکن مطلقہ لوگوں کی تعداد ناخوش شادیوں کی تعداد سے کہیں کم ہے۔ بہت سے لوگ

علیحدہ ہونا چاہتے ہیں لیکن شرم یا قانونی پابندیوں کے باعث علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ علیحدہ نہیں ہوتے، ان کے دلوں میں علیحدگی کی جرات کی بجائے رسوائی کا خوف ہوتا ہے۔ محبت کی جگہ بیزاری اور وفا کی جگہ فریب ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی علیحدہ ہو جائے تو بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح شادی کا انحطاط واضح ہو جاتا اور ہر فکر و تدبر کرنے والے سیاست دان کے لیے (جو صدی میں ایک ہوتا ہے) اور ہر عاشق کے لیے جو محبت کو اتنی جلدی مرتے نہیں دیکھ سکتا، فکر و تدبر کا مواد بہم پہنچاتا۔

۳۔ شادی کی تعمیر نو

مرض کی تشخیص تو آسان ہے لیکن اس کی دوا تجویز کرنا مشکل ہے۔ وہ کونسا نیا علاج ہے جو ہزاروں مرتبہ پہلے تجویز نہیں کیا گیا؟ اور وہ کونسا نسخہ ہے جو آزمائش میں ناکام نہیں رہا؟ ہم کیا نصیحت کریں کیونکہ ہر نصیحت زخموں پر نمک چھڑکتی ہے، اصلاح نہیں کرتی؟

شاید ہمیں اس مسئلہ کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے اور قدیم مسیحی مذاہب کی طرح یہ کہنا چاہیے کہ فرار کی ہر راہ مسدود کر دو، تو قیدی یہ سمجھنے لگیں گے کہ وہ قید میں نہیں ہیں۔ اگر شادی، بچوں اور نسل کے لیے ہے تو بچوں کی خاطر شادی کو اٹل بنا دو تاکہ جو رشتے خدا نے جوڑے ہیں، انسان انہیں توڑنے نہ پائے۔ انسان ایک دوسرے سے اتنے مماثل ہیں کہ اگر ہم ایک سے نباہ نہیں کر پائے تو گمان غالب ہے کہ دوسرے کے ساتھ بھی وہی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ انسان دکھ اٹھانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ شادی کر کے اس کے دکھ سکھ کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرے۔

لیکن کیا ہم ناپختہ جوانوں کے جذباتی عہد و پیمان کو ناقابل تحلیل قرار دے سکتے ہیں؟ کیا ہم دو روحوں کو ہمیشہ کے لیے باہم منسلک کر سکتے ہیں جبکہ ان کی محبت، نفرت میں تحلیل ہو گئی ہو؟ نسل کے ارتقا کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ اس کی خاطر افراد کو اپنی شخصیتوں کی قربانی کم سے کم کرنا پڑے۔ نسل کو فرد پر فوقیت حاصل ہے لیکن فقط اس لیے کہ وہ اعلیٰ افراد پیدا کرے، ورنہ نسل محض ایک لفظ ہے، فقط ایک قیاس۔

ہمارے ذاتیت پسند زمانہ میں شادی کا ایک بالکل مختلف نظریہ پیدا ہوا ہے جسے ”آزاد محبت“ کا دل فریب نام دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اگر عہد و پیمان محض ٹوٹنے کے لیے ہی استوار ہوتے ہیں، تو ہم عہد و پیمان کریں ہی کیوں؟ اگر شادیوں کا انجام طلاق ہی ہے تو ہم رسمی شادی کو ترک کیوں نہ کر دیں؟ اگر محبت شادی کی محرک ہے تو محبت کی موت، طلاق کے لیے بہترین جواز ہے۔ عاشق اور محبوب کو ذاتی دیانت اور اعتماد کی بنا پر یکجا ہو جانا چاہیے۔ جب محبت ختم ہو

جائے تو انہیں زندگی اور شباب کے احیا کے لیے نئے محبوب تلاش کرنے چاہئیں۔

مسئلہ شادی کا یہ حل روز بروز زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ جج لنڈزے کہتا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں شادی کی درخواستیں ۱۹۲۱ء کی نسبت ۲۵ فی صدی کم تھیں۔ وہ اس تخفیف کو "آزاد محبت" کی مقبولیت سے منسوب کرتا ہے۔ یہ آزاد اتحاد نہایت قابل تعریف ہے، مسئلہ شادی کا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ عورت اقتصادی اور نفسیاتی طور پر مرد کی محتاج ہے۔ ماہواری اور حمل اسے وقتاً فوقتاً بیکار بنا کر اس کے کمانے کی صلاحیت کو کم کر دیتے ہیں، جب تک کہ وہ گھر نہ بنائے اور ان خطرات سے کوئی مستقل تحفظ حاصل نہ کرے۔ آزادی کے تمام فوائد مرد کے حصے میں آتے ہیں۔ آج کل اگرچہ یہ احساس کم ہو رہا ہے لیکن بہرصورت موجود ہے کہ عورت اپنے آپ کو مرد کے سپرد کر کے اس کی نظروں میں اپنی وقعت کھو دیتی ہے۔ مرد ایک جنگجو حیوان ہے۔ کم سے کم وہ اپنے آپ کو یہی سمجھتا ہے۔ وہ مدافعت کو، خواہ وہ مصنوعی ہی کیوں نہ ہو، پسند کرتا ہے۔ جب وہ پوری طرح تسخیر کر چکتا ہے تو تسخیر کے نئے میدان تلاش کرتا ہے۔ مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اس سے پہلے کسی اور مرد کے ساتھ وابستہ نہ رہی ہو۔ وہ کسی تجربہ کار عورت کے ساتھ ہنگامہ معاشقہ پر فوراً رضامند ہو جاتا ہے لیکن اسے بیوی بنانا پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ تجربہ کار عورت شادی کی ابتدائی جذباتی شدت کو کھو کر پھر تنوع پسندی کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن مرد اپنا تجزیہ نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس کے یہ احساسات اور جذبات شادی کی اس قدیم رسم پر مبنی ہیں، جب عورت دام و درم کے عوض خریدی جاتی تھی اور مرد کی ملکیت بن جاتی تھی۔

یہ حالات بدل جائیں گے اور شاید جب عورت کی اقتصادی خود اختیاری مکمل ہو جائے گی اور آلات ضبط تولید، جنسی تعلقات کو تولید سے ممیز کر دیں گے تو مرد عورت کو بھی اسی معیار سے پرکھے گا، جس سے وہ اپنے آپ کو جانچتا ہے۔ اس طرح ہمارا قدیم اخلاقی نظام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کے خاتمے سے پہلے مرد کی انانیت اور غیر ذمہ داری کے باعث عورت کو درد و الم سہنا پڑے گا۔ آزاد محبت صرف مرد کو آزادی بخشتی ہے۔ کسی روز عورت اپنی زندگی کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے گی اور مامتا اسے کسی تنوع پسند مرد کے رحم و کرم کا محتاج نہیں رکھے گی۔ دور دراز مستقبل میں کسی دن ہم شاید مرد کو عورت کے ساتھ محبوس کیے بغیر بچوں کی نگہداشت کی کوئی سبیل نکال لیں گے۔ اس وقت "آزاد محبت" سب کے لیے نعمت ہو گی۔ لیکن اس وقت تک ہمیں قانون کا پابند رہنا چاہیے۔

عوام کے ذہن میں آزاد محبت اور رفاقتی شادی کے تصور الجھ کر رہ گئے ہیں۔ رفاقتی شادی

کی مستند تعریف ہے "وہ قانونی شادی جس میں ضبط تولید کی قانونا" اجازت ہو اور لاولد جوڑوں کو باہمی رضا و رغبت سے طلاق کا حق حاصل ہو۔ بالعموم بغیر اس نان نفقہ کے، جو شوہر مطلقہ بیوی کو دیتا ہے"۔ اس شادی میں سوائے "نان نفقہ" والی شق کے کوئی خطرناک بات نہیں۔ اور یہ عام شادی سے کچھ ایسی مختلف بھی نہیں۔ لوگوں کو فقط اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ تصور، مرد اور عورت کی مساوات کو مکمل کر دیتا ہے۔ بہت جلدی، امیر گھرانوں کی تعیش پسند عورتوں کی بدولت جنس نازک، مرد کے انتقام کی آماجگاہ بننے والی ہے۔ شادی کی ہیئت بدل رہی ہے۔ اب وہ بیکار عورتوں کو برداشت نہیں کرے گی، جو بہت سے گھروں میں محض خوفناک آرائش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مرد اپنی بیویوں کو یہ دعوت دے رہے ہیں کہ وہ خود کمائیں اور کھائیں۔ رفاقتی شادی اصرار کرتی ہے کہ عورت بچہ پیدا کرنے تک خود کمائے۔ عورت کی آزادی اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے، جب وہ اپنی روزی خود کمائے۔ اور یہی صنعتی انقلاب کی منطقی حد ہے۔ عورت کارخانے میں مرد کے دوش بدوش کام کرے گی۔ وہ محنت اور اجرت، فرائض اور حقوق میں مرد کی معزز شریک ہوگی۔ اس کا نام ہے آزادی۔

قابل تحسین ہے وہ شخص جس نے فرسودہ عقائد کا مقابلہ کر کے جدید شادی کے امراض کا یہ علاج پیش کیا ہے لیکن یہ ایک درشت اور جارحانہ علاج ہے۔ اسے ہر معقول شخص اس وقت تک صحیح نہیں سمجھے گا، جب تک کہ عورت کی اقتصادی خود اختیاری مکمل نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، مرد فطری طور پر ہوس ناک اور تنوع پسند ہے۔ جونہی شادی کی ابتدائی ندرت ختم ہوئی اور عورت مدافعت کے تمام اسلحے پھینک دے گی، وہ حسن و جمال کے نئے قصر فتح کرنے پر کمربستہ ہو جائے گا۔ یہ درست ہے کہ رفاقتی شادی میں طلاق فریقین کی رضا سے ہوگی اور جدید عورت فوراً طلاق کی درخواست منظور کرے گی، لیکن وہ پھر خود کیا کرے گی؟ صنعت کے جہنم میں جھونک دی جائے گی اور اس کی قدر و قیمت مرد سے کہیں زیادہ کم ہو جائے گی۔

یہ معمولی مشکلات ہیں اور غالباً تجربہ اس علاج میں قطع و برید کر سکتا ہے۔ اس علاج میں سب سے زیادہ تعمیری عنصر یہ ہے کہ یہ اوائل شباب میں شادی کی ترغیب دیتا ہے اور یہی ہمارے اخلاقی مسئلہ کی جان ہے۔ اگر ہم کسی طرح شادی کی فطری عمر کو بحال کر سکیں تو عصمت فروشی، خفیہ امراض، غیر صحت مند پاکیزگی اور جنسی بے راہ روی میں فوراً خاصی تخفیف ہو جائے۔

پھر غور کیجئے کہ کتنے کم لوگ اس سے شادی کر سکتے ہیں جسے وہ سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ شباب کے درخشاں ولولے، ہماری مالی خود اختیاری سے پہلے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم شادی کے عظیم تجربہ سے گریز کرتے ہیں اور محبت کو ختم کر دیتے ہیں۔ ابتدائی شباب کی محبت تازہ اور گہری

ہوتی ہے۔ تیس برس کی عمر کے بعد کوئی مرد جوانی کے جوش اور سپردگی کے ساتھ محبت نہیں کر سکتا۔ پہلی محبت، روح میں جو سپردگی پیدا کرتی ہے، وہ ایک برس کے اختلاط اور آزمائش سے ختم نہیں ہوتی۔ لڑکے کی معصوم ہوس اور لڑکی کا بے باک اعتماد زندگی کو ہمیشہ خوشگوار رکھے گا۔

پہلی محبت کی شادی کا تصور کیجئے۔ نئے جوڑے نے رہائش کے لیے کوئی تنگ و تاریک کمرہ نہیں چنا، بلکہ اس فضا میں ایک نیا گھر لیا ہے جہاں قدرت کی معصومیت ابھی تک کسی قدر قائم ہے۔ نئے گھر کی زینت اور آرائش کے متعلق ہزاروں خوشگوار بحثیں ہوتی ہیں۔ کیا کیا خریدا جائے اور اسے کہاں کہاں رکھا جائے؟ میاں بیوی گھر کے باغیچہ میں پھول اگاتے ہیں اور ان کی نشوونما کے ساتھ ساتھ خود بھی پھلتے پھولتے ہیں۔ گھر کو رنگ اور نغمہ کتابوں اور دوستوں سے آباد کرتے ہیں اور اسے بھرے بازاروں کی تابانی اور شور و غوغا سے کہیں زیادہ دل فریب بنا دیتے ہیں اور بالاخر ایک بچہ کی شوریدہ سری اور مسرت سے گھر کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ہم بار بار شادی کی پابندیوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں، لیکن ہمارے دلوں میں ان دنوں کی یاد ہمیشہ ایک کسک بنی رہے گی، جب محبت جوان تھی۔

اوائل شباب کی شادی پر بہت سے اعتراضات ہوسکتے ہیں۔ پند و نصیحت کرنا بیکار ہے۔ جوانوں کی مالی احتیاط کو ہم اخلاقی مواعظ سے دور نہیں کر سکتے۔ لیکن نوجوان خود نہیں......... بلکہ ان کے والدین شادی کے التوا کی نصیحت کرتے ہیں اور جوانوں پر اقتصادی پابندیاں عاید کر کے اسے ممکن بناتے ہیں۔ شباب کی بے باکی کو شادی کی تلقین کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ہمیں والدین کو یہ سمجھانا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی کو ملتوی کر کے ان میں جنسی بے راہ روی پیدا کر رہے ہیں اور حکمت اسی میں ہے کہ صحت مند نوجوانوں کی شادی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے اچھی خاصی مالی امداد مہیا کی جائے تاکہ ان کی اقتصادی ناپختگی دور ہو اور ان میں زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھے۔ یہ امداد قرض حسنہ کی حیثیت رکھے گی جو بچے اگلی نسل کو ادا کر دیں گے۔ اس میں کسی کا نقصان نہیں، ہر شخص فائدہ میں رہے گا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ والدین اس قسم کی فراخ دلی سے کام لیا کرتے تھے۔

اس امداد سے ایک محتاط لڑکا بھی محبت کی پکار سن لے گا اور کوئی لڑکا بھی، جو شادی کرنے پر آمادہ ہو، اس قدیم ضرب المثل میں کچھ حقیقت محسوس کرے گا کہ "خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو گا" غرور اس کی پشت پناہی کرے گا، اس کے بازوؤں کو طاقت بخشے گا اور اسے ہمت اور استقلال عطا کرے گا۔ ذمہ داری کی مجبوریاں اس کی شخصیت میں گہرائی پیدا کرے گی اور شادی اسے مرد بنا دے گی۔ اگر اور کوئی راہ قابل قبول نہ ہو تو شادی سے پہلے لڑکی کو کوئی کام کرنا چاہیے۔ یہ چیز گھر

میں ایک نازک سامان ترصیع بننے سے کہیں بہتر ہے۔ شادی کو غیر فطری طور پر معرض التوا میں ڈالنے کی بجائے یہ بہتر ہو گا کہ جوان لڑکے اور لڑکیاں شادی کر کے تولید کو ملتوی کر دیں۔ شادی سے جنس کے نفاق کو کم کرنے کے لیے ہمیں شادی کو تولید سے علیحدہ کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی مرد اس ذمہ داری کے باوجود تساہل اختیار کرے تو اس کا علاج یہی ہے کہ وہ بچے کا باپ بن جائے۔ بچہ اس میں غیرت مردانگی پیدا کرے گا بشرطیکہ اس میں مردانگی کی صلاحیت ہو۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ جوان اکثر دنیا کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نیطشے نے کہا تھا ”جب کوئی مرد محبت میں مبتلا ہو تو اسے اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے اور ایک جنون کی وجہ سے اپنے سماج کا کردار متعین کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں علی الاعلان عاشق و معشوق کے عہد و پیمان کو غلط قرار دے دینا چاہیے اور انہیں شادی کی اجازت نہیں دینی چاہیے“۔ یہ صحیح ہے کہ جوانی اندھی ہوتی ہے اور اس لیے کسی معقول فیصلہ پر نہیں پہنچ پاتی، لیکن محبت بڑھاپے میں نہیں ہو سکتی۔ غالباً ہمیں کسی وقت بھی اٹل فیصلے کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ امر طے شدہ نہیں ہے کہ مرد بیس سال کی بہ نسبت تیس سال کی عمر میں بیوی کا بہتر انتخاب کرتے ہیں اور چونکہ تمام بیویاں اور تمام شوہر بنیادی طور پر ایک جیسے ہوتے ہیں اس لیے اس بات سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کے ساتھ ہم آہنگی کی کوئی صورت نہیں نکال سکتا تو اکثر اوقات اس کی وجہ اس کے اپنے کردار یا رویہ میں کوئی خامی ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی اور عورت سے شادی کرے گا تو انجام وہی ہو گا۔ طلاق تو ایک سفر ہے، اگر ہم اپنے آپ کو نہیں بدل سکتے تو یہ بالکل بیکار ہے۔

بہرحال نوجوان بے خبر ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان معالات میں کون بے خبر نہیں ہوتا۔ ہم میں سے کون مرد عورتوں کو سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ صحیح برتاؤ کر سکتا ہے؟ جہالت کو کم کرنے کے لیے شادی سے چھ مہینے پہلے منگنی کی قدیم رسم کو بحال کر دینا چاہیے۔ اس عرصے میں لڑکا اور لڑکی ذہنی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے لگیں گے۔ شاید وہ شوہر اور بیوی کی طرح لڑنے بھی لگیں۔ اس طرح شادی سے پہلے ہی علیحدگی کا موقع مل جائے گا۔ یہ چھ ماہ کی مدت ہمارے شادی کے ادارہ کو وہ اخلاقی تقویت اور حسن عطا کرے گی جس کی اسے سخت ضرورت ہے۔

آخری اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تجربے کی پختگی سے پہلے ہی نوجوانوں کو یہ ترغیب دینا کہ وہ ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہو جائیں جو ممکن ہے ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، بالکل ہی غلط ہے۔ اگر چھوٹی عمر کی شادی کو کامیاب بنانا ہے تو شادی سے فرار کی بھی کوئی راہ نکالنی چاہیے اور طلاق فریقین کی رضامندی پر مل جانی چاہیے۔ لیکن یہ استدلال کر کے کہ طلاق ایک

المناک حقیقت ہے اور شادی زن و مرد کی خوشی کے لیے نہیں کی جاتی بلکہ اس کا مقصد بچوں کی پرورش اور تربیت ہوتا ہے، یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کی توسیع کی تلقین کی جائے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فریقین کی رضامندی کی شرط لگانے سے طلاقوں کی تعداد بڑھ جائے یا بچوں کی تربیت کے لیے وہ والدین بہتر ہیں جو ایک دوسرے کے لیے محبت اور اعتماد کے جذبات سے محروم ہوتے ہوئے بھی مجبوراً اکٹھے رہیں یا وہ جو علیحدہ ہو جائیں؟ اگر ہم مرد اور عورت کے متفقہ مطالبہ طلاق کو ٹھکرا دیں تو وہ علیحدگی کی کوئی اور سبیل ڈھونڈ نکالیں گے۔ یقیناً طلاق کو کچھ دیر ملتوی کرنا چاہیے۔ طلاق ہونے سے پہلے مرد اور عورت کو آزمائشی طور پر کچھ دیر علیحدہ رہنا چاہیے کہ شاید عقل و خرد بروئے کار آئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ میاں بیوی تنہائی کو جنگ سے برا سمجھیں اور جدائی ان پر وہ خوبیاں منکشف کرے جو قربت کے پردے میں پنہاں تھیں۔

امریکی کانگریس کے ایک رکن اور اس کی بیوی نے مل کر طلاق کی درخواست کی۔ یہ درخواست اس بنا پر مسترد کر دی گئی کہ انہوں نے خاصی تعداد میں کبریائی احکام اور انسانی قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ یہ حقیقت کہ انہوں نے متفقہ طور پر علیحدگی کی خواہش ظاہر کی تھی، غیر متعلق سمجھی گئی اور انہیں زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس قسم کے حالات زنا کی ترغیب کا باعث بنتے ہیں۔ کئی سال سے جاپان میں فریقین کی رضامندی پر طلاق ہو جاتی ہے، پھر بھی وہاں کی شرح طلاق ہمارے ملک سے کہیں کم ہے۔ روس میں ۱۹۰۷ء سے اس قسم کا قانون نافذ ہے۔ روم میں بھی یہ قانون تھا۔ بونا پارٹ نے اپنے آئینی نظام میں اسے شامل کر لیا تھا لیکن خاندان بوربون کے جاہل افراد نے اسے قلم زد کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس قسم کی ترمیم علیحدگیوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ کرے لیکن یہ ہمارے اخلاق اور ہماری عدالتوں کے اخلاق کو بہتر بنا دے گی۔

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے ان تجربات کا انجام کیا ہو گا۔ غالباً یہ ہماری آرزوؤں اور خواہشوں کے مطابق نہیں ہو گا۔ ہم ایک انقلاب کی موجوں میں الجھے ہوئے ہیں اور یقیناً ایسے مقامات کی طرف بہے جا رہے ہیں جن کا ہماری آرزوؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ رسم و رواج اور اداروں کے اس بے پناہ تغیر سے جانے کیا حالات پیدا ہوں۔ آج جبکہ ہمارے بڑے شہروں میں گھروں کی اہمیت ختم ہو رہی ہے، یک زوجگی کی کشش بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں بچے پیدا کرنے کی خواہش نہیں ہے، وہاں رفاقتی شادی عام ہوتی جائے گی، آزاد روابط بڑھتے جائیں گے اور اگرچہ یہ آزادی زیادہ تر مرد کے لیے مخصوص ہو گی، عورت کے لیے اخلاق کا معیار یکساں ہو جائے گا اور عورت مرد کی اس بات میں بھی نقل کرے گی کہ شادی سے پہلے جنسی تجربات حاصل کیا

کرے۔ طلاق کی تعداد بڑھ جائے گی اور ہر شہر میں شکستہ پیمانوں کے انبار نظر آئیں گے۔ شادی کا ادارہ نئی صورتیں اختیار کرے گا۔ جب عورت مکمل طور پر صنعت زدہ ہو جائے گی تو ہر طبقہ ضبط تولید اختیار کرے گا۔ تولید عورت کی زندگی کا محض ایک حادثہ بن جائے گا اور بچوں کی پرورش گھر کی بجائے ریاستی اداروں میں ہوگی۔

۴۔ بچے پیدا کرنا

بہرحال یک زوجگی شادی کی بہترین صورت ہے۔ شادی کا منتہائے کمال یہی ہے کہ میاں اور بیوی تادم مرگ اکٹھے رہیں اور یہی وہ مقصد ہے جسے ملحوظ رکھتے ہوئے ایک عاشق صادق شادی کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ طلاق میں میدان جنگ سے فرار کی طرح کچھ بزدلی سی نظر آتی ہے۔ وہ شخص جو نئے سے نئے محبوبوں کا آرزومند رہتا ہے، ایک غیر مستحکم اور سطحی شخصیت کا مالک ہے۔ مستحکم شخصیتوں کے مرد اور عورت اس خیال سے اپنی مشکلات کو حل کریں گے کہ تقریباً ہر میدان جنگ میں انہیں اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جب ربط و اتفاق باہمی کی کوششوں کا کڑا دور ختم ہوگا تو انہیں ان مشکلات کا معاوضہ ملے گا۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ایک مستقل جذبہ محبت کارفرما رہے گا، جس کا اظہار بچوں کی تربیت کی باہمی ذمہ داری کی شکل میں ہوتا رہے گا۔ ہزاروں انقلابات میں شرکت جسمانی آرزو کے ہنگامی جوش و خروش کی جگہ لے گی اور دو دل اور دو دماغ ایک ہو جائیں گے۔ جب روح کی یہ آزمائش ختم ہوگی تو وہ محبت کے کمال کا شعور حاصل کریں گے۔

لیکن یہ کمال بچوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بچوں کے لیے ہی شادی کا ادارہ ایجاد ہوا تھا۔ اس کا مقصد مرد اور عورت کا وصال بھی تھا لیکن اتنا نہیں جتنا کہ والدین کو اولاد کے ساتھ وفا اور شفقت کے رشتے میں منسلک کر کے نسل کو قائم اور جاری رکھنا۔ ہم کتنے ہی آزاد کیوں نہ ہو جائیں، ہم ماضی کے تعصبات سے کتنے ہی کیوں نہ ابھر جائیں، وہ عورت جو عمداً بانجھ رہتی ہے، ہم میں ایک ناخوشگوار اور مریضانہ تاثر پیدا کرتی ہے۔ داخلی مسرت کی طرح معروضی حسن فطری مقاصد اور وظائف کی تسکین سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے وہ عورتیں جو کبھی بچے پیدا نہیں کرتیں، کسی قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ہمیں کبھی یقین نہیں دلا سکتیں کہ انہیں سکون اور اطمینان حاصل ہے۔ اگر کسی عورت نے مامتا کی بجائے اپنی قوت صرف کرنے کی کوئی اور سبیل نکال لی ہے تو فطرت اسے برداشت کر لے گی، لیکن اگر وہ غیر مطمئن ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک مرد سے دوسرے مرد یا ایک تفریح سے دوسری تفریح کی تلاش کرے گی اور کہیں بھی اپنی دلچسپیوں کا

مرکز نہ پائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے محبت کے فطری مقصد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ نیٹشے نے کہا تھا "عورت ایک معمہ ہے اور اس کا حل ہے بچہ"۔

جدید عورت ان فرسودہ خیالات کا مذاق اڑائے گی اور کہے گی کہ وہ زمانہ گیا جب اسے تولید کی مشین کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص بھی، جسے تاریخ کا شعور ہے، عورت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی دیہاتی ماؤں کی طرح ایک بڑے کنبہ کی بنیاد رکھے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے (سوائے ان دیہاتی لوگوں کے جو ابھی تک ہمارے آئین ساز اداروں پر حاوی ہیں) کہ مشینوں کی افراط اور شرح اموات کی کمی نے کثیر تعداد میں بچے پیدا کرنے کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سماج کی فلاح و بہبود ایک کثیر آبادی میں مضمر ہے تو یہ اس لیے کہ ہم مقدار کو غیر ضروری اہمیت دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتے ہیں یا ہم استعماری توسیع کے آرزومند ہیں۔ لیکن مقدار سے کبھی کوئی جنگ فتح نہیں ہوئی۔ جنگیں عقل اور اسلحہ سے فتح کی جاتی ہیں اور جس وقت چینی مشینوں کے معاملہ میں ہماری برابری کرنے لگیں گے، وہ بھی آبادی پر پابندیاں لگانے کے وہی ذرائع اختیار کریں گے جو ہم کرتے رہے ہیں۔ بڑے کنبوں کی نہ آج قوم کو ضرورت ہے نہ اخلاق کو۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کو ایک خاص حد تک مامتا کا وظیفہ ادا کرنا چاہیے تو وہ محض اس لیے کہ اس سے سماج کی نہیں بلکہ اس کی اپنی تکمیل اور مسرت کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

جب بچے نہ ہوں تو شادی کا پھول مرجھا جاتا ہے اور بچے ہونے سے یہ پھول پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے شادی کی حیثیت ایک کاروباری معاہدہ کی تھی، جس کا مقصد جسمانی ضرورتوں کی تسکین تھا۔ اب وہ اپنا فطری مقصد پورا کرتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی شخصیتوں کو ایک وسیع کل میں مربوط کرتی ہے اور یہ اتحاد ایک شاداب پودے کی طرح پھلتا پھولتا ہے۔ عورت، مصائب اور آلام کے درمیان ایک عجیب اطمینان حاصل کرتی ہے، جس میں ایک خاموش سرور مضمر ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیکاری اور تعیش میں اتنی خوش نہیں تھی جتنی ان فرائض اور پابندیوں میں، جو اس کی نشوونما اور تکمیل کرتی ہیں حالانکہ بظاہر اسے نسل کی خاطر قربان کر رہی ہوتی ہیں اور مرد اسے دیکھ کر اس سے دوبارہ محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک نئی عورت ہے، نئی صلاحیتوں سے معمور۔ اس صبر اور نرم دلی سے لبریز جو محبت کی شدت اور تندہی میں پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے اور اگرچہ اس کا چہرہ اب زرد ہے اور اس کی ہیئت بدمعاشوں کی آنکھوں کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ شوہر کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے منہ سے اس کے لیے ایک نہایت قیمتی تحفہ لائی ہے، ایک ایسا تحفہ جس کا بدل وہ کبھی پیش نہیں کر سکتا۔ ناخوشگوار کام اب خوشگوار ہو جاتا ہے اور وہ گھر جو پہلے فقط ایک چاردیواری اور بستر تھا، اب نئی زندگی کی مسرتوں سے معمور نظر آتا ہے اور

اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ مرد اپنے آپ کو مکمل محسوس کرتا ہے۔

ولدیت سے مرد محض سماج اور نسل کے رکن کی حیثیت سے اپنا فرض ادا نہیں کرتا‘ بلکہ وہ اپنی تکمیل کرتا ہے۔ وہ ان ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے‘ جو اسے بلوغت بخشتی ہیں۔ وہ جبلت والدی کی تسکین حاصل کرتا ہے اور بچوں کی رفاقت کو بڑھاپے کی خوشی کی ضمانت سمجھتا ہے اور کسی حد تک موت کے صیاد سے بچ جاتا ہے۔ موت ہمارا گوشت اور خون لے جاتی ہے اور جوانوں کے لیے جگہ بناتی ہے۔ لیکن یہ جوان ہمارا لہو‘ ہماری زندگی اور ہماری روح ہیں۔ ہم موت کو اپنی زندگی کا فقط ایک حصہ دیتے ہیں‘ باقی حصہ ہم سے پرورش حاصل کر کے زندگی کے سیلاب میں نیا جنم لیتا ہے۔ ہمارے بچے ہمیں دکھ دیتے ہیں لیکن وہ بے پناہ سرور بھی بہم پہنچاتے ہیں جو محبت کے نشہ سے بھی زیادہ تند و تیز ہوتا ہے۔ مرد کو تکمیل حاصل کرنی چاہیے‘ ایک علیحدہ شخصیت کی طرح نہیں‘ جو تقابل کے چنگل میں گرفتار ہے‘ بلکہ ایک وسیع تر شخصیت کے جزو کی حیثیت سے‘ ایک عاشق کی حیثیت سے‘ جو لینے سے زیادہ دیتا ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے‘ جو نسل کی بقا کے لیے‘ خوشی سے زندگی کے تسلسل اور بقا میں شریک ہوتا ہے کیونکہ جزو کے کل سے تعاون میں اخلاق کی جان‘ زندگی کا راز اور مسرت کا سرچشمہ پنہاں ہے۔

⁂

باب یازدہم

بچوں کے متعلق ایک اعتراف

۱۔ ذاتی

خاندان کے متعلق اس قصیدۂ مدحیہ کے بعد ہم اس قدیم اور دشوار فرض پر غور کریں گے جسے بچوں کی تربیت کہتے ہیں۔ میں اس باب میں اپنے ذاتی تجربات بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ جن اسالیب اور نتائج کا میں ذکر کروں گا وہ ایک نہایت محدود تجربہ کا نچوڑ ہیں اور میں انہیں جوں کا توں بیان کر دوں گا۔ وہ تجربہ کیا ہے؟ ایک بچے کا اپنے والدین سے تعلق۔ میں شروع ہی میں اس بات کا اعتراف کر دوں کہ میں تین اشخاص میں نہایت شدید دلچسپی رکھتا ہوں۔ اتنی زیادہ کہ کوئی فلسفہ کل اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ قدرت ہم میں انانیت پیدا کرتی ہے تاکہ ہم زندہ رہنے پر رضامند ہو جائیں۔ ہم میں سے کون شخص اپنے آپ کو بقا اور دوام کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔

مجھے ایک بچے سے بہت محبت ہے۔ میرے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ کوئی اور بچہ صحت، ذہانت، گلابی رخسار اور گھنے بالوں میں اس سے سبقت لے گیا ہو۔ جب میں اپنی بیٹی کو مدرسہ تک پہنچانے جاتا ہوں اور مدرسہ کے نزدیک اسے رخصتی سلام کہتا ہوں، اور یہ دیکھتا ہوں کہ کس کبریائی جذبہ حیات کے ساتھ وہ رقص کرتی ہوئی اپنی جماعت کی طرف جاتی ہے تو مجھے اس دنیا کے رنج والم غیر اہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ اچھلتی کودتی لڑکی تمام معموں کا حل ہے اور تمام دکھوں کا علاج۔ جب میں گھر کی طرف لوٹتا ہوں تو ایک آبائی سرور میری رگ رگ میں دوڑنے لگتا ہے اور دکھ درد اور موت غرضیکہ ہر چیز قابل عفو معلوم ہوتی ہے کیونکہ فطرت کے غیر جانبدار ظلم و ترحم نے ایک نہایت غیر معقول الم میں سے ایک حسین بچہ پیدا کیا ہے۔

تو یہ امر واضح ہے کہ اس معاملہ میں تعصب سے کام لے رہا ہوں اور یہ بہت ممکن ہے کہ میں خاندان کے مسئلے پر غیر جانبداری سے کوئی بات نہ کہہ سکوں گا۔ یہ کوئی اصولی بحث نہیں ہے، فقط ایک اعتراف ہے۔ تربیت کی کوئی درسی کتاب نہیں بلکہ اپنے طرز عمل کا بیان ہے جو ممکن ہے قابل نفرت ہو۔ میں ان مسائل کے بارے میں اتنا ہی کم یقین رکھتا ہوں جتنا کہ مابعد الطبیعیات کے مسائل کے متعلق۔ تاہم میں اپنے دل میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے یہ خیالات نہایت فلسفیانہ اور گہرے ہیں اور درخشاں نسلوں کے وجود کی کلید ہیں اور میں یہ امید کرتا ہوں کہ دوسرے لوگ میرے ان اعترافات میں سے اپنے گھروں اور اپنی اولاد کے لیے روشنی حاصل کریں گے۔

۲۔ جسمانی

میرا خیال ہے کہ شروع سے ایتھل کو ہم روح اور بدن کا مرکب سمجھتے رہے ہیں۔ بدن پہلے پیدا ہوا اور روح اس وقت جب وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔ اس وقت سے ہمیں یہ احساس ہونے لگا کہ یہ سرخ و سفید جسم، یہ بھرے بھرے بازو اور ٹانگیں، یہ نیلی آنکھیں، گلابی ہونٹ اور سنہری بال اگرچہ بذات خود بہت دل فریب ہیں لیکن دراصل ایک غیر مرئی زندگی کا طرز اظہار ہیں۔ وہ زندگی جو بہت جلد نفرت اور محبت کے جذبات سے معمور ہوگی، آرزو کرے گی، خواب دیکھے گی، حیرت زدہ ہوگی، پھلے پھولے گی، ایک نئی شخصیت بنے گی اور ایک ایسا مرکز جس کے گرد تمام دنیا گھومے گی۔ اس زندگی کا انحصار اس بدن پر ہو گا۔ ہم نے یہ سوچا اگر یہ بدن زیادہ طاقتور اور مضبوط بن جائے تو اس میں زندگی کا شعلہ زیادہ درخشاں ہو گا۔ ہم نے یہ عہد کیا کہ جب تک ایتھل دس برس کی نہ ہو جائے، ہم اس کے بدن کی حفاظت اپنا اولین مقصد سمجھیں گے۔ ہمیں فطرت پر یہ اعتماد تھا کہ وہ جسم کامل میں سے رحم دلی اور ذہانت پیدا کرے گی۔ ہمیں یہ خیال تھا کہ کسی جسمانی مرض ہی کی وجہ سے بدکردار اور کند ذہن پیدا ہوتا ہے اور ایتھل کا تجزیہ نفسی کرنے یا اسے اخلاق کی تعلیم دینے کی بجائے ہم نے اسے تازہ ہوا اور صحت مند غذا بہم پہنچائی۔

پہلے تین مہینوں میں ہم نے ایک خطرناک غلطی کی۔ ہم نے ایک نئی قسم کے دودھ کی آزمائش کے لیے اپنی بچی کو ایک تجربہ گاہ بنایا۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی یاد کئی سال کی آبائی شفقت بھی ہمارے دلوں سے محو نہیں کر سکی۔ اب ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی نسل کو نئے طبیبوں اور پرانے حجاموں سے خبردار رہنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے ہماری غلطی کوئی رنگ نہ لائی۔ غلط غذا کے باوجود ایتھل صحت میں روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ جب ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ہم نے اس خوش نصیبی کو اس ہوا سے منسوب کیا جو ایتھل کو پہلے تین مہینوں میں میسر آئی تھی۔ ایک

خاموش گاؤں کی ہوا، جہاں فقط سانس لینا ہی زندگی کو ہم آہنگ بنانے کے مترادف تھا۔ اس وقت سے ہمارا یہ اصول اولین رہا ہے کہ ہوا اس عظیم معجزہ و قادر مطلق کے اس معجزے یعنی دودھ سے بھی برتر ہے۔ کوئی موسم ہی کیوں نہ ہو، ہر رات کھلے دریچے ہواؤں کو پکارتے ہیں کہ وہ آ کے اینتھل کے رخساروں کو پھولوں اور شعلوں میں تبدیل کر دیں۔

کئی مرتبہ ملائم الفاظ سے اور گردن میں گداز باہیں ڈال کے اینتھل ہم سے یہ اجازت مانگتی ہے کہ ہم اسے مقررہ وقت کے بعد تک جاگنے کی اجازت دے دیں لیکن اس معاملہ میں ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہم اس تجویز پر بحث ہی نہیں کرتے اور اسے ایک مجرمانہ خیال سمجھ کر مسترد کر دیتے ہیں اور اینتھل کو مقررہ وقت پر سلا دیتے ہیں۔ اب اگرچہ وہ دس برس کی ایک معزز خاتون ہے، وہ ہر روز سوا آٹھ بجے سونے کے لیے چلی جاتی ہے اور زینے سے ہمیں خدا حافظ اور شب بخیر کہتی ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ بستر میں لٹا دی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ قانون توڑا بھی گیا ہے۔ مثلاً جب کوئی ماہر موسیقی ہمارے گھر میں پیانو بجانے آیا ہو، لیکن اکثر اوقات ہم اس قانون کی ایک مقدس فریضے کی طرح پابندی کرتے رہے ہیں۔ یہ ہمارے فلسفہ زندگی میں ایک نہایت اہم تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہوا کے بعد غذا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ اینتھل کو ترکاریاں، دودھ اور گندم کی ڈبل روٹی راس آئی۔ وہ مضبوط، لمبی، توانا اور تنومند ہوتی گئی اور ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنی مکمل نشوونما کے لیے ہر وہ چیز حاصل کر رہی ہے جس کی اسے ضرورت ہے۔ لیکن نبات خوروں کو یہ سن کر صدمہ ہو گا کہ ہم نے بہت جلدی ہی اینتھل کی فہرست طعام میں ہفتہ میں دو ایک مرتبہ مرغ بھی شامل کر دیا۔ ہم اسے پیار سے "مرغ نبات خور" کہتے ہیں۔ اس عجیب غیر اصولی غذا پر یہ چھوٹا سا گھرانہ جسمانی طور پر پھلتا پھولتا رہا۔ اینتھل کی صحت ہمیشہ اچھی نہیں رہی۔ بچپن میں خسرہ نکل آئی۔ لیکن ایک ہفتے کے اندر اینتھل نے اسے ہنستے کھیلتے ختم کر دیا۔ چار برس کی عمر میں اسے ایک سہیلی سے کالی کھانسی لگ گئی لیکن بہت جلد ہی وہ دور ہو گئی۔ آٹھ برس کی عمر میں اس کا گلا سوج گیا۔ لیکن اپریشن سے بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس کی لوح صحت پر یہ چند داغ ہیں ورنہ اینتھل کو طبیبوں اور بیماریوں سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔ وہ اکثر یہ سوال پوچھتی ہے کہ پیٹ میں درد کس طرح ہوتا ہے؟

غذا کے بعد کھیل، جو حواس اور اعضا کو ہم آہنگی، اختصار حرکت اور وحدت سکھاتا ہے، ہوش مند والدین یہ جانتے ہیں کہ کون کون سے کھلونے مختلف اعضا اور صلاحیتوں کی تربیت کے لیے موزوں ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا اصول یہ ہے کہ وہ کھلونے جو صحیح مشاہدے، سبک دستی اور کھلی ہوا میں آزاد حرکت کی قوتوں کو بروئے کار لائیں، رولر سکیٹس سکوٹرز، تیر کمان چکر، کودنے کے

لیے رسی، بیس بال اور ٹینس کا سامان اور اگر آپ گیسوں سے بھری ہوئی گلیوں سے دور دیہات میں رہتے ہوں تو بائیسکلیں۔ یہ کھلونے اس فطرت کی مدد کرتے ہیں جو ہمیں کھیلنے پہ آمادہ کرتی ہے تاکہ ہماری ہر صلاحیت درجہ کمال تک پہنچے۔ ان میں سے بہترین کھیل ہیں تیرنا اور سکیٹ کرنا۔ گرمی اور سردی کے موسم انہیں کھیلوں کے لیے ایجاد ہوئے تھے۔ ہر عضو بدن ہم آہنگی سے حرکت کرتا ہے۔ سانس گہری اور تیز ہوتی ہے۔ خون میں تموج پیدا ہوتا ہے اور دل خوشی سے اچھلتا کودتا ہے۔ میں افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں سکیٹ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ سردی کے موسم میں جب اینھل سکیٹ کرنا سیکھے گی تو میں بھی گر پڑ کے سیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں تصور میں لڑکے لڑکیوں کو باہوں میں باہیں یا کمر میں ہاتھ ڈال کے ہنستی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے رخساروں کے ساتھ سرما کے آسمان کے نیچے حرکت کامل کے گیت گاتے ہوئے برف پہ تیرتے دیکھ رہا ہوں اور ہم دونوں یہ کھیل کھیلنے جائیں گے۔ ایک بوڑھا مصنف بھی یہ کھیل کھیل سکتا ہے۔ جب برف کے گالے فضا میں پرواز کریں گے تو ہم تینوں کس قدر لطف اندوز ہوں گے۔

۳۔ اخلاقی

جسم کو اولین اہمیت حاصل ہے اور اس کی نشوونما کا حسن سرچشمہ مسرت ہے۔ لیکن جب اس کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں، ہاضمہ صحت مند باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے لگے اس طرح کہ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی نہ پڑے تو کردار کی تربیت کے مسائل قابل غور بنتے ہیں۔ اگر بچہ کھانے کے معاملہ میں حریص، کھلونوں کے معاملہ میں کنجوس، کھیل میں لڑاکا، مغرور، باتونی، جھوٹا، متلون مزاج، خلوت پسند یا صفائی سے بھاگنے والا ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

پہلی بات یہ کہ بچے پر کوئی پابندی نہ لگائیں۔ اگر کوئی بچہ بری حرکت کرے تو اس سے معافی مانگ لیں کیونکہ آپ نے اسے غلط غذا دی ہے یا اس سے برا سلوک کیا ہے۔ پابندیاں لازمی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہونی چاہیے۔ غالباً یہ بہتر ہو کہ والدین ہر پہلی جنوری کو پچھلی پابندیاں منسوخ کر کے نئی پابندیوں کی فہرست تیار کریں۔ بہت سے والدین جو دولت یا محبت حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں، بچے پر پابندیاں عائد کر کے زندگی سے انتقام لیتے ہیں۔ بچے کے ساتھ تحکمانہ انداز اختیار کرنا کمزوری کی علامت ہے۔ کمزور آدمی تحکم کو پسند کرتے ہیں اور بات بات پہ اعتراض کرنے کا حق شادی کے دکھوں میں ڈھارس بندھاتا ہے۔ بچے کو خوش رہنے دیجیے اور اپنے آپ کو یہ فریب نہ دیجیے کہ آپ مستقبل کے لیے حال کی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ ہم یہ عہد کر چکے

ہیں کہ جب تک ایتھل کی شادی نہ ہو جائے' ہم اسے خوش رکھیں گے۔ اس کے بعد اس کا خدا حافظ۔

بچے کے ساتھ حاکمانہ سلوک' اس میں بغاوت اور شورش کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ اصول نیوٹن کے قوانین حرکت کی طرح یقینی ہے اور غالباً آئن سٹائن کے بعد بھی درست رہے۔ جب ہم حکم دیتے ہیں تو اس کی خودداری کی تمام پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ ہر فرمان پر ہم افواج مدافعت کو حرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ طلب کرو اور تمہیں مل جائے گا۔ حکم دو تو تمہیں مایوس ہونا پڑے گا۔ بچے کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس کی محبت اور اعتماد حاصل کرو اور تمہاری درخواستیں اور نصیحتیں تمہارے احکام سے زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔ ایتھل کے والدین اشارے کنائے کے ذریعے اس سے بہت سے کام کروا لیتے ہیں۔ ہم ایتھل کو مدرسہ تک پہنچانے جاتے ہیں اور اس کے خوشگوار زمانہ طالب علمی پر رشک کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ جب وہ دیکھتی ہے کہ ہم اس کے اس زمانہ طالب علمی کی قدر کرتے ہیں تو کیا وہ اپنے بچپن کی مسرتوں کو زیادہ شدت سے محسوس نہیں کرتی ہوگی؟ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم اس سے اس کی تعلیم کے متعلق سوال پوچھتے ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے کہ ہم اس کی تعلیم میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں اور تاریخ' جغرافیہ' ہجے' یہاں تک کہ حساب میں ہماری دلچسپی کی وجہ سے وہ بھی ان مضامین میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ان مضامین کا مطالعہ بے کیف ہو۔ یہ مضامین ایک جنگ' ایک سفر' ایک محبت نامہ یا ایک انکم ٹیکس رپورٹ کی طرح دلچسپ بن سکتے ہیں۔

یہی حال پیانو کا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو امریکہ میں ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ "جاؤ اور مشق کرو"۔ یہ ایک بے ہودہ فقرہ ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "پیانو بجانا ایک بے کیف مشغلہ ہے۔ اس کی مشق کربناک ہے۔ جاؤ اور اسے برداشت کرو' تم اس کی مستحق ہو"۔ ہم نے ایتھل کے سامنے ایک اور ترکیب کی۔ ہم نے محض اس سے یہ کہا کہ اگر تم پیانو سیکھنا چاہو تو سیکھو۔ ہم نے اس کا فیصلہ اس پر چھوڑ دیا۔ لیکن یہ تجویز کرنے سے کئی ہفتے پہلے ہم نے اس سے موسیقی کی شوکت اور اسے تخلیق کرنے کی عظمت کا ذکر شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ایسے استاد کو ڈھونڈنا شروع کیا جو بے جان میزان سکھانے کے بجائے اسے ایسی دل فریب سریں سکھائے جن سے سارا گھر لہلہانے لگے۔ ہمیں ایک ایسا استاد مل گیا اور جلد ہی ہمارا گھر ان نغموں سے معمور ہو گیا جو ننھے ننھے مگر تندرست ہاتھوں کا کرشمہ تھے۔ ہم بڑے بھی ایتھل کے ہمنوا ہو کر وہی گیت گانے لگے۔ وہ ہماری مسرت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اپنے آپ کو ایک فنکار سمجھنے لگی۔ ابتدا ہی سے پیانو اس کے لیے موسیقی کی علامت بن گیا' شور و غوغا اور درد کی نہیں۔

کچھ عرصے بعد اس کی ترقی ایک جگہ آ کے تھم گئی۔ وہ زیادہ مشق کرنے سے گریز کرنے لگی اور ہمیں جذبات اور رسوم کے عفریتوں سے جنگ کرنا پڑی، جو ہمیں جبر کرنے پر اکسانے لگے تھے۔ میں خود پیانو کے سامنے بیٹھ جاتا اور سبق کی مشق کرتا۔ پھر میں ایتھل کو یہ دعوت دیتا کہ وہ میرے ساتھ مل کر پیانو بجائے اور جب وہ میرے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کرتی تو میں خود ہی بجاتا رہتا۔ اس کے استاد نے ہمیں ایسے دوگانے سکھائے تھے جو ہم دونوں مل کر گاتے رہتے۔ (اس وقت ایتھل نے مجھے آواز دی ہے ”ابا! آؤ، میرے ساتھ مشق کرو“۔) اس کا ذوق جلدی ہی عود کر آیا۔ اور وہ کچھ عرصے میں بیتھوون موزارٹ، شومان، شوبرٹ، ہینڈل، ہائیڈن اور باخ کے فن پارے بجانے لگی۔ ہم ذوق شوق سے یہ گیت گانے لگے۔ ہم نے ایتھل پر اپنی ممنونیت کا اظہار کر دیا کہ اس نے ہمارے دلوں کو نغموں کے نور سے منور کر دیا ہے۔ اسے یہ احساس ہونے لگا کہ موسیقی ایک نعمت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے تکلیفیں اٹھانا بے سود نہیں ہے۔ ”پیانو کو خیرباد“ بجا کر اس نے کہا ”اب میں سمجھی کہ آپ بیتھوون پر اس قدر فریفتہ کیوں ہیں!“

اپنی بات سمجھانے کے لیے اب میں تیرنے کا ذکر کروں گا۔ اگرچہ موسیقی کے بعد تیرنے کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیا کبھی آپ نے والدین کو بچے کو تیرنا سکھاتے دیکھا ہے؟ وہ پہلے اسے تیرنے پر پھلاتے ہیں۔ پھر تادیب کرتے ہیں اور پھر جبراً اسے پانی میں دھکیل دیتے ہیں۔ کچھ وقت تک یہ طریق کار کامیاب رہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بچہ کے دل میں پانی کی وہ دہشت پیدا کر دیتا ہے کہ بعض اوقات وہ کبھی تیرنا سیکھ نہیں پاتا۔ اس ضمن میں تھوڑی سی مثال ہزاروں جبر سے بہتر ثابت ہوتی ہے۔ ایتھل ہر بچہ کی طرح پانی سے ڈرتی تھی۔ اس کا خوف قدرتی تھا، جو کہ گزشتہ نسلوں کے خطرناک تجربوں پر مبنی تھا۔ ہم نے اسے تیراکی کا لباس پہنا دیا اور اسے ریت پر کھیلنے دیا۔ لیکن ہم خود اس کے سامنے تیرتے رہے۔ کچھ دنوں بعد اسے ہمارے ہنر پر رشک آنے لگا اور وہ پانی سے کھیلنے لگی۔ ہم نے اسے ایک ”بچاؤ پٹی“ خرید دی اور اس کے گرد باندھ دی اور اسے یہ بتایا کہ اس کی مدد سے وہ گہرے پانی میں اپنے بال تر کیے بغیر تیر سکتی ہے۔ اس نے دوسرے لڑکے لڑکیوں کو دیکھا اور ان کی نقل کرتے ہر سمت تیرنے لگی۔ ہم نے پٹی اتار دی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ تیر سکتی ہے۔ اگلے برس اس نے ایک دوست کی مدد سے تیرنے کے اور طریقے سیکھے۔ اب وہ اپنے باپ کو تیرنا سکھاتی ہے اور اسے اپنے فن کی قوت اور تنوع دکھا کر شرمسار کرتی ہے۔ مثال اگر اچھی ہو تو اتنی موثر ثابت ہوتی ہے کہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ بہترین گھر اور بہترین مدرسہ وہ ہے جہاں جبر اور تحکم بہت کم ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ سزا اور حکم کے بغیر بچہ کا اخلاق کتنا سدھر جاتا ہے۔ اگر آزاد تعلیم ناکام رہتی ہے تو وہ محض اس لیے کہ ہم والدین ان اصولوں کی خود خلاف

ورزی کرتے ہیں جن کی ہم اپنے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ہم توازن کی تعلیم دیتے ہیں اور خود خوب کھاتے پیتے ہیں۔ ہم دوست داری کی تعلیم دیتے ہیں اور خود بازاروں میں لڑتے بھڑتے ہیں۔ ہم مٹھائیوں اور جذباتی فلموں کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور خود چوری چھپے ان سے لذت اندوز ہوتے ہیں اور ایک دن بچہ ہماری چوری پکڑ لیتا ہے۔ ہم سختی سے نرم مزاجی کا مطالبہ کرتے ہیں اور درشتی سے علم کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ ہم انکساری کی نصیحت کرتے ہیں اور خود کامل دیوتاؤں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ لیکن بچے ہماری نصیحتوں سے نہیں، ہماری مثال سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو بچے ماں باپ کو بہت زیادہ تکلیف دیتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ ہمارے ماضی کو دہرا رہے ہوں۔ مجھے اپنے بچوں سے ملایئے تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ آپ خود کیا ہیں۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ حلیم الطبع ہو تو خود حلیم الطبع بنئے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ صفائی پسند ہو تو خود صفائی پسند بنیئے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بچے کے ساتھ سخت کلامی کرنا، اس کے دل میں درشت گوئی کا نقش بٹھاتا ہے، جن کی وہ بعد میں نقل کر سکتا ہے۔ اچھی صفات صرف مستقل اچھی مثال ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ کام مشکل ہے اور اس کے لیے ہماری شخصیتوں کو از سرِ نو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ اس طرح بچے ہماری تربیت کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ راقم الحروف ان اعلیٰ اصولوں کی خلاف ورزی کر کے سوقیانہ طریقے پر چلا ہے اور عقل کو کھو کر غصہ میں جبر اور تحکم پر اتر آیا ہے۔ میں نے یہ معیاری اصول اس لیے قائم کیے ہیں کہ میں اپنی تہذیب کر سکوں اور اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کر سکوں۔

ہم نے اینتھل کی شخصیت میں ہر جبلت کو کسی اچھے مقصد پر مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے ہر ننھے حیوان کی طرح حریص رہی ہے اور اپنے کھلونوں میں کسی اور کو شریک بنانے سے گریز کرتی رہی ہے۔ لیکن وہ ہمارے اس طرز عمل سے متاثر ہوئی ہے، کہ ہم ہر چیز میں اسے شریک بناتے تھے اور اس کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ ہمارے اس دوستانہ رویہ سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ دوسروں کے ساتھ بہتر اور فیاضانہ برتاؤ کرنے لگی۔ کچھ مدت تک وہ پیسوں کی دھن میں رہی۔ ہم نے اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس شرط پر کہ وہ اپنا کمرہ صاف رکھے گی، اپنا بستر خود درست کرے گی۔ صبح سویرے اٹھے گی، مدرسہ وقت پر پہنچے گی اور اپنا سبق خوب یاد کرے گی۔ میرے دوستوں نے اس ماہانہ وظیفہ پر مجھے مطعون کیا ہے کہ میں اینتھل کو بگاڑ رہا ہوں۔ اور مجھے خود بھی کبھی کبھی اپنے طرز عمل کی حکمت پر شک پیدا ہوا ہے۔ ابھی یہ کہا نہیں جا سکتا کہ آیا میرے دوست غلط کہہ رہے ہیں یا صحیح۔ لیکن میرا خیال ہے کہ علائم ان کے خلاف ہیں۔ وظیفہ سے اینتھل کی حرص بڑھی نہیں، کم ہوئی ہے۔ اس وظیفے سے وہ کھلونے خریدتی ہے اور کبھی

کبھی ہمارے لیے بھی تحفہ خرید لاتی ہے۔ میری آئندہ سالگرہ پر اس نے مجھے ایک اچھا تحفہ دینے کے لیے اسی وظیفے میں سے کچھ رقم جمع کی ہے۔ ابھی ابھی اس نے ہمیں اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ ہم اسے ایک چھوٹا سا گھوڑا خرید دیں۔ جب ہم اس بات پر آمادہ ہو گئے تو وہ مجھ سے کہنے لگی ”میں اس کی قیمت اپنے وظیفے میں سے ادا کروں گی“ لیکن اس مرتبہ اس کی تنخواہ ناکافی ثابت ہو گی۔

یہی حال خودداری کا ہے۔ خودداری ایک مصیبت، ایک بے ہودگی بن سکتی ہے یا یہ شخصیت کی نشوونما میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بچہ منکسر المزاج یا حقیر بنے اور جب اینتھل خودسری کرتی ہے تو میں اس خیال سے مطمئن ہو جاتا ہوں کہ جب وہ بڑی ہو گی تو جو شخص اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے گا، وہ اس کی زندگی حرام کر دے گی۔ تھوڑی سی تندہی اور جذبہ مدافعت، شخصیت کی ترکیب کے ضروری عناصر ہیں۔ خودداری عزت کی ماں ہے اور ہمت اور جرات کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ وہ لامتناہی طور پر کسی اچھے مقصد کے لیے استعمال ہو سکتی ہے۔ ہم اینتھل سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اتنی خوددار ہے کہ یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی شخص اسے گندا یا غلیظ دیکھے۔ اس کی خودداری اسے اپنے حق سے زیادہ کوئی چیز لینے، تحفوں کے پیچھے بھاگنے یا کام میں کسی اور شخص کو سبقت لینے نہیں دیتی۔ خودداری سزا کا بہت اچھا بدل ہے۔ یہ ایک ایجابی محرک ہے، کوئی سلبی اقدام نہیں۔ یہ بہادری اور استقلال پیدا کرتی ہے اور بزدلی اور کم ہمتی کو کچل دیتی ہے۔ نیطشے نے یہ سوال پوچھا تھا کہ نیکی کیا ہے؟ اور خود ہی جواب دیا ”بہادری“۔ لیکن خودداری کے بغیر کوئی کیونکر بہادر ہو سکتا ہے؟

غالباً ہم بچے کی شخصیت کی تعمیر کے سلسلے میں مذمت کی جگہ تعریف و توصیف کو دے سکتے ہیں۔ مذمت روح کو مرجھا دیتی ہے اور کسی خامی کو ہمیشہ کے لیے قابل نفرت بنا دیتی ہے، تعریف ہر خلیہ کو پھیلاتی ہے، ہر عضو کو توانائی بخشتی ہے اور کسی مشکل ترین کام کو ایک معرکہ، ایک فتح بنا دیتی ہے۔ انانیت سے ہم دنیا کو متحرک کر سکتے ہیں۔ کسی کام کی خامیوں کی مذمت کی بجائے ہمیں اچھی طرح کیے ہوئے کام پر نظر رکھنی چاہیے اور اس کی تعریف کرنی چاہیے تاکہ وہ ہمارے حافظہ میں خوشگوار طریقہ پر محفوظ رہے اور ہمیں بہتر اسلوب سے کام نبھانے کی ترغیب دے۔ اگر اینتھل ہمیں یہ اطلاع دیتی ہے کہ وہ حساب اچھی طرح نہیں کر سکی (حساب اس کے لیے ہوا ہے) تو ہم افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم اسے کوسنا نہیں چاہتے۔ خدا کرے اسے یہ راز معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کے نمبر ہمارے ان نمبروں سے کہیں زیادہ ہیں جو ہم اپنے زمانہ طالب علمی میں حاصل کرتے تھے۔ لیکن جب وہ گھر آ کے اپنے اعلیٰ نمبروں کا مژدہ سناتی ہے تو ہم خوشی سے رقص کرتے ہیں اور اس کی ہر فتح کا جشن نت نئے طریقوں سے مناتے ہیں۔ جب وہ کوئی خاص کارنامہ کرتی ہے تو ہم اس کے

حساب میں ایک ڈالر جمع کروا دیتے ہیں (اگرچہ میرے دوست یہ بات سن کر بہت بگڑتے ہیں) اگر مذمت اور تادیب کی بجائے تعریف و تحسین کا طریقہ ناکام رہا تو؟ ہم پہلے طریقہ کی کامیابی پر دوسرے طریقہ کی شکست کو ترجیح دیتے۔ ہم ہر اس منصوبہ کی تائید کرتے ہیں جو ایتھل کی خوشی میں اضافہ کرے۔ رنج والم سے درشت خو بنانے کی بجائے محبت کی فراوانی سے خود سر بنانا ہمیں زیادہ پسند ہے اور مشکل مرحلوں پر درشتی اور سخت گیری نہیں بلکہ محبت ہماری مدد کرتی ہے۔

خدا جانے یہ زحمت ہے یا رحمت کہ قسمت نے ہمیں فقط ایک بچہ عطا کیا ہے۔ اگر ہمارے اور بچے بھی ہوتے تو ہم ایتھل پر اتنی توجہ صرف نہ کر سکتے۔ میں نے دو تین بچوں والے گھرانے دیکھے ہیں۔ ان کا شور و شغب مجھے پسند نہیں۔ میں اپنا کام گھر ہی میں کرتا ہوں اور ایتھل اکثر میرے پاس رہتی ہے۔ لیکن اگر اس کے بہن بھائی بھی ہوتے تو میں شاید گھر سے ایک میل دور کوئی کمرہ لے لیتا۔ اب ایتھل کا قرب میرے کام میں مخل نہیں ہوتا۔ دوسرے کمروں میں اس کی آواز یا کبھی کبھار میرے کمرہ پر اس کا حملہ مجھے تازہ دم کر دیتا ہے۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں اپنا کام شہر کے انتشار میں نہیں بلکہ ایک شخصیت کے خوشگوار نشوونما کی معیت میں انجام دیتا ہوں۔

تاہم اکلوتے بچے کی نعمت دشواریاں بھی ساتھ لاتی ہے۔ لیکن ہم ان پر اس طرح قابو پاتے ہیں کہ اس کے ہمجولیوں کو گھر میں بلا لیتے ہیں یا کبھی ایتھل کو ان کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ اپنے ایک بھانجے کو چھٹیوں میں اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی دوسرے گھروں میں ہفتہ اور اتوار گزارتے ہیں اور سب سے اہم یہ کہ ہم خود بچے بن جاتے ہیں اور ایتھل کے مطالعہ اور کھیلوں میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ فرانسیسی میں سبق لے رہی ہے۔ ہم ہفتہ بھر اس کے کام میں شرکت کریں گے اور اسے ایک تقابلی کھیل بنا کر کھیلیں گے اور ہر لفظ کو ایہام اور جوڑ توڑ سے اس کے ذہن نشین کروا دیں گے یا حساب میں اسے مشکل کام ملتا ہے، ہم کھانے کی میز پر بیٹھ جاتے ہیں اور سارا کنبہ ایک گھنٹہ تک جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کرتا رہتا ہے۔ کیا یہ والدین کے لیے تضیع اوقات نہیں؟ لیکن آپ کس طرح اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟ ہم اپنے لمحات فرصت اور کس بہتر طریقہ سے صرف کر سکتے ہیں؟

ولدیت کا راز یہ ہے کہ دوبارہ بچے بن کر اپنا وقار اور اپنا مرتبہ بھول کر بچہ کے برابر ہو کر ہم اس کے ساتھ کھیلیں۔ شاید اس بے تکلفی سے ہم بچہ کی محبت اور اعتماد حاصل کر لیں، جو تعلیم کی جان ہے۔ اگر ہم دیانت داری سے بچہ کے فطری اخلاقی سرچشمہ سے دیانت اور عزت کے اوصاف اخذ نہ کریں تو شخصیت کی نشوونما کیونکر کر سکتے ہیں؟ ہم ایتھل کو بتاتے ہیں کہ ہر خیال، غیر

مرئی طور پر اس کے چہرہ سے ظاہر ہوتا ہے اور شخصیت کا ہر جزو چہرہ پر لکھا جاتا ہے۔ لیکن ہم ان ناتواں عقلی اصولوں سے ہی مطمئن نہیں ہو جاتے۔ اگر ہم اسے راست گو بنانا چاہیں تو ہمیں خود بھی راست گو بننا پڑے گا، چاہے اس سے دوسرے کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں اسے کوئی سزا نہیں دینی چاہیے۔ صرف ہم اس پر یہ جتلا دیں کہ اس کی غلطی سے ہم سب کو دکھ ہوا ہے۔ ہمیں اعتماد ہے کہ مثال اور محبت سے وہ ہمارے ساتھ دیانت داری برتے گی۔ بالغ لوگوں کے ساتھ جھوٹ بعض اوقات جائز ہے کیونکہ یہ حقیقت سے ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن جھوٹ بچوں کے لیے شاید ہی کبھی مفید ہوتا ہو کیونکہ وہ علم کے بھوکے اور پیاسے ہوتے ہیں۔ لیکن ماہرین اخلاق حقیقت سے جی چراتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ بچے اس کی تلاش کریں۔ ایتھل دوسری چیزوں کی طرح اس معیار پر پوری نہیں اتری۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے باپ نے اس سے ہمیشہ راست گوئی سے کام نہیں لیا۔ ہم پھر کوشش کریں گے۔

۴۔ جنسی

راست گوئی کا سخت ترین امتحان بچہ کی جنسی تعلیم میں پیش آتا ہے۔ ہم اس شدید تجسس کی کیوں مدافعت کرتے ہیں جو سائنس اور تعلیم کی بنیاد ہے؟ میرا خیال ہے کہ امریکہ کی مسیحی وراثت نے ہمیں محبت کے جسمانی پہلو سے دہشت زدہ کر دیا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس کی توجیہ یہ ہے کہ حیوان بھی تناسل کے وقت علیحدگی اختیار کرتے ہیں تاکہ خارجی خطرہ سے محفوظ رہیں۔ انسانی نقطۂ نظر سے اس کی توجیہ یہ ہے کہ ہم نے شادی کی عمر کو ملتوی کر کے عنفوان شباب سے دور جا پھینکا ہے اور اس لیے ہمیں اس بنیادی جبلت کی ہر غیر ضروری تحریک سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مشکل سوال ہے اور ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم حقیقت کا ساتھ دیں گے۔ ہم آخری لحہ تک اس کے ذہن سے یہ سوال دور رکھیں گے۔ جدید زندگی کی شدید فضا میں یہ سوال بہت جلدی پیدا ہو جائیں گے اور اس سے پہلے کہ دوسرے بچے اپنے واہمہ کی مدد سے ان سوالوں کے جواب دیں، ہم خود ان کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ ہم اس سوال کا جواب بھی دوسرے سوالوں کی طرح دیں گے۔ اس معاملہ میں "تقدس" بگھارنا شرارت اور لاعلمی کو دعوت دینا ہے۔ ہمیں جنس کا ہاضمہ اور تنفس کی طرح ایک سائنس دان کی معروضیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے۔ حقیقت "تقدس" کی چادر اوڑھے بغیر ہی خاصی صحت مند ہے۔

علم اور صحت ہی بہترین ماہرین نفسیات ہیں: جہاں جسم مضبوط اور ذہن صاف ہو۔ ذہنی امراض پیدا نہیں ہوں گی۔ ڈڈرو نے کہا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی کو علم تجزیہ بدن سکھائے

گا۔ میں اتنی جلدبازی سے کام نہیں لوں گا۔ اس سلسلہ میں جوانوں کی پریشانیاں ہمارے لیے تکلیف دہ ثابت نہیں ہونی چاہئیں۔ ہمیں چاہیے کہ فطرت کو اپنا کام کرنے دیں اور وعظ اور جھوٹ سے پرہیز کریں۔ ہم بچہ کو تمام کھیلوں کے سامان بہم پہنچائیں گے اور اسے کھلی فضا میں لے آئیں گے۔ جب کوئی لڑکا انہماک اور جوش سے بیس بال کھیلے تو اس کا اخلاق میرے نزدیک بالکل ٹھیک ہے۔

بچہ کی محبت کو اگر سچائی کی دولت میسر ہو تو یہ حسن اور مسرت کا باعث بنتی ہے۔ مثلاً ایتھل مدرسہ سے آئی ہے۔ اس نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر کے کہا "ابا مجھے محبت ہو گئی ہے"۔ مجھے ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ اسے اس کے خطرناک رومان پر برا بھلا کہنا چاہیے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس کی بات سن کر ہنس دیتا ہوں اور اس سے پوری تفاصیل طلب کرتا ہوں۔ میں اس درخشاں روح کو اخلاق سے کیوں تاریک کروں؟

لیکن جب عنفوان شباب آئے تو ہم کیا کریں۔ اس کی پہلی علامت پر ہم ایتھل کو علم سے مالا مال کر دیں گے۔ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اس پر وہ حساسیت، وہ استغراق، وہ شرمیلا پن طاری نہ ہو جو عموماً زندگی کی اس منزل کو المناک بنا دیتا ہے۔ عنفوان شباب کے دور کو رنج والم کا دور نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ روح کی بہار، سپردگی اور مقاصد اور شعرو شاعری کا موسم، جسم اور ذہن کی صحت اور نشوونما کے کمال کا عہد ہونا چاہیے۔ اس زمانہ میں نئی ذہانت پھوٹتی ہے۔ اس منزل سے بدن کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے اور ماہر تعلیم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اب ذہن کے مسائل پر غور کرے۔

۵- ذہنی

میں نہیں جانتا کہ ایتھل کے ذہن کی ابتدا کب ہوئی لیکن جب تک اس نے یہ نہیں کہا کہ "ہم چھ برس کے ہو گئے ہیں" ہم نے اس کے متعلق غور ہی نہیں کیا۔ وہ یہ نہیں چاہے گی کہ میں اس کا یہ مطلب لوں کہ اس سے پہلے اس کا ذہن تھا ہی نہیں۔ کیا اس نے انگریزی زبان نہیں سیکھی تھی؟ اس ضمن میں بھی مثال احکام سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ اس لیے ہمیں یہ ماننا پڑا کہ اگر ایتھل کو صحیح انگریزی بولنا ہے تو ہم بھی صحیح انگریزی بولیں۔ اگر ہم ایتھل کی بولی میں غلیظ الفاظ شامل نہیں ہونے دینا چاہتے تو ہماری زبان پر بھی یہ الفاظ نہیں آنے چاہئیں۔ ہم نے روزمرہ کے ہر محاورہ کو ترک نہیں کیا کیونکہ ان میں سے اکثر محاورے زبان کو رنگین بناتے ہیں اور بعض اوقات کسی مطلب کو ایک لفظ میں ادا کر دیتے ہیں جسے ڈاکٹر جانسن کی زبان میں ادا کرنے کے لیے شاید

ایک پیراگراف کی ضرورت پڑے۔ لیکن ہم نے اسے ڈھیلی ڈھالی زبان سکھانے کی بجائے صحیح زبان سکھائی اور اسے اس کی عمر کے مطابق بہترین ادب پڑھنے کو دیا۔

پھر ہمیں مدرسہ کا انتخاب کرنا پڑا۔ سوال یہ تھا کہ ہم اینتھل کو پڑوس کے عام مدرسے میں بھیجیں یا ایک مشہور خاص مدرسہ میں جو گھر سے کافی دور ہے۔ ہم دونوں مدرسے دیکھنے گئے اور ہم اس ترقی پر حیران رہ گئے جو عام مدرسوں نے اس وقت سے اب ترقی کی ہے' جب میں وہاں دس ڈالر ہفتہ لے کر پڑھایا کرتا تھا۔ روشن کمرے' چھوٹی جماعتیں' ہر طالب علم کے لیے علیحدہ ڈیسک' کار آگاہ اور زندہ دل استاد' ہر مادی اور علمی سہولت۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ان مدرسوں کے خلاف بہت کچھ سنا تھا اور ان کے خلاف لکھا بھی تھا کہ یہ مدرسے قید خانے ہیں جہاں بچے کبریائی صلاحیتیں لے کر آتے ہیں اور اجڑے ہوئے دیوتا بن کے یہاں سے نکلتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ میں نے فقط لفظوں کی شعبدہ بازی دکھائی ہو۔

ہم نے اینتھل کو عام مدرسے میں داخل کرا دیا اور وہ اس کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اس مدرسے میں وطن پرستی کے جذبے کی ضرورت سے زیادہ تلقین ہوتی تھی۔ ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اینتھل اپنے وطن سے محبت کرنا سیکھے۔ بشرطیکہ وہ دوسری اقوام کی عظمت کی قدر کرنا بھی سیکھ لے۔ اینتھل چار مدرسوں میں تعلیم پا چکی ہے اور چاروں کے چاروں انسانیت اور استعداد کا مجسمہ تھے۔ کچھ دوسروں سے بہتر تھے۔ مدرسہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ روایات و روابط کے نقطۂ نظر سے۔ اینتھل جب ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں جاتی تھی تو اس کی عادتوں اور دلچسپیوں میں فرق آ جاتا تھا۔ اب وہ ایک بہترین مدرسہ میں ہے اور ہم مطمئن اور ممنون ہیں۔

اس تجربے کی بنا پر میں کوئی کلیہ قائم نہیں کروں گا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ بعض علاقوں میں عام مدرسوں کی حالت خاطر خواہ نہیں ہے۔ روابط اور روایات' مدرسہ کا ایک اہم جزو ہیں۔ ایمرسن نے کہا تھا کہ اپنے بیٹے کو کالج بھیجو اور لڑکے اس کی تربیت کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم نے نیویارک کے ایک نہایت اعلیٰ سکول کا تجربہ کیا۔ ہمیں جلدی ہی احساس ہونا شروع ہو گیا کہ اینتھل کو یہ مدرسہ پسند نہیں۔ وہ اس شور و شغب اور دھاندلی کی شاکی تھی' جسے پرنسپل نے آزادی کا نام دے رکھا تھا۔ اگرچہ اس نے وہاں چند دلچسپ صنعتیں سیکھیں اور کھلی فضا میں منظم کھیل کھیلے' لیکن وہ ہم سے اکثر یہ پوچھتی تھی کہ "آخر وہ کب مجھے کچھ پڑھائیں گے"۔ ایک برس کے بعد ہم نے اسے ایک عام مدرسے میں داخل کرا دیا اور یہ دیکھا کہ غیر معمولی ذہانت کے باوجود وہ جماعت سے بہت پیچھے تھی۔ ہمیں اسے پڑھانے میں بہت وقت صرف کرنا پڑا۔

صحیح مدرسہ دریافت کرنے کے بعد اس سے تعاون کرنا ضروری ہے۔ والدین کا یہ فرض

ہے کہ وہ دیکھیں کہ بچہ مدرسے سے ناغہ نہ کرے یا وہاں دیر سے نہ جائے۔ اس کی روزانہ ترقی اور ماہانہ ترقی پر نظر رکھیں۔ گھر کے کام اور مطالعہ میں دلچسپی لیں۔ ایسا کر کے ہم محض مدرسے سے تعاون ہی نہیں کرتے، بلکہ بچہ کی مدد کرتے ہیں۔ کوئی قابل قدر باقاعدگی شخصیت کے لیے رحمت ہے۔ جب ہم کھیتوں اور جنگلوں میں سیر کے لیے جاتے ہیں تو باتوں کا رخ تاریخ، جغرافیہ یا ادب کی طرف بدل دیتے ہیں اور بڑے آدمیوں کی دلچسپ کہانیاں، پرستانی کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔

جغرافیہ ایک بے کیف مضمون ہے؟ جہاز چاہے بندرگاہ میں کھڑا ہو یا سفر کے لیے بادبان اٹھا چکا ہو، ایک محرک رومان حقیقت نہیں ہے؟ ہر بچہ دوسرے ممالک کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اس لیے جغرافیہ پڑھانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے حقیقی یا مصنوعی سفر۔ استاد جماعت کو شنگھائی یا سنگاپور لے جاتا ہے اور ایشیا کے تمام عجائبات ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، یا وہ دریائے نیل کے کنارے کنارے سکندریہ سے حبشہ کا سفر کرتے ہیں اور ہزاروں نادر قبائل کو دیکھتے ہوئے جوہنسبرگ یا کیپ ٹاؤن پہنچ جاتے ہیں اور افریقہ فقط ایک نام کی بجائے حقیقت بن جاتا ہے۔ ہر مدرسہ کو ہومز اور نیومین کے فلمی سفرناموں سے آراستہ ہونا چاہیے۔ جو عام بے ہودہ فلموں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں اور تاریخ کو یقینا بقول کارلائل "بڑے آدمیوں کی سوانح عمری" ہونا چاہیے۔ بچہ کے دل میں ایک دفعہ عظمت کا احترام پیدا ہو جائے تو وہ ساری عمر اس کے ساتھ وفا کرتا ہے، چاہے دوسری محبتیں اس کے دل سے غائب ہو جائیں۔

مملکت ذہن میں داخل ہونے کے لیے عظیم شخصیتیں اب بھی زندہ ہیں اور تعلیم دیتی ہیں۔ صرف پڑھنا اور دیکھنا شرط ہے۔ عجلت کے بغیر وہ تصویریں اور وہ اصنام دیکھنا، جن میں فنکاروں نے اپنا فلسفہ زندگی سمو دیا ہے، پار تھینون کی عظمت یا شارتر کے حسن و نزاکت کا اطمینان قلب سے مشاہدہ کرنا، یا استقامت سے وہ کتابیں پڑھنا، جنہیں وقت نے ہر عہد کے علمی خس و خاشاک سے علیحدہ کر کے ہم تک پہنچایا ہے، اصل تعلیم ہے۔ جب ایتھل ہمیں رفیل اور ریمبرانٹ، لیونارڈو اور مائیکل ا-نجلو، ر-نلڈز اور گینزبرو، ریبونز اور وان ڈائیک کے افسانے سناتی ہے (جو اس نے مدرسہ میں سنے ہوتے ہیں) تو ہمیں کتنا لطف آتا ہے۔ اس کی عمر میں، مجھے ان عظیم الشان شخصیتوں کے وجود کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ مشغلہ اسے اقلیم ادب سے آشنا کرنا اور اسے شیکسپیئر اور شیلے، ملٹن اور بائرن، گوئٹے اور ہیوگو، ڈمین اور پو کے افسانے سنانا ہے۔

وہ حال ہی میں اس ادب کے مطالعہ سے فارغ ہو رہی ہے جو خاص طور پر اس کی عمر کے

بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس ادب کے پرانے شاہکار مثلاً "ایلس ان ونڈر لینڈ" اور لیئر کی "نان سنس بک" نہایت قابل تعریف ہیں۔ لیکن بعد کی اکثر کتابیں بچے کی ذہانت کو کمتر سمجھ کر لکھی گئی ہیں، اس لیے غیر مفید ہیں۔ ان میں بچوں کے لیے نشو و نما کی کوئی تحریک موجود نہیں۔ ہوشیار بچوں کی اگر اس ادب پر پرورش کی گئی تو وہ پڑھنے کا ذوق کھو دیں گے۔ بہت سی کتابیں، جو بظاہر بالغوں کے لیے لکھی گئی ہیں، نو دس برس کے بچوں کا سامان تفریح بن سکتی ہیں۔ مثلاً "دی تھری مسکیٹیرز"۔ "دی ٹیلسمین" اور "لے مزرابل" اور بچہ اس کتاب کو زیادہ پسند کرتا ہے، جس کے متعلق اسے بتایا جائے کہ یہ بالغوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ بچے کے لیے دنیا میں کوئی کتاب "رابنسن کروسو" اور "اور گلیور کے سفر" سے زیادہ مفید نہیں۔ اور یہ کتابیں بچوں کے لیے نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ موخر الذکر تو اب تک اچھی طرح بالغوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

ہر اس گھر میں، جہاں کتابوں کو نوازا جاتا ہے، ہفتہ میں کم سے کم ایک شام باواز بلند پڑھنے کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ بچے اور بالغ باری باری کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ غلطیوں کی اصلاح مطالعہ کے بعد علیحدگی میں ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایتھل اور اس کے سیاہ آنکھوں والے رشتہ دار، لوئی اور ہم تین بزرگوں نے مل کر اینوخ آرڈن پڑھی تھی اور بچوں نے اس کے ہر جملہ میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ کتاب کے خاتمے پر ہم سب خاموش ہو گئے اور ایتھل اپنی ماں کے بازوؤں میں چھپ کر رونے لگی۔ ہم اب وینس کے تاجر کے بہت سے نسخے خریدیں گے اور کردار متعین کر کے جلتی آگ کے سامنے اپنی خوش الحانی کے جوہر دکھائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ ہم اعلیٰ تعلیم مدرسہ اور کالج سے نہیں بلکہ ذاتی مطالعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ مسٹر ایکوریٹ ڈین مارٹن نے اس "اصطلاح" کی بہت خوب وضاحت کی ہے اور میں بڑے پر زور انداز سے ان کی کتاب ان لوگوں کے لیے تجویز کرتا ہوں جو ذہنی بلوغت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آج ہم اس آدمی کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں جو صبح، دوپہر یا شام کو اخبار پڑھ سکتا ہو اور اگرچہ ہمارے کالج سٹینڈرڈ کاروں کی طرح ہر سال گریجویٹ پیدا کرتے ہیں۔ ہماری زندگی میں صحیح تہذیب کی اب بھی خاصی کمی ہے۔ ہمارے ہاں لاکھوں مدرسے ہیں اور مشکل سے چند درجن تعلیم یافتہ اشخاص۔ اسی لیے مسٹر ویلز اور دوسرے مصنفین نے کالج کی تعلیم کے فوائد کے متعلق شک ظاہر کیا ہے۔ یہ انتہائی یاسیت ہے۔ لیکن یہ بہتر ہو گا اگر کوئی شخص یہ محاسبہ کرے کہ آیا مدرسوں اور کالجوں کی افراط نے ہمیں زیادہ ذہین بنا دیا ہے؟ ہمارے مدرسوں اور کالجوں نے سپنسر کی اس توضیح تعلیم سے بہت نقصان اٹھایا ہے کہ یہ فرد کو ماحول سے سازگار بننا سکھاتی ہے۔ تعلیم کی یہ تعریف ایک بے جان، میکانکی تعریف تھی، جو میکانکی فلسفہ سے اخذ کی گئی تھی اور جو ہر تخلیقی روح کے لیے ناخوشگوار

تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میکانکی اور فکری سائنس نے ہمارے مدرسوں کو تسخیر کرلیا ہے اور "بے فائدہ" مضامین یعنی ادب، تاریخ، فلسفہ اور آرٹ کو بڑی حد تک نظرانداز کردیا گیا ہے۔ اس طرح ہم اچھے چپڑاسی، اچھے کلرک اور اچھے کاریگر تو ضرور بن جاتے ہیں، لیکن اپنی فرصت کے لمحات کو مصور اخباروں کے مطالعہ میں غرق کردیتے ہیں اور ان تھیٹروں میں جمع ہوجاتے ہیں جو ہمیں ایک ہی محبت کے مناظر متواتر دکھاتے رہتے ہیں۔

یہ میکانکی اور عملی تعلیم مکمل نہیں بلکہ ادھوری شخصیتیں پیدا کرتی ہے۔ یہ تہذیب کو صنعت، حیاتیات کو طبیعیات اور ذوق کو دولت کے تابع کرتی ہے۔ لیکن تعلیم کا مقصد شخصیت کی تکمیل ہونا چاہیے۔ اسے انسان کی ہر تخلیقی صلاحیت کو ابھارنا چاہیے اور اس کے ذہن کو دنیا کے ہر دلچسپ اور سبق آموز پہلو سے آشنا کرنا چاہیے۔ وہ شخص جو کروڑوں روپے کا مالک ہے لیکن جس کے لیے 'بیتھوون'، کورو یا ہارڈی یا غروب میں خزاں کے جنگلوں کی روشنی بے معنی چیزیں ہیں۔ انسان نہیں محض انسان کا ہیولیٰ ہے۔ آدھی دنیا اس کی روح کے دھندلے دریچوں کے لیے بند ہوتی ہے۔ وہ تعلیم جو خالصتا "سائنٹیفک" ہے، لوگوں کو محض ایک آلہ بنا دیتی ہے۔ وہ اسے حسن سے ناآشنا کردیتی ہے اور اسے وہ طاقتیں عطا کرتی ہے جو حکمت سے بعید ہوتی ہیں۔ اگر سپنسر نے تعلیم پر کچھ نہ لکھا ہوتا تو دنیا کے لیے بہتر ہوتا۔

یہ اچھا ہوا کہ لاطینی اور یونانی زبانیں ہمارے کالجوں میں اب پہلے زور شور سے نہیں پڑھائی جاتیں کیونکہ ان پر ان کی اہمیت سے کہیں زیادہ محنت اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہائنے نے کہا تھا "اگر رومیوں کو پہلے لاطینی زبان پڑھنا پڑتی تو ان کے پاس ساری دنیا کی تسخیر کے لیے وقت نہ ہوتا"۔ اگرچہ یونان اور روما کی زبانیں سیکھنا محض ماہرین لسانیات کے لیے لازمی ہے۔ لیکن ان قوموں کا ادب تعلیم کے لیے لابدی ہے۔ کیا کوئی شخص ورجل، ہوریس، لیوکریٹس، سسرو ٹیسی ٹس اور مارکس اور یلیٹس کو نظرانداز کرکے بھی ذہنی بلوغت حاصل کرسکتا ہے؟ لیکن تعلیم کے تمام ممکن ذرائع میں سے، جن کا مجھے علم ہے، کوئی ذریعہ یونانی زندگی کے مطالعہ سے زیادہ جامع اور حسین نہیں۔ یونانی زندگی اپنی جمہوریت اور استعماریت، اپنی خطابت اور تمثیل، شاعری اور تاریخ، معماری اور بت تراشی، سائنس اور فلسفہ کے متنوع پہلوؤں کے ساتھ بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ اگر کوئی طالب علم پیریکلین اور احیائے علوم کے عہد کے ادب سے واقفیت حاصل کرلے تو وہ ایسی تعلیم حاصل کرلے گا جو کوئی کالج اسے نہیں دے سکتا۔ تعلیم کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تجارت، زمین دوزی، علم نباتات، صحافت یا فلسفہ علم میں مہارت حاصل کرلیں بلکہ یہ کہ ہم اپنی نسل کی اخلاقی، ذہنی اور جمالیاتی وراثت کو جذب کرکے اپنے آپ پر اور خارجی دنیا پر قابو حاصل کریں اور یہ کہ ہم

روح اور بدن کے لیے بہترین رفیق چنیں اور یہ کہ ہم تہذیب میں خوش خلقی، علم میں حکمت اور شعور میں عفو کا اضافہ کرنا سیکھیں۔ ہمارے کالج کب اس قسم کے انسان پیدا کریں گے؟

۶- دربارۂ سرور

ایتھل شام کے وقت آگ کے پاس بیٹھی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے۔ اس کی مضبوط سرخ ٹانگیں کرسی کے آگے پھیلی ہوئی، اس کے بھرے بھرے برہنہ بازو، اس کا سرخ ربن اس کے بلاؤز پر چمکتا ہوا، اس کے گیسو کتاب پر گرتے ہوئے، اس کا چہرہ دلچسپی اور ذوق سے فروزاں، اس کی روح دور دراز مقامات پر سفر کرتی ہے۔ اپنی سرحدیں بڑھاتی ہوئی اور اپنے آپ کو ہر روز عظیم شخصیتوں کی صحبت کے زیادہ سے زیادہ قابل بناتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہر ایک سے، سیفو سے لے کر ڈیوے، ایمپیڈو کلیس سے لے کر نیطشے تک، بدھا سے لے کر دوستو-فسکی اور لاؤ تزے سے لے کر اناطول فرانس تک گفت و شنید کرے گی۔ ہم اسے پھلتے پھولتے، سقراط سے حکمت، لیونارڈو سے سپردگی، مسیح سے نرم دلی سیکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں سپنوں میں ایک عظیم الشان شخصیت بنتی نظر آتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ وہ اتنی عالم کبھی نہیں بنے گی کہ زندگی سے محبت نہ کر سکے، اور یہ کہ وہ کبھی کتابوں کو دوستی، فطرت اور مامتا سے بہتر نہیں سمجھے گی۔ اگر اس نے کسی دن ایک بچہ کو اٹھا کر اپنے قد سے اونچا نہ کیا (جس طرح ہم اسے اٹھاتے ہیں) تو ہم اسے مکمل نہیں سمجھیں گے۔ لیکن وہ آزاد ہوگی، حتیٰ کہ ہمیں مایوس کرنے میں بھی آزاد ہوگی۔ کوئی دوسرے کی خاطر نظام زندگی نہیں بنا سکتا۔ وہ اپنی راہ کا انتخاب کرے گی اور اپنی نیکی کا تصور خود قائم کرے گی۔ ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہماری بیٹی ہے، اور ہماری اس مبہم زندگی میں سرچشمہ مسرت بن کے آئی ہے۔

* * *

باب دوازدہم

شخصیت کی تعمیر نو

۱۔ شخصیت کے عناصر

بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا ذکر تو ہو چکا۔ کیا ہم بڑوں کے پاس کوئی طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنی شخصیتیں بہتر بنا سکیں؟

اس پر زور اور پیچیدہ عہد میں ایک ذہین دماغ کے لیے ایک نادر موقع ہے کہ وہ سائنس کی پیدائش پر نظر رکھے۔ معملوں میں شور و شغب سے یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ جو ناشکر گزار سائنسوں کی ماں ہے، ایک اور بچہ کو جنم دے رہا ہے۔ اور ذہن کا مطالعہ مابعد الطبیعیات کے تاریک بطن سے آہستہ آہستہ مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں آ رہا ہے۔ ابھی تک تولید کا عمل پورا نہیں ہوا، حتیٰ کہ فرائیڈ میں بھی یہ بچہ ابھی تک ماں سے وابستہ ہے اور فکر اور وہم کی افراط سے اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔

آج نفسیات کا مقام وہی ہے جو تین سو برس گزرے طبیعیات کو حاصل تھا۔ جب فرانس بیکن نے اپنی "ایڈوانس منٹ آف لرننگ" لکھی تھی، اس جرات کے ساتھ، جس نے "احیائے علوم" کی بے باکی کو بھی متحیر کر دیا تھا۔ بیکن نے سائنسوں کے لیے ایک منشور تیار کیا تھا اور ان اہم مسائل کی طرف اشارہ کیا تھا، جنہیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان فتوحات کی پیش گوئی کی تھی جو اس نئے علم سے ہمیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ آج یہ فتوحات حقیقی ہیں اور انہوں نے بیکن کے تخیلات کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ طبیعیات اور کیمیا، ریاضی اور میکانکس نے دنیا کی شکل اس طرح بدل دی ہے کہ وہ آدمی کی رضا کی تابع ہو گئی ہے۔ صرف آدمی، اس کے عزم اور اس کی شخصیت میں فرق نہیں آیا۔

ممکن ہے کہ نفسیات بھی اسی قسم کے معرکوں کو سر کرنے والی ہو۔ اگر کوئی اور بیکن اس کے مسائل کی توضیح کر دے اور اس کی فتوحات کی پیش گوئی کرے تو دنیا اس کا یقین کرے گی؟ ہم ایک عظیم اور نادر سمندر کے ساحل پر کھڑے ہیں، جو ابھی تک واہمہ کی تاریکی میں گھرا ہوا ہے۔ ہم اس کی گلیوں اور اس کی مسافتوں سے آشنا نہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ کتنے خوشگوار جزیرے اس سمندر سے پرے ہیں لیکن یہ نئی سائنس پھلے پھولے گی اور آزمائش کرتی ہوئی تعصب اور جہالت کے بادلوں میں اپنی راہ گزر خود بنائے گی۔ تین سو برس بعد نفسیات وہاں ہوگی جہاں آج طبیعیات ہے۔ یعنی روڈاں کے کسی صنم کی طرح نامکمل اور متجسس۔ لیکن پھر بھی "ذہن" یا "دل" یا "روح" پر غالب ہوگی اور ہمارے عزائم کے انتشار میں نئے علم سے ایک اعلیٰ نسل کی طاقت اور رحم دلی پیدا کرے گی۔

ہم بنیادی طور پر اپنے آپ میں دلچسپی رکھتے ہیں اور جہاں تک نفسیات ہم سے متعلق ہے اور مجرد تصورات سے نہیں، یہ ایک تمثیل کی طرح دلچسپ ہے، جس کے ہیرو ہم خود ہیں۔ ہم آخر کار کیا ہیں؟ بندر یا دیوتا؟ یا بندر جو دیوتا بننے والے ہیں؟ وہ "انسانی فطرت" کیا ہے، جو بہت سے لوگوں کو اٹل المیہ کی طرف لے جاتی ہے؟ شخصیت اور عمل کے اجزا کیا ہیں؟ کیا وہ اتنے ہمہ گیر اور گہرے ہیں کہ شخصیت کبھی نہیں بدل سکتی؟ یا کیا ہم بیرن منشاؤزن کی طرح اپنے آپ کو اپنے جوتوں کے تسموں کی طرح اپنی وراثت سے علیحدہ کر سکتے ہیں؟ ہمیں اس وقت اور سب چیزوں کو فراموش کر کے شخصیت کی نوعیت پر غور کرنا چاہیے۔ ہم اسے مشاہدہ اور سوجھ بوجھ کے لیے ٹکڑے ٹکڑے کریں گے۔ اس کے بعد اگر ممکن ہوا تو ہم ان ٹکڑوں کو جوڑ دیں گے۔

پرانی نفسیات، جب انسانی کردار پر غور کرنے کی طرف مائل ہوتی تھی تو شخصیتوں کو دموی، سوداوی، صفراوی اور بلغمی مزاجوں میں تقسیم کیا کرتی تھی۔ یہ الفاظ کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مطلب یہی ہے کہ انسان خوش طبع، غمگین، جوشیلے یا انگریزوں کی طرح ٹھہرے ہوئے مزاج کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ تقسیم صحیح ہو لیکن یہ الفاظ محض صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ انسانی کردار کی توجیہ نہیں کرتے۔ ہم اس کے موجد کے متعلق یہ قیاس آرائی کر سکتے ہیں کہ وہ شخصیت کے بارے میں ایک دلچسپ بدنیاتی نظریہ رکھتا تھا جو لہو یا سودا، صفرا یا بلغم سے متعین ہوتی تھی۔ بین نے شخصیتوں کو عقلی، جذباتی یا ارادی شخصیتوں میں تقسیم کیا تھا جو عقل یا جذبات یا ارادہ کے غلبہ سے بنتی ہیں۔ لیکن چونکہ ارادی شخصیت جذباتی بھی ہو سکتی ہے (جس طرح الزبتھ یا سکندر کی تھی) یا عقلی بھی ہو سکتی ہے (جیسے نپولین اور سیزر کی) اور عقلی شخصیت جذباتی بھی ہو سکتی ہے (جیسے افلاطون، اتھی لارڈ، والٹیر یا نیطشے) ہم جس دروازہ سے داخل ہوئے

تھے اسی سے باہر نکلے ہیں۔ (ا) جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انسان کا مطالعہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ ماحول سے شروع ہوتا ہے اور انسان کو محض ماحول سے سازگار بننے کا آلہ سمجھتا ہے۔ یہ نظریہ فکر اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر دیتا ہے اور سپنسر کی مادیت اور واٹسن کے نظریہ کردار کا لباس پہنتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کے بڑے بڑے مفکر، ڈیموکریٹس، ایپی کیورس، لیوکریٹس، ہوبز اور حتیٰ کہ نرم مزاج سپینوزا نمائندے ہیں۔ حیاتیات میں اس نے ہمیں ڈارون اور قدرتی انتخاب کا تصور عطا کیا۔ اجتماعیات میں اس نے ہمیں بکل، سپنسر اور مارکس دیئے اور اقتصادی اثرات غیر شخصی اور غیر ارادی واقعات کے تصور سے تاریخ کی توجیہ کی۔

دوسرا طریقہ داخلی کیفیتوں سے ابتدا کرتا ہے۔ یہ انسان کو حوائج، محرکات اور خواہشات کا نظام سمجھتا ہے جو ہمیں ماحول کے مطالعہ، استعمال اور تسخیر پر مجبور کرتا ہے۔ یہ نظریہ مادہ کو ذہن میں تحلیل کر کے لذت اندوز ہوتا ہے۔ یہ ارسطو کی روح سے شروع ہوتا ہے اور برگساں اور ولیم جیمز کی ارادیت میں کمال حاصل کرتا ہے۔ ان تین مفکروں کے علاوہ افلاطون، ڈے کارٹ، لائینبز، کانٹ اور شوپنہار بھی اس نظریہ کے حامی ہیں۔ حیاتیات میں اس نظریہ نے ہمیں لیمارک اور نظریہ ارتقا کی یہ توجیہ دی کہ ارتقا آرزو کی متواتر کوششوں سے عمل میں آتا ہے۔ اجتماعیات میں اس نے ہمیں گوئٹے، کارلائل اور نیطشے دیئے اور تاریخ کی توجیہ، نفسیاتی اثرات، اختراعی ذہانت اور غالب عزائم کے تصورات کے ذریعہ کی۔

شخصیت کا وہ تجزیہ جو ہم ابھی پیش کرنے والے ہیں، دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے اگرچہ ہم ان مشکلات سے آگاہ ہیں جو اس کے راستے میں ہمیں درپیش ہوں گی۔ یہ طریقہ انسان کو ماحول کا اتنا اثر نہیں سمجھتا جتنا کہ اسے ماحول بدلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہر باغیچہ اور ہر طیارہ انسان کی فعالیت کی علامت ہے۔ شخصیت اس نقطۂ نظر سے جبلی آرزوؤں کا مرکب ہے۔ یہ ان جبلتوں کا نظام ہے جو ماحول، پیشہ اور تجربہ سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ ہم اس جگہ انسانی شخصیت کی بنیادی محرکات کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں جو انہیں اخذ کی ہوئی صفات سے ممیز کرتی ہے:

(ا) باب سوم۔

شخصیت کا نقشہ

جبلتیں		عادتیں		احساسات	
ایجابی	سلبی	ایجابی	سلبی	ایجابی	سلبی
۱- غذا تلاش کرنا	احتراز	شکار	صفائی	بھوک	تنافر
		چیرنا پھاڑنا		ظلم	
		جمع کرنا		طمع	
		حرص			
۲- لڑنا	فرار	قریب جانا	پسپائی	غصہ	خوف
		تجسس	تذبذب	حیرت	شک
		عمل	فکر		
		غلبہ	سپردگی	غرور	انکسار
۳- عمل	سونا	کھیلنا	آرام کرنا	خوشی	تکان
۴- میل ملاپ	تخلیہ	بولنا	خلوت پسندی	بزم آرائی	حیا
		تاثر پذیر			
		نقل			
		آرزوئے قبولیت		نخوت	شرم
۵- تناسل	انکار	جنس مخالف کا قرب	منہ سرخ ہونا	جنسی آرزو	کسر نفسی
والدین کی دیکھ بھال				والدین کی محبت	

یہ جبلتیں، عادتیں اور احساسات انسانی شخصیت کے عالمگیر اجزاء ہیں۔ ہر مرد اور ہر عورت میں یہ اجزاء ہوتے ہیں۔ ہم شخصیت اور مزاج میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ یہ اجزاء ایک ہی مقدار میں دو شخصوں میں کبھی ظاہر نہیں ہوتے۔ ہماری جنس اور ہماری نسل ہم میں

خاص جبلتیں پیدا کرتی ہے۔ ماحول یہ طے کرتا ہے کہ ہم کن چیزوں کی جستجو کریں اور کون سی عادتیں ڈالیں۔ خطرہ سے خالی ماحول غیظ و غضب کے جذبہ کو خالی خولی رعب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خطرہ زیادہ ہو تو یہی جذبہ غضب، مکاری بن جاتا ہے۔ جبلت وہی ہے لیکن اس کا اظہار مختلف ہے۔ معمولی زخم فرار کو عقلمندی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایک سخت زخم اسے بزدلی بنا دیتا ہے۔ اس طرح تمام تجربہ تحریک اور امتناع کا عمل بن جاتا ہے۔ ہر روز کوئی میلان کامیابی کی وجہ سے مستحکم ہو جاتا ہے اور کوئی اور میلان، ناکامی یا بے عملی کے باعث ناتواں ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص میں خفیہ صلاحیتیں موجود ہیں، جن میں سے ماحول ایک کو چن کر مضبوط بنا دیتا ہے۔ جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو لکڑی سے جدا کرتا ہے اس لیے شخصیت کو بدلنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ ماحول کو بدل ڈالو۔ اپنی شخصیت کے ساز کے غیر استعمال شدہ تاروں کو نئی طاقتوں کے زیر اثر لاؤ اور ان سے بہتر موسیقی پیدا کرو۔

ان عناصر کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہمیں ان کے متعلق چند اور باتوں کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ یہ دیکھیے کہ ہر جبلت ایک بدنیاتی نظام کا نفسیاتی اظہار ہے۔ بھوک خالی اور بے تاب خلیوں کا نتیجہ ہے۔ جنگ اور فرار، بازوؤں اور ٹانگوں کے لیے بنے ہیں (لنکن نے کہا "اگر خدا نے ایک انسان کو کمزور ٹانگیں عطا کی ہیں تو وہ بھاگنے پر مجبور ہے") عمل کی جبلتیں (رینگنا، چلنا، دوڑنا، پھینکنا وغیرہ) جسم کے تمام اعضاء کی ہم آہنگی کا اظہار ہیں۔ تناسل منجمد عناصر کا نتیجہ ہے اور اجتماعی ربط، جو کنبہ سے شروع ہوتا ہے تناسل کا۔ ہر جبلت ہمارے طبعی نظام میں جڑ پکڑتی ہے اور شخصیت کی ہر تبدیلی جو ایک جبلت کو مسخ کرتی ہے، بدن اور روح دونوں کو مجروح کرتی ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ہر جبلت کے ساتھ ایک جذبہ ملحق ہوتا ہے۔ یہ جذبہ جبلت کی طرح فطری اور گہرا ہوتا ہے۔ بھوک (جذبہ) غذا کی تلاش کے ساتھ وابستہ ہے اور کراہت کا جذبہ احتراز کے ساتھ۔ اسی طرح پیکار کی جبلت کے ساتھ غصے کا جذبہ اور فرار کی جبلت کے ساتھ خوف کا جذبہ وابستہ ہے اور یوں ہی تجسس کے ساتھ تحیر اور تذبذب کے ساتھ شک۔ غلبہ کے ساتھ غرور اور مغلوبیت کے ساتھ انکسار، عمل کے ساتھ خوشی اور آرام کے ساتھ تکان، بزم آرائی کے ساتھ ایک اجتماعی تسکین اور کبھی کبھی خلوت کے ساتھ ایک بے نام سکون۔ مجامعت کے ساتھ آرزو پسپائی کے ساتھ شرم اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ مامتا کا جذبہ، ہر جبلت ہماری سرشت میں داخل ہے اور ہمارے احساسات کی آگ سے ہماری فطرت کے اندر پیوست کی گئی ہے۔

آخر میں دیکھیے کہ ہر شخص میں تقریباً ہر جبلت کا تضاد موجود ہے۔ ایمپیڈوکلیس نے کہا تھا کہ ہر چیز کا مثبت اور منفی ہوتا ہے۔ جبلتوں کے بارے میں بھی یہ قول صحیح ہے۔ ہم غذا کی تلاش

اور غیر صحت مند چیزوں سے احتراز کرنے کی جبلتوں سے آراستہ ہیں۔ لڑنے اور فرار کرنے، غالب آنے اور مطیع ہونے، تجسس سے آگے بڑھنے اور شک سے ساکن رہنے، حرکت کرنے اور چیزوں کو توڑنے پھوڑنے، بیٹھنے، آرام کرنے اور سونے، محبوب کے قریب جانے اور مدافعت کرنے، خودنمائی کرنے اور محجوب ہونے، قیادت کرنے اور پیروی کرنے، کسی بات کی ابتدا کرنے اور نقل کرنے، بزم آرائی اور خلوت پذیری کی جبلتیں ہم میں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

یہاں ان عناصر کی تقسیم میں ہمیں انسانی شخصیتوں کے بنیادی امتیاز کا پتہ چلتا ہے۔ ہم تاریخی واقعات کو سمجھنے یا اپنے ہمسایوں سے روابط قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اگر ہم انسانوں کو خوش باش اور اداس یا نیک اور بد میں تقسیم کر دیں۔ قدرت اور تاریخ کے نزدیک صرف ایک ہی امتیاز قابل قبول ہے اور وہ ہے ایجابی اور سلبی شخصیتوں کا امتیاز۔ ہم نیکی اور بدی کے امتیاز کی مدد سے ہزاروں عینی منصوبے بناتے ہیں۔ لیکن حقیقت طاقت کے نقطۂ نظر سے انہیں برباد کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں ایجابی صلاحیتیں غالب ہوتی ہیں۔ ان میں قریب جانے، تلاش کرنے اور مغلوب کر کے ملکیت حاصل کرنے کے رجحانات حاوی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں ایجابی شخصیتوں کا نام دیں گے اور پھر وہ لوگ ہیں جن میں سلبی محرکات غالب ہوتے ہیں۔ جن لوگوں میں تذبذب، فرار، گوشہ گیری اور اطاعت کے جذبات تسلط پاتے ہیں، ہم انہیں سلبی شخصیتوں کا نام دیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت مکمل طور پر ایجابی یا سلبی نہیں ہوتی۔ یہ امتیاز مردانہ اور زنانہ کے امتیاز کی طرح بہت سے درجات اور امتزاجات کے امکانات کا حامل ہے۔ اگر ہم یہ کوشش کریں کہ ان شخصیتوں کے کمال کا تصور کریں تو ہمیں وہ حدود معلوم ہو جائیں گی جن کے درمیان شخصیت پھلتی پھولتی ہے۔

۲۔ سلبی شخصیت

سلبی شخصیت والے انسان کا قد عموماً چھوٹا ہوتا ہے اور اگرچہ وہ اپنے چہرہ، ہیئت اور ذہن کے ہر حسن کی بے حد تعریف کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنی جسمانی کمتری کے تکلیف دہ احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ قد آور اور توانا مزدور یا صاحب عمل آدمیوں پر حاسدانہ نظر ڈالتا ہے۔ سلبی شخصیت میں جسم اور طاقت نہیں ہوتی۔ اس میں طاقتور بننے کے لیے لہو نہیں ہوتا۔

اسے کھانا کھاتے دیکھیے، اسے بالکل اشتہا نہیں ہوتی۔ وہ غذا کے بارے میں عموماً بہت حساس ہوتا ہے اور بہت جلد ناخوشگوار کھانوں سے متنفر ہو جاتا ہے۔ وہ ذبیحہ خانوں کا تصور کیے بغیر گوشت نہیں کھا سکتا اور مچھلی کے شکار کو بربریت سمجھتا ہے۔ وہ لذت اور شغف سے کھانا کھانے کی

بجائے اسے اس پرندہ کی طرح چگتا ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی کیڑا منہ میں لیا ہو۔ وہ احتیاط سے اپنی انگلیاں صاف کرتا ہے اور کھانے کے بعد ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ کہیں میں نے بیرے کو ناکافی ٹپ تو نہیں دیا۔ وہ ہوٹل سے اس توقع کے ساتھ باہر نکلتا ہے کہ اسے کوئی نہ دیکھے۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

وہ دوسروں کو اس طرح دیکھتا ہے کہ کوئی اسے نہ دیکھے۔ وہ اس کی آنکھوں کے علاوہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور اس کی طاقت اور نیت کا اندازہ کرتا ہے۔ اگر اسے ذلت یا خطرہ سے سابقہ پڑے تو وہ حیرت اور خوف سے کانپتا ہے۔ وہ فعال غصہ محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک چڑچڑے غضب میں جلتا بھنتا رہتا ہے۔ اس کا تشدد ایک ایسے شخص کا نقاب ہے جو یہ جانتا ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ وہ ذمہ داری اور آزمائش سے گھبراتا ہے اور اپنے گھر کے تحفظ اور سکون کا خواہاں رہتا ہے۔ وہ کتابیں بالخصوص خطرہ اور عمل کے افسانے اور عزم اور قوت کے فلسفے پڑھنا پسند کرتا ہے۔ وہ امریکہ گلہ بان اور فوق البشر کا مدح خوان ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اگر دنیا کے لوگ ذہین ہوتے تو اسے قیادت سونپ دیتے۔ اگر وہ کسی کام میں کامیاب رہے تو اس کامیابی کا ذمہ دار خود کو سمجھتا ہے۔ اگر وہ ناکام رہے تو اپنے آپ کو بے گناہ گردانتا ہے۔ یہ ماحول (یعنی دوسرے لوگوں) حکومت یا تقدیر کا قصور تھا کہ وہ ناکام رہا۔ وہ دنیا کے بارے میں مایوسی لیکن اپنے متعلق امید آفرینی سے کام لیتا ہے۔

پھر بھی بدن کی کوتاہیوں کے باعث اسے تخیل کی جو فراوانی میسر ہے، وہ اس کی وجہ سے عظمت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا تخیل جسے عمل یا معروضی مشاہدہ کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی، مابعد الطبیعیات اور شعر و سخن کی دنیاؤں میں آزاد گھومتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ عرصہ کے لیے ان نادیدہ اقلیموں کو ترک کر کے محنت کرے، تو وہ عینی حسن یا عینی فلسفوں کی تخلیق کرتا ہے اور ادب اور فن میں نئی ہیئتیں پیدا کرتا ہے۔ یہ شخص اپنے کمال میں ایک عظیم الشان فنکار بن سکتا ہے اور زوال میں محض ایک سوچنے والا مفکر نہیں بلکہ فقط ایک ایسا شخص جس کی عادت سوچنا ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی ہے اور زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اور جسمانی توانائی بقا کے لیے اتنی لازمی نہیں رہی، ہر شہر میں اس قسم کے خیالی لوگوں کی فراوانی ہے۔

اس قسم کے انسان میں عمل کے محرکات کم اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ کھیلوں کا شائق نہیں۔ فقط فکر اور زبان کے کھیل کھیلتا ہے۔ وہ صنعت ایہام پر طبع آزمائی کرتا ہے لیکن پانی میں تیرتا نہیں۔ وہ کھیل دیکھتا ہے، ان میں شریک نہیں ہوتا۔ دیکھنا کرنے سے آسان ہے۔ آرام کرنے کی آرزو اس پر غالب رہتی ہے۔ اگر اسے گھوڑے کی سواری میسر ہے تو وہ چلتا نہیں۔ اگر وہ بیٹھ سکتا ہے تو کھڑا نہیں ہوتا۔ اگر وہ سو سکتا ہے تو جاگتا نہیں۔ اس لیے کہ وہ اچھی طرح سو نہیں سکتا۔

وہ اتنا بیدار نہیں رہا ہوتا کہ اسے نیند آئے۔ اس کے اعصاب تھک جاتے ہیں لیکن اعضا نہیں تھکتے۔ اور چونکہ عمل اس کی قوتوں کو جذب نہیں کرتا اور جذبات، جسمانی عمل میں اظہار نہیں پاتے، وہ ہمیشہ بے کل رہتا ہے اور اسے کبھی سکون میسر نہیں آتا۔

فرار اور تعطل اس کی اصلیت ہیں۔ وہ تلخ حقائق سے احتراز کرتا ہے۔ وہ خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتا ہے، جس میں وہ بہت سی فتوحات حاصل کرتا ہے۔ اس کا شرمیلا پن ایک خفیہ گوشہ گیری بن جاتا ہے اور اس کی گوشہ گیری ایک چالاک قسم کی ریاکاری ہوتی ہے جو عموماً فطری طور پر کمزور انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان معنوں میں نرم پسند بھی ہے کہ وہ خلوت سے گھبرا کر کبھی کبھی چند منتخب دوستوں کی محفل میں شریک ہوتا ہے۔ اگر اسے کبھی کوئی اس کی بات سننے والا مل جائے تو وہ اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہے۔ قہوہ خانوں میں اس قسم کے لوگ اکثر جمع ہوتے ہیں۔ وہ عام قبولیت کا بھوکا ہوتا ہے۔ وہ کم ہمتی کی وجہ سے رسم و رواج کے ساتھ مطابقت پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں رئیسانہ شعور عزت نہیں ہوتا۔ وہ کسی حد تک ایک جمہوری ضمیر کا مالک ہوتا ہے جو وفاداری سے اجتماع کے اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ عموماً نرم دل، شفیق، شکرگزار، وفادار اور پر احترام ہوتا ہے۔ وہ ظلم نہیں کرتا اور نہ اس میں کوئی کھردرا پن ہوتا ہے۔ وہ جنسی بے راہ رویوں پر مائل ہوتا ہے، لیکن وہ صرف معمولی قسم کے جرائم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں اس کی محرکات۔ وہ اس لیے ناتواں ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جو اس کی زندگی کو وحدت میں منسلک کرے۔ وہ ہمیشہ بے قرار مگر قرار کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ ایک سے دوسرے منصوبے اور ایک سے دوسری جگہ اپنی بے قراری کو پھیلاتا ہے۔ وہ ایک ایسا جہاز ہے جو کبھی ساحل پر نہیں رکتا اور اس کا سامان سڑتا گلتا رہتا ہے۔ وہ باقاعدگی یا محنت کا اہل نہیں اور اگرچہ وہ کبھی کبھی مصروف نظر آتا ہے، وہ کسی متعینہ مقصد کے لیے جم کر کام نہیں کر سکتا۔ وہ نیت میں شدید مگر عمل میں تساہل پسند ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی جذباتی شدت کا اظہار کرتا ہے جس سے توانائی کا دھوکا ہوتا ہے، لیکن وہ شدت جلد ہی منتشر ہو جاتی ہے۔ وہ خواہشوں سے معمور مگر عزم سے خالی ہوتا ہے۔ آخر کار وہ محبت میں جوئندہ ہونے کی بجائے وہ یابندہ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر اپنی محبوبہ کے قریب جاتا ہے اور اس کی تسخیر کرتا ہے لیکن دراصل اس کی محبوبہ ایک سیاستدان کی غیر مرئی ذہانت کے ساتھ اسے قابو میں لاتی ہے۔ درحقیقت، وہ اپنی تسخیر پر شرمسار ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ شاید وہ ایک تخیلی محبت سے زیادہ محظوظ ہوتا۔ لیکن وہ تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور ایک وفادار اور محنتی شوہر بن جاتا ہے اور کبھی کبھی بچوں کا باپ بن جاتا ہے اور اپنے بچوں کے لیے جان توڑ مشقت کرتا ہے۔ اس کی زندگی احساس زیاں سے تاریک ہو جاتی ہے اور وہ یہ سوچتا

ہے کہ اگر وہ پیدا نہ ہوا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ اس احساس کے ساتھ وہ وقت سے پہلے مرجاتا ہے۔

۳۔ ایجابی شخصیت

اس انسان کی شخصیت ایجابی ہے۔ اس کے پاس صحت، توانائی، لہو اور گوشت کی افراط ہے۔ وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا ہے اور اپنی کج کلاہی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اگر وہ آپ کو دیکھتا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ لیکن حقیقت میں وہ آپ کو نہیں دیکھتا۔ وہ اپنے کام میں منہمک ہے اور اپنے مقصد میں مگن۔ وہ اشخاص میں نہیں، مقاصد میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس کی تمام ایجابی محرکات مضبوط ہیں۔ وہ شوق سے اور بے تکلف ہو کر کھاتا ہے۔ اس کی اشتہا کی تسکین کے لیے ہزاروں جانور قربان کیے جاتے ہیں۔ زمین کی زرخیزی کا محاصرہ کرنے کا یہ فطری رجحان ملکیت اور جلب منفعت کا ایک جنون بن جاتا ہے۔ اس کا اصول ہے حاصل کرنا اور قابض رہنا۔ اور چونکہ وہ سلبی شخصیت سے زیادہ کامیاب ہے۔ وہ ہر جدید قوم کو اپنے انداز شخصیت میں ڈھال دیتا ہے، یعنی اسے بے طرح ہوس ناک بنا دیتا ہے۔ (یا غالباً اس کی بیوی بہت فضول خرچ ہے۔)

پچھلے زمانہ میں وہ کوئی افسر، تاجر، ٹریڈ یونین لیڈر یا انجینئر ہونے کی بجائے کوئی نواب یا سپاہی ہوتا اور اس کی جنگجوئی کی صفت ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ وہ آج کم شدید ہے اور پس پردہ کام کرتی ہے۔ وہ اسی طرح ایجابی ہے جیسے کہ اس وقت ہوتا تھا جب لوگ زرہ بکتر سے لڑا کرتے تھے۔ جنگجوئی کی ہی صفت اس کے مقاصد کو توانائی بہم پہنچاتی ہے۔ اس کی آرزوئیں بزدلانہ خواہشات نہیں ہیں، بلکہ اٹل قوتیں ہیں۔ ان کی خاطر وہ ذمہ داریوں، خطروں اور بے پناہ مشقتوں کا بار اٹھاتا ہے۔ اس میں نیکی کم اور جرات زیادہ۔ ضمیر کم اور خودداری زیادہ ہے۔ اس کے مقاصد عظیم الشان ہیں۔ وہ پابندیوں کو حقارت اور انکسار کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے ہو جو اس سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہو تو وہ اس کے سامنے جھکتا نہیں بلکہ رشک اور رقابت کے ساتھ اس کی عزت کرتا ہے۔ وہ اگر شکست کھاتا ہے تو جان توڑ لڑائی کے بعد۔

وہ جذبہ تجسس سے لبریز ہے۔ ہر چیز اسے دلکش معلوم ہوتی ہے اور اس کا ذہن فعالیت کے ساتھ عجیب و غریب چیزوں سے کھیلتا ہے۔ اسے نظریوں سے کوئی شغف نہیں۔ اس کا ہر سوچ بچار براہ راست عمل اور اپنے مقصد سے متعلق ہوتا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کیوں اعلیٰ ریاضی، شاعری، مصوری یا فلسفہ پر سر دھنتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مفکر ہے تو وہ فکر اور عمل دونوں سے یکساں سروکار رکھتا ہے۔ وہ ارسطو نہیں سینکا ہے۔ بارکلے نہیں، بیکن

ہے اور کانٹ نہیں والٹیئر ہے۔

وہ فکر پر نہیں، عمل پر یقین رکھتا ہے۔ اور سیزر کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ اگر کسی کام کا کوئی حصہ بھی ادھورا رہ جائے تو وہ کام مکمل نہیں ہوا۔ اسے پر شور زندگی پسند ہے۔ وہ دیہاتی سادگی اور امن کو پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ امن بڑھاپے کے لیے بنا ہے اور مرد کو اس سے گریز کرنا چاہیے۔ وہ رعب داب سے زندگی بسر کرتا ہے اور اس احساس سے اسے خوشی ہوتی ہے، کہ دوسرے انسان اینٹوں کی طرح ہیں، وہ انہیں ایک معمار کی طرح جیسے چاہے استعمال کرے۔ وہ اتنا خوداعتماد اور خوش طبع ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کی قیادت قبول کرنے میں ایک پوشیدہ مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا پیہم عمل اسے صحت مند بناتا ہے اور اسے فکر اور پریشانی کی مہلت نہیں دیتا۔ وہ زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ماضی اور مستقبل کے متعلق زیادہ نہیں سوچتا۔ وہ جنت الارض کے تصور کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ خبر اس کے لیے عین اطمینان کا باعث ہوگی کہ سب انقلاب پسند کل صبح سولی پر چڑھا دیے جائیں گے۔ اسے سب خیال پرستوں سے نفرت ہے یعنی ان لوگوں سے جو تقریریں کرتے ہیں، مضامین لکھتے ہیں اور اپنے بلند مرتبوں کی بلندی سے بین الاقوامی مسائل کو حل کرتے ہیں۔

لیکن بعض حالتوں میں یہ شخص بھی ایک صاحب فکر ہو سکتا ہے۔ شاعر یا مصور نہیں، فلسفی یا وہ سائنس دان نہیں جو اپنے کل پرزوں یا قدیم کتابوں میں گم رہتا ہے بلکہ ایک مخترع اور ایک معمار جو نئی ہیئتیں تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایک انجینئر جو فولاد سے بڑے بڑے دریاؤں پر پل باندھتا ہے۔ ایک بت تراش جو سنگ مرمر میں زندگی پیدا کرتا ہے یا وہ سائنس دان جو کسی نئی حقیقت کی خاطر ساری دنیا کی مخالفت مول لینے کے لیے تیار ہے۔ پھر بھی جہاں وہ فکر کی ایک زندگی بسر کرتا ہے، وہاں وہ عمل کی سینکڑوں زندگیاں گزارتا ہے۔

بالعموم وہ مدنی الطبع ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص سے اچھی طرح ملتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن کے خیالات عام نہج سے بہت مختلف ہوں۔ وہ شام کو خلوت چاہتا ہے، لیکن اس خلوت کا مفہوم گوشہ تنہائی نہیں بلکہ گھر کی خلوت ہے۔ وہ محاسبہ خاطر بہت کم کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں الجھنیں کم ہوتی ہیں اور وہ کبھی نفسیات کا ذکر نہیں کرتا۔ جب اس کی بیوی اسے دق کرتی ہے تو وہ کلب چلا جاتا ہے۔ جب کلب سے اکتاتا ہے تو اپنے آپ کو کام میں کھو دیتا ہے۔ اس کی فعال زندگی کی پابندیاں اس میں ذہنی انتشار نہیں پیدا ہونے دیتیں۔ وہ ایک صاحب عزم انسان ہے۔ اس کے یہاں عزم کا مفہوم عزائم کی کثرت نہیں بلکہ وحدت ہے۔ آرزوؤں اور خواہشوں کا انتشار نہیں جو باہم متصادم اور ایک دوسرے کو ختم کرنے پر آمادہ ہوں بلکہ ایک واحد مقصد کے رشتے میں منسلک،

مقاصد کا ایک باربط نظام جو اس کی شخصیت کے کسی غالب اور مستقل تصور سے پیدا ہوا ہے۔ اس کا عزم ایک منظم عزم ہے۔ وہ امکانات کی حدود متعین کر کے مستقل مزاجی سے مقاصد اور ان کے وسائل کی تسخیر کرتا ہے۔ وہ مکمل کام کرتا ہے، ادھورے نہیں۔ وہ اپنی کوششوں میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتا کہ دوسرے لوگ اس کے کام پر کیا تبصرہ کریں گے۔ وہ خاموش مزاج ہے۔ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ وہ قول یا عمل کی شدت میں اپنی طاقت ضائع نہیں کرتا۔ وہ والہانہ جذبات کا مالک ہوتا ہے۔ عظیم والہانہ جذبات جو ایک مقصد کے سانچے میں ڈھل کر ایک جذبہ بن جاتے۔ وہ بکھرے ہوئے جذبات نہیں جن کا انجام انتشار ہوتا ہے۔ وہ ضبط نفس کی لذتوں سے آشنا ہے۔ وہ فوری آرزوؤں اور محرکات پر قابو پا سکتا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی تکمیل کرتا ہے۔ اس کی تشکیل صحت اور ذہانت کے امتزاج سے ہوئی ہے۔

وہ محبت میں پہل کرتا ہے اور راستی اور استقامت کے ذریعے، جو اسے سب عورتوں کا محبوب بناتی ہے، فتح پاتا ہے۔ وہ جلدی شادی کرتا ہے کیونکہ وہ جلدی فیصلہ کر سکتا ہے اور متجسس قرب کو محتاط پسپائی پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بیوی اور بچوں کی ذمہ داری تنہائی اور جنسی تنوع سے بہتر ہے۔ کنبے کی ذمہ داریاں اسے مضبوط بناتی ہیں۔ وہ جلال کے ساتھ جمال کا امتزاج کرنا جانتا ہے۔ اس کے بچے اس سے محبت ہی نہیں بلکہ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ آخری عمر میں وہ آرام اور تفریح کا فن سیکھتا ہے اور بڑھاپے میں پوتوں اور نواسوں کے وجود سے نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے اس بات پر کبھی شک نہیں کرتا کہ زندگی ایک نعمت تھی۔ اسے صرف اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ اسے زندگی کا کھیل اب نئے کھلاڑیوں کے سپرد کرنا ہوگا۔

۴۔ شخصیت کی دوبارہ تعمیر کرنا

ہم نے دو مثالی خاکے پیش کیے ہیں اور اس طرح انسان کو مستحکم اور ناتواں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر اس امتیاز کو قطعی سمجھا جائے تو ہمارے خاکے بیکار ہیں۔ اگر ہم انہیں ساتھ ساتھ رکھیں تو ہمارے لیے یہ آسان ہو گا کہ ہم اپنی شخصیت کا تجزیہ کریں اور اس کی از سر نو تنظیم کر سکیں۔ کیا ہم ایک معمولی حد تک اپنے آپ کو سلبی صفات اور خامیوں سے منزہ کر سکتے ہیں۔ اور اپنے اندر وہ ایجابی استحکام پیدا کر سکتے ہیں، جو ہمارے دلوں کا پوشیدہ صنم ہے؟ کیا ہم سوچ سمجھ کی مدد سے اپنے قد و قامت میں اضافہ کر سکتے ہیں؟

اکثر لوگ اس سوال کا جواب ایک یاس آفریں "نفی" میں دیتے ہیں۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ شخصیت ہماری تقدیر ہے اور ہم جو کچھ پیدائش کے وقت ہوتے ہیں تادم آخر وہی رہتے ہیں۔

بسا اوقات شخصیت کی صفات، جسمانی حالت، صحت اور تندرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان صفات کو کیونکر بدلا جا سکتا ہے۔

لیکن کچھ شہادتیں ایسی ہیں جو انسانی شخصیت کے اس جامد عقیدہ کو جھٹلاتی ہیں۔ ہمارے اپنے زمانہ کی تاریخ سلبی شخصیتوں کے ایجابی شخصیتوں میں بدلنے کی ایک نہایت حیرت انگیز مثال پیش کرتی ہے۔ پچاس برس گزرے کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں سلبی سمجھا جاتا تھا اور ان کو ان تمام ناموں سے یاد کیا جاتا تھا جو ہم نے کمزور شخصیت کو بیان کرنے میں استعمال کیے ہیں۔ ان کی جسمانی کمزوری ایک احساس کمتری کی بنیاد بن گئی تھی جو ان کے اس پر ------ تاسف کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مرد کیوں پیدا نہیں ہوئیں اور اس تاسف کے اثر سے جو ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں آگ کی طرح جلتا رہتا تھا، ان کی زبان کبھی کبھی شعلے برساتی تھی۔ وہ فطرتاً" عمل کے معاملہ میں نرم روی سے کام لیتی تھیں۔ اور اگر کبھی کبھی وہ زبان درازی اور تیز گفتاری سے کام لیتیں تو یہ محض ان کی جسمانی کمتری کا ایک رد عمل ہوتا۔ بنیادی طور پر وہ صنف نازک ہی تھیں۔

عورت کی حیا اور تسلیم اس جسمانی اساس پر استوار تھی۔ مرد کی طرح کارگری، اس کے لیے مسرت آفریں اور ولولہ انگیز نہیں تھی۔ نسلاً" بعد نسل اس کی تقدیر تھی، بچوں کی ماں بننا۔ وہ اپنے آقا کے سامنے سر تسلیم خم کرتی، محبت سے اس کی مار پیٹ برداشت کرتی، اپنے بدن کے ساتھ اپنا نام اور جائیداد اس کے سپرد کر دیتی اور اس کی رضا پر راضی رہتی۔ زندگی اس کے لیے اندوہناک اور بے کیف تھی۔ اور وہ کبھی کبھی شعر و افسانہ میں جذب ہو کر اپنے لیے ایک روشن دنیا کی خیالی تخلیق کر لیتی تھی۔

اور پھر صنعت نے اسے اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا۔ اس کی زندگی میں تنوع سیلاب کی طرح داخل ہوا۔ اسے شخصی ذمہ داری اور اقتصادی خود اختیاری حاصل ہوئی۔ اسے اپنی محنت کی کمائی میسر آئی اور اس نے اپنے اخلاق کی خود تربیت شروع کی۔ اس نے مرد کے تفوق پر شک کرنا شروع کیا۔ اس نے مرد کو بنیادی طور پر قابل تسخیر پایا تھا۔ لیکن اب اسے یہ انکشاف ہوا جیسے مرد نے کچھ دیر پہلے انکشاف کیا تھا کہ جدید زمانہ میں سبک رو کی جیت نہیں ہوتی اور جنگ میں زور آور کو فتح میسر نہیں آتی اور انتخاب جسمانی طاقت اور گوشت پوست کے ہاتھوں سے نکل کر ذہانت اور چالاکی کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ اسے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جسمانی کمتری کامیابی کے راستہ میں کوئی ناقابل عبور خلیج نہیں ہے اور یہ کہ دنیا کی بعض عظیم ترین شخصیتیں جسمانی طور پر بہت کمزور تھیں۔ اور پھر یہ بھی کہ ایک عورت بھی اپنے تنگ اور چست لباس اور دم گھونٹنے والی روایات کے باوجود قیادت اور طاقت حاصل کر سکتی ہے اور اپنی روح کی مالک بن سکتی ہے۔

اس لیے جب انقلاب عظیم آیا تو اس نے اپنی سلبی صفات ترک کر کے اپنے اندر ایجابی اوصاف پیدا کیے۔ وہ ایک شخصیت بن گئی جو پہل کرنے، نظم و نسق اور معروضی فکر کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس نے ہوس ملکیت پیدا کی اور دولت حاصل کرنے کے ہزاروں طریقے دریافت کیے۔ اس نے بازاروں کی گھما گھمی کی خاطر گھر کی خاموشی کو ترک کیا اور پانی کی جگہ پاؤڈر استعمال کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنے لباس میں قطع و برید شروع کی اور اپنا گلا اور گردن ننگی کر دی۔ عبادت کم کر کے وہ کھیل کود میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ اس نے اپنی نئی آزادی کی خوشگوار ہوا کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا اور روحانی طور پر تنومند اور بہادر بن گئی۔ تقریباً ایک ہی نسل میں اس نے غیر معمولی سرعت سے اپنے اندر ایجابی صفات پیدا کر لیں۔

مرد حیران رہ گیا اور اس نے "جدید عورت" کے متعلق اخلاقی قسم کا شکوہ شروع کیا۔ لیکن یہ انقلاب اس کی تدبیر و رضا کے بغیر آیا تھا اور اس کی اجازت کے بغیر جاری رہا۔ اس نے عورت کو صنعت، تجارت، تعلیم اور دیگر شعبوں میں اپنا مد مقابل پایا۔ یہ شعبے ازل سے اس کی ملکیت تھے۔ وہ کام اور عزم میں عورت کی اس خود اختیاری سے نالاں تھا۔ اس کا دل قدیم زمانہ کی باحیا دوشیزاؤں، انگور کی بیلوں اور بچوں کے ساتھ گھریلو قسم کی لذتوں کے لیے تڑپتا تھا۔ اس نے بہادری اور حیرانی سے اس حملہ کا مقابلہ کیا۔

وہ ناکام رہا۔ امریکہ میں عورت نے سلبی اطاعت سے ایجابی غلبہ تک کا عبوری دور تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ باکرہ کی حیا اور ایفائے مناکحت کی قدیم صفات ختم ہو گئیں۔ اب مرد حجاب سے آنکھیں نیچی کرتا ہے اور جدید دوشیزہ کے ٹخنوں، پنڈلیوں، گھٹنوں اور دیگر پر کشش صفات کو پر حیا تحیر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ "محبت اور وفا اور اطاعت" کے الفاظ اب شادی کی رسم سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ جلدی ہی یہ الفاظ بحال کر دیئے جائیں گے۔ لیکن اب یہ الفاظ مرد ادا کرے گا مگر اب یہ الفاظ لایعنی ہوں گے۔

اس فوری انقلاب سے شخصیت کے بدلنے کے امکانات کا اندازہ لگائیے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات جنہیں ہم نے سلبی اور ایجابی کے نام دیئے ہیں، لابدی طور پر بدن کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہاں، ان کی اساس بدن کی توانائی اور ناتوانی ہے۔ لیکن وہ غیر محدود طور پر موقع اور ماحول سے بدل جا سکتی ہیں۔ لاکھوں عورتوں نے اپنے اندر کم ہمتی سے جرات اور اطاعت سے غلبہ کی صفات پیدا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم چاہیں تو شخصیت بدل جا سکتی ہے۔

لیکن یہاں ہمیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم میں سے کچھ لوگ اپنی شخصیت کو بدلنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم اپنے آپ کو اس قدر کامل محسوس کرتے ہیں اور اپنی خامیوں کو اتنا حسین

سمجھتے ہیں کہ اپنی بنیادوں کی تھوڑی بہت مرمت کرنے کا خیال ہمیں ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اخلاقی مسئلہ بھی وابستہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایجابی شخصیت نیک بھی ہو۔ کوئی قوم، جس میں فقط ایجابی قسم کے اولوالعزم انسان ہوں، رقابت اور پیکار کا بیت الجنون بن سکتی ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہم یہاں نیکی کی تلقین نہیں کر رہے اور ہمارے نسخے کسی قدر غیر اخلاقی ہوں گے۔ اگر ہم ہنگامی طور پر نیکی نہیں بلکہ طاقت پیدا کرنے پر زور دے رہے ہیں تو وہ اس لیے کہ شخصیت کا استحکام ایک اعلیٰ خوبی ہے۔ حالات کی درشتی لاکھوں شخصیتوں کو شکستہ اور لاکھوں سروں کو نگوں کردے گی۔

اگر ہمیں اپنے آپ کو مضبوط بنانا ہے تو ہمیں سب سے پہلے عزم کا مطلب سمجھنا چاہیے۔ عزم کوئی ناقابل فہم حقیقت نہیں جو شخصیت کے عناصر میں وہ مقام رکھے جو آرکسٹرا میں کنڈکٹر کو حاصل ہوتا ہے۔ جو کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھکتا ہے۔ عزم انسان کی تمام محرکات اور رجحانات کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ محرکات جن سے شخصیت کا تانا بانا تیار ہوتا ہے، اپنے سے باہر کوئی قائد نہیں رکھتیں۔ انہیں محرکات میں سے کوئی مضبوط رجحان دوسروں پر غالب آتا ہے اور ان میں ربط اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ اسے قوت عزم کہتے ہیں۔ یعنی ایک غالب آرزو دوسری آرزوؤں سے اس قدر بلند وارفع ہے کہ وہ اس کی طرف کھنچی آتی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ہی منزل کے حصول کے لیے چلنے کو تیار ہیں۔ اگر ہم کوئی ایسا غالب مقصد نہ پا سکیں جس کی خاطر ہم اپنے دل کی دوسری آرزوؤں کو قربان کر سکیں تو ہمیں وحدت میسر نہیں آسکتی اور ہمارا انجام کسی دوسرے کے مکان میں ایک اینٹ بننا ہوگا۔

اس لیے وہ کتابیں پڑھنا بیکار ہے جو شخصیت کی تعمیر کی آسان راہیں بجھاتی ہیں کیونکہ شخصیت کی تعمیر کی راہ دشوار گزار بھی ہے اور طویل بھی۔

یہ راہ زندگی کی راہ ہے۔ عزم، آرزوؤں کے ربط کا نام ہے اور جیسا کہ شوپنہار نے کہا تھا:

یہ پھلتی پھولتی زندگی کی مخصوص ہیئت ہے اور اس کی توانائی اور مقام اس صورت میں بڑھتا ہے کہ زندگی نئے کاموں اور نئی فتوحات سے دوچار ہو۔ اگر ہم مضبوط بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا مقصد اور اس کے حصول کے وسائل متعین کرنے چاہئیں اور ہر دشواری کے باوجود اس سے وفا کرنا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ شروع میں ہم وہ کام کریں، جس کے متعلق ہمیں اعتماد ہو کہ ہم کرسکتے ہیں، کیونکہ ہر ناکامی ہمیں ناتواں اور ہر کامیابی ہمیں مضبوط بناتی ہے۔ ایک کامیابی سے دوسری کامیابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ معمولی فتوحات سے ہمیں بڑی فتوحات کی طاقت اور اعتماد میسر آتا ہے۔ مشق سے عزم بنتا ہے۔ لیکن ہم ضرورت سے زیادہ محتاط بھی ہوسکتے ہیں۔ اور بڑی بڑی مہموں کی دعوت کو مسترد کر

کے مستقل طور پر اپنے لیے ایک ادنیٰ مقام مقرر کر سکتے ہیں۔ اس بات پر نظر رکھئے کہ معمولی فتوحات آپ کو مطمئن نہ کریں۔ اپنی فتح کو ایک دن منا کر دوسرے دن کسی بہتر اور اعلیٰ کام کے لیے تیار ہو جایئے۔ خطرہ کا مقابلہ کیجئے اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھایئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ آپ کو پچھاڑ سکتے ہیں اور تباہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی کی موت کی تاریخ کسی فلسفہ کے نقطۂ نظر سے ایک نہایت معمولی تفصیل ہے۔ اگر خطرات اور ذمہ داریاں آپ کو ختم نہیں کر دیتیں تو آپ کو مضبوط بنا دیں گی اور آپ کو عظمت کی طرف ابھاریں گی۔ "بن جاؤ یا مر جاؤ!"

تجزیہ نفسی کا ایک ناقابل اعتبار دور ہمیں انسانی شخصیت اور تقدیر کی لچک کی ایک اور مثال پیش کرتا ہے۔ آڈلر کے روشن نظریہ کی رو سے کہ جینئس اور ذہنی مرض کی بنیاد کوئی جسمانی خامی ہوتی ہے، جسم کا وہ نقص جو اپنی لابدی موجودگی سے روح کو مجروح کرتا ہے، اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس خامی کو دور کرے۔ فرانسس بیکن نے کہا تھا "جس کسی کی شخصیت میں کوئی مستقل قابل تنافر صفت ہو، اس میں یہ پیہم تحریک موجود ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو تضحیک اور استہزاء سے محفوظ کرے"۔ اس لیے پاؤں پھرے بائرن نے پوری مہارت سے رقص کرنا سیکھا اور اتنے گناہ کیے کہ سماج میں "شیر مرد" متصور ہونے لگا۔ ہکلا ڈیمو ستھینیز کامل مقرر بن گیا اور بیتھوون نے سماعت کھو کر لاثانی موسیقی پیدا کی۔ عورت نے اپنی جسمانی کمزوری اور محکومی کے خلاف "مردانہ احتجاج" کے ساتھ روایات اور مشکلات کی بیڑیوں کو توڑ پھینکا۔ آڈلر کہتا ہے کہ "فرد کا احساس کمتری اس میں ترقی کرنے کی آرزو پیدا کرتا ہے"۔ جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں، کوشش کر کے آگے بڑھتے ہیں اور دوڑ میں سبقت لے جاتے ہیں۔ مزدوروں کے طبقے میں سے بڑے بڑے مخترع پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مریض جسموں نے اعلیٰ روحوں کو پناہ اور لذت بخشی ہے۔

۵۔ نسخے

لیکن یہ ساری باتیں عمومی اور مبہم ہیں۔ ہمیں اپنے سوال کا ذرا زیادہ قریب سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ ذہنی اور اخلاقی طاقت حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

پہلے تندرستی تلاش کرو، باقی صفات خود بخود پیدا ہو جائیں گی یا ان کی کمی اس قدر محسوس نہیں ہوگی جیسا کہ نیٹشے نے کہا تھا "ایک شریف آدمی کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ کامل حیوان بنے"۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ ہم اچھے آباؤ اجداد کا انتخاب کریں۔ لیکن چونکہ یہ انتخاب مشکل ہے اس لیے ہم کم سے کم اچھی غذا اور اچھی عادات کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ مولشاٹ نے کہا تھا کہ انسان کافی حد تک وہی کچھ ہے جو کچھ وہ کھاتا ہے۔ کھانے کے متعلق کوئی عالمگیر کلیہ قائم نہیں

ہو سکتا۔ ہر شخص کو ان غذاؤں سے احتراز کرنا چاہیے جو اسے نقصان دیتی ہیں۔ جو چیز آپ کو نقصان دیتی ہے، اس پر خط تنسیخ کھینچیں اور اسے اپنے ہاضمہ کے قریب نہ آنے دیں۔ حتیٰ کہ خط تنسیخ کھینچتے کھینچتے آپ ایک ایسی غذا پر پہنچ جائیں جو آپ کے معدہ کے لیے سکون بخش ہو۔ اور اگر آپ کے معدہ کا فضلہ دوا کے بغیر خارج نہ ہو تو اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ وہ کون سا خطرناک مادہ ہے جو آپ کو کمزور بنا رہا ہے۔ یہ سفید آٹا ہے یا کیک اور مٹھائیاں ہیں، یا وہ کھانا جس میں سبزی اور پھل وغیرہ شامل نہیں۔ اپنے معدہ کو کھلا رکھئے اور منہ کو بند۔ یہی حکمت کی کلید ہے۔

اگر ہمیں اپنے آپ کی نئے سرے سے تعمیر کرنی ہے تو ہمیں معدہ سے ابتدا کرنی چاہیے۔ اور پھر جسم کے ہر حصہ کو پھلنے پھولنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ قدرت نے ہمیں ارباب علم، کلرک، صحافی اور فلسفی بننے کے لیے پیدا نہیں کیا تھا۔ اس نے ہمیں اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہم حرکت کریں، بھاری وزن اٹھائیں، دوڑیں، کودیں، پھاندیں۔ اس نے ہمیں بازوؤں اور ٹانگوں کی زندگی بسر کرنے کی موزوں ساخت عطا کی۔ بہترین زندگی میں جسمانی اور ذہنی مشاغل کا امتزاج ہوتا ہے۔ ولیم قیصر کی لکڑی کاٹنے کی عادت میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔ لیکن یہ ایک ایسی عیاشی ہے جس کا ہر شخص متحمل نہیں ہو سکتا۔ زندگی اس قدر پیچیدہ اور پر تقابل ہے کہ ہمیں عظمت حاصل کرنے کے لیے ایک ہی موضوع اور مقصد پر طاقت اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے لیکن ہمیں کم سے کم اپنے باغیچوں کی گھاس خود کاٹنی چاہیے۔ اپنی باڑوں اور اپنے درختوں کی قطع و برید خود کرنی چاہیے۔ اور ہمیں گھر کے ساتھ ایک باغیچہ بنانے کے لیے ہر ممکن قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ شاید کسی دن ایک پورے باغ کی اصلاح کی فرصت مل سکے۔ صحت، شہرت سے کہیں بہتر ہے کیونکہ فطین جب تک زندہ رہتا ہے، اندوہ میں مبتلا رہتا ہے اور صرف مرنے کے بعد ہی مشہور ہوتا ہے۔

صحت اور طاقت حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایک نئے ماحول کی ضرورت ہے اور یہ بات ہمیشہ باعث تسکین ہوتی ہے کہ ہم اپنی وراثت کو نہیں بدل سکتے لیکن اپنے حالات کو بدل سکتے ہیں۔ انیسویں صدی کے جبری فلسفے نے انسان کا تصور یوں کیا تھا کہ وہ وراثت اور ماحول کا مرکب ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ انسان مرکب ہے وراثت، ماحول اور اس عجیب ترقی پسند طاقت کا جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ یہ بات اس قدر صحیح ہے (اور ہم اسے لوح دل پر رقم کر سکتے ہیں) کہ جب تک ہم ان خارجی محرکات کو نہیں بدلتے جو لحظہ بہ لحظہ ہم پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، ہم اپنے آپ کو بنیادی طور پر نہیں بدل سکتے کیونکہ یہ محرکات ہمیں اپنے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ ہم غلاظت پسند لوگوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں یا ان ناخواندہ لوگوں کے درمیان، جنہیں فقط مادی اور غذائی اشیاء سے دلچسپی ہے؟ ہر حالت میں ہمیں ان لوگوں سے دور کسی بہتر صحبت کی تلاش میں چلا جانا چاہیے۔ کیا ہمارے قرب و جوار میں کہیں کوئی بہتر روح، بہتر ذہن یا مضبوط شخصیت موجود ہے؟ ہم اسے

ڈھونڈ نکالیں اور کچھ عرصے اس کی صحبت میں رہیں تاکہ اس کی چال ڈھال کو اپنے لیے نمونہ بنا سکیں۔ اس کے بعد اس سے بھی عظیم شخصیتوں کی کھوج کریں۔ عظیم شخصیتوں کے کلام سے بہرہ اندوز ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم بے وقوفوں پر حکمرانی کریں۔ سیزر کا یہ قول غلط تھا کہ روما میں مقام ثانی حاصل کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم وحشیوں کی سرداری کریں۔

اگر (جیسا کہ بہت ممکن ہے آپ سوچتے ہوں) آپ کے حلقہ احباب میں آپ سے بہتر کوئی شخص نہیں تو ماضی کی عظیم شخصیتوں سے صحبت قائم کریں۔ بہت تھوڑے داموں پر آپ ان کے خیالات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں‘ ان کا کلام سن سکتے ہیں اور اس منزہ فضا میں اپنے آپ کو سمو سکتے ہیں‘ جو ان کی شخصیتوں کے گرد رہتی ہے۔ یہ فرض کرنا غلط ہے کہ کتابوں کے پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ اثر آہستہ آہستہ محسوس ہوتا ہے‘ اس پانی کی طرح جو آب درہ بناتا ہوا رستا ہے۔ لیکن ہر برس کے بعد اس کا اثر بڑھتا جاتا ہے اور کوئی شخص بھی عظیم شخصیتوں کی صحبت سے کچھ حاصل کیے بغیر نہیں اٹھتا۔ نپولین کی صحبت میں رہنے‘ والٹ وٹمین کے ساتھ چہل قدمی کرنے اور فریڈرک اور والٹیئر کے ساتھ نیم شبانہ صحبت طعام قائم کرنے کے مواقع کے باوجود ادنیٰ رہنے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔

یہ تو رہا خارجی ماحول۔ داخلی ماحول کا معاملہ زیادہ ٹیڑھا ہے کیونکہ کس قدر وحشت مجسم ہیں ہم۔ آرزوؤں کا ایک خارزار! ہمیں کیونکر معلوم ہو کہ ہمیں کن پودوں کی آبیاری کرنا ہے اور کن بوٹوں کو مرجھانے دینا ہے؟

شخصیت کا پہلا اصول ہے وحدت۔ یہی بات گوئٹے کے ان الفاظ میں پوشیدہ ہے "کل ہونا یا کل میں شریک ہونا"۔ اور دوسرا اصول ہے جستجو کرو‘ پسپا نہ ہو۔ یہ ہے نشوونما کی راہ‘ جس سے کوئی عقلمند انسان نہیں ہٹتا۔ اگر ہٹے بھی تو استثناء کو قاعدہ نہیں بناتا۔ جبلتوں کے پہلے گروہ میں صفائی کا خیال رکھنا چاہیے‘ اگرچہ یہ صفت تنافر کی سلبی جبلت سے پھوٹتی ہے۔ نیٹشے کہتا ہے کہ بچے میں احساس صفائی کو ایک والہانہ جذبہ کی شکل دینی چاہیے۔ اس کے بعد وہ اپنے اندر ہر خوبی پیدا کر لے گا۔ صفائی کا درجہ فقط خدائی کے بعد ہے۔ اور اگر خداؤں کا وجود نہ ہو تو کیا؟ لیکن ہم راہب بننا نہیں چاہتے۔ ہم ہمیشہ اس دیندار سیاست دان کو پنہاں رشک سے دیکھیں گے جو دینداری کو اپنی اشتہا کی تسکین میں مخل نہیں ہونے دیتا۔

جبلت رزم اور خودداری کے متعلق بھی ہمارا یہی رویہ ہو گا۔ یہ خوبیاں ہیں برائیاں نہیں۔ ہم ان کی اس لیے قطع و برید کریں گے تاکہ وہ پھولیں پھولیں۔ جنگجوئی نہیں‘ نخوت نہیں۔ نخوت آئندہ فتوحات کا تصور ہے اور خودداری گزشتہ فتوحات کی یاد۔ جنگجوئی کمزور کی جبلت رزم ہے۔ رزم کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ شور و غل مچایا جائے اور لپاڈگی کی جائے۔ اس کا مطلب یہ

بھی ہو سکتا ہے کہ خاموشی اور استقلال سے ایک مقصد کی جستجو کی جائے۔ آرزومند ہونے کا مطلب ظالم اور ہوس ناک ہونا نہیں۔ مضبوط آدمی "دینے" میں بھی وہی لذت محسوس کرتا ہے جو کمانے میں۔ وہ ملکیت پانے سے زیادہ تعمیر کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ گھر بناتا ہے تاکہ دوسرے اس میں رہیں اور پیسہ کماتا ہے تاکہ دوسرے خرچ کریں۔ شخصیت غیر معمولی طور پر اپنے اوپر خرچ کرنے سے نہیں بنتی بلکہ تعمیر و تخلیق سے سنورتی اور نکھرتی ہے اور عمل سے پھلتی پھولتی ہے۔ ہم ان پیشوں سے احتراز کریں جن میں فقط فکر و تدبر ہی ہو، کچھ کرنے کا موقع نہ ملے۔ یہ بہتر ہے کہ آپ نجار بنیں اور سورج کی روشنی میں خوشبودار لکڑی کاٹا کریں اور ہتھوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ چیزیں بنتے دیکھا کریں بہ نسبت اس کے کہ آپ ہر روز نفع و نقصان کی خانہ پری کرتے رہیں یا کسی گوشہ تنہائی میں خارجی دنیا کی حقیقت کے لیے نئے دلائل وضع کیا کریں۔ یہ بہتر ہے کہ آپ ایک گیت گائیں بہ مقابلے اس کے کہ آپ سو گیت سنیں۔ آیئے ہم کھیلیں اور ہنسیں اور اگر کسی روز زندگی ایک تلخ مذاق معلوم ہو تو مذاق کو یاد رکھیں اور تلخی سے درگزر کردیں۔

شادی کریں جیسا کہ کتاب مقدس میں لکھا ہے۔ شادی جلنے سے بہتر ہے، کیونکہ وہ ہمیں اپنے آپ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کے قابل بناتی ہے۔ نیطشے جیسے ذہنی مریض کے لیے بہن بیوی سے بہتر تھی۔ لیکن ایک صحت مند مرد کے لیے بہن کا قرب ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ ایک دفعہ یہ بنیادی مسئلہ حل ہو جائے تو ہم دنیا میں ہر عورت کی ہر ادا سے متاثر ہوئے بغیر چل پھر سکتے ہیں۔ ہم یہ جان جاتے ہیں کہ لباس چاہے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، عورتیں بنیادی طور پر یکساں ہوتی ہیں۔ فلسفہ کی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف مجازی صورتوں کے پیچھے حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس طرح ہم کسی قدر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنی بیویوں سے محبت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ شاید یہ صحیح ہو کہ ایک شادی شدہ مرد پیسے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے لیکن ایک شادی شدہ مرد ہی دلچسپیوں کے اس تنوع کے قابل ہو سکتا ہے۔

دوست بنائیے! اگر آپ سے یہ نہیں ہو سکتا تو اپنے آپ کو ایسا بنانے کی کوشش کیجئے کہ آپ دوست بنا سکیں۔ تنہائی ایک دوا ہے۔ صحت کی خاطر ایک روزہ ہے، لیکن غذا نہیں ہے جیسا کہ گوئٹے نے کہا تھا۔ شخصیت، دنیا کے بہاؤ کے ساتھ بہہ کر ہی بنتی ہے۔ اگر ہم فقط خود نگری سے کام لیں تو کہیں کے نہ رہیں، چاہے ہمارا واحد شغف نفسیات ہی ہو۔ مستقل طور پر اپنے اندر دیکھنا اسی طرح خطرناک ہے جیسے ٹینس کے کھیلنے والے کے لیے کھیلتے وقت فاصلے، رفتار، زاویہ اور ضرب کے متعلق سوچتے رہنا یا پیانو بجانے والے کے لیے بجاتے ہوئے انگلیوں کی حرکات پر غور کرتے رہنا۔ دوست اس لیے مفید ہیں کہ وہ ہماری باتیں سنتے ہیں، اس لیے بھی کہ وہ ہم پر ہنستے ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں کسی حد تک معروضیت، منکسرالمزاجی اور خوش خلقی کا سبق ملتا ہے۔ ہم زندگی کے

کھیل کے قواعد سیکھتے ہیں اور اس کھیل کے بہتر کھلاڑی بن جاتے ہیں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ سے پیار کریں تو انکسار پیدا کیجئے۔ اگر آپ اپنی تعریف کرانا چاہتے ہیں تو خودداری سے کام لیجئے۔ اگر آپ محبت اور تعریف دونوں کے متمنی ہیں تو اپنے اندر خارجی انکسار کے ساتھ داخلی خودداری پیدا کیجئے۔ لیکن خودداری بھی منکسرالمزاجی بن سکتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اسے نہ دیکھے اور نہ سنے۔ بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ چست فقرے' اگر وہ دل آزاری کا باعث بنیں تو قابل نفرت ہوتے ہیں۔ ہمارا اصول یہ ہونا چاہیے کہ کسی شخص کو غلط ثابت نہ کریں۔ وہ ہمیشہ اس کی بنا پر دل میں کینہ رکھے گا۔ "کچھ نہیں" دنیا کی مفید ترین چیز ہے۔ اکثر اوقات یہ ایک اچھا کام ہے اور ہمیشہ ایک اچھی بات ہے۔ سچی بات کہنے کے متعلق پریشان نہ رہیں۔ آپ سماج کے رواجوں کو قبول کیجئے تاکہ آپ اس کے قوانین کے ساتھ کبھی کبھی بے باکانہ طور پر پیش آ سکیں۔ سماج آپ کو سب کچھ کرنے کی اجازت دے سکتا ہے بشرطیکہ آپ اسے خوش اسلوبی سے کریں اور اس کا چرچا نہ کریں۔ خاموشی سے آگے بڑھئے اور غیر ضروری عداوت مول نہ لیجئے۔ آگے بڑھتے ہوئے' تجربہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے' زندگی کو اکساتے ہوئے کہ وہ آپ کو ہمیشہ لبریز رکھے' اس سے پیشتر کہ آپ اسے خیرباد کہیں اور زندگی کے شعلہ کو اپنے بچوں کی حفاظت میں چھوڑ جائیں۔

لیکن اس پورے بیان میں ذہانت کہاں ہے؟ کیا شخصیت فقط جبلتوں کا کھیل ہے جس میں عقل اور تخیل شریک نہیں ہو سکتے؟ کاش ایسے ہوتا۔ کیونکہ اس طرح شخصیت ایک آسان مسئلہ ہو جاتی اور فقط مضبوط جذبوں سے مضبوط انسان بن جاتے۔

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اور ایک کامل روح میں تخیل اس طرح جلوہ افروز ہوتا ہے جس طرح آگ میں روشنی۔ ہم تصورات میں کھو سکتے ہیں لیکن ہم دوربینی سے بڑی بڑی فتوحات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایمرسن کہتا ہے کوئی جنگ لڑنے سے پہلے نپولین یہ کم سوچتا کہ فتح پانے کے بعد وہ کیا کرے گا........ وہ یہ بات زیادہ سوچتا تھا کہ شکست کھانے پر وہ کیا کرے گا۔ "جب میں کسی لڑائی کا منصوبہ بناتا ہوں تو میں ہر ممکن خطرہ اور مصیبت کو بڑھا چڑھا کر تصور میں لاتا ہوں"۔ تخیل ہمیں برباد کر سکتا ہے' جس طرح اس نے نپولین کو ۱۸۱۲ء میں برباد کیا تھا' یا عمل سے پہلے بہت سے امکانات کا جائزہ لینے سے ہمیں ہزاروں بربادیوں سے بچا سکتا ہے۔

عقل کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ عمل کی رہنمائی کرے۔ جب یہ بذات خود ایک شغل بن جائے تو ہملٹ اور منطقی پیدا کرتی ہے۔ جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا اور عضلات اور شخصیت گلتے سڑتے رہتے ہیں اور جب یہ ایک آرزو کا دوسری آرزو سے کھیل' ایک جبلت کی دوسری جبلت پر تنقید' ایک جذبہ کا دوسرے جذبہ سے احتساب بنتی ہے تو انسان اس اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے جہاں اس کے

عناصر ادھر ادھر گھوم پھر کے ایک وحدت، ایک ربط میں یکجا ہو جاتے ہیں اور ایک مربوط زاویہ نظر میں اور جامع طرز عمل میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

ہماری جبلتیں ہمارے بادبانوں کے لیے ہوا کا کام کرتی ہیں۔ لیکن اگر وہ بغیر کسی روک ٹوک کے الگ الگ کام کریں تو وہ ہمیں غلاموں کی طرح اپنے پیچھے گھسیٹتی لے جائیں گی۔ کس نے وہ انسان نہیں دیکھا جو فقط ہوس یا فقط جنس یا فقط جنگ یا فقط پر گوئی یا فقط کھیل ہے؟ ہر جبلت کے لیے کامل آزادی شخصیت کو ختم کر دے گی، جس طرح اس نے سائرس کے نوجوانوں کو تباہ کیا تھا، جنہیں عورتوں نے پالا اور ان کی ہر خواہش کی تسکین کی اور اس طرح وہ کمزور انحطاط پذیر انسان بن گئے۔ اس لیے آرزو پر علم کے اثر میں جو خرد کی جان ہے، شخصیت کی تنظیم کے سامان موجود ہیں۔ ہمیں ان دو راہوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے، دنیا ہماری تربیت کرے یا ہم خود اپنی تربیت کریں۔ شخصیت جیسا کہ مل نے کہا تھا "ایک مکمل طور پر منظم عزم" کا نام ہے۔

ترکیب ہمیشہ تجزیہ سے مشکل ہوتی ہے۔ نفسیات نے ابھی تک انسانی فطرت کا شیرازہ یکجا نہیں کیا، جسے اس نے علیحدہ بکھیر رکھا ہے۔ انسان کو بیان کرنا آسان ہے لیکن یہ بتانا کہ اسے کیا بننا چاہیے یا وہ کیونکر بدل سکتا ہے، مشکل ہے۔ ہم نے ایک عظیم مضمون کے فقط ایک پہلو سے بحث کی ہے، جو ہمارے عہد میں بہت سے روشن اذہان کو اپنی طرف کھینچے گا۔ ہمارے پاس علم ہے۔ اب ہمیں فن کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے آپ کو از سر نو بنائیں، جس طرح ہم نے براعظموں اور سمندروں کو اپنے عزائم کے تابع کیا ہے، لیکن علم طاقت ہے اور ہر سائنس آخر کار ایک فن بن جاتی ہے تاکہ اس کے نتائج مملکت انسانی کو وسیع کریں۔ آئندہ نسل میں لوگ اسی طرح دل و دماغ کی تعمیر کریں گے جس طرح وہ آج جہازوں اور طیاروں کی تعمیر کرتے ہیں۔ انسانی جبلتیں، جو اس بدلتی ہوئی دنیا میں ساکن اور جامد رہی ہیں، اختراعات کی اس تیز رفتار کائنات میں شعوری طور پر نئے سانچوں میں ڈھالی جائیں گی۔ اب بھی انسان کی ذہنی طاقت بہت بڑھ گئی ہے حتیٰ کہ آج کا ایک اعلیٰ دماغ بنیادی طور پر کسان کے سادہ ذہن سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ کسی دن، ہمارے ذہن، ہمارے آلات کے، ہماری حکمت، ہمارے علم کے اور ہمارے مقاصد، ہماری صلاحیتوں کے مطابق ہو جائیں گے۔ اس وقت ہم انسانوں کی طرح زندہ رہیں گے۔

* * *

حصہ پنجم

جمالیات

باب سیزدہم

حسن کیا ہے؟

۱۔ فلسفیوں کا جمالیاتی شعور

اناطول فرانس نے کہا: "میں نہیں مانتا کہ ہم کبھی بھی پوری طرح یہ جان سکیں گے کہ کوئی چیز کیونکر حسین بنتی ہے"۔ اس عظیم فنکار اور عالم کا یہ خیال شاید ہمیں مسئلہ جمالیات سے منحرف کر دے۔ پھر بھی ہم اس مسئلہ کی پیروی کریں گے تو محض اس خیال سے کہ فلسفہ میں کوئی بات تیقن سے نہیں کہی جا سکتی۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ فلسفہ اور نفسیات نے اس مسئلہ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہر دل حسن کی پکار سنتا ہے لیکن حسن کی توجیہ چند ہی لوگ کرتے ہیں۔ وحشی لوگوں کو موٹے ہونٹوں اور گہرے زخموں میں حسن نظر آتا ہے۔ یونانیوں کو حسن، شباب اور توازن میں دکھائی دیتا تھا اور رومیوں کے نزدیک تناسب، عظمت اور طاقت کا نام حسن تھا۔ احیائے علم نے اسے رنگ میں دیکھا اور جدید روح کو موسیقی اور رقص میں اس کا جلوہ نظر آیا۔ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں لوگ کسی نہ کسی حسن سے متاثر ہوئے ہیں اور اس کی کھوج میں انہوں نے کئی زندگیاں صرف کر دی ہیں لیکن صرف فلسفیوں نے اس کی فطرت معلوم کرنے اور اس کی طاقت کا راز دریافت کرنے کی کوشش کی

ہے۔

یہ مسئلہ دراصل نفسیات کا مسئلہ ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات نے اسے فلسفہ کے سپرد کر رکھا ہے اور ہر سائنس اپنے ان مسائل کو فلسفہ کے سپرد کر دیتی ہے جنہیں وہ خود حل نہیں کر سکتی (اس لیے اہم ترین مسائل فلسفہ کے ماتحت آتے ہیں اور اس کے پاس بے کیف ہونے کی وجہ جواز کم ہے) جدید سائنس کا تعصب مادیت اس کے تمام واقعات کے مقداری قوانین نے اسے حسن کی طرح کے غیر مرئی حقائق کے متعلق بے بس بنا دیا ہے۔ جب تک کہ حیاتیاتی نظریہ کو نفسیات قبول نہیں کرتی، جمالیات کے مسئلہ کا صحیح مقام متعین نہیں ہو سکتا۔ فی الحال فلسفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ ان معاملات میں دخل دے جن میں سائنس دخل دینے سے ڈرتی ہے اور جب حسن کچھ دیر کے لیے حقیقت کی جگہ لیتا ہے اور حکمت میں ایک گوشہ قبولیت تلاش کرتا ہے تو مابعد الطبیعیات کی سوکھی ہڈیاں کسی قدر لرز اٹھتی ہیں۔

تاہم فلسفیوں نے اس دل فریب مضمون کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور اسے گوشہ گمنامی میں چھوڑ دیا۔ اس میں فطرت پرستی کے کچھ عناصر موجود ہیں جو مذہبی لوگوں کے مزاج کو راس نہیں آتی تھی۔ اس کی نوعیت اس قدر غیر معقول ہے کہ متشکک عقل پرست اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ باؤم گارٹن نے، جو پہلا مفکر تھا، جس نے حسن کی فطرت کو ایک علیحدہ موضوع سمجھ کر اسے جمالیات کا نام دیا، اس نے اسے فلسفہ کے مضامین میں شامل کرنے کی معذرت کی۔ یقیناً اسے اندیشہ تھا کہ نام کو ایک علمی انداز دینے کے باوجود اس کے فلسفہ کے ناظروں کا ذہن اصنام اور حسین عورتوں کی طرف منتقل ہو گا اور اس امکان پر اسے ایک طرح کی شرمندگی سی تھی۔

حتیٰ کہ قدیم یونان میں، جہاں حسن کی تخلیق کثیر و وافر تھی اور وہ محترم بھی سمجھا جاتا تھا اور فلسفی اس کے حسین میلان کی گہرائیوں تک پہنچنے میں ناکام رہے، پائتھاگورس نے جمالیات کا کھیل، موسیقی کو ریاضی کی نسبتوں میں تحلیل کر کے کھیلا اور کائنات کو ایک توازن سے منسوب کیا۔ سقراط سے قبل کے یونانی ڈارون سے پہلے کے سائنس دانوں کی طرح حسن کو طبیعیات اور ریاضی کی اصطلاحوں میں تحلیل کرتے تھے۔ موسیقی ان کے نزدیک اصوات کی ترتیب تھی اور مرئی حسن متناسب نسبتوں کی ترتیب کا دوسرا نام تھا۔

افلاطون، جو بنیادی طور پر ایک ماہر اخلاق تھا (جو اپنے ہموطنوں کے انحطاط کو روکنا چاہتا تھا) دوسری انتہا پر چلا گیا اور اس نے حسن کو نیکی کا مترادف قرار دیا۔ فن اس کے خیال میں اخلاقیات کا ایک حصہ تھا اور موسیقی کے تعلیمی فوائد کے سوا اس کی جنت الارض میں فنون لطیفہ کا دخل کم ہی تھا۔ ارسطو کے فلسفہ میں ہمیں اس سوال کا جواب ملتا ہے۔ حسن، توازن، تناسب اور

ایک مربوط کل میں اجزا کی فطری ترتیب کا نام ہے۔ یہ وہ تصور ہے جو "جزو کے کل سے ربط" کے اس تصور کے ساتھ خوشگوار طور پر ہم آہنگ ہے، جو ہم نے ان ابواب میں بیان کیا ہے اور یہاں ہم کلیہ طرازی کی ترغیب کی مدافعت نہیں کرسکتے۔ لیکن توازن اور تناسب، نظم اور وحدت روح کو کیوں مسرور کرتی ہیں؟ یہ سوال ہمیں ہمارے کلیوں کی زد سے پرے لے جاتا ہے۔

و کلمین اور لیسنگ نے ان جوابوں پر کچھ اضافہ نہ کیا اور اس مسئلہ میں یونانیوں کی اندھا دھند قیادت منظور کرلی۔ حسن و جمال کا مسئلہ مساخت اور ہیئت، ترشے ہوئے سنگ مرمر اور پہاڑوں پر ابھرتے ہوئے مندروں کا مسئلہ رہا۔ اور یہ پارتھینوں اور اس کی آرائشوں کے لیے مخصوص بن گیا۔ یہ حقیقت کہ کوئی صنم کسی گرم اور زندہ حسن کی نقل ہے اور حسن کا راز نقل سے زیادہ اصل میں مضمر ہے، ان درشت اور علمی ذہنوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔

کانٹ اور شوپنہار کے یہاں ایک نئی لے سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن وہ صفت ہے جس کے ذریعے کوئی چیز، اس کے فوائد سے قطع نظر ہمیں پسند آتی ہے۔ جو ہم میں ایک بے عزم تفکر، ایک بے غرض مسرت کو اکساتی ہے۔ اس معروضی اور غیر جانبدار مشاہدہ میں شوپنہار کے نزدیک جمالیاتی اور فنی کمال کے اسرار پنہاں ہیں۔ ذہن کچھ وقت کے لیے آرزو سے آزاد ہو جاتا ہے اور ان افلاطونی اعیان کا شعور پیدا کرتا ہے جو عالمگیر عزم کے خارجی پہلو ہیں۔ لیکن ہیگل ہمیں پھر یونانیوں کی طرف لوٹا کر لے جاتا ہے۔ حسن پھر کثرت میں وحدت، مادہ کی ہیئت کے ذریعے تسخیر اور کسی الہیاتی مقصد کے حسیاتی اظہار میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیا عجب ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ بے کیف کتابیں حسن کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔

۲۔ حیوانوں میں جمالیاتی احساس

ممکن ہے کہ یہ نظریہ سرے سے غلط ہو۔ غالباً حسن، زندگی کا وظیفہ ہے، مادہ اور ہیئت کا نہیں۔ شاید جہاں ریاضی اور طبیعیات ناکام رہے ہوں، حیاتیات ہماری مدد کرے۔

آیئے ہم حیوانوں کا مطالعہ کریں اور احساس حسن کے سرچشمہ تک پہنچیں۔ ہمارا یہ خیال غلط ہے کہ فقط انسان ہی کو جمالیاتی احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ بہت سے حیوان اس بے پر و بال دوپائے سے زیادہ حسین ہیں جو دنیا پر حکومت کرتا ہے اور غالباً وہ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ احساس حسن فقط ہم رکھتے ہیں کیونکہ ہم حسن کو نظر اور بینائی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ حیوانوں میں جمالیاتی لرزش شامہ کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ موسیو برجرٹ کا کتا کہتا ہے: کتے کی بو نہایت لذیذ بو ہے۔ اس کے لیے انسانوں کی بو یقیناً نہایت ناخوشگوار ہوگی۔

تاہم حیوانوں کے لیے حس سماعت میں بھی حسن ہو گا۔ ہمارے بعض چوپائے آباؤ اجداد موسیقی کے لیے خاص حساسیت رکھتے ہیں۔ ہیولاک ایلس لکھتا ہے: "چڑیا گھر میں مختلف حیوانوں پر جو تجربات کیے گئے ہیں، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ سوائے چند سگ ماہیوں کے، کوئی بھی موسیقی کے حس سے بے نیاز نہیں تھا اور سب کے سب کسی بد آہنگ لے کو ناخوشگوار محسوس کرتے تھے۔ ایک شیر جو وائلن سن کر کسی قدر تسکین حاصل کرتا تھا، پکولو سننے پر غضبناک ہو گیا۔ اکثر حیوانوں کو وائلن اور بنسری پسند تھی۔ ایلس کا کتا شوپان کے ایک خواب آسا نغمہ پہ بھونکتا رہا۔ لیکن جب ایک نغمہ شادی بجا تو وہ سو گیا"۔ اور ڈین سوفٹ کہتا ہے: "کیا ایلین ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ لیبیا کی گھوڑیاں موسیقی سن کر گاڑیوں میں جتنے کے لیے تیار ہو جاتی تھیں"۔ (باحیا خواتین کو اس واقعہ سے اوپیرا زیادہ جانے کے خلاف سبق حاصل کرنا چاہیے)

حیوانوں کی آنکھیں بھی حسن کی حساسیت رکھتی ہیں۔ ڈارون کہتا ہے کہ "کچھ پرندے اپنے گھونسلوں کو رنگین پتوں اور گھونگوں، پتھروں اور پروں اور کپڑے کے ان ٹکڑوں سے سجاتے ہیں جو انسانوں کے گھروں میں پائے جاتے ہیں"۔ مرغ فردوس اپنے شریک زندگی کے لیے خاص گھونسلا بناتا ہے جو گھنی جھاڑی سے ڈھکا ہوتا ہے اور اس کے فرش پر گھاس پھونس چنی ہوتی ہے۔ وہ قریبی چشمہ سے سفید کنکر لا کر فنکارانہ طریق پر دو رویہ رکھتا ہے۔ وہ دیواروں کو چمکدار پروں، سرخ بیریوں اور دوسری خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتا ہے۔ آخر میں وہ دروازے کو دریائی صدفیوں اور درخشاں سنگریزوں سے ایک حسن و وقار بخشتا ہے۔ یہ وہ قصر ہے جو مرغ فردوس اپنی محبوبہ کے لیے تیار کرتا ہے۔ بوش کہتا ہے: "صرف ایک مرتبہ اس محل کو دیکھنے سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ حسن و جمال سے لطف اندوز ہونا اس پرندے کی فطرت میں داخل ہے"۔ کچھ پرندے اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ آئینہ کو سورج کی روشنی سے چمکائیے تو بہت سے چکاوک جمع ہو جائیں گے۔ باوجود گولیوں کی بوچھاڑ کے، یہ پرندے اندھی آرزو سے متوالے ہو کر اس کی جانب بڑھیں گے۔ مینا، پہاڑی کوا اور دوسرے پرندے، چمکدار اشیاء چاندی اور جواہرات چراتے ہیں۔ خودپسندی، تجسس یا ہوس--- کون انہیں اس حرکت پر مجبور کرتے ہیں، کوئی نہیں جانتا۔ لیکن مردہ چیزوں میں حسن دیکھنے کی صلاحیت صرف چند جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان کا جمالیاتی شعور معمولی اور ثانوی ہوتا ہے۔ اس حساس فکرمندی کے مقابلہ میں جو نر مادہ کے سامنے عہد تناسل میں خودنمائی کے لیے ظاہر کرتا ہے، ڈارون کہتا ہے "اکثر حیوانوں میں احساس حسن صرف جنس مخالف کی کشش تک ہی محدود ہوتا ہے"۔

ہمارے مطالعہ کے لیے اس منکسر المزاج سائنس دان کا یہ سادہ قول نہایت مفید ہے۔ اگر

ڈارون صحیح کہتا ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ احساس حسن، جنسی کشش سے پیدا ہوتا ہے۔ حسین چیز وہ ہے جسے ہم جنسی طور پر پسند کریں اور اگر دوسری چیزیں ہمیں حسین معلوم ہوں تو وہ محض ثانوی طور پر اور جمالیاتی احساس کے اس سرچشمہ سے وابستگی کی بنا پر حسین معلوم ہوتی ہیں۔ جب شوپنہار اپنے مضمون "حسین کی مابعد الطبیعیات" میں اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے "حسین چیز سے لذت اندوز ہونا عزم سے تعلق کے بغیر کیونکر ممکن ہے؟" اس کا جواب ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ حسین چیز پوشیدہ طور پر ہمارے عزم سے وابستہ ہے اور شوپنہار کے اپنے مفروضوں کے مطابق فرد میں بنیادی عزم 'عزم تناسل ہے۔

۳- بنیادی حسن- اشخاص

سب سے پہلے کوئی چیز اس لیے حسین ہے کہ ہم اس کی آرزو کرتے ہیں۔ ہم کسی چیز کی اس لیے آرزو نہیں کرتے کہ وہ حسین ہے بلکہ ہم اسے اس لیے حسین سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ہماری آرزو کا مقصد ہے۔

کوئی چیز جو ہماری فطرت کے کسی اساسی احتیاج کو پورا کرتی ہے' اس میں جمالیاتی حظ دینے کے امکانات موجود ہیں۔ بھوکے انسان کے لیے کھانے کا ایک طشت اسی قدر حسین ہے جتنی کہ ایک خوش خور طالب علم کے لیے ایک بالغ عورت۔ طالب علم کو ذرا بھوکا رکھئے تو حسین سے حسین عورت کے لیے اس کا ذوق بھی کند ہو جائے گا۔ وہ اسے صرف کھانے کی ایک چیز سمجھے گا۔ (یہ بنیادی بھوک ہمیشہ ہماری محبت میں قائم رہتی ہے) اس مصنف کے لیے جس نے کئی برس اپنی تصنیف کے چھپنے کی آرزو کی ہو' اس کی پہلی شائع شدہ تصنیف اسے اس قدر حسین معلوم ہوگی کہ کوئی ذہین قوم اسے ضائع کرنا گوارا نہیں کرے گی۔ لیکن ایک کسان یا کارندے کے لیے جو کتابیں لکھنے سے زیادہ صحت مند آرزوئیں رکھتا ہے' یہی صفحہ اس ردی کاغذ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس سے وہ اپنا استرا صاف کر سکتا ہے۔ حسین چیز وہ ہے جو اپنے ادنیٰ مظاہر میں اس چیز کا حیاتی پہلو ہے جو ہماری کسی قوی آرزو کی تسکین کرتی ہے۔ درحقیقت وہ مفید چیز سے محض شدت حاجت میں مختلف ہے۔

نیطشے نے کہا تھا کہ حسین اور قبیح حیاتیاتی تصورات ہیں۔ جو چیز نسل کے لیے مضر رہی ہے بدصورت ہے۔ ہم شکر اس لیے نہیں کھاتے کہ وہ میٹھی ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ہمیں طاقت کا ایک اہم ماخذ ملتا ہے۔ تمام مفید چیزیں کچھ وقت کے بعد حسین بن جاتی ہیں۔ مشرقی ایشیا کے لوگوں کو گلی سڑی مچھلی پسند ہے اس لیے کہ یہ واحد غذا ہے جس میں انہیں نائٹروجن ملتی ہے۔ سدرلینڈ

کہتا ہے کہ "آسمان اس لیے نیلا نہیں کہ ہماری آنکھوں کو خوشگوار معلوم ہو لیکن ہماری آنکھیں آسمان کی نیلاہٹ سے خوگر ہو کر اسے پسند کرنے لگی ہیں۔ تمام ہیئتیں اور رنگ ہمیں اسی قدر لذت پہنچاتے ہیں، جس قدر کہ وہ ہماری نسل کے تجربہ میں عام ہو چکے ہوں۔ سبز گھاس اور نیلا آسمان حسین ہیں لیکن عادت ایک سبز آسمان اور نیلی گھاس کو بھی ہمارے لیے پسندیدہ بنا سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ حسن، افادہ کے برعکس تسکین کی شدت سے وابستہ ہے جو آرزو کی شدت کی آئینہ دار ہے۔ کنجوس کے لیے مال و زر مفید نہیں، حسین ہیں۔ ہر وہ چیز حسین ہے جو شخصیت کو متحرک اور توانا بنائے۔ اسی لیے روشنی، ترنم اور نرم لمس حسین ہیں۔ بدصورتی ہماری توانائی کو کم اور ہمارے ہاضمہ اور اعصاب کو خراب کرتی ہے، کراہیت پیدا کرتی ہے، دانت کھٹے کرتی ہے یا شاعروں کو انقلاب کی دعوت دیتی ہے۔ سنتیانا کہتا ہے کہ حسن لذت معروضی ہے یا جیسا کہ سٹینڈ حال نے غیر شعوری طور پر ہابز کی پیروی میں کہا تھا کہ "حسن لذت کا امکان ہے"۔

جس طرح قوموں میں فن افراط دولت اور بیکار طبقہ کی نمود کے بعد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح فرد میں بھی فن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اسے بھوک نہیں ستاتی اور جنسی تحریک بڑھ جاتی ہے۔ اس کا وفور احساس حسن میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارا احساس حسن ہماری جنسی قوت کے ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے۔ محبت اسی قدر حسن کی تخلیق کرتی ہے جس قدر کہ حسن محبت کی تخلیق کرتا ہے۔ ہر عاشق اپنی محبوبہ کو حسین ترین عورت سمجھتا ہے۔ ڈی گورمونٹ کہتا ہے "ایک بھدے مینڈک سے پوچھئے کہ حسن کیا ہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ میری مادہ جس کی دو گول آنکھیں اس کے ننھے سر سے نکلی ہوتی ہیں، جس کا منہ چپٹا، پیٹ زرد اور پیٹھ بھوری ہے"۔

حسن اس قدر واضح طور پر محبت سے متعلق ہے کہ وہ جنس انسانی میں جسم کے ان حصوں پر مبنی ہے جن کی حیثیت ثانوی جنسی صفحات کی ہے--- مثلاً سینہ، بال، کولہے، جسم کے دل آویز خطوط اور نرم و گداز آواز۔ اپنے مردوں کی نظر میں زیادہ دل آویز بننے کے لیے ادنیٰ نسل کی عورتیں مصنوعی طور پر ان حصوں کو بڑھا دیتی ہیں اور اعلیٰ نسل کے لوگ کچھ عرصہ کے لیے اخفا کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اخفا، مبالغہ کی طرح موثر ثابت ہوتا ہے۔ لباس پہننا (حیا کی طرح) حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت کی ایک صورت ہے اور مدافعت آرزو کو بھڑکاتی ہے۔ سنتیانا کہتا ہے کہ "دیویاں اپنا لباس نہیں اتار سکتیں کیونکہ ان کی صفات ہی ان کی ذات ہوتی ہیں"۔ غالباً سنتیانا نے محتاط انداز میں یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ جدید، مہذب اور تخیلی زمانہ میں لباس حسن کے لیے لازمی ہے۔

ہماری نسل کے لیے عورت کا حسن، حسن کی بہترین صورت ہے جو دوسری صورتوں کا

سرچشمہ اور معیار ہے۔ تائیس میں پاپنوچے کا تصور اس سے کہتا ہے "میں عورت کا حسن ہوں۔ بے وقوف، تو مجھ سے بھاگ کر کہاں جائے گا؟ تو میری مثال پھولوں کی تب و تاب میں، کھجور کے درختوں کے کیف اور حسن میں، کبوتروں کی پرواز، غزالوں کی لپک، ندیوں کی لہروں اور چاند کی نرم اور لطیف روشنی میں دیکھے گا۔ اگر تو آنکھیں بند کر لے تو مجھے تو اپنے اندر پائے گا"۔

اگر یونانی معیار اور محرکات غالب رہتے تو مرد کا حسن ہمارے جمالیاتی شعور پر متسلط رہتا۔ یونانی دوستی یونانی محبت پر غالب تھی۔ اسپارٹا اور ایتھنز میں حسن کا آدرش خوبصورت اور بہادر جوان تھا۔ اس لیے یونانی آرٹ کامل مرد کی رفعت کا آئینہ دار تھا اور اس میں کھیل کے میدان کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن ہمارا احساس حسن ہمارے دلوں اور زندگیوں پر عورت کے غلبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر کبھی کبھی مرد کا حسن ہمیں اس زمانہ میں بھی متاثر کرتا ہے تو وہ اس لیے کہ محبت کا وہ عنصر تقویت پکڑے جس کا اظہار دوستی کے رابطہ میں ہوتا ہے۔

عورت حسن کا سرچشمہ اور معیار اس لیے بنتی ہے کہ اس کے لیے مرد کی محبت، عورت کی مرد سے محبت کے مقابلہ میں زیادہ گہری اور مختصر ہوتی ہے اور مرد کی آرزو کی شدت عورت کے بے پناہ حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ عورت مرد کے اس تصور کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ مرد سے زیادہ حسین ہے اور چونکہ وہ ملکیت پانے سے زیادہ محبوب بننے کی خواہش مند ہے، اس لیے وہ اپنے اندر ان پرکشش صفات کو اجاگر کرتی ہے جو آرزو کو تند و تیز بناتی ہیں۔ نیز یہ کہ عورت مرد میں حسن تلاش نہیں کرتی اور نہ اپنے محبوب میں اس کا تصور کرتی ہے۔ وہ اس میں طاقت اور بچوں کے تحفظ کی صلاحیت ڈھونڈتی ہے اور یہ قابلیت کہ وہ دنیا کے خزانے اس کے قدموں میں لا ڈالے۔

حسن کی آرزو سے وابستگی کی ایک عمدہ علامت یہ ہے کہ جب محبوب چیز حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے حسن کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ بہت کم مرد اس فلسفیانہ صفت کے مالک ہوتے ہیں کہ اس چیز کو بھی چاہیں جو ان کے پاس موجود ہے اور اس سے بھی کم لوگ اس چیز میں حسن پاتے ہیں جو آرزو کو متحرک نہیں کرتی۔ اکثر زندگیاں یونہی بسر ہوتی ہیں۔ تاہم اگر موت ہم سے ہمارے شریک زندگی چھین لے یا کوئی زندہ دل جوان ہماری ملکیت پر غاصبانہ نظریں ڈالے تو آرزو پھر سے بھڑک اٹھے گی اور مردہ حسن کو جلا دے گی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی چہرہ جو ہمارے لیے بے کیف ہو چکا ہے کسی اور شخص کی آنکھوں کے لیے، جو تواتر اور اعادہ سے تھک نہ چکی ہوں، رومان و شعریت کا مجسمہ بن سکتا ہے۔ خدا ہمیں یہ صلاحیت عطا کرے کہ ہم اپنے شریک زندگی کو اس طرح دیکھ سکیں جس طرح دوسرے انہیں دیکھتے ہیں۔

۴۔ ثانوی حسن۔ فطرت

محبت، حسن کی ماں ہے اس کا بچہ نہیں۔ وہ چیزوں کے نہیں، انسانوں کے اساسی حسن کی واحد ماخذ ہے۔ لیکن ہم ان لاکھوں چیزوں کے حسن کی کیونکر توجیہ کر سکتے ہیں جو ہمیں حسین معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا محبت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؟ ہم خارجی دنیا کے بے پناہ حسن کی وضاحت کیونکر کریں؟

جس طرح ہماری لغات میں بعض الفاظ کے معنی اساسی اور بعض کے ثانوی ہوتے ہیں، اسی طرح ہر جبلت کے بنیادی اور ثانوی مقاصد اور لذات ہوتی ہیں۔ غذا حاصل کرنے کی جبلت ملکیت کی عام جبلت بن جاتی ہے، جو ہر باقدر چیز کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ غذا یا محبوب کے لیے لڑنے کی جبلت ایک عام جبلت پیکار بن جاتی ہے، جس میں لڑنا آپ اپنا انعام ہے۔ اس طرح جمالیاتی جذبہ بھی محبوب سے محبوب کے ساتھ متعلق چیزوں، اس کی عادات و اطوار، اس کے قول و فعل کے انداز اور اس کی مملوکہ اور مشابہ چیزوں پر پھیل جاتا ہے۔ تمام دنیا محبوب کے حسن میں شرکت کرنے لگتی ہے۔

ان چیزوں پر غور کرو جو ہمارے لمس کو حسین معلوم ہوتی ہیں۔ مدور چیزیں، نرم اور ملائم چیزیں، خمیدہ چیزیں، یہ ہمیں کیوں لذت دیتی ہیں؟ کیا محض اس لیے کہ وہ مدور، ملائم یا خمیدہ ہیں؟ اور ایک مربع بعض اذہان کے لیے حسین ہو سکتا ہے جس طرح ارسطو کے لیے وہ عدل کی علامت تھا، یا کیا ہم مدور اور خمیدہ اور ملائم اشیا کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ ہمیں محبوب جنس کے جسمانی خطوط کی یاد دلاتے ہیں۔

ذرا حسن شامہ پر غور کرو۔ ہم صاف جسموں کی پاکیزگی، پھولوں کی خوشبو یا خوشبو کی مستی سے کیوں لذت اندوز ہوتے ہیں؟ کیا اس لیے کہ جنسی انتخاب پہلے شامہ کے ذریعہ کام کرتا تھا؟ پھول پودوں کے تناسلی عناصر کو محفوظ رکھتے ہیں اور ہماری محبوب خوشبوئیں (ترکیبی کیمیا کے وجود سے پہلے) بعض قربانی کے جانوروں کے اعضائے تناسل سے بنتی ہیں۔ ہر عورت دلوں کو مسخر کرنے والی خوشبوئیں استعمال کرنے کے فن سے واقف ہے۔

ذرا حسن سامعہ پر غور کرو۔ ہمارا حسن صوت کا تصور دراصل محبوب کی آواز اور نغمہ سے پیدا ہوا ہے۔ "عورت میں نرم آواز ایک نہایت حسین شے ہے" اور اس کے دیدار سے زیادہ خوش آئند اور جاذب ہو سکتا ہے۔ ایک درشت آواز سے کسی سڈول جسم کی جاذبیت آدھی رہ جاتی ہے۔ مانٹے گازا کہتا ہے کہ کچھ عورتوں کی آوازیں نہایت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عورت بقول ایلس ایک باریشن نر آواز کو پسند کرتی ہے کیونکہ بالعموم وہ حسن سے زیادہ طاقت کو پسند

کرتی ہے اور مرد کی پر شوکت آواز، جو کہ قوت کے جنسی انتخاب سے پیدا ہوئی ہے، تحفظ اور فراوانی کی ضامن ہے۔

ممکن ہے کہ آواز ابتدا میں جنس کی پکار ہو۔ ایک حساس کان مینڈکوں کے ٹرانے اور پرندوں کے چہچہانے میں، ہومر کی شاعری کی متنوع موجیں اور شیکسپئر کے تصور کے سمندر سن سکتا ہے۔ آواز سے نغمہ پیدا ہوا جو لازمی طور پر محبت سے وابستہ ہے (اگرچہ مذہب اور جنگ نے اسے کسی قدر چرالیا ہے) نغمہ سے رقص پیدا ہوا جو کہ محبت کی ایک رسم ہے اور نغمہ و رقص نے موسیقی سے جنم لیا۔

اس عشقیہ ابتدا سے موسیقی دور دراز تک پھیل گئی اور ابھی تک وہ اپنے سرچشمہ سے وابستہ ہے اور کوئی لڑکی اس کے بغیر محبت نہیں کر سکتی۔ وہ لڑکی جو موسیقی کے ذریعہ اظہار محبت کرتی ہے، شادی کے بعد چند برس تک پیانو کے قریب نہیں پھٹکتی۔ جب ایک حیوان مسخر ہو چکا ہو تو اسے اور مسحور کرنے سے کیا فائدہ؟ مرد جو اپنی محبوبہ کے سامنے بلند آواز سے گیت گاتا تھا، شادی کی کڑی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر اپنی موسیقی کی صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور محض مجبوراً سڑے ونسکی، شوئن برگ اور رچرڈ سڑاؤس کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔

لیکن فقط محبت حسن سامعہ کے ان پہلوؤں کی توجیہ نہیں کر سکتی۔ ترنم کی لذت ایک خود مختار عنصر ہے۔ تنفس کی آمد و رفت، دل کی دھڑکن، حتیٰ کہ جسم کا دو طرفہ توازن ہمیں آواز کے مترنم زیر و بم کی طرف مائل کرتا ہے اور صرف جذبہ محبت ہی نہیں بلکہ ساری روح اس سے تسکین پاتی ہے۔ ہم گھڑی کی "ٹک ٹک" اور قدموں کی باقاعدہ چاپ میں ترنم تلاش کر لیتے ہیں۔ ہم جھولنے، رقص، شعر، بازگردانی اور صنعت تضاد سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔

موسیقی اپنے ترنم سے ہماری ڈھارس بندھاتی ہے اور اپنے فراز میں ہمیں ان دنیاؤں میں لے جاتی ہے جو اس دنیا سے کم ظالم ہیں۔ یہ دکھ کو دور کر سکتی ہے، ہاضمہ کو بہتر بنا سکتی ہے، محبت کی تحریک کر سکتی ہے اور مفرور دیوانوں کو پکڑنے میں مدد دے سکتی ہے۔ اس کے ذریعہ پیراگوے کے یسوعیوں نے انڈین غلاموں کے کام میں اضافہ کیا اور اس کی تلخی کو کم کر دیا۔ اس کے ذریعہ ایک سپاہی ایک مترنم تسکین کے ساتھ موت کے منہ میں جا سکتا ہے۔ ہائیڈین نے کسی جرنیل سے زیادہ ہپس برگ خاندان کی خدمت کی اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ زار روس کی فوجوں کی ہمت ان کے عظیم قومی ترانے کی کس قدر رہین منت تھی۔ تھورو کا خیال تھا کہ موسیقی سے زیادہ انقلاب آفریں کوئی چیز نہیں اور وہ حیران تھا کہ ہمارے دوسرے ادارے اس کی کیونکر تاب لا سکتے ہیں۔ تھورو ایک انقلابی تھا۔ موسیقی ہمیں انفعال کی کیفیت میں ڈھال سکتی ہے یا عمل پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ٹالسٹائے

نے گورکی سے کہا تھا: جہاں تم غلام رکھنا چاہو وہاں تمہیں زیادہ سے زیادہ موسیقی بہم پہنچانی چاہیے۔ کیونکہ موسیقی ذہن کو کند کر دیتی ہے۔ یہ بوڑھا روسی پیورتن افلاطون سے قطعی اتفاق کرتا، جس کی جنت الارض میں کوئی شخص سولہ برس کی عمر کے بعد موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر میں ذرا حسن بصارت پر غور کرو۔ جب انسان نے قد استوار پایا تو شامہ نے اپنی طاقت اور قیادت کھو دی اور بصارت نے جلدی ہی جمالیاتی احساس پر غلبہ پا لیا۔ حسن بصارت بھی حسن سامعہ کی طرح ایک محبوب عورت کے حسن سے بہت دور ہے اور ہم پھر مسئلہ جمالیات کے مرکز پر پہنچ گئے ہیں۔ خمیدہ خطوط توازن و تناسب اور کثرت میں وحدت، شخصی حسن کا سبب ہیں یا نتیجہ؟ وہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں یا ثانوی؟ کیا ہم عورت سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ وہ توازن، وحدت اور ہر پرکشش رنگ کا مجسمہ ہے؟ یا یہ صفات جہاں بھی ہم انہیں دیکھیں، ہمیں اس لیے متاثر کرتی ہیں کہ یہ ہمیں زن کامل کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ "اس عورت کی گردن بطخ کی مانند ہے" اور اس طرح ہم بطخ کو حسن کا معیار بنا دیتے ہیں۔ غالباً شروع میں ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بطخ کی گردن ایک حسین عورت کی گردن کی مانند ہے۔ حسین چیز وہ ہے جس سے محبت کی جائے۔ غالباً فن کا سرچشمہ حیوان یا انسان کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان رنگوں کی نقالی کرتے ہیں جو قدرت زمانہ تناسل میں طائر و حیوان میں پیدا کرتی ہے اور جو محبوب کی نظروں کے سامنے چمکتے دمکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، پرندہ اپنے گھونسلے کو آبدار چیزوں سے سجاتا ہے اور مرد اپنے جسم کو روشن رنگوں سے آراستہ کرتا ہے جو آرزو کو بھڑکاتے ہیں۔ جب لباس پہننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو رنگ جسم سے منتقل ہو کر لباس پر آ گئے، لیکن ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ نظروں کو اپنی طرف کھینچیں، اور سرخ رنگ ایک ایسا رنگ تھا جو خون میں سب سے زیادہ حرکت پیدا کرتا تھا۔ اس طرح نغمہ اور رقص، موسیقی اور بت تراشی کی قسمیں محبت سے پیدا ہوتی ہیں۔ بت تراشی ایک ایسا فن ہے جو خود مختار معلوم ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ اس کی جاذبیت کا راز حسن میں نہیں بلکہ رفعت میں مضمر ہے۔

رفعت کا حسن سے وہی تعلق ہے جو نر کا مادہ سے ہے۔ اس کی لذت عورت کے محبوب جمال سے نہیں بلکہ مرد کی ممدوح توانائی سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت غالباً رفعت سے زیادہ متاثر ہوتی ہے اور مرد حسن سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ وہ اسے استعمال کرنے میں زیادہ تیز، اس کی آرزو کرنے میں زیادہ شدید اور اسے تخلیق کرنے میں زیادہ مستقل مزاج ہے۔ جیسا کہ برک نے ہمیں بتایا ہے: رفعت، ایک محفوظ شخص کے لیے زیادہ خطرناک اور طاقتور ہوتی ہے۔ ہنی بال اور سیزر نے ایلپس

کی رفعت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ان کے لیے ان کی حیثیت منظر حسن کی نہیں، مجسمہ دہشت کی تھی۔ ان کی اس مردانہ بے نیازی سے روسو کی نسائی حساسیت کا مقابلہ کیجیے جس نے جدید انسان کی روح کے لیے ا یلپس کو دریافت کیا۔ اسے ان ویران بلندیوں پر فوجیں نہیں چڑھانا تھیں۔ غالباً (جیسا کہ سرجی کہتا ہے) یونانیوں نے فطرت کی مصوری اس لیے نہیں کی کہ فطرت ان کے لیے ایک خطرہ تھی، جسے وہ بے نیاز ہو کر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

مناظر فطرت کی تحسین میں حسن سرچشمہ محبت سے بہت دور جا نکلتا ہے۔ مناظر فطرت کو دیکھنے سے ہمیں جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ مردانہ رفعت کی وجہ سے ہے لیکن اس میں سے بیشتر اس مطمئن حسن سے پیدا ہوتی ہے جو کسی حسینہ کی آغوش میں پر خروش سکون سے مشابہ ہے۔ ذرا کورو کو دیکھیے۔ سرسبز لہلہاتے کھیت، سایہ دار شاہ بلوط اور وہ ندیاں جو جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے خراماں ہیں۔ اس فطری لذت میں عورت کا حسن کہاں پنہاں ہے؟

ہمیں ایک ایسا کلیہ تلاش کرنے کی فکر نہیں کرنی چاہیے جو ساری دنیا پر حاوی ہو۔ فطرت ان کلیوں سے متنفر ہے جو اس کے غیر محدود تنوع کو نظرانداز کرتے ہیں۔ فطرت ہمارے عالمگیر اصولوں کی ہزاروں اشتنائیں دکھا سکتی ہے۔ ہمیں صرف اسی بات پر مطمئن ہو جانا چاہیے کہ کوئی احساس جو دراصل جنسی ہو، ان چیزوں پر پھیل سکتا ہے جو محبت سے قطعی طور پر غیر متعلق ہیں۔ جنس کی بڑھتی ہوئی توانائی اپنے وفود کو دیدار منظر میں صرف کر سکتی ہے۔ جس طرح وہ مذہب، دوستی، اجتماعی عینیت اور فن کی آبیاری کرتی ہے۔

لیکن یہاں بھی ہمیں باریک رشتے ملیں گے۔ ایک بچہ زمین اور آسمان کے حسن سے متاثر نہیں ہوتا، محض نقل اور تعلیم کے ذریعہ ان سے لذت اندوز ہوتا ہے۔ لیکن جب محبت روح کو گرماتی ہے تو ہر قدرتی چیز حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ عاشق، درختوں، ندیوں اور تابناک سویروں پر اپنی محبت اور مسرت کو صرف کرتا ہے۔ پھول ہر قدرتی چیز سے زیادہ حسین ہیں اور یہی پھول تناسل کے ذرائع اور علائم ہیں اور مردوں میں نرمی اور سپردگی کی نشانیاں۔ جب عمر ہمیں تواتر سے بے کیف بنا دیتی ہے اور جذبہ محبت مردہ ہو جاتا ہے تو فطرت کے دیدار کی لذت بھی ختم ہو جاتی ہے اور زیادہ معمر لوگ زیادہ کم عمر لوگوں کی طرح جنگلوں کے رنگ و بو سے، ستاروں کی خوش آئند شوکت سے اور ابھرتے سمندر کی بے باک موجوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ارض و سما کے ہر حسن پر جنس کے دیوتا کے نقش قدم ثبت نظر آتے ہیں۔

۵- حسن ثالث- فن

حسن کا وفور، جو اشخاص سے اشیا تک پھیلتا ہے اور ہماری سرزمین کو حسین بناتا ہے، آخر کار فن کی شورش تخلیق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مرد حسن سے آشنا ہو کر اس کے تصور کو حافظہ میں رکھتا ہے اور بہت سی دیکھی ہوئی حسین چیزوں کو ملا کر ایک عینی حسن کی تخلیق کرتا ہے جس سے اس کا ادھورا کمال ایک واحد نظر میں منسلک ہوتا ہے۔

حیاتیاتی نقطۂ نظر سے فن حیوانوں کے عہد تناسل کے رقص و نغمہ سے پیدا ہوتا ہے اور ان کی رنگ و ہیئت کے وفور کی کوششوں سے جنم لیتا ہے جن سے قدرت محبت کے موسم کو مالا مال کرتی ہے۔ جب مرغ فردوس نے اپنی محبوبہ کے لیے گھونسلا بنایا تو فن پیدا ہوا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے فن صناعانہ مصوری، لباس اور وحشی قبائل میں جسم کو مجروح کرنے کی رسم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ گروس کہتا ہے کہ آسٹریلیا کے وحشی جہاں جاتے ہیں، اپنے ساتھ بوری میں سفید، سرخ اور زرد رنگ رکھتے ہیں۔ عام دنوں میں وہ گالوں پر ہلکے رنگ لگاتے ہیں اور زمانہ جنگ میں وہ اپنے بدن پر بے طرح رنگ مل کر انہیں عجیب و غریب شکلیں دیتے ہیں تاکہ دشمن خوف زدہ ہو جائے۔ تہواروں اور محبت کے موقعوں پر وہ اپنے سارے جسم پر رنگ ملتے ہیں تاکہ لڑکیاں ان کی طرف متوجہ ہوں۔ جنگ اور محبت دونوں کھیلوں کے لیے سرخ محبوب رنگ ہے۔ کچھ قبیلے اسے اس قدر پسند کرتے ہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے سفر کی سخت صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ مرد عورتوں سے زیادہ اپنے جسموں پر رنگ ملتے ہیں اور بعض علاقوں میں غیر شادی شدہ عورتوں کو گردنوں پر رنگ ملنے کی ممانعت ہے۔

لیکن رنگ ڈھل جاتا ہے اور وحشی یونانیوں کی طرح (جو رنگ کے جلدی مٹ جانے کی وجہ سے مصوری کو تضحیک کی نظر سے دیکھتے تھے) کوئی زیادہ مستقل فن ڈھونڈتے ہیں۔ وہ جسم کو گودنا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ جسم اور جلد کو کاٹ کر زخم میں مٹی بھر کر اسے پھیلا دیتے ہیں۔ ٹورز سٹریٹس میں مرد اپنے کندھوں کو زخمی کر لیتے ہیں۔ ان سب سے زیادہ خطرناک فن کانوں اور نچلے ہونٹوں کو چھیدنے کا ہے۔ بوٹوکیوڈو قبیلہ کا نام بٹوک سے اخذ ہوا ہے جس کے معنی ہیں "میخ"۔ جو اوائل شباب کانوں اور نچلے ہونٹوں میں چھیدی جاتی ہے اور کبھی کبھی یہ میخیں خاصی موٹی ہوتی ہیں، حتی کہ ان کا بنایا ہوا چھید چار انچ قطر تک کا ہو جاتا ہے۔ مہذب عورتوں کے سامنے جب اس بربریت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہ دہشت سے اپنے کانوں کے آویزے ہلانے لگتی ہیں۔

لباس کا اولین مصرف افادی نہیں جمالیاتی تھا۔ جب ڈارون نے ایک ٹھٹھرتے ہوئے فیوجین پر ترس کھا کر اسے اوڑھنے کے لیے ایک سرخ کپڑا دیا تو اس نے نہایت خوشی سے اس قیمتی

کپڑے کے کئی ٹکڑے کر کے انہیں اپنے دوستوں میں بانٹ دیا۔ اس کے دوستوں نے ان ٹکڑوں کو آرائش کے طور پر اپنے جسم پر باندھ لیا۔ حسن کے لیے افادہ کی اس قربانی سے موجودہ زمانہ کی لڑکی کس قدر قریب ہے، جو گرمیوں میں پشمینہ پہنتی ہے اور سردیوں میں بیباکی سے اپنی گردن برہنہ رکھتی ہے۔

اپنے جسم کو خوب آراستہ کرنے کے بعد وحشی انسان نے چیزوں کی ترصیع شروع کی۔ دشمن کو ڈرانے کے لیے اس نے ایکیلیز کی ڈھال کی طرح اپنے اسلحہ کو رنگین بنایا، پتھر کے اوزاروں پر نقش و نگار کیے جو آج تک موجود ہیں۔ غاروں کی دیواروں پر ان حیوانوں کی تصویریں کھینچیں جن کا وہ شکار کرنا چاہتا تھا یا جن کی وہ پرستش کرتا تھا۔

مذہب نے، اگرچہ وہ حسن کا سرچشمہ نہیں ہے، فنون کی نشوونما میں محبت کے بعد سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، بت تراشی ان کے کھردرے میناروں کی تعمیر سے شروع ہوئی جو قبروں کی شناخت کے لیے بنائے جاتے تھے۔ فن کے ارتقا کے ساتھ مینار کے بالائی حصے کو سر کی شکل دی گئی۔ اس کے بعد سارے مینار کو انسان کی سی ہیئت میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد صبر اور استقلال کے اضافہ سے بت تراش نے اپنی تخلیق کو زیادہ حسین بنانے کی کوشش کی اور اس دیوتا کی ان صفات کو اجاگر کرنے لگا جنہیں وہ غیر فانی بنانا چاہتا تھا۔ صرف اعلیٰ درجہ کی بت تراشی میں محبت کارفرما ہوتی ہے۔

فن تعمیر قبروں کی تعمیر سے شروع ہوا۔ دنیا کی سب سے قدیم تعمیرات اہرام مصر قبریں ہیں۔ کلیسا شروع میں مقبرے تھے جہاں مرے ہوئے بزرگوں کی پرستش ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مردوں کو عمارت کے ساتھ میدان میں دفن کیا جانے لگا۔ لیکن آج بھی ویسٹ منسٹر ایبے میں پرانے بزرگوں کی قبریں کلیسا کی عمارت کے اندر ہیں۔ اس ابتدا سے وہ عظیم الشان مندر پیدا ہوئے جو یونانیوں نے پیلازا تھین اور دوسرے دیوتاؤں کے اعزاز میں تعمیر کیے تھے اور اسی قسم کی ابتدا سے انسان کی وہ حسین ترین تخلیقات یعنی گاتھی کلیسا، جو مقدس بزرگوں کے مقبرے ہیں۔

تمثیل کا سرچشمہ مذہبی رسوم اور تہوار ہیں۔ مسٹنگک یوریڈیز کے وقت تک تمثیل کو ایتھنز یں ایک مقدس چیز سمجھا جاتا تھا اور جدید تمثیل، جس کی نوعیت جدید فنون میں سب سے زیادہ غیر ہبی ہے، نماز عشائے ربانی اور ان مقدس رسوم سے پیدا ہوئی جو زمانہ وسطی میں مسیح کی زندگی اور وت کی عکاسی کرتی تھیں۔ کلیساؤں کی ترصیع میں بت تراشی نے ایک نئی شوکت اور رفعت حاصل ی اور مصوری مسیحیت کے زیر اثر اوج کمال پر پہنچی۔

لیکن مذہب کی خدمت میں بھی فن محبت سے اپنے خفیہ تعلق کا اظہار کرتا رہا۔ احیائے

علوم کے عہد کی مقدس ترین تصویروں میں حسین جسم کی پرستش کا عنصر بھی شامل ہے۔ جب احیائے علوم روما سے وینس پہنچا تو فطرت پرستی کا عنصر غالب آیا اور مقدس محبت کی جگہ غیر مقدس محبت نے لے لی۔

جس طرح مذہبی فن خدائے جنس سے طاقت حاصل کرتا ہے، اسی طرح تخلیق حسن کا ہر عنصر خدائے جنس کا رہین منت ہے۔ ترنم فوراً محبت سے وابستہ ہو کر نغمہ، رقص اور شاعری کی تخلیق کرتا ہے۔ نقالی، فن تعمیر اور مصوری کی نشوونما میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن محبت ہی اس چیز کا انتخاب کرتی ہے جس کی ہم نقل کرتے ہیں۔ ترنم اور نقل کو جذبہ محبت میں سمو دو تو تمہیں بیشتر ادب کی توجیہ مل جائے گی، حتیٰ کہ ڈانٹے کا کبریائی نغمہ، جو بظاہر انسانی زندگی کا تمثیلی بیان ہے، در حقیقت ایک نغمہ محبت ہے۔

جنسی توانائی کا یہ زیر زمین سمندر فنکار کے تخلیقی جذبہ کی آبیاری کرتا ہے۔ بعض فنکاروں میں یہ تعلق جنس اور فن کے بیک وقت بلوغ میں ظاہر ہوتا ہے اور اس اتحاد سے رومانی قسم کا جینئس پیدا ہوتا ہے۔ سفو، سکندر اور لیوکر۔ٹس، بائرن، شیلے، کیٹس اور سون برن، ہیوگو، روسو اور ورلین، پٹراک، برونو اور گیور جیون، شلر، ہائنے اور پو، شومن، شوبرٹ اور اور شوپین، سٹیرنڈ برگ، آرٹزی بیشیف اور چیئوکوسکی وہ لوگ ہیں جن میں تخیل عقل پر حاوی ہوتا ہے اور جن میں جنس اور فن ایک ہی سرچشمہ سے پر خروش توانائی حاصل کر کے فنکار کو ختم کر دیتے ہیں اور اس کی جوانی کے خاتمہ سے پہلے ہی اسے جسمانی اور روحانی طور پر مردہ چھوڑ جاتے ہیں۔ چونکہ آرزو، ان میں ایک مستقل اندوہ کی صورت اختیار کرتی ہے، وہ حساس، جذباتی، خوگر الم اور بے طرح تخیل پرست ہوتے ہیں۔ عجیب و غریب اور نادر چیزیں ان کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہیں۔ یہ لوگ محبت کی شاعری، مصوری، موسیقی اور فلسفہ پیدا کرتے ہیں اور ہر عاشق ان کی تخلیقات کی پرستش کرتا ہے۔

لیکن دوسرے فنکاروں میں جنس کا سیلاب سراسر تخلیق کی راہ اختیار کرتا ہے۔ محبت اپنی طاقت کھو دیتی ہے۔ جذبات قابو میں آجاتے ہیں۔ عقل پھلتی پھولتی ہے اور ذہن ہر چیز پر چھا جاتا ہے۔ اس عظیم ارتفاع سے کلاسیکی جینئس پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً سقراط، سفو کلیس، ارسطو، ارشمیدس، سیزر، گیلیلو، گیوٹو، لیونارڈو، ٹیشین، بیکن، ملٹن، نیوٹن، ہویز، باخ، کانٹ، گوئٹے، ہیگل، ترجینیف، فلابیئر رینان، اناطول فرانس --- یہ متوازن دماغ لوگ ہیں جنھوں نے آرزو پر قابو پا کر اپنے ذہن کے انتشار کو ارتفاع سے ستارۂ رقصاں میں تبدیل کر دیا۔ یہ لوگ صبر اور استقلال کے ساتھ آہستہ آہستہ کام کرتے ہیں، آمد اور وجدان کے منتظر نہیں رہتے۔ ان کے قول و فعل میں توازن اور ضبط ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں اور تیس برس کی عمر کے بعد بہتر تخلیق کرتے ہیں، اچھی

شہرت پاتے ہیں اور بسا اوقات خاصی عمر تک زندہ رہتے ہیں۔ وہ رومانی قسم کے فنکار سے زیادہ ارتقاع کی وہ طاقت نہیں رکھتے جو تمام عظمت کا سرچشمہ اور طغرائے امتیاز ہے۔ لیکن اس سرچشمہ سے وہ جنس کے لیے کم اور فن کے لیے بہت زیادہ طاقت اخذ کرتے ہیں۔ مائیکل اینجلو، بیتھوون اور نپولین کو اس لیے عظمت حاصل تھی کہ ان میں جینئس کی دونوں قسمیں ایک فوق البشر ربط میں متحد تھیں۔

نیطشے نے کہا ہے کہ "کسی شخص کی فطانت ایک خونخوار چمگادڑ کی طرح ہوتی ہے"۔ یہ اپنے شعلہ میں انسان کو جلا دیتی ہے۔ محبت کا بھی یہی طریقہ ہے اور اگر دونوں بیک وقت کسی انسان پر حاوی ہو جائیں تو وہ عظیم اور روشن تخلیق کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کی آواز جلدی ہی بند ہو جائے گی۔ حسن اور فن کی طرح فطین بھی اپنی طاقت اس تخلیقی سرچشمہ سے حاصل کرتا ہے جو مستقل طور پر نسل کو تروتازہ کرتا ہے اور زندگی کو غیرفانی بناتا ہے۔

۶۔ معروضی حسن

ان سوالوں میں سے جو تشنہ جواب رہ گئے ہیں ایک سوال بالخصوص بہت اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ آیا حسن معروضی حیثیت رکھتا ہے یا وہ ایک ذاتی اور داخلی تعصب ہے؟

ایلس جس کی رائے نہایت قابل احترام ہے (کیونکہ وہ اس کے علمی تجربہ پر مبنی ہے) یہ سمجھتا ہے کہ حسن شاہد سے مستغنی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں یہ کہتا ہے کہ دنیا کی اکثر نسلوں کے جمالیاتی رجحانات بنیادی طور پر ایک جیسے ہیں۔ لیکن جب ہم چینی موسیقی اور زولو جراحتوں کو دیکھتے ہیں تو یہ خیال اتنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ حسن اخلاق کی طرح جغرافیہ کے ساتھ بدلتا ہے۔ ڈارون ہمیں بتاتا ہے کہ تاہیتی کے وحشی چپٹی ناک کو پسند کرتے ہیں اور حسن کی خاطر اپنے بچوں کے نتھنے اور پیشانیاں دبا دیتے ہیں۔ مایا قبیلے کے لوگ زیورات سے اپنے بچوں کے ناک اور کان چھید دیتے ہیں اور ان کے دانتوں کو گھس کر ان کے اوپر کچھ چڑھا دیتے ہیں اور ان کے سروں کو تختے کے نیچے دبا دیتے ہیں اور انہیں بھینگا پن سکھاتے ہیں، کیونکہ انہیں اسی میں حسن نظر آتا ہے۔ منگو پارک حیران رہ گیا کہ افریقہ کے کالے حبشی اس کی سفید جلد کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب مشرقی افریقہ کے ساحل پر حبشی بچوں نے رچرڈ برٹن کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے "ذرا سفید آدمی کو دیکھو۔ کیا وہ ایک سفید بندر کی طرح معلوم نہیں ہوتا؟" اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زولو حبشی ایک کالے گریلے کی مانند ہے۔ غالباً ہم دونوں صحیح کہتے ہیں۔

یا بعض افریقی حسیناؤں کی چرب نوازی پر غور کرو۔ ڈارون کہتا ہے "اکثر لوگ یہ جانتے

ہیں کہ بہت سی ہاٹن ٹوٹ عورتوں کے کولہے بے حد بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور سرا ینڈریو سمتھ کو یہ یقین ہے کہ یہ خصوصیت مردوں کے لیے بہت کشش رکھتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ ایک عورت کو دیکھا جو قبیلہ میں اپنے حسن کی وجہ سے مشہور تھی۔ اس کے کولہے اتنے زیادہ بڑھے ہوئے تھے کہ جب وہ ہموار زمین پر بیٹھتی تھی تو اٹھ نہیں سکتی تھی اور جب تک وہ ڈھلوان کے قریب نہ پہنچتی، اسے اپنے آپ کو دھکیلنا پڑتا۔ مختلف حبشی قبائل میں کچھ عورتیں یہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ اور برٹن کہتا ہے کہ سومال قبیلے کے مردوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیتے ہیں اور جس کے کولہے سب سے زیادہ بھاری ہوں، اسے اپنی بیوی بنا لیتے ہیں۔ ایک حبشی کے لیے دبلے پتلے کولہوں سے زیادہ قابل نفرت چیز کوئی نہیں۔

حتیٰ کہ یورپ کے لوگوں میں بھی حسن کا معیار، مقام اور زمانے کے ساتھ رہا ہے۔ کبھی مضبوط اور فربہ ہونے کی رسم تھی۔ ریو بنز کی وسیع و عریض عورتوں، رمبراں کی فربہ لڑکیوں کو دیکھو، حتیٰ کہ ر-فیل کی عورتیں بھی جسمانی لحاظ سے فربہ ہیں۔ لیکن رینالڈز، گینز برو اور رومنی کی حسینائیں جثہ میں بہت کم ہیں اور وسلر کی عورتیں نازک اور لاغر ہیں۔ ہمارے اپنے زمانہ میں نسائی حسن کا معیار فربہی سے نزاکت میں بدل گیا ہے۔ جسموں کے فیشن بھی لباسوں کے فیشن کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمالیاتی احساس میں ایک داخلی نسل اور شخصی عنصر موجود ہے۔ فقط ایک عنصر معروضی ہے اور وہ یہ کہ تقریباً تمام دنیا کے صحت مند مردان عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کی ہیئت صحت مند مامتا کی ضامن ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر فطری وظیفہ کا کمال صحت مند ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ پہلے عورت میں، بعد میں کسی اور چیز میں کوئی کام جو اچھے طریقہ پر نبھایا گیا ہو، کوئی زندگی جو اچھی طرح بسر کی گئی ہو، کوئی کنبہ جس کی اچھی طرح پرورش کی گئی ہو، کوئی اوزار جو اپنا کام بخوبی سرانجام دیتا ہو، ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ حسین ہے۔ اگر ہم بالکل صحیح الذہن ہوں تو ہمیں ایک تنومند عورت، جو اپنے تندرست بچے کی پرورش کر رہی ہو، دنیا کے تمام حسن کی معراج معلوم ہو۔ اس معاملہ میں زمانہ وسطیٰ اور زمانہ احیائے علوم اپنی "مریموں اور بچوں" کے ساتھ مذاق حسن میں ہم سے کہیں زیادہ بہتر اور صحیح تر تھے۔ ایک انحطاط پذیر فن کے ذریعہ گمراہ ہو کر ہم کمزور اور تپلی دبلی عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں جو بچے پیدا کرنا کم جانتی ہیں لیکن بھڑ کی طرح کاٹنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

اگر ہماری جبلتیں غازہ و گلگونہ سے فریب نہ کھائیں یا مال و دولت سے گمراہ نہ ہو جائیں تو ہمارا احساس حسن حیاتیاتی طور پر صحیح ہوگا اور محبت بہترین وراثت اور اولاد کی ضامن ہوگی۔ حسن

پھر فطرت کے مقاصد کے مطابق صحت کا پھول اور مغنی بنے گا اور کامل طور پر تندرست بچوں کا ضامن ہوگا۔ وہ ایک بار پھر نسل کو کمزور نہیں، مستحکم بنائے گا۔ اخلاقیات اور جمالیات ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے اور ہم افلاطون کی طرح اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "نیکی کا اصول حسن کے آئین میں تحلیل ہو جاتا ہے"۔

افلاطون اس معاملہ میں جھجکتا رہا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرف جھکے درشت اتھین کی حکمت کے سامنے یا افروڈائٹ کی متبسم جاذبیت کے آگے غالباً وہ جھجکنے میں عقل سے کام لے رہا تھا اور حسن جیسا کہ ہمارے ہاں موجود ہے، ایک کامل ریاست کی بنیاد مشکل ہی سے بن سکتا ہے۔

لیکن اس حکمت سے کیا فائدہ جو ہمیں حسن سے محبت کرنا اور حسن فطرت سے بہتر حسن تخلیق کرنا نہ سکھائے۔ حکمت ایک وسیلہ ہے۔ جسم اور روح کا حسن ایک مقصد ہے۔ فن سائنس کے بغیر افلاس ہے۔ لیکن سائنس فن کے بغیر بربریت ہے، حتیٰ کہ کبریائی فلسفہ بھی ایک وسیلہ ہے۔ لیکن جب ہم اس کی پرواز کو ایک بھرپور زندگی کی مربوط قدروں پر پھیلا دیں تو وہ مقصد بن جاتا ہے۔ کوئی فلسفہ جو حسن و جمال سے متاثر نہ ہو، انسان کے قابل نہیں ہے۔

مصر کا کچھ نہیں رہا۔ سوائے ان پرشکوہ و اجلال عمارتوں کے جو اس نے صحرا میں استوار کیں۔ یونان کا کچھ باقی نہیں سوائے اس کی حکمت و فن کے۔ زندہ حسن بہترین ہے۔ لیکن عمر اور وقت کے ساتھ وہ مرجھا جاتا ہے۔ صرف فنکار ہی ہنگامی حسن کو گرفت میں لا سکتا ہے اور اسے ایک غیر فانی ہیئت عطا کر سکتا ہے۔ ذرا گوئٹے کو سنئے:

تمام چیزیں فانی ہیں۔ پر اجلال فن ہی بقا سے آشنا ہو سکتا ہے۔
مرمر میں ڈھلا ہوا سینہ ریاست کے فنا ہونے پر بھی زندہ رہتا ہے۔
اور پر ہیبت تمغہ، جسے کوئی مزدور زمین کی تہوں میں سے نکالتا ہے، شہنشاہ کی یاد کو محفوظ رکھتا ہے۔
دیوتا مر جائیں گے، لیکن ملکہ سخن لازوال ہے۔ وہ موت سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔

* * *

حصہ ششم

فلسفہ تاریخ

باب چہارم

تاریخ کا مفہوم : ایک مکالمہ

مکالمہ کے افراد

اناطول فرانس
فرانسوا میری ایروائٹ ڈی والٹیئر
ژاک بینین بوسے
ہنری طامس بکل
طامس کارلائل
فریڈرک رٹزل
ولیم جیمز
گیبرئیل ٹارڈ
چارلس لوئی ڈی سیکنڈ آٹ بیرن دی موفسکو

فریڈرک نیطشے
جارج ولیم فریڈرک ہیگل
لسٹروارڈ
کارل مارکس
جوزف آرتھر کونٹ ڈی گوبینو
میڈیسن گرانٹ
فلپ
ایرئیل
راوی

منظر: سرزمین ذہن میں ایک گلستان

۱- پومانوک میں افتتاحیہ

ہم پومانوک کی ایک وادی میں سیر کر رہے تھے اور کروچے کے اس خیال پر جوش و خروش سے بحث کر رہے تھے کہ تاریخ صرف فلسفیوں کو لکھنی چاہیے اور فلسفہ صرف مورخوں کو۔ گو ہمارے حواس ایک نمایاں احساس تشکر کے ساتھ زمین کی تازگی، گھنے درختوں کے ٹھنڈے سائے، جھیل کے درخشاں پانی اور غروب آفتاب کی سنہری فضا سے لذت اندوز ہو رہے تھے، لیکن ہمارے خیالات ان کتابوں میں گم تھے جو گرما کی اس سہ پہر کو ہمارے زیر مطالعہ تھیں۔

ایرئیل نے کہا: ”مجھے بڑی مسرت ہے کہ اب ہم تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں تمہاری منطق، فلسفۂ علم اور مابعد الطبیعیات سے تنگ آ چکا تھا۔ ان علوم نے مجھے کچھ نئے حقائق سکھانے کی بجائے مجھ سے میرے پہلے حقائق بھی چھین لیے“۔

اس پر فلپ نے کہا: ”بہت سے حقائق کا علم بھی کوئی اچھی بات نہیں“۔

میں نے کہا: ”شاید آپ کا خیال صحیح ہے لیکن یہ بے کیف مضامین اگر ہمارے ذہن کی فلسفیانہ تربیت کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ بھی کر سکیں تو ان کی اہمیت مسلم ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ علوم ہمیں ایک وسیع ”کل“ کو سمجھنے اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ایک کلی زاویہ نظر سے سمجھنے اور برتنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

ایرئیل نے ایک عفو آمیز تبسم کے ساتھ کہا: ”تمہیں کلی زاویہ نظر کی اصطلاح سے عشق ہوگیا ہے شاید؟ ہے نا؟“

”ہاں! میں تناظر کا پرستار اور ربط کا رسیا ہوں۔ میں اشیاء کو ان کی کلی یا مکمل صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں“۔

فلپ نے جوش سے کہا: ”خوب اور یہی بات ہے جس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ کسی دینیاتی تصور کو ثابت کرنا یا کسی جماعت کے لائحہ عمل کی تعریف کرنا، یا کسی جذبہ حب الوطنی کی خود فریبی کی تبلیغ کرنا، ان کا مقصد ہے۔ اپنے ملک، ان میں اپنی جماعت یا اپنے شیوہ کو کل کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی جرات نہیں۔ تمام تاریخ مرقومہ کا اسی فیصدی حصہ مصر کی تصویری تحریر کی مانند ہے اور اس کا مقصد اسقفوں اور بادشاہوں کے کارناموں کی مدح و ستائش کے سوا کچھ بھی نہیں“۔

ایرئیل نے پوچھا: ”ہمارا محبوب مورخ گبن بھی تو بادشاہوں کا بہت زیادہ ذکر کرتا ہے۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟“

میں نے کہا: ”ہاں! لیکن وہ مائیکل انجلو کی طرح وسیع خاکے بناتا ہے اور باخ کی طرح موسیقی کی تخلیق کرتا ہے۔ میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ ذرا غور کرو کہ وڈرو

ولسن نے تاریخ کی تعریف یوں کی تھی کہ یہ ماضی کی سیاست ہے۔ بس یہی ہماری بنیادی غلطی تھی۔ سیاست میں بھلا کون سی بات ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہو"۔

ایریئل نے کہا: "چینی حکومت زیادہ دیانت دار تھی۔ دو ہزار چھ برس سے کچھ عرصہ قبل تک وہ مورخوں کو بادشاہوں کے محاسن اور فتوحات تحریر کرنے اور ان کے مصائب اور شکستوں کو بہتر رنگ میں ڈھالنے پر مامور کرتی رہی"۔

فلپ نے کہا: "وطن پرست محکمہ ہائے تعلیم کے لیے اس طرح کی تاریخیں بہترین تاریخیں ہوں گی لیکن جدید یورپ کے مقابلہ میں قدیم چین کے حالات کچھ ایسے برے نہیں تھے۔ زمانہ وسطیٰ اور عہد احیائے علوم میں لوگوں نے دنیا کی تاریخیں لکھیں لیکن انیسویں صدی نے وطنیت کے تصور کی دریافت کی اور تقریباً تمام مورخوں کے زاویہ نظر کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ ٹرائش کے اور فان سبل، مشلے اور مارٹن، میکالے اور گرین، بینکروفٹ اور فسک پہلے وطن پرست تھے اور بعد میں مورخ۔ وہ اپنے ملک کو خدا کی سرزمین سمجھتے تھے اور باقی ساری دنیا کو وحشیوں اور بدمعاشوں کی آماجگاہ۔ ان مصنفوں اور ان سیاستدانوں میں زیادہ فرق نہیں جو دوسرے ممالک کے لوگوں کو حقارت آمیز ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ان مورخوں کی حیثیت سیاست دانوں کے اخباری نمائندوں یا بری اور بحری فوجوں کے رنگروٹ فراہم کرنے والے افسروں کی سی ہے"۔

ایریئل نے پوچھا: "یہ بات کس نے کہی تھی کہ بین الاقوامی امن کی شاہراہ تنسیخ تاریخ ہے نہ کہ معاہدے اور تجارت"۔

میں نے جواب دیا "لیکن بیسویں صدی اس لحاظ سے انیسویں صدی سے زیادہ بہتر نہیں۔ مجھے آج کل کے مورخوں کا انداز پسند نہیں وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سب بڑے آدمی درحقیقت معمولی ہوتے ہیں اور یہ کہ ان کے متعلق اہم ترین باتیں یہ ہیں کہ وہ گالیاں بکتے، جھوٹ بولتے، شراب پیتے اور وسیع پیمانہ پر محبت کرتے تھے۔ میں ولز کی اس بات کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ وہ نپولین اور سیزر کو اپنی سطح پر لے آیا ہے۔ "میں تو اپنے مسلک پر قائم ہوں اور وہ ہے عظیم شخصیتوں کی پرستش"۔

فلپ نے کہا: "مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ یہ سوانح نگار جو عظیم شخصیتوں کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے یا کسی ادبی شاہکار کی تہ میں جنسی الجھنوں کی کھوج کرتے ہیں، دراصل اسی طرح جانب داری سے کام لیتے ہیں، جس طرح ایک عام سوانح نگار کو ان میں سوائے پاکیزگی اور معصومیت کے اور کچھ نظر نہیں آتا، لیکن حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں دونوں طرح کے سوانح نگاروں کی ضرورت ہے ان سے کہیں زیادہ بدمذاق ہیں وہ مستند مورخ جو اپنی ساری

زندگیاں غیر اہم باتوں کو اہم ثابت کرنے میں بسر کر دیتے ہیں اور فلسفہ ان کے مقالوں کی طرح جو محض حکمت کی سند حاصل کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، بلند بانگ لیکن بے سود مضامین تحریر کرتے ہیں۔ انہیں ذرا کتب خانوں میں گھومتے دیکھئے وہ اپنے آپ کو غیر ضروری تفاصیل میں گم کر دیتے ہیں اور چیونٹیوں کے استقلال کے ساتھ حقائق کو محض حقائق کی خاطر، جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ دستاویزوں اور اعداد و شمار میں مستغرق ہو کر انتہائی تن دہی اور عرق ریزی سے غیر اہم باتوں کی حقیقت ثابت کرتے ہیں۔ وہ جزو کو دیکھتے ہیں اور کل کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ماضی کی اس کے سوا کوئی اہمیت نہیں کہ وہ زندہ لوگوں کے کردار اور مقاصد کو متاثر کر سکتا ہے اور تاریخ کی اس کے سوا کوئی اہمیت نہیں کہ وہ حال کی راہوں کو درخشاں اور مستقبل کو روشن بناتی ہے۔ یہ لوگ تاریخ کے اہل مدرسہ ہیں اور ان کی مثال فلسفہ علم کے ان ماہرین کی سی ہے جن سے تمہیں سخت نفرت ہے، یہ ان ماہرین حیاتیات کی مانند ہیں، جو ایک کیڑے کو مار کے الکحل میں ڈال دیتے ہیں۔ وقتاً "فوقتاً" اس کے جسم کی چیر پھاڑ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم زندگی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یا وہ ان ماہرین نفسیات سے مشابہ ہیں جو نفسیات کے معمل میں اعداد و شمار اور حساب کتاب کے ذریعہ انسانی کردار کے متعلق وہ باتیں ثابت کرتے ہیں جو صدیوں سے ہر شخص کو معلوم ہیں"۔

ایریئل اس کا جوش و خروش دیکھ کر مسکرائی اور زور سے بولی: "مورخین مردہ باد!"

میں نے کہا: "انہیں تھوڑے سے فلسفہ کی ضرورت ہے جو انہیں "کل" کا تصور بخش سکے"۔

ایریئل نے کہا: "ہاں! میں تاریخ کو مربوط ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ قوانین کی تابع ہے یا نہیں یا اس میں ہمارے لیے کچھ سبق ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ ماضی، ہماری مستقبل کی جدوجہد میں مدد کر سکتا ہے کہ نہیں اور کیا ترقی محض ایک حسین فریب ہے؟ میں نپولین کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھول سکتی اور یہ اس کے آخری اقوال میں سے ایک تھا کہ "خدا کرے کہ میرا بیٹا تاریخ کا مطالعہ کرے کیونکہ تاریخ ہی صحیح فلسفہ ہے"۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تاریخ ٹھیک طرح لکھی جائے تو ہم اس کی مدد سے انسان کی صحیح فطرت کے متعلق، نفسیات اور فلسفہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ میں انسانوں کی حقیقت سے اسی طرح واقف ہونا چاہتی ہوں جیسے بڑے بڑے ارباب سیاست تھے۔ بغیر کسی فریب اور بغیر کسی مذمت کے"۔

میں نے کہا: "سبحان اللہ! کتنا حسین فقرہ ہے!"

فلپ نے کہا: "ہم کروچے کی تجویز کے مطابق فلسفے اور تاریخ کو ملا کیوں نہ دیں؟ ہمارے

زمانہ میں "فلسفہ تاریخ" کی وہ عظمت اور عزت باقی نہیں رہی جو اسے پہلے حاصل تھی۔ اب اسے کس قدر تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جس طرح ہماری سیاست میں بسیط اور دوررس منصوبوں کا فقدان ہے، اسی طرح تاریخ میں گبن اور والٹیئر کی سی فلسفیانہ گرفت بھی مفقود ہے۔ ربط کا اب رواج نہیں رہا"۔

میں نے اعتراض کیا کہ ایک لحاظ سے اس رویہ سے ایک معقول احتیاط کا اظہار ہوتا ہے، فلسفیانہ تاریخ ہر نظام فکر کی طرح اسی مرض میں مبتلا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنا دے۔ ہر خیال میں غلو سے کام لینا اور ہر واقعہ کو کلیہ کی شکل دے دینا اس کا اسلوب بن گیا ہے۔ وہ تمام ماضی کو کسی ایک تصور میں سمونے کی کوشش کرتی ہے"۔

لیکن فلپ اپنی بات پر قائم رہا۔ وہ کہنے لگا، لیکن فلسفہ کے بغیر، تاریخ محض واقعات کی فہرست بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ساتھ محض شغف کی بناء پر تعلق قائم کرتی ہے۔ رہا فلسفہ تو وہ بھی تاریخ سے ربط پیدا کیے بغیر محض ایک ہوائی نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ انسان کی تخلیقی قوتوں سے اسے کوئی تعلق نہیں رہتا، فلپ نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا، "تاریخ وہ بنیاد ہے جس پر فلسفہ کی تعمیر استوار ہوتی ہے اور اس بنیاد پر فلسفہ تمام علم کو یکجا کرتا ہے، تاکہ انسانی زندگی بہتر اور روشن تر بن سکے"۔

"مرحبا! فلپ مرحبا!" اریَیل نے کہا۔

ستارۂ شام طلوع ہو گیا اور چاند نے ایک تابناک خنجر کی طرح آسمان میں شگاف کر دیا۔ ہم ایک چھوٹی پہاڑی پر چڑھے اور کچھ عرصہ کے لیے مبہوت کھڑے رہے۔ ہم نے کبھی چاند کو اتنا سفید اور آسمان کو اتنا نیلا نہیں دیکھا تھا۔ ہمیں اپنے بہت قریب دبی دبی آوازوں کا احساس ہوا۔ جھٹپٹے میں غور سے دیکھنے پر ہمیں ایک حسین اور وسیع گلستان نظر آیا۔ اس میں ایک ندی گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی، گھاس پر اور ایک مرمریں چشمہ کے گرد دہقانی کرسیوں پر چند عظیم انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پچھلے زمانوں کے لباسوں میں ملبوس تھے لیکن ان میں سے چند چہرے اس قدر آشنا اور مانوس معلوم ہوتے تھے، جیسے ہم انہیں ہمیشہ سے جانتے ہوں۔

اریَیل نے سرگوشی کے انداز میں کہا! "وہ یقیناً ہمارا محبوب والٹیئر ہے"۔

فلپ نے خوش ہو کر کہا! "یقیناً!"

میں نے کہا! "اور وہ اس کا پوتا، اناطول فرانس ہے، اس کا قد میرے اندازہ سے کچھ چھوٹا ہے لیکن کیا چہرہ پایا ہے اس نے! زمانہ کی آدھی حکمت اور ساری رحمت اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی ہے"۔

ہم نے ہر شخص کے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ اور ان میں سے بہت سوں کو پہچان لیا۔ انہیں میں ایک لحیم شحیم پادری بھی تھا۔ وہ پادریوں کے مخصوص لبادے میں ملبوس گود میں ہاتھ رکھے، تفکر میں مستغرق بیٹھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ بوسے ہے۔ جو لوئی چہاردہم کا درباری مواعظ تھا، والٹیئر کے قریب، ایک فرانسیسی رئیس بیٹھا تھا جس نے زمانہ وسطیٰ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ مونٹین ہے۔ پھر ایک اور چالیس برس کا، اعصاب زدہ، ناتواں شخص نظر آیا جو اپنے خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔ اس کی صورت مورخ تہذیب بکل کی ان تصویروں سے مشابہ تھی جو اکثر میری نظر سے گزری تھیں۔

فلپ نے متعجب ہو کر کہا: "اور وہ ہے میرا استاد، لسٹروارڈ!" ایک بدصورت اور حد درجہ سنجیدہ جرمن کو دیکھ کر مجھے ہیگل کا شبہ ہوا۔ اس کے قریب ہی خوفناک مونچھوں اور نرم آنکھوں والا نیطشے بیٹھا تھا۔ ایک گوشہ میں طامس کارلائل بیٹھا نظر آیا، اداس اور تنہا۔ کوہسار کی طرح عظیم، جس کی بھوویں چٹانوں کی مانند تھیں اور آنکھیں اس جنگجو سپاہی کی طرح جو بالاخر گرفتار اور بے بس ہو گیا ہو۔ چشمہ کے قریب ایک لمبا اور حسین شخص کھڑا تھا۔ میں پہچان گیا کہ یہ ولیم جیمز ہے جو ایک امریکی کی طرح پرہیجان اور ایک فرانسیسی کی طرح زندہ دل ہے۔ اس کے مقابل، کوتہ قد، سیاہ اور متین، کارل مارکس تھا، اور پر زور بحث کے دوران میں ان کی داڑھیاں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ جرمنی کا ایک قد آور عالم، امریکہ کا ایک وکیل نما شخص، ایک فرانسیسی مجسٹریٹ اور ایک فرانسیسی امیر بھی جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا وہاں موجود تھے۔ اناطول فرانس ایک پادری کے لہجہ میں اور موسیو برجرٹ کی زندہ دلی کے ساتھ کچھ کہہ رہا تھا۔ تاریکی ہر طرف پھیل گئی تھی اور ہم، سب کی نظروں سے بچ کر، گھاس پر ایسی جگہ بیٹھ گئے، جہاں سے ہم سب کی باتیں سن سکتے تھے۔

۲۔ تاریخ کی مذہبی تاویل

اناطول فرانس ، پیارے اردیٹ،

"قوموں کے اخلاق اور کردار اور شارلیمین سے لے کر لوئی سیزدہم تک کی تاریخ کے اہم واقعات پر تمہارا مقالہ تمہاری عظیم ترین تصنیف ہے، یہ عنوان تمہارے اس عظیم کارنامہ کے شایان شان ہے۔ تم نے تاریخ نگاری میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا"۔

والٹیئر: "نہیں اس معاملے میں اولیت کا شرف مجھے حاصل نہیں، مجھ سے ۔شب بوسے نے "عالم گیر تاریخ" لکھ کر میرے لیے زمین اس سے پہلے ہموار کر دی تھی۔ تاریخ فقط واقعات کی

فہرست ہوتی تھی، کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ شب بوسے ہمیں لوئی چہاردہم کا درباری تصور کر کے ہمیں یہ شرف بخشیں گے کہ تاریخ کے موضوع پر ایک مختصر سا وعظ فرمائیں"۔

بوسے: "حضرات، آپ میں سے اکثر متشکک ہیں، اور مجھے یہ اندیشہ ہے، کہ آپ ایک ایسے بوڑھے پر ہنسیں گے جو خدا پر ایمان رکھتا ہو اور تاریخ کو مشیت ایزدی کا مظہر جانتا ہو۔ میں شہزادہ کو تاریخ کا مطلب سمجھانا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اس کے لیے ایک کتاب لکھی جو سب قوموں اور زمانوں کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہو، جو دنیا کے نقشہ کی، براعظموں، سمندروں اور ملکوں کے معاملہ میں ہے۔ میں نے ہر جزو کا مفہوم اس رشتے کو پیش نظر رکھ کر سمجھانے کی کوشش کی تھی جو اسے کل سے وابستہ کرتا ہے"۔

اناطول فرانس: "یہ ایک نہایت بلند مقصد تھا، اگر یہ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا تو اس کی حیثیت ایک مکمل فلسفہ کی ہوتی"۔

بوسے: "میرے نزدیک تاریخ مشیت ایزدی کی تمثیل ہے۔ جس میں ہر واقعہ ایک سبق ہے جسے خدا بندے کے لیے ظہور میں لاتا ہے۔ میں لوئی پانزدہم کو تنبیہہ کرتا رہتا تھا کہ خدا کی طرف سے انقلابوں کا ظہور بادشاہوں کو انکسار کی تعلیم دینے کے لیے ہوتا ہے"۔

اناطول فرانس: "محترم اسقف گستاخی معاف! لیکن آپ کی بات سن کر مجھے بوناڈین سنٹ پیرے کی وہ بات یاد آتی ہے جو اس نے خربوزہ کے متعلق کہی تھی کہ ظاہر طور پر اس لیے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے کہ وہ کنبہ کے لوگوں میں کھائے جانے کے لیے بنایا گیا ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا شاگرد شہزادہ نہایت ناکارہ اور بدمعاش ثابت ہوا، اس کی بہت سی داستانیں تھیں وہ غریبوں سے بہت ظالمانہ سلوک کرتا تھا، تاہم اس نے خاصی لمبی عمر پائی۔ اس کے برخلاف اس کا جانشین، لوئی، شش دہم ایک منکسرالمزاج، نیک اور پرہیزگار حکمران تھا، اس نے اپنے ملک کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور تشدد اور افلاس کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ۱۷۹۲ء میں اسے قتل کر دیا گیا"۔

بوسے: "مشیت ایزدی ہمارے فہم و ادراک سے ماورا ہے لیکن ہمیں خدا پر ایمان رکھنا چاہیے"۔

اناطول فرانس: "میرے نزدیک آپ کی کتاب میں سب سے زیادہ قابل تعریف حصہ وہ ہے جہاں آپ نے بہت سے لاینحل مسائل کی بڑی خوداعتمادی سے وضاحت کی ہے۔ مثلاً حوا کی تولید اور خدا کے برگزیدہ لوگوں کے مصائب، مجھے افسوس ہے کہ دنیا علم اور یقین سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے اور وہ امور جو کبھی بالکل واضح تھے آج انہیں سمجھنا دشوار ہو گیا ہے، ہمیں پہلا سا علم پھر

کبھی حاصل نہیں ہو سکتا"۔

بکل: "میں اسقف کی تاریخ دانی کا قائل ہوں، ان کی کتاب میں ہابیل کے قتل، طوفان نوح اور ابراہیم کی پیغمبری کی تاریخیں دی ہوئی ہیں۔ مجھے اپنے کتب خانہ میں ان تاریخوں کی تصدیق نہیں مل سکی"۔

بوسے: "یہ بات تو بہت سیدھی ہے میرے بیٹے! میں مقدس کتابوں کو الہامی کتابیں سمجھتا ہوں، ایمان کے بغیر علم ناممکن ہے"۔

کارلائل: "جناب! آپ نے جو کچھ فرمایا یہ ممکن ہے، عین ممکن ہے"۔

اناطول فرانس: "پھر بھی، حضور انور، آپ نے ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے، آپ نے تاریخ کو مشیت ایزدی میں تحلیل کیا، لیکن آپ نے اپنے ناخلف شاگرد کو یہ بھی تعلیم دی کہ مشیت ایزدی اکثر و بیشتر، ثانوی اور قدرتی اسباب و عمل کے ذریعہ کام کرتی ہے اور آپ نے یہ بھی ہے کہ مورخ کو وہ ثانوی اسباب تلاش کرنے چاہئیں، جو تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کا باعث بنتے ہیں۔ آپ نے فلسفیانہ تاریخ کے مسئلہ کی وضاحت کر کے بڑا کام کر دکھایا اور آپ ہی کے سمجھائے ہوئے راستہ پر چل کر والٹیئر، آپ کا دشمن بنا"۔

والٹیئر: "آپ پھر میری تعریف میں مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ ہم ویکو کی خدمات کو فراموش کر رہے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں جوانی میں اطالیہ نہ جا سکا کہ اس عالم سے تبادلہ خیال کر سکتا، موسیو بکل ہمیں شاید اس سلسلے میں کچھ بتا سکیں"۔

بکل: "اس کی جگہ زمانے اور نظریہ دونوں کے لحاظ سے .شب بوسے اور آپ کے درمیان ہے۔ وہ مشیت ایزدی پر ایمان رکھتا تھا، لیکن تبلیغ کے مقدس محکم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد اس نے اپنی نئی سائنس کی تعمیر سراسر ارضی بنیادوں پر استوار کی۔ اس نے سوال کیا کہ دوسرے مضامین کی طرح تاریخ کی سائنس کیوں نہیں ہے؟؟"

اس نے کہا کہ جس طرح نیوٹن کے قوانین، قدرت کے عجائب کی توضیح کرتے ہیں، اسی طرح قوموں کے بظاہر بے سبب عروج و زوال میں بھی شاید کچھ قوانین مضمر ہوں۔

اناطول فرانس: "بے چارہ نیوٹن! میں اسے آئن سٹائن سے متعارف کراؤں گا لیکن آپ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھئے"۔

بکل: "ویکو کے نزدیک تاریخ، چند قوانین کی تابع ہے، ہر تہذیب، تین منزلوں میں سے گزرتی ہے"۔

ہیگل: "تین منزلوں میں سے بہت ہوشیار تھا وہ کہ اس نے میرے فلسفہ کے متعلق پیش

بنی سے کام لیا"۔

بکل: "پہلی منزل وحشت کی تھی جس میں فکر کا گزر نہیں تھا‘ فقط جذبات تھے۔ دوسری منزل بربریت کی تھی‘ جس میں تخیلی علم نے ہومر اور ڈانٹے اور اولوالعزم لوگوں کے عہد تخلیق کیے۔ تیسری منزل تہذیب کی ہے‘ جس میں خرد‘ سائنس‘ قانون اور ریاست کو جنم دیتی ہے‘ ویکو کا یہ خیال تھا کہ رومی سلطنت نے عظیم ترین تہذیب تخلیق کی تھی‘ جس طرح بربریوں نے اپنی ان گنت تعداد اور وحشیانہ قوت سے اس تہذیب کی ناتواں حساسیت اور محدود تعداد کو ختم کر دیا‘ اسی طرح مستقبل میں وحشی اقوام ہر تہذیب کو فنا کر دیں گی۔ سیاست میں بھی اسے یہی ترتیب نظر آئی‘ بربریت‘ سرداروں کو وجود میں لاتی ہے جو بعد میں رئیس طبقہ کی صورت میں منظم ہو جاتے ہیں‘ رئیسانہ ستم اور علیحدگی انقلاب پیدا کرتی ہے اور پھر جمہوریت جنم لیتی ہے اور جمہوریت کے انتشار کی بدولت بربریت پھر واپس آ جاتی ہے"۔

اناطول فرانس: "سب فلسفی اداس رہتے ہیں‘ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ فکر انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی ہے‘ قدیم زمانہ کے لوگوں نے مستقبل کو دیکھنے والی نظر کو ہمیشہ ایک خطرناک صلاحیت سمجھا ہے‘ آپ نے بھی موسیو والٹیئر! اپنی عظیم تاریخ کے آخر میں کوئی خوش آئند نتائج اخذ نہیں کیے"۔

والٹیئر: "میں ایک وحشی عہد کا ذکر کر رہا تھا‘ میں ان انقلابات میں سے گزر رہا تھا‘ جو شارلیمین کے زمانہ سے رونما ہو رہے تھے‘ ان سب کا انجام کیا ہوا؟ تباہی اور ہزاروں زندگیوں کا خاتمہ۔ ہر عظیم واقعہ ایک عظیم تباہی تھا۔ ممکن ہے کہ یہ غلطی میرے ماخذ کی پیدا کی ہوئی ہو‘ جس میں امن اور سکون کے زمانوں کا کوئی ذکر نہیں۔ انہوں نے صرف تباہیوں اور بربادیوں کی داستانیں بیان کی ہیں‘ اس لیے میرے نزدیک بھی تاریخ جرائم اور مصائب کا ایک مرقع ہے۔ بے بنیاد اوہام‘ غیر معقول خصائل اور وحشیانہ قوت کی جلوہ گری۔ یہ ہیں وہ طاقتیں جو تاریخ کے پس پردہ کام کرتی ہیں‘ مجھے بہت کم تاریخ میں یہ بات نظر آئی ہے کہ واقعات کی تشکیل میں عقل انسانی نے کوئی حصہ لیا ہو‘ اس کے برعکس‘ حقیر ترین اور ذلیل ترین اسباب نے عظیم اور المناک نتائج پیدا کیے ہیں‘ میں نے تو یہی اندازہ لگایا کہ مشیت حوادث کا دوسرا نام ہے"۔

بکل: "آپ کا شاگرد ٹرگو اس قدر یاس آفرینی سے کام نہیں لیتا تھا‘ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۷۵۰ء میں اس نے سوربون میں لیکچر دیئے تھے جن میں اس نے تہذیب کی تاریخ بیان کی تھی اور اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ انسانی ذہن ضرور ترقی کرے گا"۔

والٹیئر: "آپ نے میرے شاگرد کی تعریف کی‘ مجھے اس سے مسرت ہوئی‘ جب بادشاہ نے

اسے وزارت خزانہ کے عہدے سے معزول کیا، تو مجھے بڑا دکھ ہوا، مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی تھی۔ ترقی کا تصور میرے زمانہ میں بھی مقبول تھا۔ یہ تصور میرے دوست ’موسیو کونڈورسے کو بہت عزیز تھا۔ عین اس وقت، جبکہ فرانسیسی تہذیب تباہ کی جا رہی تھی، لیکن ٹرگو ٹھیک کہتا تھا۔ تاریخ اسی وقت قابل برداشت ہوتی ہے، جب وہ تہذیبوں کے عروج و زوال بیان کرے۔ تاریخ صرف فلسفیوں کو لکھنی چاہیے۔ وہ اپنے مواد میں اہم اور غیر اہم کی تمیز کر سکتے ہیں۔ وہ غیر ضروری تفاصیل سے گریز کر سکتے ہیں اور وہ چیزوں کو ایک وسیع اور بسیط زاویہ سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ذہنی جلا کی ترقی، مادی، خوشحالی اور اخلاقی بلندی --- کسی قوم کی تاریخ میں ان چیزوں کی حیثیت محض چند پہلوؤں کی نہیں بلکہ حقیقت میں یہی چیزیں قوم کی تاریخ ہیں، باقی سب چیزیں فروعات ہیں، ان کی اہمیت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ وہ اقتصادی، ذہنی اور اخلاقی ترقی پر کیا روشنی ڈال سکتی ہیں، اس لیے میں نے اپنی کتاب ESSAI SUR LES MA URS اس مقصد سے لکھی کہ انسانی ذہن کی تاریخ بیان کروں۔ میں ان مراحل کو متعین کرنا چاہتا تھا، جن سے گزر کر انسان بربریت سے تہذیب کی منزل مقصود تک پہنچتا ہے"۔

اناطول فرانس: "حضور، آپ نے عینی تاریخ کے تصور کو خوب بیان کیا ہے، میں اس نسل کی تخلیقی قوتوں پر حیرت زدہ ہوں جس نے آپ کی تصانیف، موسیو مونٹسکو کی "روح قانون" اور موسیو گبن کی ضخیم تاریخ تخلیق کی۔ آپ سب نے مل کر تاریخ کو مذہبیات کی زنجیروں سے آزاد کیا اور اسے فلسفہ اور سائنس کے سپرد کیا۔ جب میں مابعد الطبیعیاتی بندروں کی موجودہ نسل کے متعلق غور کرتا ہوں کہ وہ حکمت کی چار منزلیں طے کر آئی ہے اور جب میں سقراط کے عہد، ہورلیس کے عہد، ریبلیشر کے عہد اور آپ کے عہد کا (جسے آپ کے نام سے ہی یاد کرنا چاہیے) کا تصور کرتا ہوں تو تاریخ کی جنگیں اور اس کے جرائم، اس کے مصائب اور اس کی ناانصافیاں اس قدر مہیب معلوم نہیں ہوتیں۔ انسانی تاریخ کا جواز اس کی عظیم شخصیتوں کا وجود ہے"۔

۳۔ تاریخ کی جغرافیائی تعبیر

بکل: "مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے موسیو مونٹسکو کا ذکر کیا کیونکہ اب تک ہم نے تاریخ کے متعلق جتنی گفتگو کی وہ اس کے اسلوب کے متعلق تھی۔ ہم نے ان اسباب کا ذکر نہیں کیا، جو قوموں کی عظمت اور ذلت کا باعث بنتے ہیں۔ تاریخ کے مرکز کو آسمان سے زمین، بادشاہوں سے انسانیت اور جنگوں سے تہذیب تک، منتقل کرنے کے بعد، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کے فیصلہ کن اسباب کیا ہیں؟ کیا جیسا کہ ابھی آپ نے اشارہ کیا تھا، عظیم شخصیتوں کی عظمت ہی اس کا فیصلہ

کن سبب ہے؟ یا اس کے علاوہ کچھ اور مثلاً علم کی طاقت، سائنس دانوں کی اختراعیں اور ایجادیں، اچھی نسلوں کا لہو، اقتصادی پیداوار اور تقسیم کا نظام، آب و ہوا اور زمین اور جغرافیائی حالات کی خصوصیات؟ موسیو مونٹسکو کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قوموں کی عظمت اور ذلت کے مخصوص اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی"۔

مونٹسکو: "آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ میرا ذکر کر رہے ہیں، مسٹر بکل، اپنے ہم وطنوں سے زیادہ آپ کے ہم وطنوں نے مجھے یاد رکھا ہے، حتیٰ کہ موسیو والٹیئر بھی جو یوں بے حد وسیع النظر اور فیاض ہیں، میری کتابوں کو خاطر میں نہ لائے"۔

والٹیئر: "میں آج تک آپ کی دو مشہور تصانیف کی عظمت اور ذکاوت کی وجہ سے آپ کو معاف نہیں کرسکا"۔ (ان دو کتابوں کے نام ہیں: Lethes Persanesas اور Lesprit Des Lois)

مونٹسکو: "میں جانتا ہوں عظیم شخصیتیں، ایک دوسرے کے ساتھ معمولی آدمیوں کا سا سلوک روا رکھتی ہیں۔ میرے ہم عصروں نے میری پہلی دو کتابوں، یعنی "ایرانی مکاتیب" اور "رومہ کے عروج و زوال" کے اسباب کے متعلق یہ کہا کہ یہ اصل میں "مونٹسکو کا عروج اور زوال" کی داستانیں ہیں، انہیں فلسفہ سے زیادہ بذلہ سنجی مرغوب تھی، میں نے فونٹینل، ہیلوٹیس اور دوسرے علم دوست احباب کو لا بریڈ (جہاں میں رہتا تھا) بلایا کہ میری کتاب "روح قانون" کے چند ابواب سنیں جن پر میں نے بیس برس محنت کی تھی، کتاب سننے کے بعد سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ میں یہ کتاب شائع نہ کروں، قصہ مختصر، میں انگلستان میں بہت مقبول رہا ہوں"۔

بکل: "میں "روح قانون" کو اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، آپ پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ بتایا کہ تاریخ میں شخصیتوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اور یہ کہ منفرد واقعات (حتیٰ کہ عظیم جنگیں بھی) کسی قوم کے عروج و زوال کا سبب نہیں بن سکتے، آپ نے ہمیں یہ سکھایا کہ عظیم شخصیتیں اور عظیم واقعات وسیع اور مستقل قوتوں کے علائم اور نتائج ہیں۔

ان میں سے بعض قوتیں غیر شخصی ہوتی ہیں، مثلاً ملک کی ہیئت یا ہوا کی حرارت۔

مونٹسکو: "بقراط نے چار سو قبل مسیح میں ایک کتاب "ہوا، پانی اور جگہ" لکھی تھی، جس میں اس نے بتایا تھا کہ جغرافیائی ماحول کا لوگوں کی جسمانی ساخت اور ریاستوں کے آئینی نظام پر کیا اثر ہوسکتا ہے۔ ارسطو نے یونانیوں کی کامرانی، حتیٰ کہ ان کی ذہنی برتری کو یونان کی "متوسط" آب و ہوا سے منسوب کیا تھا۔ اگرچہ ہم ایتھنز کے درجہ حرارت کو متوسط ہرگز نہیں کہہ سکتے"۔

اناطول فرانس: "اس میدان میں آپ کا ایک اور پیشرو بوڈین تھا جس نے سولھویں صدی میں جغرافیائی حالات اور انسانی اخلاق و اطوار، اس کی ہمت اور ذہانت کے باہمی ربط اور تعلق کی وضاحت کی تھی۔ اس کے نزدیک عرض البلاد کا فرق باکرہ عورتوں میں فرق پیدا کر دیتا ہے"۔

مونٹسکو: "یہ سمجھنا غلط ہے کہ میں نے تاریخ کو جغرافیہ میں تحلیل کر دیا تھا، مختلف قوموں کے لیے مختلف اسباب فیصلہ کن ثابت ہوئے ہیں، بعض کے لیے قوانین، بعض کے لیے مذہب، بعض کے لیے رسوم اور اخلاق اور بعض کے لیے طبیعی حالات اور آب و ہوا۔ ان میں سے آخری سبب یعنی طبیعی حالات اور آب و ہوا فقط وشیوں کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ چینیوں پر رسوم حاوی تھیں، جاپانیوں پر قوانین، سپارٹا پر اخلاق، اور حکومت کے اصول اور اطوار کی قدیم سادگی کئی نسلوں تک رومنوں کا کردار متعین کرتی رہی"۔

بکل: "لیکن میرے نزدیک آپ کی کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ تھا، جہاں آپ نے آب و ہوا اور تاریخ کے تعلق سے بحث کی ہے"۔

مونٹسکو: "میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے بھی اس مضمون سے دلچسپی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کردار اور مزاج کے اختلافات جو تقدیر اقوام پر خاص حد تک اثر انداز ہوتے ہیں، آب و ہوا سے بھی متاثر ہوتے ہیں، سرد علاقوں میں لوگ اکثر و بیشتر توانا ہوتے ہیں لیکن گرم علاقوں میں تن آسان یہ ایک معمولی سی بات ہے، لیکن اس کے نتائج کتنے اہم ہیں، ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ سکون اور عدم وجود تمام چیزوں کی اساس ہیں، اور تمام چیزوں کا عینی منتہا، اس لیے وہ بے عملی کو تمام کوائف سے بہتر اور تمام امیدوں کا مرکز و منبع سمجھتے ہیں۔ بے عملی ان کے لیے بلند ترین خوبی اور جنت کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ اس کے برعکس گرمی، دوزخ کا ایک بنیادی عنصر ہے، اس قدیم خیال کی وجہ سے بے عملی اعلیٰ مرتبہ کی علامت بن گئی ہے اور جو لوگ کام نہیں کرتے اپنے آپ کو کام کرنے والوں کا آقا سمجھتے ہیں۔ بہت سی جگھوں پر رواج ہے کہ لوگ اپنے ناخون نہیں کاٹتے، تاکہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ کام نہیں کرتے۔

اناطول فرانس: "فرانس میں اونچی ایڑی کے جوتوں کے رواج کا بھی یہی مطلب تھا، لیکن خود پسندی کی استقامت نے اب اس رواج کو عالمگیر بنا دیا ہے۔

مونٹسکو: "یہ کیا بات ہے کہ قبائل سے شکست کھانا جنوب کے باشندوں کا مقسوم بن گیا ہے؟ شاید اس لیے کہ شمال کی آب و ہوا میں انسان توانا ہوتا ہے اور جنوب کی آب و ہوا اسے کمزور اور ناتواں بناتی ہے۔ جنوب نے ہمیشہ دنیا کو غلام دیئے ہیں اور شمال نے آقا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایشیا گیارہ مرتبہ شمال کے وحشیوں سے شکست کھا چکا ہے"۔

والٹیئر: "جناب آپ کو شاید علم ہو کہ انگریزی کا لفظ سلیو (جس کے معنی ہیں غلام) لفظ سلاو سے نکلا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہمارے کلیسا نے عیسائیوں کو غلام بنانے کی ممانعت کردی تھی، سلاو لوگ اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، اس لیے انہیں آسانی سے بیچا جا سکتا تھا۔ اس طرح یہ لفظ، جس کا مفہوم کبھی شان و شکوہ تھا، غلامی کی علامت بن گیا۔ یہ شمالی غلام آپ کے کلیہ میں استثناء کا حکم رکھتے ہیں، لیکن یہ کوئی اہم استثناء نہیں"۔

مونٹسکو: "اس اصلاح کا شکریہ! میرا خیال ہے مسٹر بکل! کہ آپ نے بھی آب و ہوا اور تاریخ کے تعلق کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے"۔

بکل: "نہیں جناب! میں اس موضوع پر کچھ زیادہ کام نہیں کر سکا۔ جب میں پیدا ہوا تو تقریباً نیم مردہ تھا۔ میں بچپن بھر بے حد کمزور رہا اور اس لیے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل نہیں سکا، اپنی چالیس برس کی عمر میں شاید ایک دن بھی میں درد اور بیماریوں سے نجات نہیں حاصل کر سکا، میری آنکھیں خراب تھیں، اس لیے میری ماں نے زمانہ کے مذاق سے بے نیاز ہو کر مجھے پڑھانے کی بجائے بنا سکھا دیا، یہاں تک کہ آٹھ برس کی عمر تک میں نے حروف ابجد نہیں سیکھے تھے۔

کارلائل: "بس رہنے دیجیے ہر شخص جانتا ہے کہ چالیس برس کی عمر میں آپ انگلستان کے فاضل ترین انسان تھے، مجھے ہکسلے نے بتایا تھا کہ آپ اپنا سر علم کے بوجھ سے سیدھا نہیں کر سکتے تھے۔ آپ فرانسیسی، جرمن، ڈینش، اطالوی، ہسپانوی، پرتگالی، ولندیزی، والون، فلیموی، سویڈی، آئس لینڈی فریزک، موری، روسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی زبانیں جانتے تھے، آپ انگریزی لکھ سکتے تھے۔ میں نے ایک موقع پر ڈارون کو یہ کہتے سنا ہے کہ آپ کا جیسا عمدہ اسلوب نگارش انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے اسلوب نگارش کے متعلق زیادہ نہیں معلوم لیکن مجھے آپ کے تشریحی حاشیے بہت پسند آئے"۔

بکل: "میری یہ آرزو تھی کہ میں انگلستان کی تہذیب کی مکمل تاریخ لکھوں، لیکن بیس برس کی محنت کے بعد میں فقط "تمہید" لکھ سکا، جو چار جلدوں میں پوری ہوئی۔ پھر میری ماں کا انتقال ہو گیا اور میں اس سے آگے نہ لکھ سکا۔ اگر میری صحت اچھی ہوتی تو ممکن ہے کہ میں کوئی قابل ذکر کام کر سکتا"۔

مونٹسکو: "کیا آپ ازراہ کرم ہمیں اپنے مطالعہ کے نتائج بتائیں گے؟"

بکل: "آپ جانتے ہوں گے کہ بیلجیئم کے ماہر اقتصادیات، کیٹولیٹ نے شادی جیسے ارادی افعال اور پتہ لکھے بغیر ڈاک میں خط ڈال دینے کے بظاہر معمولی واقعات کو اعداد و شمار کی ایک

باقاعدہ اور مرتب شکل دی تھی۔ ان بظاہر معمولی واقعات اور ان سے ملتی جلتی معمولی باتوں کی بنیاد پر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب ہم انسان کے کردار پر اس کی تفصیلات کے ساتھ غور کرتے ہیں تو وہ آزاد معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس پر اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے اور ہمیں جو اندازہ ہوتا ہے، وہ واضح طور پر ان قوتوں سے متاثر ہوتا ہے جو انفرادی عزم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہیں، انسانی امور میں انفرادی خصوصیات کی کوئی اہمیت نہیں اور مورخ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ ترقی عظیم شخصیتوں کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ علم کو جمع کرنے اور پھیلانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مجھے اخلاق اور انسانی محرکات اور احساسات میں کوئی ترقی ہوتی نظر نہیں آتی، فقط سائنس ترقی کرتی ہے اور دنیا کو آہستہ آہستہ بدلتی رہتی ہے۔

موفسکو: "جو نتیجہ آپ نے اخذ کیا ہے وہ نہایت معقول ہے، میں نے ایک مرتبہ فوٹینل کو بھی اسی قسم کی کوئی بات کہتے سنا تھا"۔

بکل: "جناب! آپ کی طرح مجھے بھی تاریخ پر جغرافیہ کے اثرات کے موضوع سے دلچسپی ہے، آب و ہوا، زمین، غذا اور قدرت کے عام عناصر نے ہر نسل کی تاریخ کو متاثر کیا ہے۔ ہندوستان کے عظیم الشان قدرتی مناظر نے ہندوؤں کے ذہن اور ان کی ہمتوں کو پسپا اور مجبور کر کے اور انہیں اوہام اور پرستش کی طرف مائل کیا۔ یورپ کے سادہ مناظر نے انسان کی جرات میں کمی نہیں آنے دی اور اس کے مزاج میں فطرت کی پرستش کی بجائے فطرت پر قابو حاصل کرنے کا میلان پیدا کیا"۔

اناطول فرانس: "مسٹر بکل! یہ بات سب جانتے ہیں کہ آپ نے کبھی بحر اوقیانوس عبور نہیں کیا۔ ان وحشیوں میں، جو اب شمالی امریکہ میں بستے ہیں، قدرتی سائنس نے بے نظیر ترقی کی ہے اس کے باوجود کہ وہ مبالغہ کی حد تک مذہبی اور پرہیزگار ہیں۔ مسٹر بکل، آپ امریکیوں کو دیکھتے تو ان سے آپ کو یقیناً دلچسپی پیدا ہوتی"۔

بکل: "اول تو مجھے فرصت ہی نہیں دوسرے مسٹر ڈکنز نے ہمیں ان کے متعلق جو کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ بھی کچھ ایسی ہمت افزا نہیں تھیں، لیکن میں نے امریکہ کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا ہے، میں نے مغربی کرۂ میں جغرافیائی حالات کا عجیب امتزاج دیکھا۔ میکسیکو کے شمال میں مغربی ساحل پر بغیر نمی کے گرمی ہے اور مشرقی ساحل پر گرمی کے بغیر نمی ہے اس لیے کولمبس سے پہلے امریکی تہذیب میکسیکو اور وسطی امریکہ تک محدود تھی کیونکہ فقط اسی خطہ میں نمی اور گرمی کا وہ امتزاج موجود تھا، جو پودوں، حیوانوں اور انسانوں کی زندگی کے لیے سازگار ہے۔ اس کے بعد یورپ والوں کی آمد اور ایجادات اور اختراعات کی فراوانی نے انسانوں کو قدرتی حالات کا زیادہ محتاج

نہیں رکھا"۔

موٹسکو: "تو آپ جغرافیائی تعبیر کو قوتوں کی تاریخ کے ابتدائی زمانہ تک محدود کرتے ہیں؟

بکل: "جوں جوں انسان کا ماحول پر تسلط بڑھتا جاتا ہے واقعات کی تشکیل میں معروضی اور مادی مظاہر کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے"۔

ولیم جیمز: "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی، کیونکہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ ہم سب کو عرض البلد اور طول البلد میں ہی تحلیل نہ کر دیں، لیکن آپ کو شاید یہ جان کر خوشی ہو کہ مسٹر رٹیزل نے جو بڑی خاموشی اور انکسار سے یہ بحث سن رہے تھے، جغرافیائی تعبیر کو تاریخ کے اعلیٰ کوائف پر بھی اثر انداز دکھایا ہے"۔

بکل: "میں اس سلسلہ میں تازہ ترین خیالات اور تصورات کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔

رٹیزل: "جناب! امریکہ کا یہ عظیم فلسفی میری اہمیت بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لے رہا ہے۔ میرے زمانہ کے علم جغرافیہ میں جو بیش بہا تحقیقات ہوئی ہیں، میری تحقیق ان کا ایک حقیر حصہ تھی، رٹر، کویل، پیشل اور ریکلس اس میدان کے شہسوار تھے اور ڈاکٹر جیمز آپ کے ملک میں بھی پروفیسر ہنٹنگڈن نے نہایت مفید تحقیقات کی تھیں"۔

بکل: "آپ ہمیں اپنے خیالات سے مستفید فرمایئے!"

رٹیزل: "میں سیو موٹسکو اور آپ کے تصورات میں کسی قدر ترمیم کی اجازت چاہتا ہوں۔ گرم ممالک میں زندگی گرمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ زلزلوں، وباؤں، درندوں اور کیڑوں مکوڑوں کی وجہ سے دشوار بنتی ہے۔ نیم گرم ممالک میں گرمی کی کمی ایک رحمت ہے، وہ زندگی کے بیرونی مشاغل بزم پسندی، شدید جنسیت اور اس کے ساتھ ساتھ فن اور تمدن سے قریبی لگاؤ کا سبب بنتی ہے۔ سرد شمال [illegible] غالب طبقہ میں صنعت اور کاروبار کی طرف جو پرجوش میلان اور ملکیت، تسلط اور کارکردگی کی جو ہوس ہوتی ہے اس کی بدولت فن کی بجائے سائنس اور فرصت کی بجائے دولت کو ترقی کا موقع ملتا ہے۔ گھریلو زندگی سے بزم آرائی کے مشاغل کی کمی پوری ہوتی ہے اور مسلسل اور پیہم مقابلہ سخت قسم کی انفرادیت کی تخلیق کرتا ہے"۔

مارکس: "میں آپ کو بعد میں یہ بتاؤں گا کہ یہ سب نتائج جو آپ آب و ہوا سے منسوب کر رہے ہیں، وہ دراصل اقتصادی اسباب سے پیدا ہوئے ہیں"۔

بکل: "لیکن...... پروفیسر صاحب آپ اپنا سلسلہ کلام جاری رکھئے"۔

رٹیزل: "آب و ہوا سے قد اور چہرہ کی ساخت بھی متعین ہو سکتی ہے۔ بہت سے مبصرین یہ کہتے ہیں کہ امریکی لوگوں کی رنگت پیتل کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ سرخ ہندیوں کی طرح اور

پروفیسر بواس کا یہ خیال ہے کہ امریکہ کی آب و ہوا سے لمبے قد والے مہاجروں کی اولاد کے قد چھوٹے اور چھوٹے قد والے مہاجروں کی اولاد کے قد لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔ اور مختلف نسلوں کے سروں کی ساخت ایک سی ہوتی جا رہی ہے اور پروفیسر ہنٹنگڈن نے' پرنس کروپٹکن کی پیروی میں.....''

اناطول فرانس: ''پرنس کروپٹکن' فرد پرست صوفی' میری اس سے اچھی شناسائی تھی''۔

رٹیزل: ''پروفیسر ہنٹنگڈن نے یہ ثابت کیا ہے کہ بارش کی مقدار کسی قوم کی تقدیر متعین کر سکتی ہے' خشک جھیلوں کی تہیں ہزاروں ہجرتوں کی داستانیں سناتی ہیں اور وقتاً'' فوقتاً'' جب ایشیا میں بارش نہیں ہوئی تو تہذیبیں تباہ ہو گئیں''۔

ولیم جیمز: ''یہ بات بڑی دلچسپ ہوگی اگر کل یہ ثابت ہو جائے کہ ہجرتیں فتوحات اور بڑی بڑی سلطنتیں' سورج کے داغوں کے نشیب و فراز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں''۔

رٹیزل: ''ہر چیز ممکن ہے۔ ذرا دریاؤں کے اثرات پر غور کیجئے۔ نیلی اور گنگا' ہوانگ ہو اور نیگ سی' دجلہ اور فرات' ٹائیبر اور پو' ڈینوب اور ایلبا' سین اور ٹیمز' ہڈسن اور سینٹ لارنس' اوہیو اور مسیسی۔ ان کے زرخیز ساحلوں پر تقریباً تمام تہذیبوں کی بنیاد رکھی گئی اور ڈینوب' حضرات' اگر یہ کبود ڈینوب بول سکتا' تو کتنی مختلف قوموں کی داستانیں سناتا' جو ویران ایشیا کو خیرباد کہہ کے کم آباد یورپ میں چلی آئی تھیں۔ اگر روس کے دریا جنوب کی بجائے شمال کی طرف بہتے تو کبھی وہ قسطنطنیہ کی ہوس کرتا' جس کے لیے اس نے کئی جنگیں لڑیں ہیں۔ چونکہ روس کے دریا بحیرۂ اسود اور بحیرۂ کیسپن میں جا گرتے تھے' اس لیے ڈ۔نیپر نے اسے باز نطینی اور دولگا نے اسے ایشیائی بنا دیا' جب تک پطرس نے سینٹ پیٹرز برگ نہیں تعمیر کیا اور نیوا' جب تک جاری نہیں ہوا' اس وقت تک روس نے مغرب کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی اور یورپ کا ایک حصہ نہیں بنا''۔

بکل: ''یہ بات بہت دلچسپ ہے آپ کہتے جائیے' پروفیسر!''

رٹیزل: ''تاریخ میں ساحلوں کی اہمیت پر غور کیجئے۔ بحیرۂ روم نے کئی تہذیبوں کو اپنے پانیوں سے منسلک کر رکھا تھا۔ پھر اوقیانوس نے یورپ کو امریکہ سے ملا دیا اور تجارت کی شاہراہیں بدل گئیں''۔

ہیگل: ''میں نے اپنے ''فلسفہ تاریخ'' میں جس کا ذکر ابھی تک کسی نے نہیں کیا یہ کہا تھا کہ قدیم زمانہ کی تاریخ' بحیرۂ روم کے بغیر تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ جس طرح روما اور ایتھنز کا تصور' ان چبوتروں کے بغیر ناممکن ہے' جو سارے شہر کا مرکز تھے''۔

رٹیزل: ''مجھے آپ کی کتاب کا یہ حصہ اچھی طرح یاد ہے' ایک اچھے ساحل اور آس پاس

کے ہزاروں جزیروں نے یونان پر ایران اور مشرق کی راہیں کھول دیں اور اسے بحیرۂ روم میں تجارت کا مرکز بنا دیا۔ ساحل اور رقبہ کی کم زور نسبت نے ایشیا میں دولت کی ترقی کو روکا یہی حال آج کل افریقہ کا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ بھی، جہاں ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک خاصا فاصلہ ہے، ایک پسماندہ ملک رہ جاتا ہے اگر ریل گاڑیوں نے اس کے ہر علاقہ کو ساحل سے نہ ملا دیا ہوتا"۔

اناطول فرانس: "جنگ عظیم کے دوران میں، روس نے بالٹک کی ایک بندرگاہ کے لیے، جرمنی نے رائین کے دہانہ کے لیے فرانس نے سارے رائین کے لیے، آسٹریا نے ٹری اسٹ اور فیوم کے لیے، انگلستان نے ساری دنیا کے لیے اور امریکہ نے جمہوریت کے لیے جنگیں لڑیں۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ آپ جغرافیہ کے اثر کو مبالغہ آمیز اہمیت دے رہے ہیں۔ آپ نے ماضی کے چند پہلوؤں کو جغرافیہ کے نقطۂ نظر سے تقسیم کر دیا ہے لیکن چند اور پہلو بھی ہیں اور میرا خیال ہے کہ قوموں کی زندگی اور تقدیر اس اصول سے ماورا ہے، دنیا کے ہر خطہ میں عظیم قوموں نے جنم لیا ہے اور مختلف آب و ہواؤں میں ان کا عروج و زوال ایک ہی طرح رونما ہوا ہے"۔

رٹیزل: "میری بات کا مطلب غلط نہ سمجھئے، میں تاریخ کے ہر پہلو کو جغرافیہ میں تحلیل کرنا نہیں چاہتا، مجھے فقط چند پہلوؤں کی توجیہہ مقصود ہے"۔

ولیم جیمز: "آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔

امریکہ کے ایک بزرگ استاد نے کہا تھا "تاریخ میں، جغرافیائی حالات کے اثرات کی اہمیت کو کم کرنے کی تحریک جاری ہے"۔

بکل: "آپ بجا فرماتے ہیں، جغرافیائی حالات محض لابدی پابندیاں ہیں۔ فیصلہ کن قوتیں نہیں ہیں، وہ ایسے حدود قائم کرتے ہیں، جن کے اندر دوسری قوتیں کسی قوم کو عروج و زوال کی طرف لے جاتی ہیں، خلیج کے بہاؤ کے بدلنے سے انگلستان تباہ ہو سکتا ہے لیکن خلیج کے بہاؤ نے انگلستان کو عظمت نہیں بخشی۔ تمام اعلیٰ تہذیبوں میں فیصلہ کن اسباب اقتصادی یا ذہنی نوعیت رکھتے ہیں"۔

والٹیئر: "یہ خیال نہایت معقول ہے، میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ انگریز سمجھدار ہوتے ہیں۔ یہ خیال ایسا ہے جس میں موسیو مونٹسکو مجھ سے متفق ہیں"۔

نیطشے: "شاید آپ دونوں کا خیال صحیح نہیں"۔

۴- تاریخ کی نسلی تعبیر

اناطول فرانس: ”موسیو بکل، آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ فیصلہ کن اسباب، اقتصادی، ذہنی یا نسلی ہو سکتے ہیں۔ میرے زمانہ میں بہت سے طلباء قوموں کے عروج و زوال کو نسلی خصوصیات سے منسوب کر رہے تھے۔ اس طرح پروفیسروں کے لیے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ وہ بیک وقت سائنس دان اور وطن پرست بن سکیں۔ بس کاؤنٹ گوبینو اس معاملہ میں ایک استثناء ہیں وہ نہ پروفیسر تھے، نہ محب وطن“۔

گوبینو: ”جب آپ صرف دس برس کے تھے، تو میں نے ایک کتاب شائع کی تھی ”انسانی نسلوں کے اختلافات“ جس میں میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انسانی تخلیق کے ہر شعبہ سائنس، فن، تہذیب، الغرض ہر اس چیز کا جو اس دنیا میں عظیم، بلند اور مفید ہے، سرچشمہ ایک ہی ہے، سب کی جڑ ایک ہی ہے اور وہ ہے ٹیوٹن نسل۔ انسانی کنبہ کی اس شاخ کا بیج، غالباً سیاہ اور زرد نسلوں کے بیج سے مختلف تھا۔ اس کے افراد کا انداز کچھ اور ہی تھا اور اس کی مختلف شاخوں نے دنیا کے ہر مہذب گوشہ پر تسلط حاصل کیا ہے۔ نسل کے تصور سے تاریخ کی توجیہہ ہو سکتی ہے، جیسے میرے دوست نیطشے نے کہا ہے، ”قیادت کے لیے ذہن کی ضرورت نہیں بلکہ خون کی ضرورت ہے“۔

نیطشے: ”کاؤنٹ گوبینو! میں آپ کا مداح ہوں، لیکن اس نسلی تصور سے میرا کوئی واسطہ نہیں، میں نے ہر نسل کے کچھ لوگوں میں اچھے خون کی علامتیں دیکھی ہیں۔ وینس کے کشتی بانوں کا خون، غالباً جرمن نوجوانوں کے خون سے بہتر ہے“۔

اناطول فرانس: ”محترم کاؤنٹ! آپ کے تصور سے انگریز اور جرمن ناخوش نہیں ہوئے، پروفیسر فری مین نے اسے ناشائستہ سرعت سے اپنایا، پروفیسر ٹرائی اسکے نے اسے خوشی سے قبول کیا اور ڈاکٹر برنارڈی نے یہ تسلیم کیا کہ جرمن قوم تاریخ کی مہذب ترین قوم ہے۔ موسیو چیمبرلین نے، جنہوں نے انگلستان چھوڑ کر جرمنی میں سکونت اختیار کی، ایک ضخیم کتاب لکھی ”انیسویں صدی کی بنیادیں“ جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ”اصل تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب جرمنوں نے اپنے قوی ہاتھوں سے عہد پارینہ کی وراثت کو اپنایا۔ میرا خیال ہے کہ اس وراثت کے معماروں نے تاریخ کی تخلیق نہیں کی تھی۔ مسٹر چیمبرلین کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی شخص میں عظمت کے آثار ہوں، تو یہ سمجھ کر اس کی رگوں میں ٹیوٹن خون موج زن ہے، انہیں ڈانٹے کا چہرہ جرمن معلوم ہوا۔ انہیں پولوس رسول کے ”گلیتیوں کے نام خط“ میں جرمن لہجہ کی گونج سنائی دی اور اگرچہ وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ مسیح جرمن تھا لیکن انہوں نے پورے وثوق سے کہا کہ ”جو شخص یہ کہتا ہے کہ مسیح یہودی تھا، یا جاہل ہے یا بددیانت“۔ رچرڈ واگنر نے اس

تصور کو موسیقی پر چسپاں کیا۔ پچاس برس، مفلسی میں بسر کرنے کے بعد اس وحشی نے یہ جان لیا کہ تاریخ کی ٹیوٹنی تعبیر کو اپنانے اور اپنے بچپن کی پارسائی کی نمائش کرنے سے وہ شاید رئیس طبقہ کو اپنی موسیقی کی طرف مائل کر سکے"۔

نیطشے: "مجھے اس سے بہت محبت تھی، لیکن آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ وہ ڈھونگ رچانے میں ماہر تھا"۔

اناطول فرانس: "ہر عظیم شخصیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کی "نیم حکیمی" کے بغیر وہ بھوکا مرجاتا، جمہوری ممالک میں اس کی خاص طور پر ضرورت پڑتی ہے"۔

ولیم جیمز: "ہمارے زمانہ کے عقلمند لوگ نسل کے تصور کے حامی تھے۔ گالٹن نے عظمت کو وراثت میں تحلیل کیا، علم الارث نے رئیسوں کی اولاد کی حمایت میں ایک مہم شروع کی۔ میکس ملر، لسانیات کی تشریح اس طرح کر رہا تھا کہ آریہ قوم، ہندوستان سے یورپ آئی اور وائزمن ثابت کر رہا تھا (سائنس بہت سی چیزیں ثابت کرتی ہے، فقط ایک دن کے لیے) کہ مادۂ حیات ہمارے جسم کے بدنام حصوں میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ ماحول کے اثرات سے بے نیاز ہے۔ ماہرین حیاتیات، وراثت پر اور مورخ نسل کے تصور پر ادھار کھائے بیٹھے تھے"۔

اناطول فرانس: "حضرات، شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ موسیو میڈ-سن گرانٹ، جو حال ہی میں نیویارک سے آئے ہیں، اس مضمون کے ماہر ہیں۔ میں نے اپنے بڑھاپے میں، ان کی کتاب "ایک عظیم نسل کا خاتمہ" دیکھی تھی۔ میں نے اسے اس خیال سے پڑھنا شروع کیا کہ شاید ان کا مطلب فرانس قوم کا خاتمہ ہے، لیکن جب میں نے دیکھا کہ ان کا اشارہ جرمن اور انگریز اقوام کی طرف ہے تو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسے آگے پڑھنا فضول ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ غلط کہہ رہے ہیں"۔

والٹیئر: "آپ اپنے خیالات سے ہمیں آگاہ کیجیے، موسیو گرانٹ اور اگر موسیو فرانس کو آپ سے اتفاق نہیں تو پریشان نہ ہوجیے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم فرانسیسی غلطی پر ہوں اور باقی دنیا ٹھیک کہتی ہو"۔

گرانٹ: "میرا نظریہ، مسٹر چیمبرلین اور مسٹر گوبینو کے نظریوں سے مختلف ہے۔ میں ٹیوٹنی نسل کے تصور کو غلط سمجھتا ہوں کیونکہ یہ نسل، مختلف نسلوں کا امتزاج ہے، جن میں ابھی تک ربط پیدا نہیں ہوا۔ میں اپنا تصور فقط نارڈک نسل تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، جو ہمارے زمانہ میں خصوصیت سے ان جرمنوں میں نظر آتی ہے، جو بالٹک کے علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، یا ان انگریزوں اور امریکیوں میں جو اینگلو سیکسن نژاد ہیں لیکن یہ تقسیم جدید ہے اور نسل، تاریخ کی طرح

قدیم ہے۔ سب سے پہلے نارڈک، ساچی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جنہوں نے ہندوستان کو سنسکرت سے متعارف کیا۔ وہ شمال سے سفید حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تھے اور انہوں نے اثر مناکحت اور اپنی نسل کے تنزل کو روکنے کے لیے ذات، ایجاد کی "ذات" کا مطلب رنگ تھا اور اس کا وظیفہ اقتصادی نہیں، حیاتیاتی تھا۔ اس کا مقصد اقتصادی مواقع کی اجارہ داری حاصل کرنا نہیں بلکہ خون کا تحفظ تھا۔

پھر ہم سارین قوم کو قفقاز سے ایران میں آتے دیکھتے ہیں۔ آخیین، فرجیین اور ڈورئین قوموں نے ایشیائے کوچک اور یونان کی تسخیر کی۔ ابرین اور اوسکن قوموں نے اطالیہ پر فتح پائی۔ جہاں کہیں وہ گئے، وہ جنگجو سپاہیوں، معرکہ پسندوں، سیاحوں، حاکموں اور قائدوں کی حیثیت سے گئے۔ دوسری یورپی نسلوں، مثلاً خاموش اور رضاجو ایلپی، بحیرہ روم کے علاقہ کے جوشیلے، متلون مزاج اور تساہل پسند لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ یہ تضاد اطالیہ میں بہت نمایاں ہے۔ جنوبی اطالیہ کے لوگ بحیرہ روم کے علاقہ کی دوسری نسلوں کی مانند ہیں۔ وہ ان تمام نسلوں کے گمنام غلاموں کی اولاد ہیں، جنہیں رومنوں نے اپنی وسیع اور فراخ املاک پر کام کرنے کے لیے درآمد کیا تھا۔ شمالی اطالیہ کے لوگ بہتر نسل سے ہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر ان جرمن فاتحین کی اولاد ہیں، جو سیزر سے لے کر شارلیمین تک اطالیہ پر حملے کرتے رہے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے فلورنس میں احیائے علوم کی تحریک شروع کی اور پھر اسے اپنے ساتھ روما لے گئے۔ ڈانٹے، رفیل، ٹیشین، مائیکل اینجلو، لیونارڈو ڈاونچی، سبھی نارڈک نسل سے تھے۔ یونان میں آخیین قوم نے مفتوح قوم کے ساتھ اثر مناکحت شروع کر دی اور پیریکلیز کے عہد کے ایتھنز کے ذہین اور زیرک لوگ پیدا کیے۔

اناطول فرانس: "آخیین قوم بہت غیر ذمہ دار تھی کہ اس نے اس طرح اثر مناکحت شروع کر دی!"

والٹیئر: "آپ فرانس کی باتوں کی پروا نہ کیجئے، آپ کے خیالات نہایت دلچسپ ہیں، آپ جاری رکھئے"۔

گرانٹ: "ڈورین قوم نے اثر مناکحت سے پرہیز کیا اور اسپارٹا کی قوم بن گئی۔ ایک جنگجو قوم جو ڑدی غلاموں پر حکمراں رہی، اعلیٰ طبقے کے یونانی گورے تھے، ادنیٰ طبقہ کے کالے۔ اولمپس کے دیوتاؤں کے بیان میں انہیں ہمیشہ گورا بتایا گیا ہے۔ یہ تصور کرنا محال ہے کہ کوئی یونانی فن کار گندمی رنگ کی وینس بنائے گا۔ آج کلیسا میں تمام فرشتے گورے رنگ کے دکھائے جاتے ہیں اور ادنیٰ طبقہ کے آدمی گہرے گندمی رنگ کے۔ قدیم منقش پردوں پر اکثر کوئی گورا نواب گھوڑے پر سوار نظر آتا ہے اور اس کی باگیں ایک سیاہ بالوں والے گنوار کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ صلیب کی

تصویر بناتے ہوئے کوئی فنکار مسیح کو گورے اور دو چوروں کو گندمی رنگ میں ڈھالتے ہوئے نہیں ہچکچائے گا۔ یہ محض رسم نہیں بلکہ یہ روایات بتاتی ہیں کہ مسیح نارڈک غالباً یونانی نسل کا جسمانی اور اخلاقی صفات کا مالک تھا"۔

اناطول فرانس: "بڑا آدمی بننا بھی بڑی بد نصیبی ہے، تم ساری عمر فاقے کرو اور جب تم مر جاؤ تو لوگ تمہیں، سوائے تمہاری اپنی ہیئت کے ہر ہیئت دینے کو تیار ہیں۔ لیکن آپ اپنی بات جاری رکھئے۔ نارڈک نسل کے لوگ شوق سے مسیح کو لے جائیں، یہودیوں کو اس کی ضرورت نہیں"۔

گرانٹ: "یونان نے مقدونیہ سے شکست کھائی، جہاں یونانی نسل اثر مناکحت سے خراب ہو گئی تھی۔ مقدونیہ کے لوگ نارڈک تھے۔ انہوں نے ایران کو شکست دی، کیونکہ ایرانیوں نے غیر ایرانی ایشیائی نسلوں سے اثر مناکحت کر کے اپنے آپ کو کمزور کر لیا تھا، پھر عظیم حملوں کے عہد تک ہمیں نارڈک نظر نہیں آئے۔ وہ بالٹک تک پہنچ گئے تھے۔ سکینڈ نیویا کو آباد کر رہے تھے اور اس علاقہ سے وہ سینکڑوں سمتوں میں پھیل چکے تھے۔ یورپ کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں یہ ظالم نہ پہنچے ہوں اور جہاں انہوں نے حکومت نہ کی ہو۔ پہلے انہوں نے روما کو فتح کر لیا اور احیائے علم کے زمانہ کے نواب نارڈک تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ فرانس کو فتح کیا۔ فرینک، نارڈک ٹیوٹن تھے اور انہوں نے فرانس کو جرمن کا نام دیا۔ شارلیمین جرمن شہنشاہ تھا۔ اس کا دارالخلافہ آخن تھا۔ اس نے جرمن کو اپنی درباری زبان بنایا۔ دلاوری، سرداری، جاگیرداری، طبقاتی تقسیم، نسلی خودداری، ذاتی اور خاندانی غرور، نارڈک عادات اور خصائل میں شمار ہوتے تھے۔ یہ وہی جابرانہ مزاج تھا، جس نے فرانس، صقلیہ اور انگلستان کو فتح کیا تھا۔ اسی نے روس کو فتح کر کے ۱۹۱۱ء تک مطیع رکھا۔ اسی نے امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں نو آبادیاں قائم کیں۔ اسی نے یورپ کے تاجروں پر ہندوستان اور چین کے دروازے کھول دیئے اور اپنے سنتری ایشیا کی ہر بندرگاہ پر متعین کر دیئے، یہ وہی لوگ ہیں جو بلند ترین کوہساروں کو عبور کرتے ہیں۔ ایلپس کو کھیل کا میدان سمجھتے ہیں اور قطبین کی کھوج میں بے سود سفر اختیار کرتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۷۸۹ء میں فرانس میں اس کے قدم اکھڑ گئے۔ انقلاب فرانس، دراصل اصلی فرانسوی نسل کی ٹیوٹن سرداروں کے خلاف بغاوت تھی، جنہوں نے فرانس کو ایک ہزار برس تک مطیع رکھا تھا۔ نارڈک قوم کی صلیبی جنگوں میں پیکار پرستی جو خودکشی کے برابر تھی تیس سالہ جنگ، نپولین کے معرکے اور جنگ عظیم نے نارڈک نسل کا خون چوس لیا۔ انگلستان اور جرمنی میں نارڈک نسل کے لوگ اپنی کم شرح پیدائش کی وجہ سے ختم

ہوتے جا رہے تھے۔ روس میں وہ ان وحشیوں سے شکست کھا گئے ہیں، جن کی قیادت ایک منگول اور ایک یہودی کر رہا ہے۔ امریکہ میں جنوبی یورپ کے مہاجرین، ان مہاجروں کی زیادہ شرح پیدائش اور جمہور کی حکومت اور ان کے بڑھتے ہوئے اثر نے انہیں بے بس کر دیا۔

اناطول فرانس: "بہت خوب! کیا عمدہ بات فرمائی ہے آپ نے!"

گرانٹ: "اس کا نتیجہ، تہذیب کا انحطاط ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں معیار اور ذوق کا زوال ہے، نغمہ و موسیقی، رقص و سرود، تمثیل۔ کامیاب ارباب سیاست اب عوام میں سے اٹھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہجرت پر کڑی پابندیاں اور نارڈک اور غیر نارڈک نسلوں کے درمیان اثر مناکحت کی ممانعت، امریکہ کو محفوظ کردے گی لیکن پانی سر سے گزر چکا ہے، شرح پیدائش کے اختلافات ہجرت اور اثر مناکحت کے ساتھ ساتھ تہذیب کو ختم کردیں گے۔ ۲۰۰۰ء تک نارڈک نسل ہر جگہ اپنا اقتدار کھو دے گی اور اس کے ساتھ یورپ اور امریکہ کی تہذیب ادنیٰ نسلوں سے ابھرتی ہوئی ایک نئی بربریت کی نذر ہو جائے گی۔

اناطول فرانس: "یہ ایک نہایت تاریک تصویر ہے، لیکن پھر بھی ایلپی فرانسیسی، اطالوی، آسٹروی اور روسی باقی رہ جائیں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ روسی اپنے آپ کو جمہوریت کے ہاتھوں تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ نارڈک نسل کے لوگوں یعنی انگریزوں کو یہ کیا شرارت سوجھی کہ انہوں نے اکثریت کی حکومت ایجاد کی! لیکن حضرت، سچ سچ بتائیے کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ نارڈک نسل کے لوگ بہت عمدہ لوگ ہیں؟ میرے نزدیک تو وہ بہت بڑے جنگجو، ڈاکو اور لٹیرے تھے۔ کیا یہی تہذیب ہے؟"

گرانٹ: "انہوں نے جدید یورپ کی ریاستوں کو منظم کیا اور ہماری تہذیب کو ممکن بنایا"۔

نیطشے: "اگر انہوں نے جدید یورپ کی ریاستوں کو منظم کیا، تو یہ اور بھی بری بات کی۔ بہتر ہوتا کہ یہ ریاستیں قائم نہ ہوتیں، تب پاپائے روم ایک متحدہ یورپ پر حکومت کرتا۔ اپنے استحکام اور طاقت کے زیر اثر کلیسا میں فن اور آزادی کا گداز پیدا ہوتا اور مہذب طبقہ اسی طرح آزاد ہوتا، جس طرح آج پیرس یا وی آنا میں ہے، یا لیو دہم کے وقت روما میں تھا اور عوام "یادگاری توشہ" حاصل کرکے مطمئن رہتے"۔

گرانٹ: "آپ قدرت پرست ہیں، جناب"۔

نیطشے: "یقیناً یونانی زبان جانتے ہوئے میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا"۔

اناطول فرانس: "چند دنوں کی بات ہے کہ ہم نے مل کر ایک "انتخاب" کیا اور جس طرح امریکی حیاتیات کے بارے میں رائے شماری کرتے ہیں، اس طرح ہم نے یہ متعین کرنا چاہا کہ اس

عالم بقا میں ہم میں سے عظیم ترین شخصیتیں کون سی ہیں۔ مجھے منتخب لوگوں کے نام یاد ہیں۔ اس فہرست میں شیکسپیئر تھا، ابھی تک اسے اس زمرہ سے خارج کرنے کی کسی کو ہمت نہیں۔ پھر اس فہرست میں بیتھوون اور مائیکل اینجلو کا موسیٰ، اور مسیح، جو واقعی بہت پیارا آدمی ہے، شامل تھے۔ افلاطون ان میں فلسفیوں کا نمائندہ تھا اور لیونارڈ فن کاروں کا۔ میں نے والٹیئر کو شامل کرنے پر اصرار کیا۔ نیطشے نے نپولین کی سفارش کی اور برانڈیس نے کہا کہ "سیزر کو بھی شامل کر لو"۔ میں نے ریلیز کا نام لیا لیکن انتخاب کرنے والوں نے حماقت کی، جو ہر اجتماع کرتا ہے اور ڈارون کو چن لیا۔ اس فہرست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے موسیو گرانٹ"۔

گرانٹ: "بہت اچھی ہے یہ فہرست"۔

اناطول فرانس: "جواب دینے سے پہلے آپ نے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ یہ فہرست آپ کی نارڈک نسل کے خلاف جاتی ہے۔ ان دس حضرات میں سے صرف تین نارڈک نسل سے تعلق رکھتے ہیں، باقی یہودی، یونانی اور لاطینی ہیں۔ میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ فن اور ادب، فلسفہ اور مذہب، اور قلب و نظر کے معاملات میں نارڈک اتنے عظیم نہیں، جتنے وہ ایک دوسرے کو ذبح کرنے اپنے ہمسایوں کو تباہ و برباد کرنے اور ٹیکس لگانے میں ہوشیار ہیں"۔

گرانٹ: "آپ کی باتوں نے مجھے بوکھلا دیا ہے، حضور، بروسون کے آنے پر میں اپنا انتقام لوں گا"۔

اناطول فرانس: "میں اسے واپسی کا ٹکٹ خرید دوں گا"۔

گرانٹ: "آپ غالباً صحیح کہہ رہے ہیں، نارڈک اور ایلپس جسمانی ہیئت میں تیز لیکن بحیرۂ روم کے علاقہ کے لوگ ذہنی طور پر ان دونوں سے برتر تھے۔ فن کے معاملہ میں موخرالذکر کی عظمت میں کسی کو کلام نہیں۔ جہاں تک جدید یورپ کا تعلق ہے، تہذیب شمال سے نہیں، جنوب سے آئی تھی۔ پرانے رومی اسی نسل سے تھے، مصر کی دریا تہذیب، کریٹ کی شاندار منوی سلطنت، ایٹریا کی سلطنت (جو روما کی پیش رو اور رہنما تھی) بحیرۂ روم اور بحر اسود کے گرد یونانی ریاستیں اور نو آبادیاں، فنیشیا کی بحری اور تجارتی طاقت اور اس کی عظیم نو آبادی، کارتھج۔ یہ سب رومی نسل کی تخلیقات تھیں، انہیں یورپ میں کلاسیکی تہذیب پھیلانے کا فخر حاصل ہے۔

اناطول فرانس: "آپ کے اعترافات نہایت فیاضانہ ہیں، میں اس بات پر زور نہیں دوں گا کہ ایتھنز کے لوگ، جو نارڈک اور رومی نسلوں سے اثر مناکحت کی پیداوار تھے، سوائے جنگ کے ہر معاملہ میں اسپارٹا کے لوگوں سے بہتر تھے، جو بقول آپ کے خالص نارڈک تھے، میں صرف یہ درخواست کروں گا کہ ذرا سکینڈ نیویا کی طرف دیکھئے، جس نے عظیم ابسن اور نوبل پرائز کو جنم دیا۔

ذرا ان خالص نارڈک لوگوں کی تہذیبی سرگرمیوں کا احیائے علوم کے اطالویوں کے فن، ادب، سائنس اور فلسفہ سے مقابلہ کیجئے، جو آپ کے نزدیک نارڈک اور غیر نارڈک نسلوں کے ملاپ کی پیداوار تھے۔ کیا آپ کو یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ نارڈک اور غیر نارڈک نسلوں کے ملاپ سے بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں"۔

گرانٹ: "کبھی کبھی"۔

نیطشے: "نسل کیا ہوتی ہے؟"

گرانٹ: "ہر عیاں بالذات چیز کی طرح نسل کی تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نسل" ایک ہی ماخذ کے لوگوں کے مجموعہ کا نام ہے جس کے اکثر افراد ایک ہی مخصوص رنگت، ایک ہی طرح کے بال، کھوپڑی کی ایک سی ساخت اور ایک ہی قد و قامت رکھتے ہوں"۔

اناطول فرانس: "جب میں انگلستان میں تھا تو موسیو ہلیئر .بیلک نے مجھے بتایا کہ ایک شخص نے یہ پتہ لگایا ہے کہ وہ نارڈک نسل سے تعلق رکھتا ہے اور وہ سر کی ساخت، قد، رنگ اور بالوں کے لحاظ سے ایلپی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک عورت کے پانچ بچے ہیں، جن میں سے دو رومی، ایک ایلپی، ایک نارڈک اور ایک تینوں نسلوں کا مرکب ہے۔ یہ سب قسمیں ممکن ہے انگلستان میں موجود ہوں لیکن موسیو .بیلک کا خیال تھا کہ غالباً یہ خاتون سیر و سیاحت کرتی رہی ہے"۔

گرانٹ: "میں مانتا ہوں کہ کوئی نسل خالص نہیں ہوتی اور ہر فرد میں مختلف نسلوں کا خون شامل ہوتا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ انگلستان کے رئیس، ان امریکیوں سے کہیں زیادہ خالص ہیں، جو جدید امریکہ کے خونوں کے انتشار سے پیدا ہوں گے"۔

بکل: "میرا خیال ہے کہ انگریز قوم، کیلٹ، رومن، اینگل، سیکسن، جیوٹ، ڈین اور نارمن نسلوں کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے"۔

گرانٹ: "لیکن ان میں سے اکثر نسلیں، نارڈک نسل کی شاخیں تھیں۔ حقیقت میں وہ ایک ہی نسل تھے"۔

رٹیزل: "حضرات، کیا میں مخل ہو سکتا ہوں؟ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یورپ کی یہ تینوں نسلیں دراصل ایک ہی نسل کی شاخیں ہیں۔ یہ نسل مشرق سے ابھری تھی اور ایلپیوں کی طرح وحشی تھی، پھر یہ شمال اور جنوب میں پھیل گئی اور مختلف جغرافیائی اور اقتصادی حالات کے زیر اثر نارڈک اور رومی نسلوں میں بٹ گئی۔ نسلی اختلافات، ماحول کے اختلافات سے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے نسل کو تاریخ کا فیصلہ کن سبب نہیں کہا جا سکتا۔

شمال کے لوگ جب وہ کچھ عرصہ تک گرم ممالک میں رہیں تو جنوب کے لوگوں کی خصوصیات حاصل کر لیتے ہیں۔ پہاڑوں کو عبور کرنے والے ہر جگہ لمبے قد کے ہوتے ہیں چاہے وہ کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ جرمن جو جنوبی برازیل میں ہجرت کر گئے ہیں، آہستہ آہستہ اپنی "توانائی" کھو بیٹھے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے انگریزوں کی طرح وہ درختوں کے نیچے بیٹھتے ہیں اور کسی کالے آدمی کو کام کرنے کے لئے ملازم رکھتے ہیں۔ نسلی خصوصیات جغرافیائی حالات سے پیدا ہوتی ہیں"۔

۵- تاریخ کی معاشی تعبیر

مارکس: "ٹھہریئے جناب ریٹرل، صرف جغرافیائی ماحول کو آخر اتنی اہمیت کیوں؟ قد، غذا سے کیوں نہیں اور صرف آب و ہوا اور نسل ہی سے کیوں متعین ہوتا ہے؟ مجھے حیرت ہے کہ یہ بحث اتنی دیر سے ہو رہی ہے اور کسی نے تاریخ کی معاشی تعبیر کا ذکر تک نہیں کیا"۔

والٹیئر: (اناطول فرانس سے) "یہ سیاہ سنجیدہ داڑھی والا دیوتا کون ہے؟"

اناطول فرانس: (والٹیئر سے) "یہ محاذ جنگ کا سقراط، کارل مارکس ہے۔ اس نے ایک بے حد زوردار کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں طاقتور، کمزور کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں"۔

والٹیئر: "یہ ایک نادر انکشاف ہے، کیا اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس استحصال کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے؟"

اناطول فرانس: "ہاں! اس کا خیال ہے کہ کمزور اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے طاقتوروں کا خاتمہ کر دیں گے"۔

والٹیئر: (مارکس سے) "آپ کا کیا نظریہ ہے، موسیو؟"

مارکس: "جناب میرا نظریہ نہایت سادہ ہے، میرے نزدیک ہر زمانہ میں معاشی پہلو تاریخ کا بنیادی پہلو رہا ہے۔ پیداوار اور تقسیم کا طریقہ، دولت کی تقسیم اور اسے صرف کرنے کا انداز، آقا اور ملازم کا تعلق، امیر اور غریب کی طبقاتی آویزش۔ یہ ہیں وہ اسباب جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں یعنی مذہب، اخلاق، فلسفہ، سائنس، ادب اور فن کی نوعیت کو متعین کرتے ہیں۔ پیداوار سے پیدا ہونے والے مختلف قسم کے رشتے اجتماعی طور پر اقتصادی نظام کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں اور اس بنیاد پر قانونی اور سیاسی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی کے مطابق اجتماعی شعور ڈھلتا ہے"۔

والٹیئر: "آپ کی باتیں بڑے مجرد اور ٹھوس انداز کی ہیں اور انہیں سن کر میرے سر میں ہلکا ہلکا سا درد ہونے لگا ہے۔ لیکن جناب شاید آپ اپنے مجرد تصورات کو مثالوں کے ذریعہ واضح کر سکیں"۔

مارکس: "بہت بہتر! میں اپنے نظریہ کی روشنی میں انسان کی مکمل تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تاریخ کو قدیم، متوسط اور جدید زمانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ تاریخ کی یہ تقسیم عہد وسطیٰ کے مفکروں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ میں نے انسانی تاریخ کو شکاری اور شبانی، زراعتی اور دستکاری، صنعتی اور مشینی عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ میں جتنے عظیم واقعات پیش آئے ہیں وہ عظیم سیاسی نہیں، اقتصادی ہیں۔ میں میراتھون کی جنگ، سیزر کے قتل اور انقلاب فرانس کو نہیں، بلکہ زراعتی انقلاب اور صنعتی انقلاب کو تاریخ کے اہم اور عظیم واقعات سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ان میں سے ایک نے زندگی کے نظام کو شکاری سے زراعتی بنایا اور دوسرے نے گھریلو صنعتوں کی جگہ کارخانہ کی صنعتوں کو رائج کیا"۔

والٹیئر: "گویا آپ کے نزدیک دولت اور افلاس کی شکلوں کا بدلتے رہنا زندگی کی سب سے اہم حقیقت ہے"۔

مارکس: "محض یہی نہیں بلکہ اقتصادی حالات، سلطنتوں کے عروج و زوال کا سبب ہوتے ہیں۔ سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی حالات کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بداخلاقی، تعیش پرستی، نفاست پسندی، یہ اسباب نہیں بلکہ نتائج ہیں۔ ہر چیز کی تہ میں زمین کا فرق اور اس کی نوعیت اپنا کام کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی خاص زمین پر کھیتی باڑی ہو سکتی ہے یا وہ صرف شکار اور بھیڑ بکری پالنے کے لیے موزوں ہے! یا اس میں مفید معدنیات پوشیدہ ہیں؟ مصر اپنے لوہے کی وجہ سے مشہور ہوا، قدیم برطانیہ اپنے ٹین کی وجہ سے اور جدید برطانیہ اپنے لوہے اور کوئلے کی وجہ سے۔ ایتھنز کی چاندی کی کانیں جب خالی ہو گئیں تو ایتھنز کی قوت ختم ہو گئی۔ مقدونیہ کے سونے نے فلپ اور سکندر کے ہاتھ مضبوط کیے۔ روما نے ہسپانیہ کی چاندی کی کانوں کے لیے کارتھج سے جنگ لڑی اور جب اس کی زمین بنجر ہو گئی تو وہ زوال پذیر ہو گئی"۔

اناطول فرانس: "مجھے تاریخ کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میرا علم صرف ادب اور فلسفہ کی بیکار تفاصیل تک محدود ہے۔ لیکن جناب، میں اپنے زمانہ کی جنگوں کا جائزہ لے کر آپ کی تائید کر سکتا ہوں۔ وہ سب کی سب قدرتی ذرائع پیداوار، یا کسی اجنبی ملک کے تجارتی مواقع حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں"۔

مارکس: "شکریہ۔ آپ نے تجارتی مواقع کا ذکر کیا۔ یہ بھی یقیناً تاریخ کی تعیین میں حصہ

لیتے ہیں۔ یونانیوں نے ٹروجن جنگ کیوں لڑی؟ کیا وہ ایک آوارہ عورت کے حسن کے لیے لڑی گئی تھی؟ اگر ہیلن کا کوئی وجود ہوتا' یقین مانئے کہ اسے محض اقتصادی محرکات پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ یونانی چاہتے تھے کہ ان کے تجارتی رقیبوں' اور ان کے معاونین کو اس شہر سے خارج کیا جائے جو ایشیا کو جانے والے بحری راستہ پر قابض تھے"۔

ولیم جیمز: "تو گویا ہیلن کے چہرہ نے ہزاروں جہازوں کے بادبان ہوا میں نہیں لہرائے تھے"۔

مارکس: "جہاں تک مجھے علم ہے' نہیں! آپ یہ جانتے ہوں گے کہ وہ بحری بیڑا' جسے تھیمو سٹیکلیس نے یزد جرد کے خلاف بنایا تھا' مسیح سے پانچ صدیاں پہلے ایتھنز کی جمہوریت کی بنیاد تھا اور ڈیلیا کی حکومت کی دولت سے ایتھنز نے اپنے شاندار صنم خانے تعمیر کیے تھے۔ چرائے ہوئے سونے کی بدولت فن کے یہ شاہکار استوار کیے گئے تھے۔ فن کے اکثر زریں عہد' دولت سمیٹنے کے بعد وجود میں آئے ہیں لیکن ایتھنز غذا کے لیے در آمد کا محتاج تھا۔ اسپارٹا نے جونہی اس کا محاصرہ کیا' ایتھنز کے عوام بھوکے مرنے لگے اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد یہ عظیم شہر پھر نہ سنبھل سکا۔

یہ بھی دیکھیے کہ یونان میں مزدوروں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے سے صنعتی جدت اور ترقی رک گئی۔ عورتوں کی غلامی سے صحت مند محبت کے امکانات ختم ہو گئے۔ امرد پرستی پیدا ہوئی اور اس نے یونانی صنم تراشی کو متاثر کیا۔ مادی چیزوں کی پیداوار کے طریقے' زندگی کے اجتماعی' سیاسی اور روحانی وظائف کو متاثر کرتے ہیں۔ لوگوں کا شعور ان کے وجود کا باعث نہیں بنتا' بلکہ ان کے اجتماعی وجود سے ان کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ فرد یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے خیالات' اپنا نظام فلسفہ' اپنے اخلاقی تصورات اور مذہبی عقائد' اپنے جماعتی تعصب اور فنی شعور' منطقی اور غیر جانب دار استدلال سے حاصل کیے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کے اقتصادی حالات نے اس کے افکار کو کس قدر متاثر کیا ہے"۔

موفسکو: "آپ اپنا نظریہ روما کی تاریخ پر کس طرح منطبق کریں گے"۔

مارکسل: "روما کی حکومت بنیادی طور پر غلاموں پر ستم روا رکھنے والی حکومت تھی۔ اس لیے پہلے تاریخ میں آقاؤں نے کبھی اتنی سخت گیری اور بد اخلاقی سے کام نہیں لیا تھا' لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ کسان غریب ہوتے گئے' امیروں نے ان کی زمینیں خرید لیں اور ان پر ہل چلانے کے لیے غلاموں کو در آمد کیا۔ غلاموں نے بے پروائی اور تساہل سے کاشت کاری کی۔ زمین تباہ ہو گئی اور روما کو اپنی غذائی ضروریات کے لیے دوسروں کا محتاج ہونا پڑا۔ غلاموں کی بغاوتوں نے ملک کا

شیرازہ بکھیر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ اور ایشیا کی باہمی تجارت روما کے راستہ کم اور باسفورس کی راہ میں زیادہ ہوتی گئی۔ قسطنطنیہ پھلنے پھولنے لگا اور روما پر زوال آگیا"۔

بوسے: "آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ زمانہ وسطیٰ میں اقتصادی حالات نہیں بلکہ مذہب لوگوں کی زندگیوں پر حاوی تھا"۔

مارکس: "میرے نزدیک یہ نظریہ سطحی ہے' کلیسا کی طاقت ان مظلوم لوگوں کے افلاس اور تباہی پر مبنی تھی جو روحانی سکون اور امید فردا کے بھوکے تھے۔ اس کا انحصار لوگوں کی جہالت اور توہم پرستی پر تھا' جو افلاس کا لازمی نتیجہ ہے اور وہ طرح طرح کے ٹیکسوں کی مدد سے مستحکم ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس نے یورپ کی دو تہائی زرعی زمین خرید لی۔ یہ تھی کلیسا کی طاقت کی اقتصادی بنیاد۔ یہی حال زمانہ وسطیٰ کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا تھا۔ ان کے اسباب بھی اقتصادی تھے۔ صلیبی جنگیں' کافروں سے تجارتی راہیں چھیننے کے لیے لڑی گئی تھیں۔ احیائے علوم' سونے کی فراوانی کی علامت تھی' جو شمالی اطالیہ کی بندرگاہوں کے ذریعہ یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت سے شمالی اطالیہ کو میسر آئی تھی۔ اصلاح مذہب کا زمانہ اس وقت آیا جب جرمنی کے نوابوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے عوام کا پیسہ' کلیسا کہ بجائے ان کی جیبوں میں منتقل ہونا چاہیے"۔

بوسے: "آپ غلطی پر ہیں جناب!"

مارکس: "انقلاب فرانس کی وجہ بوربون خاندان کی بداخلاقی' یا موسیو والٹیئر' آپ کا طربیہ ادب نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تین سو سال تک ایک نیا اقتصادی طبقہ' یعنی تجارتی طبقہ' رئیسوں کا ہم سر بننے کی کوشش میں مصروف تھا' اور اس نے ان ناکارہ نوابوں سے' جو لوئی شش دہم کے دربار کی زینت تھے' کہیں زیادہ مال و دولت جمع کر لیا تھا۔ سیاسی طاقت' اقتصادی طاقت کے بعد کبھی نہ کبھی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ کامیاب انقلاب' اقتصادی فتوحات پر محض سیاسی دستخطوں کا کام کرتے ہیں جیسا کہ ہیرنگٹن نے کہا تھا کہ حکومت کی ہیئت کا انحصار' زمین کی تقسیم پر ہے۔ اگر ملک کی بیشتر زمین ایک شخص کے ہاتھوں میں ہے تو نظام حکومت بادشاہت ہو گا اور چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے تو رئیسیت اور اگر عوام کے ہاتھوں میں ہے تو جمہوریت"۔

گرانٹ: "آپ کی باتیں بہت حد تک صحیح ہیں۔ غالباً زمینداروں کی تعداد (بمقابلہ بے زمین شہریوں کے) کم ہونے کی وجہ سے امریکہ میں جمہوریت ختم ہو گئی ہے"۔

مارکس: "امریکہ کو کیوں دریافت کیا گیا تھا؟ کیا مسیحیت کی خاطر؟ نہیں' سونے کے لیے۔ انگریزوں نے اسے ہسپانوی' ولندیزی اور فرانسیسی حکام سے کس طرح چھین لیا؟ اس طرح کہ ان کے پاس بہتر جہاز بنانے کے لیے دولت تھی۔ نو آبادیوں نے انگلستان کے خلاف بغاوت کیوں کی؟

اس لیے کہ وہ غیر معقول ٹیکس نہیں دینا چاہتے تھے اور برطانیہ کے ان رئیسوں کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے جنہیں شاہی عطیہ کے طور پر وہاں زمینیں ملی تھیں کیونکہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر شراب اور غلاموں کی تجارت کرنا چاہتے تھے اور اپنے قرض ایک کم قیمت کے سکہ میں ادا کرنے کے خواہش مند تھے"۔

ولیم جیمز: "کیا مطلب؟"

مارکس: "جناب! آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے ایک ہم وطن پروفیسر نے اپنی تحقیقات سے امریکہ کے آئینی نظام اور جیفرسن کے تصور جمہوریت کے اقتصادی اسباب بتائے ہیں۔ یا کبھی آپ نے ڈینئل و-بسٹر کو پڑھا ہے؟ آپ کے شاندار مقرر نے کہا تھا! ہمارے نیو انگلینڈ کے آباؤ اجداد جائیداد کے معاملہ میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے حالات کا تقاضا تھا کہ زمین کو تقسیم کیا جائے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس لازمی اقدام سے ہمارے ملک کی حکومت کی تقدیر متعین ہو گی تھی۔ ان کے سیاسی اداروں کی ہیئت جائیداد کے متعلق قوانین سے متعین ہوئی تھی۔ دنیا کی آزاد ترین حکومت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کے قوانین کی رو سے دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے اور باقی لوگ محتاج اور قلاش رہیں۔ اس حالت میں عوام کی طاقت' جائیداد کے حقوق کو توڑ دیتی ہے یا جائیداد کا اثر' عوام کی طاقت کو محدود کر دیتا ہے۔ ہمہ گیر حق رائے دہندگی اس معاشے میں یادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا جہاں جائیداد غیر مساوہ طور پر تقسیم ہو چکی ہو"۔

والٹیر: "یہ آپ دونوں کی تقریر بے حد موثر ہے"۔

اناطول فرانس: "اس میں موسیو مارکس کے نقطۂ نظر سے فقط ایک سقم ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوانین' جائیداد کی تقسیم میں تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو جناب! پھر آپ کا نظریہ خام ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ سیاسی ادارے' اقتصادی حالات سے متعین ہوتے ہیں اور انقلاب اسی وقت کامیاب ہوتے ہیں' جب کوئی ایسی جماعت ان کی پشت پناہی کرے جو مالی اعتبار سے مستحکم ہو۔ کیا روسی انقلاب آپ کے نظریہ کو غلط ثابت نہیں کر دیتا؟

مارکس: "بالکل نہیں! میں ابھی اس بات کی وضاحت کر دوں گا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سیاسی ہیئت کو اقتصادی حالات کے مقابلے میں بدلنا پڑتا ہے۔ کسانوں کے ملک میں پرولتاری انقلاب' پرولتاری نقاب پہن سکتا ہے لیکن درحقیقت حکومت ان لوگوں کے مفاد کی نمائندگی کرتی ہے' جو زمین کے مالک ہیں"۔

اناطول فرانس: "میرا خیال ہے کہ بہادر بالشویک اچھے مارکسی نہیں ہیں"۔

مارکس: "میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ میں مارکسی نہیں ہوں"۔

واشین: "موسیو مارکس! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک فوجی آمریت کبھی کبھی کسی خاص اقتصادی طاقت کے بغیر قائم ہو سکتی ہے؟ جیسے کہ پریٹورین گارڈ کے زمانہ میں"۔

مارکس: "جناب! فقط کچھ مدت کے لیے ایسا ہو سکتا ہے"۔

اناطول فرانس: "مجھے علم نہیں کہ آپ اس چیز سے واقف ہیں یا نہیں جسے عہد جدید کے لوگ ضبط تولید کہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ کیتھولک کلیسا نے اپنے معتقدین کو اس پر عمل نہ کرنے کی تلقین کی ہے اور وہ بڑی خاموشی سے اپنی اس دانشمندانہ دوراندیشی کے نتائج دیکھ رہا ہے' یعنی پروٹسٹنٹ مذہب کے پیروؤں اور فلسفیوں میں شرح پیدائش کم ہو گئی ہے اور پہلے جرمنی اور اس کے بعد امریکہ آہستہ آہستہ پھر کیتھولک ہو رہے ہیں۔ اگر کلیسا کی یہ پالیسی کامیاب ہو گئی (اور اس کی خاموشی اور دوراندیشی نے کئی جنگیں جیتی ہیں) اور اگر شرح پیدائش سے اصلاح مذہب اور احیائے علوم کی تحریک ختم کر دی گئی تو کیا یہ ایک نہایت اہم واقعہ نہیں؟ لیکن یہ واقعہ تاریخ کی اقتصادی تعبیر کے ماتحت نہیں آتا۔ شاید ہمیں تاریخ کی حیاتیاتی تعبیر کی ضرورت پیش آئے"۔

مارکس: "آپ غلطی پر ہیں' جناب! ضبط تولید کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے اسباب اقتصادی ہیں۔ معیار زندگی بڑھ گیا ہے۔ شہروں میں مخلوق کی فراوانی ہے اور آپ کے ملک کے قوانین زمین' والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ جائیداد کو اپنے بیٹوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دیں"۔

گرانٹ: "لیکن یقیناً آپ یہ بات تسلیم کریں گے کہ نسلی اسباب بعض اوقات اقتصادی اسباب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں؟"

مارکس: "ہرگز نہیں"۔

گرانٹ: "تو پھر آپ ایشیا پر یورپ کے نارڈکوں کی فتح کی کیا توجیہہ کریں گے؟"

مارکس: "اس کی توجیہہ محض اس اتفاق کی بنا پر کی جا سکتی ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب پہلے آیا۔ آپ اس وقت کا انتظار کیجئے جب چین میں صنعتی انقلاب آئے اور آپ نارڈکوں کو ایشیا سے فرار ہوتے دیکھیں"۔

گرانٹ: "لیکن میں نے اکثر (مثلاً امریکہ میں ہڑتالوں یا صدارتی انتخاب کے موقع پر) عوام کو اقتصادی وجوہ کی بنا پر نہیں' بلکہ نسلی وجوہ کی بناء پر گروہوں میں تقسیم ہوتے دیکھا ہے"۔

مارکس: "افراد اور جماعتیں اکثر اس طرح کے غیر اقتصادی محرکات سے متاثر ہوتے ہیں جیسے نسلی' مذہبی' وطنی اور جنسی۔ لیکن جب ان افراد اور جماعتوں کے اعمال تاریخی طور پر اہم بنتے

ہیں تو وہ ان اشخاص کے زیر اثر آ جاتے ہیں جو اپنے اقتصادی مفاد کا پورا شعور رکھتے ہیں۔ کیا وہ ارباب سیاست جو، جوش آفریں، تقریروں اور موسیقی کے ترنم کے ساتھ سپاہیوں کو میدان جنگ میں بھیجتے ہیں، اقتصادی محرکات سے بالکل منزہ ہوتے ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ کولمبس نے جزائر ہند کی اس لیے تلاش کی کہ وہ نئے مسیحیوں کو پاپائے روم کے حضور میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے، اگرچہ اسے یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کہ اس مرد پیر کے ذہن میں یہ خیالات موجود ہوں لیکن کیا آپ یہ مان سکتے ہیں کہ فرڈیننڈ اور ازابیلا نے ان وجوہ کی بنا پر اس کی معاونت کی۔ افراد، غیر اقتصادی محرکات کی وجہ سے عمل کر سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے بچوں، اپنے ہم وطنوں یا اپنے دیوتاؤں پر قربان کر دیں، لیکن یہ مجنونانہ یا بے ربط اعمال قوموں کے عروج و زوال کو متعین کرنے کے ضمن میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اقتصادی جبریت کو افراد پر منطبق نہیں کرتا"۔

ولیم جیمز: "مجھے آپ کی یہ بات سن کر خوشی ہوئی ہے۔ میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ اخلاقی قوتیں بھی تاریخ کی تعیین میں حصہ لیتی ہے، مثلاً دلبر فورس اور گیر-سن کے زیر اثر غلامی سے نفرت، لیکن آپ میرے اس خیال کی تصحیح کر سکتے ہیں"۔

مارکس: "تاریخ میں اخلاقی قوتوں اور قدروں کی کوئی جگہ نہیں۔ ہر عظیم واقعہ کے پس پردہ اقتصادی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ محض اخلاقی وعظوں سے گیر-سن غلامی کے خلاف اپنی مہم کو ترقی دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور جب لنکن نے غلاموں کو آزاد کیا تو یہ ایک جنگی اقدام تھا۔ جنوب کو کمزور کرنے کے لیے جنوبی ریاستیں، شمالی ریاستوں سے علیحدہ ہونا چاہتی تھیں، کیونکہ ٹیکسوں سے ان کا مفاد مجروح ہوتا تھا اور وہ کانگرس پر تسلط پانے کی طرف سے ناامید ہو چکی تھیں، شمالی ریاستیں جنوب کو اپنے سرمایہ داروں کی منڈی اور غذا اور خام مال کا ذریعہ سمجھ کر اپنے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتی تھیں۔ نصب العین کی حیثیت محض ایک نقاب کی سی ہے۔ ہر حالت میں نصب العین ایک مادی ضرورت ہے، جسے اصطلاح میں ایک اخلاقی امنگ کہتے ہیں"۔

اناطول فرانس: "کیا آپ اشتمالی نصب العین کے متعلق بھی یہی کچھ فرمانے کی زحمت گوارا کریں گے؟"

مارکس: "ہاں ہاں! یقیناً"۔

اناطول فرانس: "افسوس!"

۶- تاریخ کی نفسیاتی تعبیر

ہیگل: "جناب، آپ کے خیالات بہت انقلابی اور تشویشناک ہیں۔ تاریخ کے متعلق اب تک جتنے نظریے پیش کیے گئے ان میں زندگی کا ہر پہلو موجود ہے سوائے انسانی ذہن کے۔ آپ کی باتیں سن کر انسان کو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ دنیا میں ذہانت اور جرات محض ناکارہ چیزیں ہیں اور چونکہ ایک ہی طرح کے جغرافیائی، اقتصادی اور نسلی حالات افراد اور کبھی کبھی قوموں کو، یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احمق اور فطین انسان میں کوئی فرق نہیں۔ یا کوئی شہری عالم ہے یا جاہل، آپ کے نظام حیات میں مرد مجاہد کے لیے کوئی جگہ نہیں"۔

مارکس: "میرے نزدیک دنیا میں مرد یا مرد مجاہد کا وجود نہیں۔ فکر، آرزو کا سرچشمہ ہے اور قوموں اور گروہوں کی آرزوؤں کی بنیاد ہمیشہ معاشی ہوتی ہے جیسا کہ بسمارک نے کہا تھا کہ قوموں کے باہمی روابط میں اخلاق کوئی اہمت نہیں رکھتا اور مرد مجاہد یا مرد کی حیثیت محض ایک آلہ کی ہے اور عظیم شخصیتیں عوامی تحریکوں یا غیرذاتی قوتوں کے اظہار کا ایک وسیلہ ہیں۔ اگر وہ یہ نہیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ ایسا بے اثر دیوانہ ہے جس پر تاریخ کوئی توجہ کیے بغیر آسانی سے نظرانداز کر دیتی ہے۔ نظریات کا تاریخ سے وہی تعلق ہے جو فکر کا فرد کے عمل سے۔ دونوں صورتوں میں خیال، نتیجہ کا سبب نہیں ہوتا بلکہ اس کا سبب وہ آرزو ہوتی ہے جس کا ضروری نہیں کہ فرد کو شعور و احساس ہو۔ حقیقت میں کسی خاص زمانے کے مخصوص تمدن کا اقتصادی زندگی کے ساتھ وہی رشتہ ہے جو خیال کا جسم کے ساتھ ہے۔ یہ تعبیر و تاویل ہے جس سے تحریکوں اور اجتماعی قوتوں کی وضاحت ہوتی ہے"۔

ہیگل: "مجھے حیرت ہے کہ ایک جرمن اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کانٹ، لیسنگ، ہرڈر، گوئٹے، شیلر، بیتھوون اور میرے عہد زریں کے بعد جرمنی نے اپنی روح صنعت میں گم کر دی۔ اب جرمنی ماہرین کیمیا اور کاریگر پیدا کرتا ہے، فلسفی اور فن کار نہیں۔ اسی لیے وہ تاریخ کی تعبیر کلوں کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ گوئٹے آپ کے سامنے اپنے نظریئے کی وضاحت کرے۔ یا ہرڈر، جس نے ۱۸۸۷ء میں اپنی کتاب "فلسفہ تاریخ انسانیت کے بارہ میں افکار" سے ہمیں متاثر کیا تھا اپنے خیالات کی توضیح کرے۔ وہی ہرڈر، جس نے کہا تھا کہ تمام تاریخ، انسانی نسل کی تعلیم کی داستان ہے"۔

اناطول فرانس: "تاریخ کے متعلق آپ ہمیں اپنا نظریہ بتائیے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میرے ملک میں آپ کی دھوم تھی، اور کزن تو بات بات میں آپ کا نام لیتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی آپ کے فلسفہ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکا لیکن ممکن ہے کہ یہاں جنت کی ان وادیوں میں ہم اسے سمجھ سکیں"۔

ہیگل: "جناب! مجھے جان بوجھ کر ادق انداز اختیار کرنا پڑا کہ کہیں میرا فلسفہ احمقوں کے ہاتھ نہ آ جائے۔ اپنی نسل کو یہ سمجھانا آسان نہیں تھا کہ اس کائنات میں ذہانت، اسی حد تک موجود ہے، جس حد تک ہم اسے یہاں استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ خدا اتنا سبب اول نہیں جتنا کہ مقصد حیات ہے، پھر مجھے یہ باتیں اس طرح ادا کرنی پڑیں کہ محتسب مجھے گردن زدنی نہ قرار دے دے"۔

والٹیر: "میں آپ سے متفق ہوں، جناب! اس لیے فریڈرک کی موت کے بعد، جرمنی میں سوچنا غیر قانونی فعل سمجھا جانے لگا تھا"۔

ہیگل: "لیکن درحقیقت، میرا فلسفہ بہت سادہ تھا۔ خدا حقیقت مطلق ہے اور حقیقت مطلق کائنات کی تمام چیزوں پر مشتمل ہے، جو روبہ ارتقا ہیں "خدا" عقل ہے اور عقل اس قانون فطرت کا تانا بانا ہے، جس میں تمام موجودات پھلتی پھولتی ہیں۔ خدا، روح ہے اور روح، زندگی ہے۔ تاریخ، روح کے ارتقا اور زندگی کی نشوونما کا نام ہے۔ تاریخی عمل، روح یا زندگی کی خود شعوری یا آزادی حاصل کرنا ہے۔ آزادی، زندگی کی جان ہے بالکل اسی طرح جیسے کشش ثقل پانی کی۔ تاریخ میرے نزدیک آزادی کے ارتقا کا نام ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ روح مکمل طور پر آزاد ہو جائے"۔

والٹیر: "جناب ہیگل، یہ تو انقلاب کی زبان ہے"۔

ہیگل: "میرا مقصد بھی یہی تھا۔ میں نے تاریخ کو تین واضح ادوار میں تقسیم کیا تھا۔ مشرقی دور، جس میں صرف فرد آزاد ہے۔ یونان و روما کا دور، جس میں چند افراد آزاد ہیں اور جدید دور، جس میں روح، اپنی آزادی کا شعور حاصل کرتی ہے، اسے ریاست میں منظم کرتی ہے تاکہ ہر شخص آزاد ہو جائے"۔

مارکس: "ہم یعنی نوجوان جرمنی کے اراکین آپ کے اس قصور کو کبھی معاف نہیں کر سکے کہ یورپ کی سب سے زیادہ رجعت پسند ریاست پرشا کی مدح خوانی کی، لیکن ہم آپ کی مابعد الطبعیات کے پوشیدہ مطالب سمجھ گئے تھے اور آپ کی جدلیات کی اہمیت کو قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ میرے کانوں میں ابھی تک یہ الفاظ گونج رہے ہیں "مقدمہ، ضد مقدمہ، ترکیب" کراؤسے نے ہمیں بتایا ہے کہ "عہد قدیم، مقدمہ تھا، عہد جدید، ضد مقدمہ اور اور پولیشیا ترکیب" لیکن ہم طلباء نے اس بات کو ایک اور بہتر مثال کے ذریعہ سمجھا تھا۔ یعنی "پیاس مقدمہ، شراب جو، ضد مقدمہ اور زمین پر بیہوش ہو کر گرنا، ترکیب"۔

ہیگل: "خوب ہنس لو، مجھ پر اور میرے فلسفے پر، میرے بائیں بازو کے بچو! لیکن اس بات پر بھی غور کرو کہ تمام تاریخ، تمام مابعد الطبیعات کی طرح، میرے جدلیات کی روشنی میں چمک اٹھتی

ہے۔ ہر عہد اپنے اندر ایک تضاد رکھتا ہے، جس طرح تمہاری سرمایہ داری کے اندر اس کا توڑ موجود ہے۔ آہستہ آہستہ وہ تضاد واضح اور شدید ہوتا رہتا ہے اور آخر کار، تفرقہ، جنگ، انقلاب اور انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ متضاد عناصر نئے انداز سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور نئی ہیئتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس فارمولے کی مدد سے آپ مستقبل کے متعلق پوری آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک منزل سے اس کی متضاد منزل پیدا نہیں ہوتی بلکہ دونوں کا امتزاج ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس لیے جب سرمایہ داری اشتراکیت سے ٹکراتی ہے تو نتیجہ اشتراکیت نہیں ہوتا بلکہ ریاستی سرمایہ داری۔ انقلاب پسند سرمایہ دار بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ریاست کہتے ہیں اور اگرچہ بہت سے لوگوں کو تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس طرح ہماری رسائی تاریخ کی ایک اعلیٰ منزل تک ہو جاتی ہے"۔

مارکس: "اگر ایسا ہے تو پھر آپ نے اپنے زمانہ کے باغیوں کا خیر مقدم کیوں نہ کیا؟ کیا آپ کے نظریہ کے مطابق وہ مستقبل کے پیغمبر نہیں تھے؟ آپ نے جان بوجھ کر یہ غلط بیانی کیوں کی کہ قدیم یونان کے مقابلہ میں پرشا میں زیادہ آزادی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ پرشا، تاریخ کی برگزیدہ ترین تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے، اور چونکہ پرشا میں ملوکیت تھی جس کے پروفیسر آپ تھے، آپ نے تاریخ میں الٹ پلٹ کر کے یہ ثابت کیا کہ ادنیٰ منزل میں فقط ایک شخص آزاد ہوتا ہے۔ گویا وہ ہے استبداد کی منزل۔ دوسری منزل جس میں چند لوگ آزاد ہوتے ہیں، ریلیسٹ یا جمہوریت کا دور ہے اور آخری منزل جس میں سب آزاد ہوتے ہیں، ملوکیت ہے۔ خداوند! ملوکیت! آپ نے قوموں کو اس طرح ترتیب دیا، جس طرح ایک بچہ ڈاک کے ٹکٹوں کو ترتیب دیتا ہے اور آپ نے یہ فارمولا بتایا کہ ترقی، تہذیب کو مغرب کی طرف دھکیل رہی ہے اور کوئی تہذیب جس حد تک مغربی ہوگی اسی حد تک ترقی یافتہ ہوگی۔ آپ نے شام کی تہذیب کو چین کی تہذیب پر ترجیح دی۔ اپنے استدلال کی رو سے آپ کو امریکہ کو جرمنی پر ترجیح دینی چاہیے تھی، لیکن آپ نے وطن پرستی کو بہتر سمجھا"۔

ہیگل: "حالات کا تقاضا یہی تھا"۔

مارکس: "نہیں، جناب! چاہے آپ کہیں ہوں، حقیقت ایک ہی ہوتی ہے"۔

اناطول فرانس: "آپ اس طرح باتیں کر رہے ہیں، جیسے آپ حقیقت کی تہ تک پہنچ چکے ہیں۔ اتنے تیقن سے بات نہ کیجئے شاید حقیقت کا کوئی وجود ہی نہیں"۔

کارلائل: "ایک بڈھے کو بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے، تو میں یہ عرض کر دوں کہ آپ نے گو مرد مجاہد کو تاریخ سے قطعی خارج کر دیا ہے، اس کے باوجود آپ بحث و تمحیص سے کسی نتیجہ پر

نہیں پہنچے۔ میرا خیال ہے کہ عالم گیر تاریخ یعنی انسان کے کارناموں کی تاریخ، دراصل عظیم شخصیتوں کی تاریخ ہے۔ یہ لوگ عوام کی قیادت کرتے تھے، اور ایک وسیع مفہوم میں ان کا مرتبہ خالق کا تھا۔ انہوں نے ہر اس چیز کی تخلیق کی جسے انسان نے بنایا ہے یا حاصل کیا ہے۔ ہر وہ چیز جسے ہم اپنی دنیا میں مکمل صورت میں دیکھتے ہیں، خارجی طور پر مادی انجام ہے، ان خیالات کا جو ان شخصیتوں کے ذہن میں موج زن تھے۔ ساری دنیا کی تاریخ کی روح یہی خیالات تھے۔ اگر ہم انہیں اچھی طرح جان سکیں تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے دنیا کی تاریخ کی روح کو پالیا"۔

ولیم جیمز: "خوب! بہت خوب! آپ نے بڑی پتے کی بات کہی، کارلائل، وقت آگیا ہے کہ ہم ان افکار کی تہ تک پہنچیں جو تاریخ کے محرک ہیں"۔

ہیگل: "حضرات! جوش سے کام لے بغیر سوچئے تو آپ بھی میری طرح اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہی افکار ہر عہد کی روح ہوتے ہیں۔ یعنی ہر عہد کے فکر اور احساس کا ایک منفرد انداز ہوتا ہے اور تاریخ اس انداز کا نتیجہ ہے۔ عظیم شخصیتوں کا اثر و رسوخ اسی صورت میں قائم ہوتا ہے کہ وہ اس انداز فکر کے غیر شعوری آلے بن جائیں۔ اگر کوئی غیر معمولی شخصیت، اس انداز فکر سے ہم آہنگ نہ ہو سکے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ عظیم شخصیتیں، جنہیں آئندہ نسلیں بزرگ و برتر جانتی ہیں، لازمی نہیں کہ متقدمین سے عظیم تر ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ تہذیب کی تعمیر میں ان کا بھی تھوڑا سا حصہ ہے، لیکن متاخرین کی یہ خوش قسمتی ہے کہ عمارت کو استوار کرنے کے لیے آخری اینٹ رکھنے کی خدمت ان کے حصے میں آتی ہے۔ ان افراد کو اس "فکر عموی" یا عین کا شعور نہیں ہوتا جسے وہ بے نقاب کر رہے ہوتے ہیں، لیکن انہیں اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک ضرور ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ترقی کے لیے کیا چیز لازمی ہے؟ عظیم شخصیتیں اس لحاظ سے تخلیق سے زیادہ پرورش کرنے اور پروان چڑھانے کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ وہ زمانہ کے بطن میں جو اسرار پنہاں ہیں، انہیں بے حجاب کرتی ہیں"۔

کارلائل: "جناب ہیگل! میں ان شخصیتوں کے متعلق تو زیادہ نہیں جانتا جنہیں آپ نے پرورش کرنے اور پروان چڑھانے والی شخصیتیں کہا ہے لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ کرومویل کے بغیر تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسی وہ اب ہے۔ یہی حال فریڈرک اور نپولین کا ہے۔ نپولین کا وجود نہ ہوتا تو انسان انقلاب فرانس کو کبھی عفو و درگزر کی نظر سے نہ دیکھتا۔ عظیم شخصیتوں پر یقین نہ رکھنے کا انجام دہشت ہے"۔

نیٹشے: (جیسے اپنے آپ سے) "عظمت کی پرستش، دیوتاؤں کی پرستش کی مقدس یادگار ہے، لیکن کوئی شخص اب عظمت کی تعظیم اور احترام کرنا نہیں جانتا۔ دنیا میں دیوتا ناپید ہیں۔ اب ہم

فوق البشر کے منتظر اور متمنی ہیں"۔

والٹیئر: "کیا یہ شخص دیوانہ ہے؟"

اناطول فرانس: "جناب! یہ مجذوب ہے"۔

ولیم جیمز: "مجھے تاریخ کے اس عظیم شخصیتوں والے نظریے سے دلچسپی ہے۔ وہ کیا اسباب ہیں، جو ہر نسل کو مختلف بناتے ہیں؟ جن کی بنا پر ملکہ این کا انگلستان، ملکہ الزبتھ کے انگلستان سے اس قدر مختلف معلوم ہوتا ہے؟ جناب مارکس کہتے ہیں کہ یہ تبدیلیاں افراد کی رضا سے مستغنی ہوتی ہیں۔ میں یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔ یہ اختلافات افراد کی مثال ان کی جرات اور ان کے عزائم کے مجموعی اثرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ نہیں! مسٹر مارکس، عوام، تاریخ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ وہ غیر معمولی شخصیتوں کی قیادت قبول کرتے ہیں۔ ایک ہی نسل میں بسمارک نے اس جرمنی کو جو الہیات میں مستغرق تھا، عسکریت اور استعماریہ کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ ایک ہی نسل میں نپولین نے اس فرانس پر اپنا تسلط قائم کر لیا جو تکان اور افسردگی سے عافیت پسند ہو چکا تھا اور اپنے عمل اور ذہانت کی سحر آفرینی سے سارے ملک کو جاہ و جلال کی آرزو کا تب و تاب عطا کر دیا۔ تھیوڈور روزو یلٹ نے بھی امریکہ کو قریب قریب اسی طرح زندگی بخشی۔ میں ایمرسن کا ہم نوا ہوں، جس نے کہا تھا کہ میں چینی مینیکیس کے اس قول سے متفق ہوں کہ ایک برگزیدہ شخصیت تو نسلوں کی معلم ہوتی ہے۔

لو کے اخلاق کا ذکر سن کر بیوقوف عقلمند ہو جاتے ہیں اور متزلزل مزاج لوگ ارادوں کو مستحکم کر لیتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ میرے دوست، موسیو ٹارڈ میری بات کی تائید فرمائیں گے کیونکہ میرا تصور تاریخ، ان کے نظریہ نقل کے بغیر نامکمل ہے۔

ٹارڈ، ہاں، میرے عزیز ہم عصر، مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔ دنیا میں بڑے آدمی بھی ہیں اور چھوٹے بھی اور صرف بڑے آدمی ہی حالات کو بدل سکتے ہیں۔ تمام جغرافیائی، نسلی اور اقتصادی حالات کو لے لیجئے، کسی نہ کسی کو ہر تبدیلی کے لیے کوئی فیصلہ کن عمل کرنا پڑے گا، چھوٹا آدمی خوف کی وجہ سے فیصلہ کن عمل نہیں کرتا اور غالباً وہ کبھی نہیں سوچتا کہ روایتی اعمال کے علاوہ کسی اور طرز عمل کی بھی ضرورت ہے۔ رسم و رواج اس کے لیے کافی ہوتے ہیں لیکن عظیم شخصیت ضرورت کو محسوس کرتی ہے، سوچتی ہے اور حالات کو بدل دیتی ہے۔ کبھی وہ ناکام رہتی ہے، لیکن اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اس سے کم تر آدمی اس کی پیروی اور تقلید کرتے ہیں، اور نقالی کا سیلاب سارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ایک جاپانی تاجر نے مغربی رسم و رواج کی نقل کی۔ دس نے اس کی نقل کی۔ اب سینکڑوں نے ان کی پیروی کی اور سارے جاپان کی ہیئت بدل گئی

ہے۔ میں کیتھولک کیوں بنا؟ نقالی سے، میں فرانسیسی کیوں ہوں؟ جناب ہیگل، میں آپ سے محض نسل اور خون کے اعتبار سے نہیں، بلکہ عادات اور زبان، رواج اور احساس و فکر کے انداز میں بھی مختلف کیوں ہوں؟ نقل و اتباع کی بنا پر، نقل و اتباع کی تاریخ، دراصل تاریخ کی جان ہے۔ اقتصادی اور جغرافیائی حالات کے پس پردہ حیاتیاتی قوتیں کارفرما ہیں جن کی رو سے مفید تبدیلیاں کامیاب ہوتی ہیں۔ مرد عظیم تبدیلی پیدا کرتا ہے اس کا خیال، انقلاب ہے۔ روح عہد اور جغرافیائی حالات وہ فضا ہیں جس میں خیال کو کامیاب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ معمولی اور غیر معمولی انسانوں کے درمیان جنگ کا نام تاریخ ہے“۔

کارلائل: ”آپ کا شکریہ! آپ نے بہت خوب بات کہی ہے“۔

لسٹروارڈ: ”حضرات! میں ان خیالات میں صرف ایک بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تاریخ، بڑے بڑے اختراعات کی تاریخ ہے۔ اقتصادی تبدیلیوں کے پیچھے میکانکی تبدیلیاں ہیں اور ان کے پس پردہ سائنس کی ترقی کام کر رہی ہے اور اس کے پیچھے غیر معمولی شخصیتوں کے افکار ہیں۔ عظیم انسان شاید تاریخ کے عظیم واقعات، جنگ، انتخاب، ہجرت کے اسباب نہ ہوں، لیکن وہ ان ایجادات اور انکشافات کے اسباب ضرور ہوتے ہیں جو دنیا کو نئی ہیئت بخشتے ہیں اور ہر نئی نسل کو اگلی نسل سے مختلف بناتے ہیں۔ علم کی نشوونما تاریخ کی جان ہے“۔

بکل: ”آپ کا ارشاد بجا ہے۔ ہر ملک کی سیاسی تاریخ اس کی ذہنی ترقی کی تاریخ میں تحلیل ہو سکتی ہے“۔

وارڈ: ”جناب والٹیئر یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ بربریت سے تہذیب کیوں کر پیدا ہوئی؟ جواب ہے کہ اختراعات سے۔ امریکی تاریخ میں اہم انسان، امریکہ کے صدر یا سیاست دان نہیں بلکہ موجدین ہیں۔ فلٹن، وٹنی، مورس، مکورمک، رائیٹ برادران، ایڈیسن، ان لوگوں کے کارناموں کے اثرات اس وقت بھی باقی رہیں گے، جب دنیا امریکی سیاست دانوں کو فراموش کر چکی ہوگی۔ بھاپ کے انجن نے انیسویں صدی کی تعمیر کی۔ برقی قوت، کیمیا اور طیارے بیسویں صدی تعمیر کی کر رہے ہیں“۔

مارکس: ”میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقتصادی تبدیلیوں کے پیچھے نئی اختراعات کام کرتی ہیں، لیکن ان اختراعات اور سائنسی تحقیق کے پیچھے اقتصادی ضروریات اور تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک ٹیکنیکل ضرورت دس یونیورسٹیوں سے زیادہ سائنسی تحقیق کو حرکت بہم پہنچاتی ہے اور ہر اختراع ایک طویل تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ معمولی اور بسا اوقات غیر مرئی مراحل سے گزر کر پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے“۔

اناطول فرانس: "اختراعات اور ایجادات، دراصل ہماری زندگی کی ضروریات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اقتصادیات اس کا ایک پہلو ہے۔ کچھ ایجادیں اور بہت سی تاریخ، محبت کی ضرورت سے پیدا ہوئی جس کی کوئی اقتصادی بنیاد نہیں۔ جب محبت اقتصادیات کو چھوتی ہے تو وہ مرنے لگتی ہے اور آپ کے نظریہ کے مطابق لوگ موسیقی کی تخلیق کیوں کرتے ہیں؟"

مارکس: "میں اسے محض ایک حادثہ تصور کرتا ہوں۔ ہماری زندگیوں میں اس کی حیثیت فروعی ہے۔ بالکل ایسے جیسے تارکول اور صابن کی"۔

نیطشے: "میرے نزدیک موسیقی کے بغیر زندگی ایک غلطی ہے"۔

اناطول فرانس: "میرا خیال ہے کہ اب ہم زیادہ بحث نہ کریں"۔

ہاں، موسیو مونٹسکو، موسیو بکل اور موسیو رٹیزل، ہم زمین پر رہتے ہیں اور اس لیے ہمیں ہمیشہ زمین کے قوانین کی پابندی کرنا پڑے گی، اگرچہ ہم اس کی حدوں کو عبور کرلیں گے اور کبھی کبھی ہمالیہ کے اوپر پرواز بھی کریں گے، اور یہ ممکن ہے موسیو گرانٹ کہ چند نسلیں، کسی سازگار ماحول میں خاصی مدت رہنے کے بعد جسم، خون اور ذہنی صلاحیتوں کے نقطۂ نظر سے دوسری نسلوں پر فوقیت رکھتی ہوں، لیکن ذرا ایک ہزار سال کے لیے ان بہترین نسلوں کو ادنیٰ نسلوں کا ماحول دے دیجیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ جہاں تک موسیو مارکس کا تعلق ہے میں انہیں اس خیال کی ترغیب نہیں دلا سکتا کہ آپ سب بھی ٹھیک کہتے ہیں اور ان کا خیال بھی درست ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے لیکن آپ، جناب ہیگل! عظیم شخصیتوں کی اہمیت کو تسلیم کرلیں گے اگر جناب جیمز، ٹارڈ اور کارلائل آپ کی روح عصر کو وہ فضا سمجھ کر تسلیم کرلیں، جو عظیم شخصیتوں کا انتخاب کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اپنے اپنے تصورات کے متعلق اپنے دلوں میں تھوڑا سا شبہ پیدا کرلیں تو ہم سب آسانی سے باہم متفق ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میں عظیم شخصیتوں کا گرویدہ ہوں، قطع نظر اس کے کہ وہ تاریخ کا سبب ہیں کہ نہیں۔ میں فرانس کے دس عظیم اذہان کو باقی سارے فرانس پر ترجیح دوں گا۔ یہ یاد رکھیے، جب آپ تاریخ لکھتے ہیں تو عظیم واقعات ہمیشہ عظیم شخصیتوں کی زبانی بیان ہوتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اعداد و شمار اور خاکوں سے ماضی مجھ پر اتنا واضح نہیں ہوتا جتنا کہ ایک عظیم انسان کی نظروں سے دیکھ کر روشن ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک عظیم انسان میں وہ سارے رشتے یکجا ہو گئے ہیں، جو تاریخ کے واقعات میں منتشر تھے۔ ہم جرمنی کو بغیر گوئٹے کے، انگلستان کو بغیر شیکسپیئر کے اور فرانس کو بغیر والٹیئر کے، کس طرح معاف کرسکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں؟

والٹیئر: ”اب دیر ہو گئی ہے‘ آخر غیر فانی انسانوں کو بھی تو نیند آتی ہے“۔

۷۔ مجتمع تاریخ

جب ہم پہاڑی پر سے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو فلپ نے کہا: ”یہ بڈھا ٹھیک کہتا ہے ان تمام نظریوں پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو وہ مہمل معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر انھیں یکجا کر دو‘ تو ان میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں تجزیہ سے عاجز آ چکا ہوں۔ میں اب ترکیب کا آرزو مند ہوں“۔

میں نے کہا: ”آج رات سب سے زیادہ عقل کی بات والٹیئر نے کہی تھی (اور اس نے یہ بات کروچے سے چرائی تھی) کہ تاریخ صرف فلسفیوں کو لکھنی چاہیے کیونکہ وہ واقعات کو ”کل“ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ فقرہ کہہ کر اس نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا“۔

اریئیل نے کہا: ”لیکن تم یہ بات بھول رہے ہو کہ تاریخ کتنی طویل داستان ہے۔ کوئی انسان اتنی دیر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس ساری داستان پر محیط ہو کر صحیح مناظر پیدا کرے‘ خواہ وہ سبزیوں پر ہی گزارا کیوں نہ کرے“۔

میں نے کہا: ”یہ صحیح ہے ہمیں ماہرین کی ضرورت ہے جو ہمیں سائنس اور تاریخ کے حقائق بہم پہنچائیں۔ لیکن دونوں حالتوں میں اگر ان حقائق میں ربط پیدا نہ کیا جائے تو نتیجہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ فلسفہ کا سائنس کے ساتھ وہی تعلق ہونا چاہیے جو تاریخ سے اور یہ تعلق ربط کے تعلق کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہم کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر فلپ نے کہا:

”اس بحث سے مجھے تاریخ لکھنے کا ایک نیا انداز سوجھا ہے۔ بالعموم جب کوئی شخص تاریخ لکھتا ہے‘ مثلاً ”تاریخ یونان“ تو اس کا مطلب ہوتا ہے یونان کی سیاسی یا زیادہ سے زیادہ اقتصادی اور سیاسی زندگی۔ پھر ایک اور شخص یونان کی صنعت اور تجارت کے متعلق ایک اقتصادی جائزہ سا پیش کر دیتا ہے۔ ایک اور شخص یونانی مذہب کی تاریخ مرتب کرتا ہے‘ دوسرا فلسفے کی‘ پھر ایک تیسرا ادب کی اور اسی طرح اور شخص اجتماعی زندگی کی اور پھر ایک اور شخص یونانی فنون لطیفہ کی۔ اور پھر ہم طلباء سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم ان ٹکڑوں کو جوڑیں اور اپنے ذہن میں یونان کی پیچیدہ زندگی کی ایک مربوط اور ہم آہنگ تصویر بنائیں۔ ہم سے اس کام کی توقع رکھی جاتی ہے‘ جو ایک فاضل مورخ نہیں کر سکا۔ کسی قوم کی تاریخ کو حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ ہر حصہ کو مصنوعی طریقہ سے دوسرے حصوں سے کاٹ دیا جاتا ہے اور ہم اسے صرف وقت اور تسلسل کے نقطۂ نظر سے نہیں

دیکھتے۔ میرے نزدیک ماضی کو اس طرح بیان کرنا بڑا بے تکا پن ہے"۔

اریئیل نے کہا: "منتشر تاریخ!"

میں نے شکایتاً" کہا: "آج کل کے مفکروں میں جرات نہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث کرتے ہیں، مثلاً وہ اس سوال پر بحث کریں گے کہ آیا افلاطون کا مطلب الف تھا یا ب؟ یا یہ کہ سورج آسمان پر ہے یا ہمارے دماغ میں؟ اور کیا ایک سنگترہ، تاریکی میں بھی زرد رہتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ جب سے کلیسا نے انسان کو یہ بتانا چھوڑ دیا کہ وہ کیا سوچیں، وہ کائنات سے خوفزدہ ہو گیا ہے"۔

فلپ نے کہا: "خیر مجھے ایک خیال سوجھا ہے"۔

"بقول اریئیل کے تاریخ منتشر ہے، تو پھر آخر ایک مجتمع تاریخ کیوں نہ ہو؟ جس میں کوئی شخص ایک عہد کو لے کر مثلاً پیرکلیس یا والٹیئر کے عہد کو پیش نظر رکھ کر صرف ایک صدی یا ایک نسل پر اپنی توجہ مرکوز کرے اور اس کی پوری تاریخ لکھے اور زندگی کے تمام پہلوؤں مثلاً اقتصادی، سیاسی، عسکری، سائنسی، فکری، مذہبی، خلاقی، ادبی، تمثیلی اور فنی پہلو کو ہم آہنگی اور ربط کے سانچے میں ڈھالے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم مسئلہ ارتقا سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ہم ہر چیز کو تسلسل اور علیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مثلاً ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افلاطون کے فلسفہ کا سبب سقراط کا فلسفہ تھا، یا ارسطو کے فلسفے کا سبب افلاطون کا فلسفہ تھا یا سپنوزا کے فلسفہ کا سبب ڈے کارٹ کا فلسفہ تھا۔ لیکن واقعات کی توجیہہ صرف ان سے پہلے واقعات ہی نہیں، بلکہ ان کے گرد کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں۔ افلاطون کا فلسفہ ممکن ہے کہ سقراط کے فلسفہ سے اتنا متاثر نہ ہوا ہو، جتنا اپنے زمانہ کے سیاسی اور ثقافتی حالات سے۔ مثلاً ان تقریروں سے جو اس نے سنیں، یا تھیٹر کی ان تمثیلوں سے جو اس نے دیکھیں، یا ان اصنام سے جو مندروں اور بازاروں میں اس کی نظر کے سامنے آئے اور ممکن ہے ارسطو افلاطون سے اتنا نہیں، جتنا اپنے مقدونیہ کے دوستوں سے متاثر ہوا ہو"۔

اریئیل نے کہا: "بہت خوب، فلپ، تم کمال کر رہے ہو"۔ اس نے جواب دیا: "میرا مذاق نہ اڑاؤ، اریئیل! میں ایک سنجیدہ بات کہہ رہا ہوں۔ میں مردوں اور عورتوں کے اعمال کو ان کے عہد کے ساتھ وابستہ کر کے ان میں ربط پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں ماضی کو جیسا کہ وہ تھا، یکجا کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔ نپولین کے عہد کو لو، دیکھو کس طرح سیاسی حالات اقتصادی حالات پر مبنی تھے، نپولین کی جنگوں کی تقدیر انگلستان کے سونے نے متعین کی اور ویلنگٹن کے پس منظر میں روتھسچائلڈ کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ دیکھو کس طرح ان کا ادب اس زمانہ کے مذہبی اور سیاسی مسائل

کی عکاسی کر رہا تھا، مثلاً شیلے، بائرن اور شاتو بریاں کا ادب۔ دیکھو کہ ان کا فن کس طرح روما کی انقلابی نقل کا منہ چڑا رہا تھا۔ تالما اسٹیج پر رو سکیس کی طرح اکڑ کر چلتا تھا۔ موسیقی نے رومانی اور مجاہدانہ رائے اختیار کرلی تھی۔ کس طرح بیتھوون کبھی کبھی شعوری طور پر انقلابی جذبات اور نپولین کی عظمت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ سارا عہد ایک تھا۔ صرف فرانس ہی میں نہیں، بلکہ روس کے مغرب میں سارے یورپ میں اس کی حالت ایک سی تھی۔ میں ایک عہد کی تاریخ چاہتا ہوں، جو سارے پہلوؤں پر حاوی ہو، جیسا کہ وہ اس وقت تھا جب زندہ تھا"۔

اریئیل نے کہا: "اس طرح کی تاریخ ناممکن ہے"۔

میں نے کہا: "غالباً ایک عہد کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح تمام عہدوں میں ایک پہلو کا مطالعہ۔ والٹیئر کے عہد کا مطالعہ اسی طرح ممکن ہے، جس طرح کہ گبن کی "رومی سلطنت کا انحطاط اور زوال" یا "تاریخ قوانین" یا گروٹ کی "تاریخ یونان" ممکن تھی۔ سائمنڈز نے احیائے علوم پر سات جلدیں لکھ کر وہی کیا، جس کی فلپ! تم سب مورخوں سے توقع رکھتے ہو"۔

"ہاں" فلپ نے کہا، "وہ بہت اعلیٰ درجے کی کتاب ہے میں ہر عہد کی تاریخ اسی طرح چاہتا ہوں۔ تاریخ اور انسانی زندگی کے متعلق ہمارا تصور کتنا بہتر ہو جائے اگر ہم اسی قسم کی کتابیں پڑھا کریں اور اس سے بہتر یہ کہ اگر ہم تاریخ کا اس طرح مربوط مطالعہ کریں، تو کتنے مکمل انسان بن جائیں۔ کہاں ہیں گوئٹے، لیونارڈو اور ارسطو، جو مربوط نظریہ کے دیوتا تھے!"

"تم خود ایسی تاریخ کیوں نہیں لکھتے؟" اریئیل نے کہا: "مثال قائم کرو اگر ایسا کرنا ممکن ہے تو کر دکھاؤ"۔

فلپ نے کہا: "میں انیسویں صدی کی تاریخ اسی انداز سے لکھنا چاہتا ہوں اور اپنی کوتاہیوں کے پیش نظر اسے صرف یورپ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ شاید ہم تینوں مل کر یہ کام کر سکیں۔ کیا آپ میرے ساتھ شریک ہوں گے؟ دیکھو اس عہد کی ایک تمثیل بن سکتی ہے۔

پہلا ایکٹ۔ نپولین کا عہد،
دوسرا ایکٹ۔ رومانی عہد،
تیسرا ایکٹ۔ حقیقت پسندی کا عہد،
چوتھا ایکٹ۔ استعاری عہد،

پوری انیسویں صدی کو ایک تصویر میں ڈھالنا کتنا دلچسپ کام ہے۔ انیسویں صدی کے

یورپ کی منتشر‘ پیچیدہ اور شاندار زندگی کو ربط بخشنا‘ ایک شاندار کارنامہ ہو گا“۔

اریئیل نے کہا: ”آؤ پھر ہم تینوں مل کر یہ کام کریں‘ میں خواتین کا مطالعہ کروں گی۔ تو پھر یہ کام کب شروع کریں؟“

فلپ: ”کل“۔

اریئیل نے کہا: ”لیکن ایک بات ہے جس کے متعلق ان غیرفانی شخصیتوں کے سلسلے میں مطمئن نہیں ہوں۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ آیا تاریخ ترقی کر رہی ہے کہ نہیں؟ یا یہ کہ ہم مستقبل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ نہیں؟“

فلپ نے کہا: ”دیکھو‘ شاید ہمیں پھر ان سے ملاقات کا موقع ملے“۔

* * *

باب پانزدہم

کیا ترقی سراب ہے؟

۱۔ ترقی کا آغاز

یونانیوں نے، جن کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل ہے، ہمیں اس بعد اور فصل کی وجہ سے ایسے لوگ نظر آتے ہیں، جنہوں نے تاریخ میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں نہایت سرعت سے ترقی کی۔ انہوں نے اپنے متنوع ادب میں ترقی کے مغلق بہت کم بحث کی ہے۔ ایسکلیس کے پرومیتھیئس میں ایک ٹکڑا ہے، جس میں پرومیتھیئس ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے آگ کے انکشاف نے کس طرح انسانیت کو تہذیب سے آشنا کر دیا۔ اس نے ثقافتی نشوونما کی منازل کا تذکرہ پچاس سطروں میں اس انداز سے کیا ہے کہ کئی امریکی ریاستیں اسے آج غیر اخلاقی حد تک جدید سمجھیں گی۔

یورپڈیس میں بھی ترقی کی طرف ایک اشارہ ملتا ہے۔ لیکن یہ تصور، زینوفن کے سقراط اور افلاطون کے یہاں بھی موجود ہے۔ اور ارسطو کی سرد مہر رجعت پسندی تو اس تصور کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ یونانیوں نے تاریخ کو ایک چکر سے مثال دی ہے اور ارسطو کا یہ خیال کہ تمام فنون اور علوم، ان گنت مرتبہ ایجاد اور فنا ہوئے ہیں، تھیلیس سے لے کر مارکس اوریلیئس تک یونان کے اس نقطۂ نظر کا نچوڑ ہے، جو اس نے علوم کے سلسلہ میں پیش کیا تھا۔ رواقیوں نے یہ تعلیم دی تھی کہ مستقبل سے کوئی امید نہ رکھو، حتیٰ کہ ابی کیورس کے پیرو بھی اپنی لذتوں کو ایک اداسی کے ساتھ قبول کرتے تھے اور بریڈلے کی طرح یہ محسوس کرتے تھے کہ ”سب ممکن دنیاؤں میں یہ دنیا بہترین دنیا ہے اور اس میں ہر چیز ایک لازمی بدی کی حیثیت رکھتی ہے“۔ لذت پرست، ہیکیساس نے زندگی کو ایک فضول اور ناکارہ چیز تصور کر کے خودکشی کی تلقین کی اور شوپنہار کی سی لمبی عمر پائی۔

آزادی کی دولت چھن جانے کے بعد یاسیت ایتھنز کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی، لیکن روما کی تاریخ میں بھی ہر قدم پر ہمیں یہی یاسیت ملتی ہے۔ لیوکریٹس، انسانوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہمارے اس سوال کا کہ "کیا ترقی ایک سراب ہے؟" نہایت مختصر جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تمام چیزیں ایک ہی حالت میں رہتی ہیں، لیکن یہ عظیم شاعر اور مفکر، اگر آج زندہ ہوتا تو موجودہ تہذیب کے متعلق بھی یہی بات کہتا؟ یقیناً وہ ہماری مشینوں اور اوزاروں کی تعداد سے متاثر اور مرعوب ہوتا، جو ہماری ہر آرزو کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن غالباً وہ اپنے محزوں انداز میں ہم سے یہ سوال پوچھتا کہ کیا یہ انسان، جو یہ بڑی بڑی مشینیں استعمال کرتے ہیں، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے آباؤ اجداد سے بہتر ہیں؟ وہ اس خبر میں دلچسپی کا اظہار کرتا کہ ایک جوان بیوی نے ایک کھڑکی کے آلہ توازن سے اپنے شوہر کو قتل کر دیا اور اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ انسانیت کو کئی صدیوں کے بعد آلات توازن کے فوائد اور استعمال کا علم حاصل ہوا ہے۔ وہ لازمی طور پر یہ کہتا کہ یہ فرق، مقاصد کا نہیں، محض ذرائع کا ہے اور یہ کہ شوہر کشی ایک قدیم صنعت ہے۔ زندگی میں جتنی زیادہ تبدیلیاں ہوتی ہیں، چیزیں اتنی ہی زیادہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہیں۔ غالباً ہماری ساری ترقی وسائل اور اطوار کی ترقی ہے، مقاصد اور اعیان کی نہیں۔

دوسرے رومی لیوکریٹس سے بھی گئے گزرے ہیں۔ وہ محض مستقبل کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ماضی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ ہوریس ماضی کا قصیدہ خواں ہے۔ ہیٹس اور جوونیال اپنے عہد کے انحطاط کا رونا روتے ہیں اور ورجل اپنے خوش آئند تخیل کی شدت سے نغمہ سرائی کرتے کرتے یکایک توارد ابدی کے المناک تصور میں کھو جاتا ہے۔

"پھر وہ قدیم پیغمبر، ٹیفیس پیدا ہوگا اور ایک اور جنم لے گا جو ہمارے محبوب مجاہدوں کو لے جائے گا۔ پھر جنگیں ہوں گی اور عظیم المرتبت اکیلیس پھر ٹرائے بھیجا جائے گا۔ وقت پھر ماضی کو جدت کے التباس میں ملبوس کر کے حال میں لے آئے گا۔ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے، سب کچھ فریب ہے" اور مارکس اور یلیس، انسانی وجود کا کمال حاصل کر کے یعنی اپنے اندر سیاست اور فلسفہ کا ایک خوش آئند امتزاج پیدا کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"خردمند روح تمام دنیا کا سفر کرتی ہے۔ اپنے گرد خلا میں گھومتی ہے اور ازل کا مشاہدہ کرتی ہے اور کائنات کی تخریب اور احیا کے ادوار پر غور کرتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں کسی نئی چیز سے روشناس نہیں ہوں گی اور ہمارے آباؤ اجداد نے ہم سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ ایک چالیس برس کا انسان، جو اوسط ذہانت کا مالک ہے، ماضی اور مستقبل کے سب واقعات دیکھ لیتا ہے۔ دنیا میں اتنی یکسانیت ہے"۔

ترقی کے تصور کے خلاف یونانیوں کا عناد یا اس سے بیزاری کے کیا اسباب ہیں؟ کیا اس کی وجہ ان کے تاریخی تجربہ کا اختصار تھا کہ ان کی تہذیب بہت سرعت سے اوج کمال پر پہنچی اور پھر زوال پذیر ہوگئی۔ یا ان کے یہاں تاریخی دستاویزوں کا فقدان تھا، جس کی وجہ سے ان میں وہ نظر پیدا نہ ہوسکی، جو انہیں ان کی ترقی کے معیار سے آگاہ کرتی۔ ان کے یہاں بھی زمانہ وسطیٰ آیا تھا اور ایک ہزار برس کی مدت میں وہ بربریت کی منزل سے فلسفہ کی منزل تک پہنچے تھے۔ اس مدت کے بعد ہی انہوں نے ادب کی تخلیق شروع کی تھی۔ لیکن کیا کاغذ اتنا مہنگا تھا کہ اسے محض تاریخ لکھنے پر ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا؟ یا ترقی میں عدم یقین اس سبب سے تھا کہ یونانی صنعت اپنی نشوونما میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھی اور کریٹ کے علم حرفت سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ یا ان مادی آسائشوں کی خاصی مقدار پیدا نہ کرسکی تھی، جو جدید "ایمان ترقی" کی بنیاد ہیں۔

زمانہ وسطیٰ میں آسائشوں کی کمی نے ترقی کے تصور کو ابھرنے کا موقع نہ دیا لیکن اس وقت جنت کی امید زندگی کا مرکز تھی۔ حیات بعد ممات پر یقین عموماً افلاس کی شدت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، فرد میں بھی اور جماعت میں بھی۔ اور جب دولت آتی ہے تو بہشت بے معنی اور بے مقصد نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن ایک ہزار برس تک یہ تصور لوگوں کے ذہن پر مسلط رہا۔

مغربی یورپ میں احیائے علوم اور صنعتی انقلاب کے ساتھ دولت آئی اور دولت میں اضافہ کے ساتھ ترقی کی کشش زیادہ اور نجات کی امید کم ہوگئی۔ جدید تاریخ کا عظیم ترین واقعہ کوپر لیکس کا یہ انکشاف ہے کہ زمین کی، عالم سیارگاں میں کوئی اہمیت نہیں۔ اس تصور نے بہت سی نازک روحوں کو ناخوش کردیا، لیکن جب جنت، محض آسمان اور مکان میں تحلیل کی گئی تو انسان کی لچکدار روح نے ایک ارضی جنت میں ایمان پیدا کیا۔ کیمپنیلا، مور اور بیکن نے "جنت الارض" پر کتابیں لکھیں اور عالمگیر مسرت کے لابدی ہونے کا اعلان کیا۔ یورپ نے آسائشیں اور لذتیں در آمد کیں اور صوفیوں اور سادھوؤں کو خارج کیا۔ تجارت نے شہر تعمیر کیے۔ شہروں نے یونیورسٹیاں بنائیں، یونیورسٹیوں نے سائنس کو ترقی دی، سائنس نے صنعت کی طرح ڈالی اور صنعت نے ترقی کے امکانات پیدا کیے۔ گیرا گینٹوا نے پنٹیا گردیل کو لکھا: "تمام دنیا عالموں، فاضل مدرسوں اور بڑے بڑے کتب خانوں سے بھری پڑی ہے"۔ پیر ڈی لاری نے ۱۴۵۰، ۱۵۵۰ کے زمانے کے متعلق کہا: "ایک صدی میں ہم نے انسانوں اور علم و فضل کے کارناموں میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد، چودہ صدیوں میں بھی نہ کرسکے تھے"۔ ان الفاظ میں ہمارے معاصرین کا لہجہ بول رہا ہے۔ کس صدی نے اپنے آپ کو اس قسم کے بلند بانگ اندازوں سے نہیں یاد کیا؟ لیکن یہ خود اعتمادی، احیائے علوم کی جان تھی۔ ہمیں اس کی جھلک فرانسیس بیکن کی ہر نظر

میں نظر آتی ہے اور یہی خود اعتمادی ایشیائی روح کے مقابلہ میں یورپ کا طغرائے امتیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ ترقی کا تصور صنعتی اور لادین تہذیب کے لیے وہی حیثیت رکھتا تھا جو جنت کی آرزو زمانہ وسطیٰ کی مسیحیت کے لیے رکھتی تھی۔ جدید ذہن کے لیے عزیز ترین تصور، جو ہمارے سماجی فلسفہ کا نچوڑ ہے، ترقی اور جمہوریت کا تصور ہے۔ اگر یہ دونوں تصورات بالائے طاق رکھ دیے جائیں تو ہم ذہنی طور پر برہنہ اور مضحکہ خیز بن جائیں گے اور ہمارے احیا کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔

۲۔ ترقی کا عروج

ترقی کے تصور کی تعیین، اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ روسو زمانہ کی رو سے مختلف تھا۔ اس نے امریکی وحشیوں کو، جنہیں اس نے نہیں دیکھا تھا، پیرس کے ان ظالموں پر ترجیح دی، جنہوں نے اس کے اعصاب کو شدت سے متاثر کیا تھا۔ روسو کے نزدیک فکر، انسان کے انحطاط کی علامت تھا۔ وہ ماضی کے عہد زریں کی تلقین کرتا تھا جس میں جنت اور ہبوط آدم کی گونج سنائی دیتی تھی۔ لیکن جب ہماری نظر ولولہ آفریں اور باہمت والٹیئر پر پڑتی ہے تو ہمیں روشنی کے زمانہ کی خوشگوار فضا دکھائی دیتی ہے۔ اس خداوند ذہن کو سرخ ہندیوں کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انسان وحشت کے زمانہ کے مقابلہ میں عہد تہذیب میں بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے وحشی انسانوں پر آہستہ آہستہ غلبہ پانے کی طرف سے اطمینان اور یقین تھا، اور وہ پیرس کو جنت پر ترجیح دیتا تھا۔

اس کے پیرو، ٹرگو اور کنڈورسے نے ترقی کے تصور کو اپنے عہد کی روح رواں بنا دیا تھا۔ ۱۷۹۳ء میں ایک فرانسیسی رئیس کنڈورسے گلوٹین سے خوفزدہ ہو کر پیرس کے گرد و نواح میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ روبس پیئر نے اسے دعوت دی کہ وہ آئے اور موت قبول کرے، کیونکہ اس نے ٹام پہن کی طرح بادشاہ کے قتل کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ ایک تنہا کمرہ میں جہاں اس کی رسائی نہ دوستوں تک تھی نہ کتابوں تک اور ایسی حالت میں کہ کوئی جانباز بھی یاسیت اور نومیدی کا شکار ہو جاتا، کنڈورسے نے ایک نہایت امید آفریں کتاب لکھی، جسے ترقی پسند ادب کی ایک مستند کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ انسان کی آئندہ عظمت کی شاندار پیشین گوئی کر کے کنڈورسے پیرس سے بھاگ کر ایک دور دراز کی دیہاتی سرائے میں جا چھپا، اور وہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ کر آرام سے بستر پر لیٹا اور سو گیا۔ لیکن جب وہ بیدار ہوا تو وہ سپاہیوں کی حراست میں تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے اسے قید خانے میں مردہ پایا۔ گلوٹین کو فریب دینے کے لیے وہ اپنے ساتھ زہر کی ایک شیشی لیتا گیا تھا۔ اس کی کتاب پڑھ کے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک غمگین اور متشکک نسل سے تعلق

رکھتے ہیں۔ ذرا اس شخص کو دیکھیے جس نے بظاہر ہر چیز کھو دی تھی۔ جس نے اپنی دولت و ثروت، انقلاب پر نچھاور کر دی تھی، جو ان وحشیوں کا ہدف ستم تھا جو انقلاب کے بعد برسر اقتدار تھے اور جس نے انقلاب فرانس کو، جسے وہ مستقبل کی روشنی سمجھا کرتا تھا، ابتری اور انتشار پر ختم ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کی کتاب انسان کی امید آفرینی کا کمال تھی۔ اس سے پہلے کبھی انسان کو انسانیت پر اتنا اعتماد حاصل نہیں ہوا۔ اور نہ شاید اس سے بعد۔ دیکھیے کہ کنڈورسے طباعت کے معاملہ میں کس قدر طلاقت سے کام لیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ چھاپا انسان کو آزادی اور حریت سے آشنا کرائے گا۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ چھاپا محض حس انگیز بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "فطرت نے توسیع علم اور آزادی، نیکی اور حقوق انسانیت کے احترام کا باہمی رشتہ قائم کیا ہے۔ فراوانی زر، انسانوں کو انسانیت، فراخدلی اور انصاف کی طرف مائل کرے گی"۔ اس کے بعد وہ روشنی کے عہد کے مشہور ترین عقیدہ کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "انسان کی صلاحیتوں کے نشوونما کی کوئی حدود نہیں ہیں۔ انسان لامتناہی طور پر کمال حاصل کر سکتا ہے۔ حصول کمال کی ترقی، جو ہر اس طاقت سے بلند ہے جو اس ترقی کے راستے میں حائل ہوتی ہے، اس دنیا کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے"۔

آخر میں وہ مستقبل کی ایک نہایت خوش آئند تصویر کھینچتا ہے۔ "علم میں اضافہ سے غلامی کم ہو جائے گی۔ طبقوں اور قوموں کی غلامی، پھر وہ وقت آئے گا جب دنیا میں صرف آزاد قومیں ہوں گی، جو صرف عقل و دانش کو اپنا آقا تسلیم کریں گی۔ اس وقت ظالم اور مظلوم، پادری اور ان کے پیرو اور معتقد صرف تاریخ کے اوراق اور تھیٹر کی سٹیج پر نظر آئیں گے۔ سائنس زندگی کی میعاد کو دوگنا تگنا کر دے گی۔ عورت مرد سے، مزدور سرمایہ دار سے اور غلام بادشاہ کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے گا اور شاید انسانیت جنگ کو فراموش کر دے گی"۔ اور آگے چل کر وہ نہایت شدت سے کہتا ہے۔

"کتنا اہم ہے یہ نظریہ اس فلسفی کی تسلی کے لیے، جو دنیا کی غلط کاری، ناانصافی اور جبر پسندی پر متاسف ہے۔ مستقبل کے اس امکان پر غور کرنے سے اسے عقل کی ترقی اور آزادی کے قیام کی تمام کوششوں کا اجر مل جاتا ہے۔ وہ ان تمام کوششوں کو انسانیت کی تقدیر کے سلسلہ کی کڑیاں سمجھتا ہے اور اس تصور میں اسے نیکی کی صحیح خوشی اور ایک ایسی لازوال خدمت کرنے کا سرور حاصل ہوتا ہے، جسے انقلابات زمانہ نہیں مٹا سکتے۔ یہ جذبہ اس کی پناہ گاہ ہے، جہاں اس پر ظلم کرنے والوں کی یاد اس کا تعاقب نہیں کر سکتی۔ وہ تخیل میں اپنے آپ کو اس انسان سے وابستہ کر دیتا ہے، جو اپنے حقوق حاصل کر چکا ہے، جو ظلم و ادبار کا بوجھ پھینک چکا ہے اور تیز قدموں سے

راہ مسرت پر گامزن ہے۔ وہ اپنے دکھ بھول جاتا ہے۔ وہ آلام اور مصائب، طعن و تشنیع کی پروا نہیں کرتا بلکہ ان عقلمند اور خوش نصیب لوگوں کی محفل میں بیٹھتا ہے جن کی قابل رشک حالت اس نے اپنی سنجیدہ کوششوں سے پیدا کی ہے"۔

کتنی پرزور امید آفرینی ہے یہ؟ کتنی بیباک عینیت اور انسانیت کے لیے کتنی ہمدردی ان الفاظ سے ٹپکتی ہے! ہم کنڈورسے کے اس معصوم جوش و خروش کو مضحکہ خیز سمجھ کر رد کردیں یا اپنے زمانہ کی ذہنی کم ہمتی کو، جس نے اپنے کچھ خواب پورے کرلیے ہیں، لیکن باقی خوابوں کی تکمیل کی اس میں جرات نہیں۔

اس روشن فلسفہ کے پیچھے تجارتی اور صنعتی انقلاب کارفرما تھا۔ اب نئے معجزے پیدا ہو رہے تھے۔ مشینیں، یہ مشینیں بے اندازہ مقدار میں اور نہایت سرعت کے ساتھ اور زندگی کے لوازمات اور اس کی آسائشیں پیدا کرتی تھیں۔ یہ محض وقت کی بات تھی کہ تمام اہم ضروریات زندگی پوری ہو جائیں گی اور افلاس مٹ جائے گا۔ بینتھم اور بڑے مل نے یہ سمجھا (۱۸۳۰ء میں) کہ اب انگلستان، اپنے سب باشندوں کے لیے تعلیم کی سہولتیں پیدا کر سکتا ہے اور ہمہ گیر تعلیم سے ایک صدی کے اندر تمام سماجی مسائل سلجھ جائیں گے۔ کومٹے نے تاریخ کو تین منزلوں میں تقسیم کیا۔ دینیات سے مابعد الطبیعیات اور مابعد الطبیعیات سے سائنس۔ بکل کی "تاریخ تہذیب" (۱۸۵۷ء) نے یہ امید بیدار کی کہ علم کی توسیع سے تمام انسانی آلام ختم ہو جائیں گے۔ دو برس بعد ڈارون نے اپنا نظریہ ارتقا پیش کیا۔ جدید ذہن اس دنیا میں رس بس گیا اور ڈانٹے کی جنت اور روسو کا "زریں ماضی" اس دنیاداری میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ سپنسر نے ترقی کو ارتقا کے ساتھ وابستہ کردیا اور ترقی کو زمانہ کی لازمی اور اٹل تقدیر سمجھنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طرف سے نادر ایجادات کی بھرمار ہونے لگی اور دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ سائنس، جو اب دینیات کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی تھی، ہر چیز کو ممکن سمجھنے لگی۔ سیاروں کی پیمائش ہونے لگی اور انسان بہادری سے طیور کی پرواز کا مقابلہ کرنے لگا۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء سے پہلے انسان کی صلاحیتوں کے متعلق ہر قسم کا مبالغہ آمیز عقیدہ جائز تھا۔

۳۔ ترقی یا تنزل

تاہم، دولت اور طاقت کے اضافہ کے ساتھ اور اس سرعت رفتار کے ساتھ، جو مغربی تہذیب کا طغرائے امتیاز ہے۔ بعض لوگوں نے ترقی کی حقیقت یا قدر پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ میکیاولی نے "احیائے علوم" کے عہد میں کہا: ہر زمانہ میں، انسانوں کی دنیا یکساں رہی ہے۔ ایک

ملک اور دوسرے ملک کے اختلافات سے قطع نظر، دنیا کا نقشہ ہمیشہ یہی نظر آتا رہا ہے کہ کچھ قومیں رو بہ ترقی رہی ہیں اور کچھ انحطاط پذیر۔ فوٹینل نے اپنے ”مکالمات مردگاں“ میں سقراط اور مونٹین کو دوزخ میں دکھایا ہے جہاں سب فلسفی ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں، وہاں وہ ترقی کے تصور پر بحث کرتے دکھائے گئے ہیں۔ سقراط اس ترقی کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، جو انسانیت نے اس کی موت کے بعد کی ہے اور وہ یہ سن کر غمگین ہو جاتا ہے کہ انسان ابھی تک وحشی ہیں۔ مونٹین اسے یقین دلاتا ہے کہ دنیا روبہ انحطاط ہے۔ اب پیر-کلیس، ارسٹیڈیس اور سقراط جیسی عظیم شخصیتیں نظر نہیں آتیں۔ بڈھا فلسفی اپنے کندھے جھٹک کر کہتا ہے ”اپنے زمانہ میں ہم اپنے آباؤ اجداد کا بے حد احترام کرتے تھے اور اب ہماری اولاد ہمیں ضرورت سے زیادہ تعظیم کی نظر سے دیکھتی ہے۔ در حقیقت ہمارے آباؤ اجداد میں، ہم میں اور ہماری اولاد میں کوئی فرق نہیں“۔ اور فوٹینل اس بحث کا نچوڑ یوں پیش کرتا ہے! ”دل ہمیشہ یکساں رہتا ہے، عقل اپنی پختگی کی کوششوں میں مصروف ہے۔ جذبات، نیکیاں اور بدیاں اب بھی وہی ہیں لیکن علم بڑھ رہا ہے“۔

ایکرمین نے کہا: ”انسانیت کی نشوونما کئی ہزار سال ہوئے شروع ہوئی تھی“۔ گوئٹے نے جواب دیا: ”شاید، ممکن ہے کئی لاکھ سال پہلے شروع ہوئی ہو، لیکن جب تک انسانیت قائم ہے، اس کے راستہ میں رکاوٹیں رہیں گی اور اسے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا تاکہ وہ اپنی قوتیں اور صلاحیتیں پختہ تر کر سکے۔ انسان زیادہ ہوشیار اور زیادہ زیرک تو ہو جائیں گے لیکن نہ بہتر یا خوش تر اور نہ عمل میں چالاک تر سوائے ایک محدود عرصہ کے لیے۔ مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے جب خدا انسانیت سے بیزار ہو جائے گا اور پھر ایک نئی نسل کی تخلیق کرے گا“۔ شوپنہار نے کہا: ”تاریخ کا اصل اصول ہے، ایک موضوع اور تفاصیل کا اختلاف“۔ نیٹشے نے کہا کہ ”انسانیت ترقی پذیر نہیں، نہ انسانیت کا کوئی وجود ہے۔ یا دنیا ایک وسیع جسمانی معمل ہے جہاں ظالم فطرت اپنے تجربات کرتی ہے۔ جہاں کچھ باتیں ہمیشہ کامیاب ہو جاتی ہیں لیکن اکثر چیزیں ناکام رہتی ہیں“۔ رومانوی جرمنی اس نتیجہ پر پہنچا تھا۔

ڈزرائیلی ان لوگوں میں سے تھا، جنہوں نے سب سے پہلے مادی اور اخلاقی ترقی، طاقت میں اضافہ اور مقاصد کی بہتری کے درمیان فرق کیا تھا۔ ”یورپ کے لوگ ترقی کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ چند سائنٹیفک انکشافات کی مدد سے انہوں نے ایک ایسے سماج کی طرح ڈالی ہے جو آسائشوں کو تہذیب سمجھتی ہے۔ مہذب یورپ خوش نہیں ہے، اس کا وجود ایک بخار ہے جسے وہ ترقی کا نام دیتا ہے۔ کس مقصد کے لیے ترقی؟ رسکن نے جو ایک متمول شخص تھا، ترقی اور دولت کے ہم معنی ہونے پر شک کا اظہار کیا۔ کیا یہ متمول دکاندار یا تاجر، جانسن یا شیکسپیئر یا چاسر کے عہد کے انگریزوں

سے بہتر انسان ہیں؟" کارلائل اور ٹالسٹائے نے یہ بات تسلیم کی کہ انسان نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے وسائل ایجاد کر کے بہت ترقی کی ہے۔ لیکن اس بے پناہ قوت سے کیا فائدہ جب وہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے صرف ہوتی ہے جو پہلے کی طرح متناقض اور مہمل اور بے معنی ہیں۔

۱۸۹۰ء میں سر آرتھر بالفر نے اپنے حکیمانہ اور پر زور انداز میں کہا کہ انسانی کردار اور اجتماعی تنظیم، فکر پر نہیں (جو ترقی کرتا ہے) بلکہ احساس اور جبلت پر مبنی ہے، جو ہزاروں سال میں بھی نہیں بدلتے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ہے راز ہماری اس ناکامی کا کہ ہم اپنے بڑھتے ہوئے علم کو زیادہ خوشی اور دائمی امن حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکے۔ ممکن ہے، یہ پھیلتا ہوا علم ہی ہمارے عہد کی یاسیت کا سبب ہو۔ اہل مدرسہ نے کہا تھا: "علم میں اضافہ، اندوہ میں اضافہ کے مترادف ہے" اور ان کا جدید ہم خیال اناطول فرانس کہتا ہے "ساری کائنات میں سب سے زیادہ غمگین مخلوق انسان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ میرے دوست، انسان اشرف المخلوقات ہے"۔

جدید صنعت کی اشتمالی تنقید نے ہمارے "ایمان ترقی" کو کسی حد تک متزلزل کر دیا۔ لوگوں کو ہمارے زمانہ کی ناانصافیوں کا احساس دلانے کے لیے اشتراکیوں نے ماضی کے امن و سکون کو سراہنا شروع کیا۔ رسکن، کارلائل، مورس اور کروپٹکن نے زمانہ وسطی کا ایسا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا کہ ہر شخص حسرت سے یہ سوچنے لگا کہ کاش وہ کسان ہوتا، جو کھیتوں سے وابستہ رہتا، اور اپنی کاشت کا ایک مقررہ حصہ زمیندار کو دے دیا کرتا! اس کے ساتھ ساتھ جدید سیاست کی آزاد تنقید نے ہر شعبہ میں بداخلاقی اور کم صلاحیتی کو بے نقاب کر کے ہمیں جمہوریت کی کبریائی حیثیت پر شک کرنے پر مجبور کر دیا، جو ایک صدی سے ہماری دیوی بن چکی تھی۔ چھاپے اور عوامی اخباروں کی ایجاد نے کمتر اذہان کو بلند کرنے کی بجائے بلند فطرتوں کو گرا دیا۔ سیاست، مذہب، ادب، حتیٰ کہ سائنس پر بھی اوسط قسم کے لوگ چھا گئے۔ نارڈک علم انسان اور عزم للیقین کا فلسفہ، سوقیانہ علم اصلاح نسل اور وی اینا کی نفسیات سے مقابلہ کرنے لگا۔ صحافت نے ادب کی جگہ لے لی۔ فلم کی ایجاد نے ڈرامے کے فن کو پس پشت ڈال دیا۔ عکاسی نے مصوری کو حقیقت سے دور دھکیل کر اسے عجیب و غریب ٹیڑھی ترچھی شکلیں اور مہلک صورتیں اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ روڈان میں بت تراش نے تراش خراش کو ترک کر کے مصوری شروع کر دی۔ بیسویں صدی میں موسیقی، چینی برتنوں کی نزاکت اور لطافت کی رقیب بن گئی۔

فن کے انحطاط اور جنگ کی آمد سے ترقی پر ہمارا ایمان متزلزل ہو گیا۔ صنعت کی توسیع اور رئیسیت کے زوال نے مل کر فنی ہیئت کو تباہ کر دیا۔ جب مشین نے کاریگر کی جگہ لی تو کاریگری ختم

ہو گئی اور جب مشین نے وسیع منڈیوں کی تلاش پر مجبور ہو کر اپنی مصنوعات کو فراواں مخلوق کی ضروریات کے مطابق ڈھالا، تو کثرت، یکسانیت اور بدذوقی نے حسن اور آہنگ کی جگہ لے لی۔ اگر رئیسیت باقی رہتی اور عوام کے لیے جمالیاتی ذوق کا سرچشمہ بنی رہتی تو ممکن تھا کہ صنعت اور فن دونوں ترقی کرتے۔ لیکن جمہوریت کو سیاست اور فن دونوں میں عوام کی پسندیدگی اور قبول عام کو کسوٹی بنانا پڑا۔ لاتعداد اوسط درجے کے انسانوں کا ذوق کارخانہ دار، تمثیل نگار، فلمی منظر نگار، ناول نویس اور آخر کار مصور، صنم تراش اور معمار کا رہنما بن گیا۔ قیمت اور حجم، قدر کا میزان بن گئے۔ حسن اور قدرت فن کی جگہ جو فن کے مقاصد تھے، ایک عجیب و غریب ندرت نے لے لی۔ فنکار جو صدیوں کے تمدن یافتہ رئیس طبقہ کے ذوق کی تحریک سے محروم ہو گئے تھے، اب تصور اور عمل کے کمال کے جویا نہیں ہیں بلکہ حیرت انگیز تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس میں یقیناً ندرت اور انفرادیت ہے۔ مصوری ذہنی مرض کی علامت بن گئی۔ معماری صدیوں کے لیے نہیں بلکہ ایک محدود مدت کے لیے عمارتیں بنانے پر مجبور ہوئی اور اس طرح اپنے لیے نشوونما کی راہیں مسدود کر لیں۔ موسیقی، عوام کے گھرانوں اور کارخانوں میں جا کر، قصابوں اور خادماؤں کے اعصابی نظام کے مطابق، نئے آہنگ تلاش کرنے لگی۔ صنم تراشی، لباس کی غیر مقبولیت کے باوجود تنزل پذیر ہوتی گئی۔ اگر موجودہ زمانہ موٹریں اور چہرہ کی آرائش و زیبائش کے سامان ہمیں نہ دیتا تو ہم یہ سمجھتے کہ بیسویں صدی میں فن بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

اور پھر "جنون عظیم" کا دور آیا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کا جامہ تہذیب خطرناک حد تک نازک اور باریک ہے۔ انہیں یہ اندازہ ہوا ان کا امن کتنا عارضی اور غیر محفوظ، اور ان کی آزادی کس درجہ ناتواں ہے۔ جنگوں کا تواتر اب ختم ہو گیا تھا لیکن اس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سائنس، جو کبھی ترقی کی ضامن تھی، اب فرشتہ اجل بن گئی تھی۔ وہ اس صفائی اور سرعت سے قتل اور خونریزی کرتی تھی کہ زمانہ وسطیٰ کی جنگیں کالجوں کے اکھاڑے معلوم ہونے لگی تھیں۔ سورما ہواباز، عورتوں اور بچوں پر بم پھینکتے تھے اور ماہرین کیمیا زہریلی گیس کی ثناخوانی میں رطب اللسان تھے۔ ایک صدی کے مترجم ادب، سائنس دانوں کے تعاون، تجارتی تعلقات اور مالی احتیاج سے جو بین الاقوامی دوستی قائم ہوئی تھی، تباہ و برباد ہو گئی اور یورپ، مختلف اقوام میں تقسیم ہو کر رہ گیا، جو ایک دوسرے کی خون کی پیاسی تھیں۔ جب یہ جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ فاتح اور مفتوح دونوں نے وہ تمام چیزیں کھو دی ہیں جن کی خاطر وہ لڑے تھے اور ایک حریص استعماریت پاٹسڈم سے منتقل ہو کر پیرس چلی گئی اور منظم اور منضبط حکومت کی جگہ جنگجو آمریت نے لے لی۔ جمہوریت گو پھیل رہی تھی لیکن مر چکی تھی۔ امید کا نام و نشان بھی مٹ گیا اور وہ نسل، جس نے جنگ پر بھروسا

کیا تھا، اب کسی چیز پر بھی یقین نہیں کر سکتی تھی۔ بیزاری اور کلیت کی موجوں نے سوائے کم تجربہ یافتہ یا بہت پختہ روحوں کے، ہر شخص کو اپنی زد میں لے لیا۔ ترقی کا وہ تصور جس نے کبھی انسان کو ایک بے سود عینیت کی طرف مائل کیا تھا، اب بے حقیقت فریب معلوم ہونے لگا۔

۴۔ چند اور فروعی باتیں

والٹیئر نے کہا تھا: "اگر تم مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو اپنی اصطلاحوں کی تعریف کرو"۔ ترقی کا کیا مطلب ہے؟ اعتباری تعریفیں بیکار ہیں۔ ہم ترقی کے تصور کو کسی ایک قوم، ایک مذہب یا ایک نظام اخلاق کے نقطۂ نظر سے نہیں جانچ سکتے۔ مثلاً رحم دلی میں اضافے کا تصور، نیطشے کے جوان پیروؤں کو خائف کر دے گا۔ ہم ترقی کو خوشی کی اصطلاح میں بھی تحلیل نہیں کر سکتے کیونکہ دنیا میں احمق، ذہینوں کے مقابلہ میں زیادہ خوش ہیں۔ اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ قابل احترام شخصیتیں، خوشی نہیں عظمت کی جویا ہیں۔ کیا ترقی کی کوئی معروضی تعریف ہو سکتی ہے، جو ہر فرد، ہر اجتماع اور ہر جنس کے نقطۂ نظر سے صحیح ہو؟ آیئے ہم عارضی طور پر ترقی کی تعریف یوں کریں کہ یہ ماحول پر زندگی کا بڑھتا ہوا تسلط ہے۔ ماحول، آرزو کی تکمیل کے سامانوں کا نام ہے اور ذہن اور مقصد کا انتشار پر، اور ہیئت اور عزم کا مادہ پر غلبہ کا دوسرا نام ترقی ہے۔

ترقی، ضروری نہیں کہ مسلسل ہو۔ اس میں تاریک ایام اور مایوس کن انحطاط کے دور بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آخری منزل بلند ترین منزل ہے تو ہم کہیں گے کہ ہم نے ترقی کی ہے۔ اور زمانوں کی قدر جانچتے وقت فکری الجھاؤ سے گریز کرنا پڑے گا۔ ہمیں دو ایسی قوموں کا باہمی موازنہ نہیں کرنا چاہیے جن میں سے ایک شباب سے گزر رہی ہے اور دوسری پختگی کی منزل کو پہنچ چکی ہے۔ کسی عہد کی بدترین صفات کا کسی دوسرے عہد کی حسین ترین صفات سے مقابلہ صحیح انداز فکر کے منافی ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ امریکہ اور آسٹریلیا جیسی نو عمر قوموں میں عام ذہنی افتاد، تنظیمی، سیاحتی اور سائنسی قسم کی ہے اور مصوری، شاعری یا صنم تراشی کی طرف مائل نہیں، تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر عہد اور ہر مقام کو ایک خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اور ثقافتی قسم کے ذہن اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب عملی قسم کے ذہن، ان کے لیے پہلے راستہ صاف کر چکے ہوں۔ اگر ہمیں یہ نظر آئے کہ تہذیبوں کے دور آتے اور گزر جاتے ہیں اور انسان کے ہر فعل کا انجام فنا ہے تو ہم موت کو برحق جان کر اس بات سے اطمینان حاصل کریں گے کہ ہم نے اپنی اور اپنی قوم کی محدود زندگی میں تھوڑی بہت ترقی کی ہے اور پہلے سے کسی قدر بہتر ہو گئے ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ آج کل کے فلسفی، افلاطون اور سقراط کے پایہ کے نہیں ہیں، یا ہمارے صنم تراش، ڈوناٹیلو یا انجلو

کا درجہ حاصل نہیں کر سکے، یا ہمارے مصور مرتبہ میں ویلاسکیوز سے کمتر ہیں۔ ہمارے شاعر اور مغنی، شیلے اور باخ کی بلندیوں تک پرواز نہیں کر سکے تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سب ستارے ایک ہی رات کو نہیں چمکے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا کل یا اوسط انسانی صلاحیت میں پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے یا نہیں اور آج وہ بلند ترین منزل پر ہے کہ نہیں؟

جب ہم زندگی کو ایک مربوط زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی جدید زندگی کا اس کے خطرات اور انتشار کے ساتھ، وحشی لوگوں کی زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں جو جہالت، بربریت، آدم خوری اور امراض سے پر تھی، تو ہمیں کچھ تسکین ہوتی ہے۔ ہماری نسل کے ادنیٰ درجے کے لوگ ان لوگوں سے شاید کچھ کم ہی مختلف ہوں، لیکن ان مدارج سے اوپر ہزاروں، لاکھوں انسان ایسے ہیں جنھوں نے ایسی ذہنی اور اخلاقی سربلندی حاصل کی ہے کہ وحشی انسان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ شہری زندگی کے پیچیدہ تانے بانے میں ہم کبھی کبھی وحشی ایام کی خاموش سادگی کے تصور میں پناہ لیتے ہیں، لیکن غیر رومانی لمحات میں ہم جانتے ہیں کہ یہ زندگی کے فرائض سے فرار ہے اور یہ کہ وحشت اور بربریت کی پرستش ہماری شخصیت کی ناپختگی کی علامت ہے۔ ان وحشی قبائل کی زندگی کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بچوں کی اموات کی شرح زیادہ اور زندگی کی میعاد کم تھی۔ ان کی رفتار سست تھی۔ ان میں قوت برداشت کم تھی۔ ان کا عزم ناتواں تھا اور ان میں طاعون کی وبا اعلیٰ پیمانہ پر پھیلتی تھی۔ دوست دار اور سبک رو وحشی، فطرت سے مشابہ ہے۔ دلچسپ، لیکن کیڑے مکوڑوں اور غلاظت کے لیے دلچسپ۔

لیکن وحشی اس خیال کی تردید کر سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی سیاست اور اپنی جنگوں سے کس طرح لذت اندوز ہوتے ہو؟ اور کیا تم واقعی ان وحشیوں سے زیادہ خوش ہو، جن کے قبائلی نام تم علم الانسان کی کتابوں میں پڑھتے ہو؟ ترقی کے نام لیوا یہ بات تسلیم کریں گے کہ ہم نے فن پیکار میں بہت ترقی کی ہے اور ہمارے سیاست دان، (سوائے دو چار کے) میلو اور کلاڈ۔لئس کے زمانہ کے رومی سیاست دان ہو سکتے تھے، اگرچہ مسٹر کولج، نیرو کی ایک زیادہ ترقی یافتہ صورت تھے۔ جہاں تک خوشی کا تعلق ہے، اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ وہ ایک غیر مرئی فرشتہ ہے، جو ہمارے مشاہدہ میں آتے ہی غائب ہو جاتا ہے اور شاید ہی کوئی اس کی پیائش کر سکے۔ خوشی اور مسرت کا انحصار پہلے صحت پر ہے، پھر محبت پر اور پھر دولت پر۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے، ہم اس طرح ترقی کر رہے ہیں کہ وہ ہمارے ارباب فکر کے ضمیر پر گراں گزرتی ہے۔ جہاں تک محبت کا تعلق ہے، ہم اس جذبہ میں عمق کی کمی کو ندرت اور تنوع سے پورا کرتے ہیں۔ ہماری غذا اور ادویہ کے دستور ہمیں اس خیال کی طرف مائل کرتے ہیں کہ سادہ وحشیوں کے

مقابلہ میں ہم امراض سے زیادہ گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں طبیب زیادہ ہوں گے، وہاں بیماریاں بھی پہلے سے زیادہ ہوں گی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے مقابلہ میں ہمارے زمانہ میں امراض کی کثرت نہیں۔ دولت البتہ ہمارے پاس زیادہ ہے۔ ہماری دولت ہمارے لیے یہ ممکن بناتی ہے کہ ہم ان امراض کا علاج کریں، جن میں مبتلا ہو کر وحشی ان کے یونانی نام جانے بغیر مرجایا کرتے تھے۔

صحت اور خوشی کا ایک معروضی اور قابل اعتبار پیمانہ ہمارے پاس موجود ہے اور وہ ہے بیمہ کمپنیوں کی اموات کے اعداد و شمار۔ بعض حالات میں یہ اعداد و شمار تین صدیوں پر حاوی ہیں۔ مثلاً جنیوا میں ۱۶۰۰ء میں اوسط میعاد زندگی بیس برس تھی، اور ۱۹۰۰ء میں چالیس برس، ۱۹۲۰ء میں امریکہ کے سفید باشندوں کی اوسط عمر ترپن سال تھی اور ۱۹۲۶ء میں چھپن سال۔ اسی قسم کے اعداد و شمار ہمیں جرمنی سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جرمنی میں ۱۵۲۰ء میں اوسط عمر بیس سال تھی، ۱۷۵۰ء میں وہ تیس سال ہوئی، ۱۸۷۰ء میں چالیس سال، ۱۹۱۰ء میں پچاس سال اور ۱۹۲۰ء میں ساٹھ سال۔ اگر یہ اعداد و شمار، حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر زندگی ایک نعمت ہے تو ہم اس کی مقدار میں روز افزوں اضافہ کر رہے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اس رفتار کو قائم رکھیں گے۔ حال ہی میں گورکنوں نے اپنے سالانہ اجلاس میں ان خطرات کا ذکر کیا، جو ان کے پیشہ کو عمر کا اوسط بڑھ جانے کی وجہ سے درپیش ہیں۔ اگر گورکن مغموم ہیں تو ترقی کے حقیقی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

۵۔ تاریخ کا خلاصہ

تاریخ کے موضوع اور مواد کے سلسلے میں اب تک جو اعتراضات اور جو ترمیمات ہمارے سامنے آئیں، آیئے ان کی روشنی میں مسئلہ ترقی کو ایک مربوط زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں یاسیت پسندوں کے نقطۂ نظر کی تردید قطعی غیر ضروری ہے۔ ضروری فقط اسی قدر ہے کہ ہم اس نقطۂ نظر کو جس حد تک ہو سکے، اپنے نقطۂ نظر میں سمونے کی کوشش کریں۔ جب ہم تاریخ کو قوموں کے عروج و زوال کا ایک نقشہ تصور کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس صعود و ہبوط کے انتشار میں کچھ لمحے انسانی تاریخ کے معراج کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ یہ لمحے ترقی کے وہ مرحلے ہیں جو کبھی ضائع نہیں ہوئے۔ آہستہ آہستہ انسان نے وحشت کی منزلیں طے کیں، سائنس کے عہد تک پہنچا۔ ترقی کے اس عہد تک پہنچتے پہنچتے اس نے جو منزلیں طے کی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

پہلی منزل، زبان نطق یا گویائی: زبان اچانک پیدا نہیں ہوئی اور نہ یہ دیوتاؤں کا عطیہ ہے، بلکہ یہ ذریعہ اظہار، صدیوں کی کوششوں کے بعد، حیوانوں کی تناسلی فطرت سے شعروشاعری کی منزل تک پہنچا ہے۔ الفاظ یا چیزوں کے عام ناموں کے بغیر، جو خاص تصورات کو ایک جماعت کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت بخشتے ہیں، کلیئے کبھی معرض وجود میں نہ آتے اور عقل کبھی وحشت کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکتی۔ الفاظ کے بغیر، فلسفہ اور شاعری، تاریخ اور نثر سب چیزیں ناممکن تھیں۔ الفاظ کے بغیر فکر کبھی آئن سٹائن اور اناطول فرانس کی باریکیاں حاصل نہ کر سکتا، الفاظ کے بغیر نہ مرد مرد بن سکتا اور نہ عورت عورت۔

دوسری منزل، آگ: کیونکہ آگ نے انسانوں کو آب و ہوا کی محتاجی سے رہائی دلائی اور اسے دنیا پر محیط ہونے کی اہلیت بخشی، اسی کی بدولت اس کے اوزاروں کو درشتی اور پائیداری حاصل ہوئی اور ہزاروں چیزیں جو پہلے کھانے کے قابل نہیں تھیں، انسان کی غذا کا جزو بن گئیں۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ آگ نے اسے رات کا آقا بنایا اور اس کے شام و سحر کے لمحات کو جگمگا دیا۔ ذرا اس زمانہ کا تصور کیجیے جب انسان نے تاریکی کو تسخیر نہیں کیا تھا۔ ہماری روایات اور غالباً ہمارے خون میں اب تک اس تاریکی کے خوف لرزاں ہیں۔ کبھی ہر جھٹپٹا، انسان کے لیے ایک المیہ تھا اور انسان غروب آفتاب سے خوفزدہ ہو کر اپنے غار میں گھس جاتا تھا، اب ہم صبح سے پہلے غاروں میں نہیں جاتے۔ اگرچہ طلوع کے منظر سے محروم رہنا حماقت ہے، لیکن ان قدیم خدشات سے آزاد ہونا بھی ایک نعمت ہے۔ انسان نے جب رات کو خودساختہ ستاروں سے روشن کیا تو اس کی روح درخشاں ہوگئی اور زندگی میں ہماہمی اور مسرت کے امکانات بڑھ گئے۔ ہم شاید کبھی مصنوعی روشنی کی ایجاد کا پوری طرح شکریہ ادا نہ کر سکیں!

تیسری منزل، حیوانوں کی تسخیر: ہمارے حافظے فراموش گار اور ہمارا تخیل ناتواں ہے کہ ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ جدید حالات میں ہم خونخوار درندوں کے حملوں سے محفوظ ہیں۔ اب حیوان ہمارے لیے تفریح کا مشغلہ اور ہماری غذا ہیں، لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا جب انسان صیاد بھی تھا اور صید بھی۔ اور غار یا کٹیا سے باہر ایک قدم رکھنا بھی اس کے لیے خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ دنیا کی تسخیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس سیارہ پر انسانیت کو حاوی کرنے کی جنگ، انسانی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ تھی۔ اس کے مقابلے میں اور سب جنگیں، معمولی خانہ جنگی کی حیثیت رکھتی تھی۔ جسم کی طاقت اور ذہن کی قوت کا یہ معرکہ رزم ایک طویل مدت تک جاری رہا اور آخرکار جب ذہنی قوت نے فتح پائی تو انسان دنیا میں محفوظ ہوگیا۔ اور اب یہ حفاظت نسلاً "بعد نسلاً" ہمیں میراث میں ملتی ہے اور پیدائش کے وقت سے ہماری ملکیت ہے۔ اس پیکار اور اس فتح کے سامنے ہنگامی انحطاط

کے لحاظ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

چوتھی منزل، زراعت: شکاری عہد میں تہذیب ناممکن تھی۔ تہذیب کے لیے ایک مستقل سکونت، ایک پائیدار طرز زندگی کی ضرورت ہے۔ تہذیب ہمیں، گھر اور مدرسہ کی بدولت حاصل ہوئی اور گھر اور مدرسہ اس وقت وجود میں آئے جب حیوانوں کے گوشت کے بجائے زرعی پیداوار ہماری غذا بنی۔ صیاد کو شکار مشکل سے ملتا تھا لیکن عورت، جسے وہ گھر چھوڑ جاتا تھا، زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرتی تھی۔ بیوی کی محنت سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ وہ مرد کے غلبہ سے آزاد ہو جائے گی اور اپنے غلبہ کو قائم رکھنے کے لیے مرد آخر کھیتی باڑی کی بے کیف زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ انقلاب صدیوں میں روپذیر ہوا، لیکن جب مکمل ہوا تو تہذیب کا آغاز ہوا۔ میرڈتھ نے کہا تھا کہ عورت وہ آخری مخلوق ہو گی جسے مرد تہذیب سے آراستہ کرے گا۔ میرڈتھ کی یہ بات اتنی غلط تھی کہ ایک جملے میں شاید ہی کسی نے اتنی غلط بات کہی ہو۔ اس لیے کہ تہذیب دو بڑے اسباب سے پیدا ہوئی۔ ایک گھر جس نے وہ اجتماعی رجحانات تکمیل کو پہنچائے، جو سماج کو مربوط رکھتے ہیں۔ دوسرے زراعت، جس نے انسان کو شکار، گلہ بانی اور قتل سے باز رکھا اور اسے اتنی مدت تک ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور کیا کہ وہ گھر، مدرسے، کلیسا، کالج، یونیورسٹیاں اور تہذیب کی تعمیر کرنے لگا۔ لیکن عورت نے مرد کو زراعت اور گھر عطا کیے۔ اس نے، جس طرح بھیڑوں اور سوروں کو گھریلو بنایا تھا، اسی طرح مرد کو بھی خانہ پسندی کی صفت بخشی۔ مرد، عورت کا آخری گھریلو جانور ہے اور غالباً وہ آخری مخلوق ہے جسے عورت تہذیب سے آشنا کرے گی۔ یہ کام ابھی شروع ہوا ہے۔ ذرا اپنی غذا کو دیکھیے، اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ابھی تک شکاری عہد میں ہیں۔

پانچویں منزل، اجتماعی تنظیم: دو شخص آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پچھاڑ کر قتل کر دیتا ہے اور پھر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ جو شخص زندہ ہے وہی راستی پر تھا۔ اور جو مارا گیا ہے وہ غلطی پر تھا۔ یہ طریقہ ہمارے بین الاقوامی تنازعات چکانے میں اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ دو اور شخصوں کو دیکھیے، جو آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے کہتا ہے چلو، ہم دونوں لڑائی سے باز آئیں۔ ممکن ہے ہم دونوں اس لڑائی میں مارے جائیں۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم اپنا جھگڑا قبیلہ کے ایک بڈھے کے پاس لے چلیں اور اس سے فیصلہ کی درخواست کریں۔ جس وقت ایک شخص نے دوسرے سے یہ بات کہی، وہ انسانی تاریخ کا ایک نہایت اہم لمحہ تھا کیونکہ اگر دوسرا شخص انکار کر دیتا تو بربریت جاری رہتی۔ اگر وہ ہاں کر دیتا تو تہذیب انسان کے حافظہ پر ایک اور نقش چھوڑ جاتی۔ وہ نقش کیا تھا؟ انتشار کی جگہ نظم، بربریت کی جگہ تدبر اور تشدد کی جگہ قانون کا احترام۔ یہ بھی ایک عطیہ فطرت ہے جسے ہم اس لیے محسوس نہیں کرتے کہ ہم اس کی حفاظت میں

چلے ہیں۔ ہم اس کی اہمیت اسی وقت محسوس کرتے ہیں جب ہم دنیا کے ان حصوں میں سفر کرتے ہیں جہاں ابھی تک انتشار اور بد نظمی کا تسلط ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ہمارے دارالعوام کسی خاص قدر و وقعت کے مستحق نہیں کیونکہ وہاں اوسط ذہن کی نمائندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں زندگی اور جائیداد کا وہ تحفظ میسر ہے جس کی قدر ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ خانہ جنگی یا انقلاب ہمارے ملک کو وحشت اور بربریت میں تحلیل کر دے۔ آج کل کے محفوظ سفر کا مقابلہ زمانہ وسطیٰ کے یورپ کے اس سفر سے کیجئے جس میں ہر طرف راہزن تھے۔ تاریخ میں کبھی وہ ربط اور آزادی نظر نہیں آئی جو آج کل کے انگلستان میں دکھائی دیتی ہے۔ اور شاید جب شہری اداروں میں قابل شخصیتوں کو جگہ ملنے لگے تو امریکہ میں بھی یہی صورت نظر آنے لگے۔ تاہم ہمیں سیاسی خرابیوں یا جمہوری بد نظمی سے اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ سیاست، زندگی نہیں بلکہ زندگی کا ایک نقش ہے۔ اس کی بدعنوانیوں کی تہہ میں سماج کا روایتی نظام قائم رہتا ہے۔ کنبہ میں، مدرسہ میں اور ہزاروں دوسرے اداروں میں، جو ہماری فطری انتشار پسندی کو تعاون اور نیک دلی میں تبدیل کر دیتے ہیں، ہم اس بات کا شعور نہیں رکھتے کہ ہم ایک ایسے سماجی نظام کا جزو ہیں جو سینکڑوں نسلوں کی سعی و ناکامی اور صدیوں کے علم اور دولت کا نتیجہ ہے۔

چھٹی منزل، اخلاق: یہاں ہم مسئلہ تہذیب کی شہ رگ کو چھیڑ رہے ہیں۔ کیا ہم اخلاقی طور پر وحشیوں سے بہتر ہیں؟ جہاں تک ذہانت، اخلاق کا ایک حصہ ہے، ہم نے یقیناً ترقی کی ہے۔ ذہانت کا اوسط پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ گیا ہے اور پختہ اذہان کی تعداد اب کہیں زیادہ ہے۔ لیکن جہاں تک کردار کا تعلق ہے، ہم یقیناً مائل بہ تنزل ہیں۔ فکر کی چالاکی بڑھ گئی ہے، لیکن روح کا استحکام کم ہو رہا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے حضور میں ہم ارباب فکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ ہم اپنے خیالات کی تعداد کے لحاظ سے ان سے بہتر ہیں اور ہم نے اپنے آپ کو ان اوہام سے آزاد کر لیا ہے، جو ان کے لیے اطمینان قلب کا ذریعہ تھے لیکن ہم اپنی ہمت، اعمال و مقاصد سے وفاداری اور شخصیت کی سادہ توانائی میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔

لیکن اگر اخلاق کے معنی وہ خوبیاں ہیں، جن کی مسیح نے تلقین کی تھی تو ہم نے باوجود کانوں اور جھونپڑیوں کے اور باوجود جمہوری خرابیوں اور جنسی بے راہ رویوں کے مقابلے کے کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کی ہے۔ ہم اپنے آباؤ اجداد کے مقابلے میں زیادہ نرم دل ہیں۔ ہم میں رحم اور سخاوت کے سلوک کی، حتیٰ کہ غیر ملکیوں اور دشمنوں کے ساتھ نسبتاً زیادہ صلاحیت ہے۔ ایک سال میں ہمارے ملک کے لوگوں نے سخاوت اور صدقہ کے طور پر دس کھرب ڈالر یعنی اپنے ملک کے مجموعی سکہ کا نصف خرچ کیا۔ ہم اب بھی قاتلوں کو پھانسی کی سزا دیتے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں اس

قدیم دستور قصاص کے متعلق شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان جرائم کی تعداد، جن کے ارتکاب پر ہم یہ سزا دیتے ہیں، بہت کم ہو رہی ہے۔ دو سو برس گزرے، انگلستان میں ایک شلنگ چرانے کے جرم میں آدمی کو پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ اور اب بھی اگر کوئی بہت بڑی چوری نہ کر سکے تو اسے سزا ملتی ہے۔ ایک سو چالیس برس گزرے، سکاٹ لینڈ کی کانوں میں کام کرنے والے غلام تھے۔ فرانس میں مجرموں کو اعلانیہ طور پر اذیتیں دے کر مارا جاتا تھا۔ انگلستان میں مقروض لوگوں کو زندگی بھر قید بھگتنی پڑتی تھی اور معزز لوگ غلام پکڑنے کے لیے افریقہ کے ساحل پر حملے کرتے تھے۔ پچاس سال گزرے، ہمارے قید خانے، غلاظت اور وحشت کے انبار تھے جہاں چھوٹے مجرم، بڑے مجرم بننے کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اب ہمارے قید خانے تھکے ہوئے قاتلوں کی سیرگاہیں ہیں۔ ہم اب بھی اپنے مزدوروں کی مزدوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن ہم "اصلاحی کام" کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ علم الارث نے، فطری انتخاب کے اس طریقہ میں جو کمزور اور ناتواں کو مٹا دیتا تھا، رحم دلی اور انسانیت کے عناصر شامل کر کے مصنوعی انتخاب کے ذریعہ توازن پیدا کر دیا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں پہلے سے زیادہ تشدد ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اخباروں کی تعداد اب پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئی ہے اور وسیع اور بارسوخ ادارے جرائم اور جنس سے تعلق رکھنے والے واقعات کی خبریں دنیا کے ہر گوشہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں، تاکہ ان کے ناظروں کے، جو دفتری کام اور یک زوجگی سے تنگ آ چکے ہیں، ضمیر کی تسکین ہو سکے۔ اور ہمارے صبح کے ناشتہ کو دلچسپ بنانے کے لیے پانچوں براعظموں کی بدعنوانیاں اور سیاسیات ایک ہی صفحہ پر یکجا کر دی جاتی ہیں۔ ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا کا ایک نصف حصہ باقی نصف کو تباہ کر رہا ہے اور جو اس تباہی سے محفوظ رہتے ہیں، ان میں سے اکثر خودکشی کر لیتے ہیں۔ لیکن بازاروں میں، گھروں میں، اجتماعی اداروں میں، ذرائع نقل و حرکت میں، ہمیں قتل اور خودکشی کرنے والے نظر نہیں آتے۔ ہر طرف صرف جمہوری خوش سلوکی اور ایک بے تصنع خوش خلقی نظر آتی ہے جو اس وقت کے اخلاق سے سینکڑوں درجے بہتر ہے جب مرد مصنوعی تواضع سے کام لیتے تھے اور جب بیت المقدس میں مسیح کے نام پر لڑنے کے لیے جاتے تو اپنی بیویوں کی عصمت محفوظ رکھنے کے لیے انہیں زنجیروں میں جکڑ جاتے تھے۔

ہمارا دستور نکاح، اگرچہ انتشار اور ابتری کا حامل ہے لیکن وہ اس دستور نکاح سے بہت بہتر ہے، جس کی رو سے عورت یا تسخیر ہوتی تھی یا خریدی جاتی تھی۔ آج مرد اور عورت، والدین اور اولاد، استاد اور شاگرد کے درمیان بربریت تاریخ کے کسی اور عہد کے مقابلہ میں کہیں کم ہے۔

عورت کی آزادی اور اس کا مرد پہ تفوق، اس مرد میں نفاست کے جذبات کی علامت ہے جو کبھی اس معاملہ میں کشت و خون سے گریز نہیں کرتا تھا۔ محبت، جس سے وحشی انسان قطعی نابلد تھا اور جسے صرف جسم کی ایک بھوک سمجھتا تھا، اب نغمہ و احساس کا ایک حسین گلستان بن گئی ہے، جس میں مرد کی عورت کے لیے طلب، اگرچہ اس کا سرچشمہ جسمانی ہوس ہی ہے، شعر و سخن میں رنگ و بو کی بساط بچھاتی ہے۔ اور جوان جس کے گناہ اس کے عمر رسیدہ بزرگوں کو ناخوشگوار معلوم ہوتے ہیں، اپنی چھوٹی چھوٹی خامیوں کا اس ذہنی بیتابی اور اخلاقی جرات سے کفارہ ادا کرتا ہے جن کی قدر اس وقت معلوم ہوگی جب تعلیم ہماری سماجی زندگی کو منزہ اور پاک کرنے کا فیصلہ کرے گی۔

ساتویں منزل، اوزار: رومانی لوگوں کے مقابلے میں، جو وحشت کی طرف مراجعت کی تلقین کرتے ہیں، ہم اوزاروں، انجنوں اور مشینوں کے گیت گاتے ہیں جو انسان کو حلقہ بگوش کر کے اب اسے حریت عطا کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی دولت پر شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ آسائشیں اور مواقع، جو کبھی صرف نوابوں اور جاگیرداروں تک محدود تھے، اب ہر صاحب عمل کا حق بن گئے ہیں۔ یہ لازمی تھا کہ تہذیب کی عمارت فرصت کے لمحات پر استوار ہوتی۔ یہ بڑھتی ہوئی ایجادیں ہمیں ماحول پر قابو پانے میں مدد دے رہی ہیں۔ اب ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ ہم حیوانوں کی طرح انہیں اپنے جسموں سے منسلک رکھیں۔ ہم انہیں ایجاد کرتے ہیں، استعمال کرتے ہیں اور پھر اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ ہم مہیب بازو بناتے ہیں، جو ایک مہینہ میں وہ اہرام بنا کر رکھ دیں جن کی تعمیر کے لیے کبھی لاکھوں مزدوروں کی محنت درکار تھی۔ ہم اپنے لیے وہ عظیم آنکھیں بناتے ہیں جو آسمان پر ستاروں کی خبر لاتی ہیں اور وہ باریک بیں آنکھیں تیار کرتے ہیں، جو زندگی کے خلیوں کو جا ٹٹولتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو براعظموں اور سمندروں کے پار خاموش آوازوں سے ہمکلام ہو سکتے ہیں۔ ہم زمین اور ہوا پر لازوال دیوتاؤں کی طرح سیاحت کرتے ہیں۔ یہ مانا کہ محض رفتار بے سود ہے، لیکن ہمیں طیارہ اس لیے عزیز ہے کہ یہ انسانی جرات اور استقلال کی علامت ہے۔ پرومیتھیلس کی طرح مدتوں زنجیروں میں اسیر رہنے کے بعد ہم نے اب آزادی حاصل کر لی ہے اور اب ہم شاہین سے چشمک کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

نہیں، یہ اوزار ہمیں غلام نہیں بنا سکتے۔ مشینوں سے ہماری شکست محض ایک عارضی حادثہ ہے۔ وہ حقیر کام، جو کبھی آقا اور غلام دونوں کے لیے باعث ذلت تھے، اب انسانوں کے کندھوں سے اٹھا کر ہم نے فولاد اور آہن کے عضلات کے سپرد کر دیے ہیں۔ بہت جلدی چشموں اور ہواؤں کی بابرکت طاقت، کارخانوں اور گھروں کی ملکیت بن جائے گی اور انسان کو ذہنی کاموں کے لیے فرصت نصیب ہو جائے گی۔ غلام انسان انقلابوں کی مدد سے نہیں بلکہ ایجادوں کے ذریعے

آزادی حاصل کرے گا۔

آٹھویں منزل، سائنس: بکل ٹھیک کہتا تھا، ہم محض علم میں ترقی کرتے ہیں اور دوسری برکتیں ذہن کی روشنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ تحقیق کی بے نام شرافت میں اور دارالعمل کی خاموش جنگوں میں ایک ایسی داستان پنہاں ہے، جو سیاست کی بدعنوانیوں اور جنگ کی بے سود خونریزی کی یاد بھلا دیتی ہے۔ اس قلمرو میں انسان اشرف المخلوقات معلوم ہوتا ہے اور تاریکی اور ستم گری کے بادلوں کو چیرتا ہوا سرچشمہ نور تک جا پہنچتا ہے۔ اسے ذرا اس ننھے سیارہ پر کھڑا دیکھئے۔ وہ کس طرح ان اجرام فلکی کی پیمائش اور تحلیل کرتا ہے جو اس کی حد نظر سے بہت دور ہیں۔ وہ کرہ ارض، سورج اور چاند کے انقلابات کی پیش گوئی اور دنیاؤں کی پیدائش اور موت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یا ذرا اس ماہر ریاضی کو دیکھئے، کس طرح وہ الجھی ہوئی راہوں سے نئے اصول نکالتا ہے اور ان گنت ایجادوں کے لیے راستہ صاف کرتا ہے، جو ہماری نسل کی طاقت میں اضافہ کرتی ہیں۔ یہ ایک پل ہے، چار فولادی چادروں پر لاکھوں ٹن لوہا معلق ہے جو ساحل کو ساحل سے ملاتا ہے اور کروڑوں انسانوں کی گزرگاہ بنتا ہے۔ یہ بھی شاعری ہے، شیکسپیئر کی شاعری کی طرح زوردار۔ یا اس شہر نما عمارت کو دیکھیے، جو بڑی بیباکی سے فلک کی طرف اٹھ رہی ہے جو ہماری دور اندیشی کی بدولت پیچ و خم کے ہر خطرہ سے محفوظ ہے اور رات کو ہیرے کی طرح جگمگاتی ہے۔ یہاں طبیعیات میں نئی ابعاد، نئے عناصر، نئے ذرے اور نئی قوتیں ہیں۔ یہاں چٹانوں پر زندگی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ یہاں دارالعمل میں حیاتیات ذی حیات کائنات کو بدل رہی ہے، جس طرح طبیعیات نے مادہ کو تبدیل کر دیا تھا۔ ہر جگہ آپ کو اس قسم کے منکسر المزاج اور گمنام شخص مطالعہ اور مشاہدہ میں مستغرق دکھائی دیں گے۔ یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ان لوگوں کی سپردگی اور انہماک کو کون سی محرکات نشوونما بہم پہنچاتی ہیں۔ جب ان کی کوششیں پھل لائیں گی تو وہ مر چکے ہوں گے، لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کیے جاتے ہیں۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ جس طرح انسان نے مادہ کو مسخر کیا ہے، وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا۔ ترقی کے حق میں ہمارا سارا استدال اس جگہ پھر متزلزل نظر آتا ہے۔ نفسیات نے ابھی تک انسان کے عمل کو بدلنا تو درکنار، سمجھا بھی نہیں۔ ابھی تک وہ تصوف، مابعد الطبیعیات، تجزیہ نفسی، نظریہ کردار، اساطیر الغدود اور عنفوان شباب کے دوسرے امراض میں مبتلا ہے۔ محتاط بیانات صرف وہی ماہرین نفسیات کرتے ہیں، جن کے متعلق ہم عموماً کچھ سنتے ہی نہیں۔ ہمارے وطن میں انتہا پسند بیانات کے لیے جمہوری جنون ہر سائنس کو فیشن بنا دیتا ہے، لیکن نفسیات ان امراض اور طغیانیوں پر قابو پا لے گی۔ وہ دوسری سائنسوں کی طرح ذمہ داریاں سنبھال کر پختگی اور معراج حاصل کرے

گی۔ اگر کوئی دوسرا بیکن پیدا ہو کر اس وسعت اور اسلوب مشاہدہ کو متعین اور محدود کر دے تو ہم میں سے کون، ان ہنگامہ پرور انکشافات کی حد بندی کر سکتا ہے جو علم ذہن کے ذریعہ ہم تک پہنچ سکتے ہیں؟ حال ہی میں انسان اپنے خود ساختہ ماحول سے توجہ ہٹا کر خود اپنی طرف دیکھنے لگا ہے۔

نویں منزل، تعلیم: ہم اپنے تجربات کا سرمایہ اگلی نسل کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں بخش رہے ہیں۔ یہ تعلیم ہمارے زمانہ ہی میں ایجاد ہوئی ہے۔ سب کے لیے مدرسوں کے سامان اور تعلیم اور تدریس کی سہولتیں بہم پہنچانے پر خاصی دولت اور محنت صرف ہوتی ہے۔ غالباً یہی ہمارے زمانہ کا اہم ترین پہلو ہے۔ کسی زمانہ میں کالج ایک عیاشی سمجھے جاتے تھے۔ کالج کی تعلیم فقط امیر طبقہ کے مردوں کو میسر آسکتی تھی۔ آج یونیورسٹیاں اتنی متعدد ہیں کہ ہر شخص پی ایچ ڈی بن سکتا ہے۔ گو ہم نے قدیم زمانہ کے بہترین اذہان پر تفوق حاصل نہیں کیا لیکن ہم نے انسانی علم کے اوسط معیار کو ضرور بلند کر دیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کا ذکر چھوڑیے، ایتھنز کی بیوقوف، مجنون اور وحشی مجلس کا تصور کیجیے۔ اس کے عوام، اس کی مذہبی رسوم اور اس کی مجبور اور مقہور عورتوں کے متعلق سوچیے، جو صرف طوائف بن کر ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔

صرف کوئی بچہ ہی یہ شکوہ کر سکتا ہے کہ ان مدرسوں اور ان یونیورسٹیوں نے، جہاں دونوں جنسیں تعلیم پاتی ہیں، ابھی تک دنیا کی تعمیر نو نہیں کی۔ تاریخی نقطۂ نظر سے تعلیم کا یہ تجربہ ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ اس کو ابھی اتنا وقت نہیں ملا کہ اپنی قدر و اہمیت کو ثابت کر دکھائے۔ وہ دس ہزار برس کی جہالت اور اوہام پرستی کو ایک دن میں تو دور نہیں کر سکتا، ہاں یہ ممکن ہے کہ جہالت کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش اور عام انتخاب کے ذریعہ عقاید کی تعیین، بالآخر تعلیم پر حاوی ہو جائے۔ ترقی کے اس اقدام کے بارے میں ہم ابھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ انسانیت کا ایک مستقل کارنامہ ہے، لیکن مفید نتائج ابھی سے نظر آرہے ہیں۔ لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ ذہنی برداشت اور آزادی امریکہ کے شمال میں زیادہ ہے اور جنوب میں کم؟ اس کی محض یہی وجہ نہیں کہ ابھی تک جنوب کے پاس اتنی دولت نہیں کہ وہ کافی مدرسے تعمیر کر سکے۔ شاید ہمارے سیاسی عہدوں میں اوسط قسم کی شخصیت کی مقبولیت اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ان خطوں سے منتخب ہوتے ہیں، جہاں اقتصادی ضروریات اور سیاسی تصرف ذہن کی تربیت کی مہلت نہیں دیتے۔ ہماری تعلیم کے نتائج اس وقت کیا ہوں گے جب ہم میں سے ہر شخص بیس برس کی عمر تک تعلیم پائے گا اور اس کے بعد انسانیت کے ذہنی خزانے اس کے لیے کھلے ہوں گے۔ پھر ذرا جبلت مادری پر غور کیجیے۔ سب صحت مند والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد ان سے بہتر ہو۔ یہ ہے انسانی ترقی کے پیچھے قوت، جو کسی آئین سازی یا اخلاقی تدریس سے کہیں زیادہ معتبر ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت پر مبنی ہے۔ عنفوان شباب کا

عہد طویل تر ہوتا جاتا ہے۔ ہم نے ابتدا بے بسی سے کی لیکن ہم آہستہ آہستہ اس اعلیٰ انسان کی طرف ترقی کر رہے ہیں، جو ہماری تاریک روحوں سے پیدا ہوگا۔ ہم تہذیب کا خام مال ہیں۔

ہمیں تعلیم سے نفرت ہے کیونکہ ہمیں جوانی میں اس کی اصل ہیئت سے واسطہ نہیں پڑا۔ تعلیم محنت شاقہ سے حقائق یکجا کرنے کا نام نہیں، بلکہ عظیم شخصیتوں سے تعارف اور شناسائی کا نام ہے۔ یہ محض روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ دنیا کو سمجھنے، اس پر تسلط پانے اور اس کی قدر پہچاننے کا وسیلہ ہے۔ اس کی پوری تعریف یہ ہے کہ یہ انسانیت کی سائنسی، ذہنی، اخلاقی اور فنی میراث کو اکثر لوگوں تک صحیح طور پر پہنچانے کا نام ہے۔ جس میراث کے ذریعہ نسل، فرد کی تربیت کرتی ہے اور اسے انسانیت بخشتی ہے۔ ہم پیدا ہوتے ہی انسان نہیں بن جاتے۔ ہم پیدائش کے وقت مضحکہ خیز اور بدبودار حیوان ہوتے ہیں۔ ہم انسان بنائے جاتے ہیں۔ ہم پر، ان سینکڑوں راہوں سے انسانیت تھوپی جاتی ہے، جن کے ذریعہ ماضی ہماری ذہنی اور ثقافتی میراث کو حال میں منتقل کرتا ہے اور اس میراث کی بقا، ہمارے جہلا اور حمقا کے باوجود، ہمیں ہر عہد گزشتہ پر فوقیت عطا کرتی ہے۔

دسویں اور آخری منزل، تحریر اور طباعت: یہاں بھی ہمارا تخیل کمزور ہے۔ ہم جہالت، نامردی اور خوف کے ان زمانوں کو پوری طرح یاد نہیں کر سکتے، جو ادب کی ایجاد سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان زمانوں میں انسان اپنے علم کو فقط زبان ہی کے ذریعہ اپنی اولاد تک منتقل کرتے تھے۔ اگر کوئی نسل بھول جاتی یا غلط فہمی سے کام لیتی، تو اسے علم نئے سرے سے حاصل کرنا پڑتا۔ تحریر نے ذہنی کارناموں کو ایک مستقل حیثیت عطا کی۔ اس نے ہزاروں سال تک افلاس اور واہمہ پرستی کے ادوار میں بھی، فلسفہ کی حکمت اور تمثیل اور شاعری کے حسن و جمال کو محفوظ رکھا۔ اس نے مختلف نسلوں کو مشترکہ میراث کے ذریعہ یکجا کر دیا۔ اس نے وہ قلمرو ذہن تخلیق کی، جس میں عظیم شخصیتوں کی عظمت ضائع نہیں جاتی۔

جس طرح تحریر نے نسلوں کو ملایا، اس طرح طباعت نے اپنی ہزار خامیوں اور خرابیوں کے باوجود تہذیبوں کو ہم آہنگ کیا۔ اب یہ لازمی نہیں ہے کہ اس کرہ ارض کی فنا سے پہلے ہماری تہذیب ختم ہو جائے۔ تہذیب اپنا مقام بدل لے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر ملک کی زمین، غلط کاشت کاری سے بنجر ہو جائے گی اور نئی زمینیں ہر نسل کے بہترین افراد کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ لیکن تہذیب کوئی مادی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سائنسی علم اور ثقافتی تخلیق کا مجموعہ ہے اور چونکہ یہ دوسری سرزمینوں پر منتقل ہو سکتے ہیں، اس لیے تہذیب کی فنا لازمی نہیں۔ وہ محض اپنے لیے ایک نیا گھر بنا لیتی ہے۔ فقط حکمت اور حسن ہی بقا کے مستحق ہیں۔ مفکر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کا آبائی شہر قائم رہے۔ وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ اس شہر کے کارنامے انسانیت کی مستقل میراث

بن جائیں۔

اس لیے ہمیں مستقبل کے بارے میں مایوسی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہم جنگوں سے تنگ آ چکے ہیں اور اس ذہنی تکان میں سپینگلر کی اس پیش گوئی پر ایمان لے آتے ہیں کہ مغربی تہذیب ختم ہونے والی ہے، لیکن تہذیبوں کے عروج و زوال کا یہ عالمانہ خاکہ ضرورت سے زیادہ نفیس ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل اس مہذبانہ یاسیت کا مضحکہ اڑائے گا۔ پہلے بھی جنگیں ہوتی رہی ہیں، جو اس جنگ عظیم سے زیادہ ہولناک تھیں۔ انسان اور تہذیب پھر بھی زندہ رہے۔ واٹرلو کے پندرہ برس بعد، شکست خوردہ فرانس نے وہ عظیم اذہان پیدا کیے کہ پیرس کا مفلس علاقہ ان سے بھر گیا۔ ہماری تہذیب اور تمدن کی میراث کبھی اتنی محفوظ نہیں تھی اور نہ کبھی ذہنی طور پر اتنی متمول تھی، جتنی اب ہے۔ ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس میراث میں اضافہ کریں اور اسے آئندہ نسلوں تک منتقل کریں اور یہ یقین رکھیں کہ وقت اس کی خرابیوں کو فنا کر دے گا اور اس کی حسین اور باقدر صفات، بہت سی نسلوں کو روشن ضمیری دینے کے لیے قائم و دائم رہیں گی۔

* * *

باب شانزدہم

تہذیب کی تقدیر

۱۔ اعصابی دور

۱۸۱۸ء میں شوپنہار نے اپنی کتاب "دنیائے عزم و فکر" تصنیف کی۔ انسان کا ترقی اور تہذیب پر جو یقین اور ایمان ہے، یہ تصنیف اس پر ایک زوردار اور جامع حملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۸۲۱ء میں کیٹس دق اور مایوسی سے جاں بحق ہوا اور مرنے سے پہلے وہ مکمل شاعری تخلیق کی جو خزاں کی پژمردہ کلیوں کی مہک اور فریب زدہ آرزوؤں کے المیہ سے گراں بار ہے۔ ۱۸۲۲ء میں شیلے، شاید اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کیے بغیر ڈوب کر مر گیا۔ بقول سیزر کے وہ "کافی مدت زندہ" رہ چکا تھا اور یورپ میں آزاد خیالی کی ہمہ گیر شکست کے بعد اس نے زندہ رہنا گوارا نہیں کیا۔ ۱۸۲۴ء میں بائرن مرگی کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس دنیا کو جس کا نقشہ اس نے "ڈان ژادن" میں شدید طنز کے ساتھ کھینچا تھا، اس نے خوشی اور اطمینان کے ساتھ خیرباد کہا۔ ۱۸۳۵ء میں ڈی موسے نے اپنی کتاب "نمائندہ صدی کے اعترافات" شائع کی، جس میں اس نے اس "تباہ حال دنیا" اور مایوس لوگوں کا ذکر کیا۔ ۱۸۳۷ء میں پشکن نے روس میں اور لیوپارڈی نے اطالیہ میں یاس آفریں شاعری کر کے وفات پائی۔ مختصر یہ کہ اس نسل کے اکثر لوگ یاس پسند تھے۔

لیکن ۱۸۵۰ء تک یورپ کی توانائی پھر زندہ ہوئی اور زندگی اور ادب کی تحریک نے دوبارہ جنم لیا۔ ایجادات نے صنعتی فتوحات کی طرح ڈالی۔ مشینوں نے انسان کو لمحات فرصت عطا کرنے شروع کیے اور ریل گاڑیاں اور دخانی کشتیاں، قوموں اور تہذیبوں کو، اشیاء اور افکار کے مبادلہ سے متحد کرنے لگیں۔ یہی زمانہ جدید ڈرامے کی انقلابی فتوحات کے آغاز کا دور ہے جس میں ہیوگو نے ۱۸۳۰ء میں ہرفانی لکھا اور ۱۸۴۸ء میں ابسن پیدا ہوا۔ انہیں دنوں بالزاک اور سٹینڈحال ناول کو

درجہ کمال تک پہنچا رہے تھے۔ ہائنے اور ہیوگو شعر و سخن اور سینٹ ہیویو اور ٹین تنقید نگاری کی تکمیل میں مصروف تھے۔ ٹینی سن اور براؤننگ نے اپنے پہلے دیوان شائع کیے۔ ڈکنز اور تھیکرے کی رقابت کا آغاز ہوا۔ ترجنیف، دوستووسکی اور ٹالسٹائے روس میں پھل پھول رہے تھے۔ ڈیلا کروا، مصوری میں قدامت پرستی کے خلاف اپنی پہلی جنگیں لڑ رہا تھا اور ٹرنر انگلستان کو آفتاب کی شعاعوں سے لبریز کر رہا تھا۔ ڈارون، جدید سائنس کے اہم ترین معرکہ کے لیے مواد جمع کر رہا تھا۔ اسپنسر ایک نیا فلسفہ تعمیر کرنے میں مصروف تھا اور رینان نے ایک بہتر دنیا کی امید میں اپنی کتاب "سائنس کا مستقبل" لکھی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف احیا کا دور دورہ تھا۔

اس موت و حیات، تخریب اور تعمیر کے پس منظر میں ہمیں جنگ کے بعد کی یاسیت کو سمجھنے اور اسے قابل عفو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ واقعات کا پس منظر حقائق کے ادراک کا واحد طریقہ ہے۔

یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ جنگ عظیم ہمارے فکری حزن کا واحد سبب ہے۔ جنگ نے محض ان افکار اور احساسات کو نمایاں کیا، جو اس صدی کے اوائل سے ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔ سپنگلر نے اپنی عظیم کتاب "انحطاط مغرب" کا خاکہ ۱۹۱۴ء میں، یعنی جنگ سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ لیکن جونہی جرمنی نے شکست کھائی، اس نے اس کتاب کو نیطشے کے بعد اہم ترین فلسفیانہ طرز فکر کی بنیاد سمجھنا شروع کر دیا۔ مسٹر سپنگلر کو کبھی اپنے عہد سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور نہ انہوں نے کبھی مستقبل سے کوئی توقعات وابستہ کی تھیں۔ لیکن جنگ کی بربریت اور امن کی کلبیت کے بعد امریکہ کے ہزاروں نوجوانوں نے انہیں اپنے طرز فکر اور انحطاط پذیر تہذیب سے تنافر کا بہترین نمائندہ قرار دیا۔ جنگ کے بعد کا یورپ ہی، کیسرلنگ کے فلسفہ کو، جو مہاتما بدھ اور کنفیوشس کی صدائے بازگشت تھا، آمادگی اور انہماک سے سن سکتا تھا۔ اور جب اُس نے ہمیں یہ یقین دلایا کہ پرانی تہذیب ختم ہو رہی ہے تو اس کے خلاف احتجاج کی آواز نحیف تھی۔ ڈین انج اور ہلیئر بیلک صرف اسی بات پر متفق ہیں کہ تہذیب کا خاتمہ قریب ہے۔

بہت سے اسباب نے مغرب کو اس غیر روایتی انکسار پر مائل کیا تھا۔ ہنری ایڈمس نے قوت کی تذلیل کے تصور پر یاسیت کی بنیاد رکھی۔ میڈیسن گرانٹ نے یہ قدرے معقول استدلال کیا کہ نارڈک نسل جنگ کی وجہ سے تعداد میں کم، اثر مناکحت سے ناتواں، رومی نسل سے ضعیف اور ایشیا کی بغاوت اور جمہوریت سے ختم ہو رہی ہے۔ لوتھروپ سٹوڈرڈ نے ان خیالات کی تبلیغ پوری قابلیت سے اور ایک ایسے لہجہ میں کی جس میں احتیاط کے پہلو کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اور پروفیسر میکڈوگل نے بھی اس عام نوحہ گری میں اپنی لے شامل کر لی۔ اسی زمانہ میں عظیم ماہر

مصریات، پروفیسر فلنڈرز پیٹری نے یہ اعلان کیا کہ ایک نئی تہذیب کی تخلیق کے لیے یہ لازمی ہے کہ مختلف نسلیں آپس میں مل جائیں۔ لیکن اس نے بھی یہ محسوس کیا کہ اس اشتراک نسل سے مغربی تہذیب ختم ہو رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ تہذیب ۱۸۰۰ء میں اوج کمال پر پہنچ چکی تھی اور انقلاب فرانس کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ چار یا پانچ صدیوں میں ایک نئے نسلی امتزاج سے ایک نئی نسل پیدا ہو گی جو ایک نئی تہذیب کی داغ بیل رکھے گی۔

سپنگلر بھی قدیم زمانہ کا ذکر رومانیت کے افسردہ انداز میں کرتا ہے، اس لیے کہ اس نے اپنی پیٹھ پر روسو کی طرح سامنتی نظام کے زخم نہیں کھائے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کے وجود کے لیے:

”۱۸۰۰ء کے لگ بھگ انقلاب کا زمانہ آیا۔ زندگی کی ایک حد پر، زندگی بھرپور اور خود اعتماد تھی۔ وہ داخلی تقاضوں کی بدولت، گوتھک طفولیت سے گوئٹے اور نپولین تک مسلسل ارتقا کی مظہر رہی۔ لیکن دوسری حد پر ہمارے عظیم شہروں کی خزاں آور، مصنوعی اور بے جان زندگی ہے، جس کے سانچے عقل و خرد نے بنائے ہیں۔ آج ہمارے کام، انتخاب کو قائم رکھنے اور بہتر بنانے سے متعلق ہیں۔ کوئی عظیم جاندار تخلیق کرنے کی بجائے یونان کے عہد زوال کے سکندری مہندسین کی طرح ہم تفاصیل اور فروعات جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ جو شخص یہ نہیں سمجھتا کہ یہ انجام لابدی ہے اور اس میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی، وہ تاریخی شعور سے نابلد ہے“۔

ہم ختم ہو چکے ہیں یا بقول اس غیر متزلزل جرمن کے مابعد الطبیعیاتی ضروریات نے ہمارا خاتمہ کر دیا ہے۔ سپنگلر کو افادیت پر اعتقاد نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی ان دلائل کے مطابق رواں دواں ہے جنہیں منطق کبھی نہیں سمجھ سکتی۔

۲۔ اقوام کی فنا

تاہم سپنگلر کے نظریہ کی حمایت میں ہمارے پاس کافی شہادت موجود ہے۔ یہ شہادت مابعد الطبیعیات پر مبنی نہیں کیونکہ مابعد الطبیعیات کو آسانی سے مسترد کیا جا سکتا ہے۔ یہ شہادت، تاریخ کی اساس پر قائم ہے اور اگر تاریخ دروغ گوئی سے کام نہ لے تو وہ قابل تردید ہے۔ تاریخ، جس کے چہرہ پر فنا کی چھاپ ہے۔ تاریخ، جس کا اہم ترین قانون یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ابھرتی ہے، گرتی بھی ہے۔ انیسویں صدی کی تحقیقات نے پوری تفصیل سے ہمیں قوموں، نسلوں اور ریاستوں کے زوال کی داستانیں سنائی ہیں۔ اس سے پہلے شاید ہی کبھی کسی قوم نے ماضی کو اتنا کھنگالا ہو، جتنا کہ پچھلے سو سال میں لوگوں نے عہد گزشتہ کی چھان بین کی ہے۔ ترقی اور مورخوں کی صدی نے

طیاروں، ریڈیو اور زہریلی گیس کی صدی کے لیے مایوسی اور انحطاط کی میراث چھوڑی ہے۔

تاریخ کس طرح تقدیر کی مجبوریوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ذرا متکبر مصر کی طرف دیکھیے، جس نے ریگ زار پر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ یورپ سے زیادہ پر اجلال صنم کدے تعمیر کیے، بحیرۂ روم کے تمام باشندوں پر حکومت کی، کروڑوں غلاموں پر ظلم و تعدی کا مینہ برسایا اور اپنے بادشاہوں اور اسقفوں کو "مکان ابد" میں جگہ دی۔ لیکن اس "ابد" کا کیا باقی رہ گیا؟ سڑتی ہوئی ہڈیوں پر سفید بال نمایاں ہیں۔ اہرام مصر میں سے بھی موت کا تعفن بر آمد ہوتا ہے۔ ان تجسیمات اوہام کے گرد، صحراؤں کی ریت اڑ اڑ کر چکر لگاتی ہے۔ حکومت ہر سال انہیں صاف کرنے پر خاصی رقم خرچ کرتی ہے۔ اور جب مسافر، جس کے چہرہ پر ریت کے ٹکڑے جم جاتے ہیں، انہیں دیکھنے کے بعد لوٹتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ اگر حکومت ایک دو صدیوں تک ان اہرام کی جھاڑ پونچھ نہ کروائے تو کیا ہو! وہ تصور کرتا ہے کہ ان پر ریت کی تہیں چڑھ جائیں، حتیٰ کہ ان میں سے طویل ترین عمارت بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور پھر مصر کی عظمت اور بربریت کا کونسا نشان باقی رہ جائے!

یا یونان کو لیجیے اور اس پہاڑی پر چڑھیے جو پار تھنیون کو جاتی ہے۔ یاد کیجیے کہ کس طرح نو برس تک، اکٹنس اور نیسکلیس نے اس سادہ لیکن مکمل صنم کدہ کی تعمیر کی نگرانی اور رہنمائی کی، جو توازن اور طرز کے لحاظ سے اعتدال و توازن کی مثال ہے اور جس کے خطوط اس طرح قوموں کا انداز اختیار کرتے ہیں کہ ان سے انسانی جسم کی حرارت اور گداز جھلکتے ہیں۔ غور کیجیے کہ کس طرح فیڈیاس اور اس کے تلامذہ نے سخت مرمر میں سے اصنام تراشے۔ مردوں کے اس قدر حسین اصنام کہ انہیں دیکھ کر ذہن اور شخصیت پھلے پھولے بغیر نہیں رہ سکتے، دیوتاؤں کے پر شکوہ اور متین بت، جنہیں دیکھ کر انسان ان دیوتاؤں کو بھول جاتا ہے، جو عیاشی اور کشت و خون میں مصروف رہتے تھے۔ کئی صدیوں تک یہ مندر پہاڑی پر کھڑا رہا۔ سورج کی روشنی میں چمکتا دمکتا رہا۔ کئی نسلیں اس کے مشاہدہ سے روحانی غذا حاصل کرتی رہیں اور یہ محسوس کرتی رہیں کہ یہاں شاید ایک دو لمحوں کے لیے انسان دیوتا بن گئے تھے۔

لیکن ۱۶۸۷ء میں جنگ کے بادل گھر آئے۔ ترکوں نے ایتھنز پر فتح حاصل کر کے پار تھنیون کو اپنا بارود خانہ بنایا۔ وینس والوں نے پیر-ئس میں اپنی جنگی کشتیاں بھیجیں اور انہوں نے پار تھنیون پر توپیں چلا کر اسے تباہ و برباد کر دیا۔ جب آپ اس پہاڑی پر، اس حسن اور خرد کے مجسمہ کو خراج عقیدت پیش کرنے جاتے ہیں تو وہاں آپ کو پار تھن نظر نہیں آتے فقط ان کے چند آثار دکھائی دیتے ہیں جو شاید ایک دو زلزلوں کے جھٹکے سے ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں۔ پار تھنیون کا

اکثر و بیشتر حصہ آپ کے قدموں کے نیچے ہوگا۔ سفید، درخشاں پتھر کے کروڑوں ریزے! جب آپ لوٹیں گے تو یہ سوچیں گے کہ کیا تاریخ کا سبق یہی ہے کہ انسان جاں کاہی اور جانفشانی سے ایک عمارت تعمیر کرے اور بے حس اور بے رحم زمانہ اسے مٹا ڈالے۔ زمانہ دائم و قائم ہے اور انسانی فن فانی اور حسین ترین چیزیں زیادہ جلد فنا ہوتی ہیں۔

پار تھینون ختم ہوا، یونان ختم ہوا، روما آیا اور اس شدت اور تندی سے دنیا پر چھا گیا کہ کبھی گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن شرح پیدائش اور زمین کی کم زرخیزی نے اسے تباہ کر دیا۔ اب اس کا کوئی نشان تک نہیں رہا، سوائے اس کے امیروں کی یاد کے، جن کی ہم نقل کر سکتے ہیں۔ کریٹ ختم ہو گیا۔ جوڈیا، فینیشیا، کارتھیج، بابل اور ایران ان دیوتاؤں کی مانند ہیں جن کے پرستار ختم ہو گئے ہیں۔ یہ وہ صنم کدے ہیں جہاں زائرین تو جاتے ہیں لیکن کوئی دست دعا نہیں اٹھاتا۔ ان سب پر موت طاری ہے۔

یورپ آیا۔ اطالیہ، ہسپانیہ، فرانس، انگلستان، جرمنی اور ایک ایسی تہذیب پیدا ہوئی کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ انہوں نے کلیسا بنائے، جو پار تھینون کے ہمسر تھے۔ یونانیوں سے بہتر سائنس تعمیر کی۔ ایسی موسیقی تخلیق کی کہ قدما کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی اور علم کو جمع کر کے اسے اس پیمانے پر دوسروں تک منتقل کیا کہ اس سے پہلے کبھی ممکن نہ ہوا تھا۔ لیکن شپینگلر اٹھتا ہے اور اس یورپ سے یوں خطاب کرتا ہے جو جنگ سے ہراساں اور لرزاں ہے:

”تم مر چکے ہو، میں تم میں انحطاط کی تمام علامتیں دیکھتا ہوں۔ تمہارے ادارے، تمہاری جمہوریت، تمہاری بد عنوانیاں، تمہارے وسیع و عریض شہر، تمہاری سائنس، تمہارا فن، تمہاری اشتراکیت اور دہریت، تمہارا فلسفہ، حتیٰ کہ تمہارا ریاضی، ان تمام صفات کا حامل ہے جو قدیم ریاستوں کی آخری منزلوں کو ممیز کرتی تھیں۔ ایک اور صدی گزرنے دو اور تہذیب تم سے دور کہیں اپنا گھر بنائے گی۔ یہ تمہارا اسکندری عہد ہے“۔

امریکہ آتا ہے اور ایک ایسی جامع تہذیب کی بنیاد رکھتا ہے کہ اس سے پہلے شاید ہی کبھی پیدا ہوئی ہو اور غالباً یہ تہذیب، سب پچھلی تہذیبوں سے زیادہ عروج حاصل کرے گی۔ لیکن اگر تاریخ میں کچھ صداقت ہے اور اگر ماضی، مستقبل کے لیے مشعل ہدایت کا کام دے سکتا ہے تو یہ تہذیب بھی، جسے ہم محنت شاقہ اور عرق ریزی سے تعمیر کر رہے ہیں، فنا ہو جائے گی اور آج جہاں ہم محنت و مشقت میں مصروف ہیں، یہاں ہزاروں سال کے بعد وحشیوں کا راج ہو گا۔

یہ ہے وہ نقشہ جو مورخ کا تصور، ماضی اور مستقبل کے متعلق قائم کرتا ہے۔ وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تاریخ میں فقط ایک امر یقینی ہے اور وہ ہے انحطاط۔ جس طرح زندگی میں فقط ایک چیز

قطعی ہے اور وہ ہے موت!

۳- اقتصادیات اور تہذیب

یہ بڑی المناک تصویر ہے۔ آیئے دیکھیں کہ کیا المناک تصویر صحیح ہے؟

تہذیب کیا ہے؟ تہذیب، تحفظ اور ثقافت، تنظیم اور آزادی کا ایک مرکب ہے۔ اخلاق اور قانون کے ذریعہ سیاسی تحفظ، پیداوار اور مبادلہ کے ذریعہ اقتصادی تحفظ، علم، اطوار اور فنون کی نشوونما اور تبلیغ کے ذریعہ ثقافت، یہ ایک پیچیدہ مرکب ہے جس کے کئی اسباب و علل ہیں، جن میں سے کوئی سبب بھی عظمت یا انحطاط کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم اس مرکب کو اجزا میں تحلیل کرنے کی کوشش کریں گے اور ہر ایک جزو کا الگ الگ مطالعہ کریں گے۔

اقتصادی اسباب اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا انسان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود ہوتی ہے اور اگرچہ انسان اپنے ماحول کو اتنا ہی متاثر کرتا ہے، جتنا کہ ماحول اسے۔ ماحول پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ آب و ہوا زمین کی زرخیزی پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ کم بارش آہستہ آہستہ کسی تہذیب کو ختم کر سکتی ہے، جس طرح کہ اس نے شام اور بابل کی تہذیبوں یا اس قدیم تہذیب کو ختم کیا تھا جس کے آثار اینڈریوز نے منگولیا میں دیکھے ہیں۔ اہمیت کے اعتبار سے خوشگوار آب و ہوا کے بعد زمین کی زرخیزی کا دوسرا درجہ ہے۔ یہ سبب لابدی نہیں ہے کیونکہ یونان اور روما کا اکثر حصہ چٹانوں، دلدلوں اور ریگزاروں پر استوار ہوا تھا۔ لیکن روما کے زمینداروں نے یونان کو فتح کیا تھا اور زمین میں زرخیزی کی کمی تھی، جس نے روما کو تباہ کیا۔ افسروں کے کسانوں پر مظالم اور زمین پر زمینداروں کی جگہ کاشتکاروں کی نگہداشت اور اس کے ساتھ کاشت کاری کی نوعیت میں انحطاط نے روما کو مجروح و متاثر کیا اور اب اسی طرح امریکہ کو مجروح اور متاثر کر رہا ہے۔ اس کے برعکس، چین کی دائمی زرخیزی، اس قدیم مگر نوجوان ملک میں تہذیب و تمدن کے اعادہ کی توجیہ کرتی ہے۔ تہذیب کی راہ، مغرب کی طرف نہیں بلکہ ہرے بھرے کھیتوں کی طرف جاتی ہے۔ جب انسان گرم ممالک سے نکلتا ہے تو اسے سلطنت قائم کرنے کے امکانات شمال اور جنوب میں نظر آتے ہیں۔ لیکن آج کل وہ تمام اصولوں کی طرف سے بے نیازی اختیار کر کے اور ان کا مذاق اڑا کر مشرق کی طرف لوٹ سکتا ہے، لیکن یہ بات اب بھی صحیح ہے کہ ہر جگہ زمین کی نوعیت روح کی تہذیب پر اثرانداز ہوتی ہے۔

زمین غذا کے علاوہ معدنیات پیدا کرتی ہے اور بعض حالتوں میں سونا اور چاندی، لوہا اور کوئلہ، قوموں کی بقا کے لیے گندم اور جو سے زیادہ اہم ثابت ہوتے ہیں۔ پھر انگلستان کی مثال

لیجیے۔ لاریئم کی چاندی کی کانیں ختم ہو گئیں تو یونان مفلس اور ناتواں ہو گیا۔ یہی حال روما کا ہوا۔ ہسپانیہ میں چاندی کی کانوں کا انتشار اس کی کمزوری کا باعث بنا۔ انگلستان کی موت اس وقت قریب ہوگی، جب نیو کاسل در آمد کرنے لگے گا۔ اور جب چین کی زمین اپنی معدنی دولت دوبارہ اگلنے لگے تو وہ شاید پھر تہذیب کے معاملہ میں دنیا کی قیادت کرنے لگے۔ بروکس ایڈمس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایلیسس لورین کی فتح کے بعد جرمنی نے انگلستان سے صنعتی قیادت چھین لی تھی اور ۱۸۹۷ء میں پنسلوانیا کے کوئلے کے میدانوں کے افتتاح سے امریکہ صنعتی طور پر تمام دنیا سے سبقت لے گیا۔ اس وقت یورپ چین پر اس کے کوئلے کے حصے بخرے کرنے کے لیے لپکا، اور امریکہ نے فلپائن پر قبضہ کر لیا۔ کوئلہ بادشاہ ہے، تیل ولی عہد ہے اور برقی قوت تاج و تخت کی جھوٹی دعویدار ہے۔

ان اقتصادی اسباب کی طرح تجارتی حیثیت اور طاقت بھی تہذیب کے قیام و استحکام کا ایک اہم سبب ہے۔ کسی قوم کو اشیا اور تہذیب کے اس مبادلہ کی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے، جو قوموں کو زندگی کی تحریک اور زرخیزی عطا کرتی ہیں، اس کے لیے کسی اہم تجارتی شاہراہ سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ یونان، ٹرائے کی فتح اور ایجیئن پر تسلط کے بعد ابھرا۔ روما نے کارتھج کی شکست اور بحیرۂ روم پر تسلط کے بعد عروج حاصل کیا۔ ہسپانیہ میں سرواٹیس اور ویلاسکویز اس لیے پیدا ہوئے کہ وہ نئی دنیا کی رہگذر پر تھا۔ اطالیہ میں احیائے علوم ہوا کیونکہ وہ مغرور لوگوں کی آماجگاہ اور یورپ اور مشرق کے درمیان تجارت کا وسیلہ تھا۔ روس بہت آہستہ آہستہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوا کیونکہ زمانہ وسطیٰ کے بعد زمینی راہوں کی جگہ بحری راستوں نے لے لی تھی اور کسی قسم کی سیاسی چالبازی یا جنگ سے وہ ان سمندروں پر قبضہ نہیں جما سکا، جن میں اس کے دریا آکر ملتے تھے۔ جب کونسٹائن نے قسطنطنیہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا اور قدیم بازنطین، روس، جرمنی اور آسٹریا سے لیوانٹ تک کی شاہراہوں کا وسطی مقام بن گیا تو روما کا انحطاط شروع ہو گیا۔ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور تجارتی راہیں بحیرۂ روم سے شمالی اوقیانوس میں منتقل ہو گئیں تو اطالیہ کے زوال کے دن آ گئے۔ جب طیاروں کے ذریعہ تجارت میں اضافہ ہو گا تو تہذیب اپنی آماجگاہ ہوائی راستوں کے اڈوں پر بنائے گی۔ برلن سے بغداد تک کا تصور شاید کل محض خواب نہ رہے اور جب چین، مغرب کا قومی رقیب اور خریدار بن جائے تو ممکن ہے کہ روس کے بیابان، آسمانی چہل پہل سے فروزاں ہو جائیں۔

آخری اقتصادی سبب صنعت ہے اور اس کی تاریخ اتنی مختصر ہے کہ اس کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں۔ صنعت، دولت بہم پہنچاتی ہے اور ایک مختصر سی جگہ میں ایک کثیر آبادی کو یکجا کرتی ہے۔ استعماری تشدد کو سرمایہ دیتی ہے اور سیاسی استیلا کا باعث بنتی ہے۔ لیکن کیا یہ

تہذیب کی پرورش بھی کرتی ہے؟ صنعت مقدار کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور صنعت، فنکاری اور انفرادیت کو نظرانداز کرتی ہے۔ کبھی ہر صنعت فن تھی، اب ہر فن صنعت ہے۔ کبھی انسان، جو کارخانوں میں کام کرتے تھے، دست کار تھے، اب وہ محض مزدور ہیں۔ کیا مشینیں انسان کو بھی ایک کل میں تبدیل کر دیں گی اور روح، روحانی لطافت اور نشوونما سے محروم ہو جائے گی؟ صنعتی انگلستان میں، الزبتھ کے عہد کا سا ادب یا نیوٹن کے زمانہ کی سی سائنس، یا وہ روشن اور درخشاں مصوری، جو رینلڈز سے شروع ہو کر ٹرنر پر ختم ہوئی تھی، اب معدوم ہے۔ جرمنی کا عظیم زمانہ، فریڈرک، کانٹ، گوئٹے اور بیتھوون کے ساتھ شروع ہوا اور بسمارک اور فان مولٹکے، یعنی خون، فولاد اور کوئلے پر ختم ہوا۔ فرانس میں انگلستان یا جرمنی سے کہیں کم صنعت اور کہیں زیادہ تہذیب تھی اور اگرچہ فرانسیسی اطوار و آداب میں، والٹیئر کے عہد کی سی زندہ دلی نہیں رہی، لیکن فرانسیسی ذہن، مولیئر کے بعد سے روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اب، جبکہ فرانس کے پاس السیس لورین ہے، وہ بھی ادب کو صنعت پر قربان کر سکتا ہے۔

نہیں، یہ صنعت نہیں، تجارت ہے جس نے زندگی اور فکر کو نشوونما کی تحریک بخشی ہے اور یورپی تہذیب کے اعلیٰ زمانے تخلیق کیے ہیں۔ پھر بھی، صنعت جوان ہے اور ماضی کو دیکھ کر مستقبل کا تصور قائم نہیں ہو گا۔ ممکن ہے کہ صنعت اتنی دولت جمع کر لے کہ ہمیں فکر کے لیے فرصت اور فراغت کے لمحے مل جائیں اور ہم زندگی کے فن کو پھر زندہ کر سکیں۔

۴۔ حیاتیات اور تہذیب

صحیح ماحول اور فضا موجود ہو تو تہذیب کے مقاصد کے لیے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے جو توانائی اور اجرت کی دولت سے مالا مال ہو اور صحراؤں کو سمن زاروں اور ماحول کو اپنے مقاصد کے سانچے میں ڈھال لے۔ یہ حقیقت تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے سامنے آئی ہے۔ پروفیسر پیٹری کے نظریہ کی رو سے، جب بہت سے لوگ ایک ماحول کی تسخیر میں مصروف ہوں تو ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔ پیٹری کہتا ہے کہ تقریباً آٹھ صدیوں کے بعد اعلیٰ قابلیت کا دور آتا ہے اور چار پانچ سو سال تک قائم رہتا ہے۔ مثلاً گال، فرینک اور کلوویز اور شارلیمین کے عہد کے دوسرے قبائل کے اشتراک کے آٹھ سو سال بعد، ربیلیز اور مونٹین کا زریں فرانسیسی عہد آیا۔ اسی طرح اینگلز، سیکسن اور جیوٹس کے اشتراک کے آٹھ سو سال بعد شیکسپیئر اور بیکن کے انگلستان نے جنم لیا۔

دوسری اقوام کی تاریخ شاید اس نظریہ کے عین مطابق نہ ہو، لیکن ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ

نسلی اختلاط، ہنگامی طور پر مفید نہیں ہوتا لیکن تہذیب کے نقطۂ نظر سے، اس کے نتائج اہم اور مفید ہوتے ہیں۔ مختلف نسلوں کے اختلاط سے، غالباً کچھ مدت کے لیے شخصیت کی رنگینیاں ختم ہو جاتی ہیں، لیکن یہ اختلاط ذہن اور جسم کی بنیادی اور قدیم صفات کو مستحکم کر دیتا ہے اور احیا کا یہ عمل نئی فضاؤں میں جاری رہتا ہے کیونکہ ہجرت انہیں افراد کو منتخب کرتی ہے جو اساسی طور پر روحانی دولت سے مزین ہوتے ہیں اور جن میں تہذیب کم ہوتی ہے اور توانائی زیادہ۔ امریکہ اس بات سے سبق سیکھ سکتا ہے۔ ہمارا انتشار خون، ایک نئی قوم، نئے استحکام روح اور نئی تہذیب کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن گوبینو، نیطشے، چیمبرلین اور گرانٹ کے نظریہ کے متعلق آخر ہم کیا کہیں۔ اس نظریے کے مطابق نسلوں کا اختلاط شخصیت اور تہذیب کے انحطاط کا سبب بنتا ہے۔ ان معروف مفکروں نے بات کو الٹا سمجھا ہے، اس لیے کہ تاریخ شاہد ہے کہ انحطاط کی وجہ سے اختلاط عمل میں آیا۔ روما کا زوال وحشیوں کے حملہ سے کہیں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یہ زوال پہلے تعیش پسندی اور بعد میں رومن نسل کے خاتمہ سے شروع ہوا۔ جرمنوں سے اختلاط، نسلی زوال کا سبب نہیں، نتیجہ تھا۔

پیٹری کے نظریہ کا ناخوشگوار پہلو یہ ہے کہ ایک نسل ایک فرد کی مانند، جسمانی توانائی کی ایک معینہ مقدار کی اہل ہوتی ہے اور اسے طفولیت، پختگی اور زوال کی منازل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر نے اس نظام فکر کے ساتھ، جو ہر عالم کو بھلا لگتا ہے، یہ کہا کہ یہ زندگی اور موت کے چکر کی مدت تقریباً ہر جگہ ایک ہی سی ہوتی ہے۔ لیکن زندگی تمام عظیم کلیوں سے برتر ہے، وہ نسلیں یا قومیں جو کاشت کاری کرتی ہیں، صنعتی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتی ہیں۔

شاید یہی راز ہے اس انحطاط کا جو روما کی نسل پر آیا، جب اس نے زمین سے اپنا رستہ منقطع کر لیا اور مردانہ جنگجوئی کے باعث، بد اخلاق اور بیکار مزدوروں کا ایک شہر بسا لیا تو اس کی صحت اور تندرستی زائل ہو گئی۔ تمدن، تہذیب کے لیے لازمی ہے لیکن اس میں نسلی انحطاط کے بیج بھی موجود ہیں۔ ذہنی کام، دھوئیں سے بھرے ہوئے گھر اور لوگوں سے بھرے ہوئے بازار، حسین لباس اور مرغن غذائیں، تندرستی کو خراب کرتی ہیں۔ شہری صحت اور ادویہ کے ذریعہ بچوں کی شرح اموات میں کمی ہو گئی ہے اور زندگی کی میعاد بڑھ گئی ہے۔ وباؤں نے رومی سلطنت کی نصف آبادی کو اینٹونائینس کے عہد میں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور روما کو کثیر التعداد جرمنوں کے جال میں پھنسا دیا۔ کالی وبا نے انگلستان کو اس طرح پامال کر دیا کہ وہاں جاگیرداری ختم ہو گئی۔ ممکن ہے کہ جراثیم ہم پر پھر حملہ آور ہوں۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن صرف خوردبین کے ذریعہ ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم سبب، قوموں کی تقدیر پر شہری زندگی کے اثر سے پیدا ہوتا ہے اور وہ ہے ولدیت پر ارادی ضبط۔ جوں جوں شہر بڑے ہوتے جاتے ہیں، کنبے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ شہروں کی آبادی تناسل سے نہیں بڑھتی، بلکہ لوگ یہاں غیر ملکوں اور دیہاتوں سے ہجرت کر کے آتے ہیں۔ پرانی نسلیں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی نسلیں اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں۔ اس طرح رومیوں کی نسل قلیل تر ہوتی گئی۔ اس نے جرمن سپاہیوں سے نہیں بلکہ جرمن ماؤں سے شکست کھائی۔ یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ سیزر نے ان رومنوں کو انعام دیئے، جن کے کنبے بڑے تھے اور بانجھ عورتوں کو زیورات پہننے کی ممانعت کر دی۔ آگسٹس نے غیر شادی شدہ لوگوں پر پابندیاں عائد کر دیں اور ہر بچے کے لیے ماں کو ایک معقول رقم کا معاوضہ دینا مقرر کیا۔ اور کانسٹنٹین نے ان تمام بچوں کی پرورش حکومت کے سپرد کر دی، جن کے والدین ان کی نگہداشت کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ شرح پیدائش ہر اس جگہ کم ہو گئی جہاں تھوڑے بچوں والے کنبوں کو زیادہ بچوں والے کنبوں پر اقتصادی تفوق حاصل ہے۔ یہ باتیں فلسفہ کی دست برد سے باہر ہیں۔

کیا شرح پیدائش میں یہ کمی ہماری تہذیب کے انحطاط کا باعث نہیں بنے گی؟ ہر شخص جانتا ہے کہ امریکہ کے تعلیم یافتہ حلقوں میں شرح پیدائش بہت کم ہے۔ ماہرین حیاتیات اس اعتراض سے بخوبی واقف ہیں کہ طب اور سخاوت نے "فطری انتخاب کو ختم کر دیا ہے"۔ عام لوگ یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ نسل نچلی سطح سے ابھر رہی ہے اور تقریباً ساری اگلی نسل نااہل لوگوں کے ذریعہ بڑھ رہی ہے اور تعلیم قابل لوگوں کی لاولدیت کی وجہ سے زبوں حالت میں ہے۔

اس بات میں کسی قدر صداقت ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ مدرس کا کام اس حقیقت کی وجہ سے دوچند مشکل ہو گیا ہے کہ آئندہ نسل آج کے احمقوں کے ہاتھوں تربیت پا رہی ہے۔ تعصب اور واہمہ صوبہ پرستی اور رجعت پسندی کو جہلا کی زرخیزی سے نئی زندگی حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ اتنا عظیم حادثہ نہیں، جتنا کہ معلم سمجھتا ہے۔ علمی کارنامے میراث میں نہیں ملتے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے بچوں کو بھی پڑھنا لکھنا پڑتا ہے اور وہ بھی تعصب اور توہم پرستی کے دور میں سے گزرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مفلس لوگوں کے ہراساں اور اپاہج بچوں میں کتنی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے، جسمانی طاقت، علمی میراث کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے، شخصیت کا استحکام علم یا طاقت کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل قدر ہے۔ فلسفی، بالعموم نسلی بقا کے لیے بہترین مواد ثابت نہیں ہوتے۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ جرمنی کا بہترین خون، دہقانوں کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ ہمارا بھی یہی حال ہے۔ ممکن ہے یہ حالت امید افزا ہو کہ اب جو طلبا مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں، ان گھروں سے آتے ہیں، جہاں توانائی اور طاقت زیادہ

ہے۔ اور گمان غالب ہے کہ ان کی جہالت بہت جلدی تعلیم کے ذریعہ ختم ہو سکتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس مسئلہ کا حل، امرا میں شرح پیدائش کو بڑھانا نہیں بلکہ مفلسوں میں اسے کم کرنا ہے۔ ہمیں ضبط تولید کی طبی امداد کو آئینی حیثیت دینی چاہیے۔ ہمیں کمزوروں کی کثرت تولید کو کم کرنا چاہیے اور محبت کی کم نظری کو ختم کر کے ہمیں لوگوں میں تندرستی کی اہمیت کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ ہمیں تعلیم یافتہ لوگوں میں قلت تولید کی حقیقت کو تسلیم کر کے ماحول اور تعلیم پر یہ اعتماد رکھنا چاہیے کہ ان کی مدد سے تہذیب پھلے پھولے گی۔ وراثت، نسل کی معراج کا ایک حقیر سبب ہے۔ ارتقا اب حیاتیاتی نہیں، اجتماعی نوعیت رکھتا ہے۔ ہمیں ایک تندرست نسل دے دو، بہتر مدرسے تہذیب کو محفوظ اور قائم رکھنے کا کام خود کر لیں گے۔

۵۔ اجتماعات اور تہذیب

ترقی کا انحصار اتنا قدیم اداروں کی نوعیت پر نہیں، جتنا انتخاب کے طریقوں پر ہے۔ اس کا دارومدار تعلیم اور حکومت پر ہے نہ کہ طاقتور کے ناتواں کو نیست و نابود کرنے پر۔ اور مستقبل کے متعلق ہمارے شکوک، خاندانوں کے شجروں پر نہیں بلکہ ان اجتماعی اداروں کی موجودہ حیثیت سے متعلق ہیں، جنھوں نے کئی صدیوں سے انسان کے ارتقا کو منظم کیا ہے۔ کلیسا، خاندان، مدرسہ، ریاست، تہذیب کی تبلیغ کہاں تک کر سکتے ہیں؟

کلیسا نے یورپ میں، جہاں وہ کبھی حاوی تھا، اپنا تسلط کھو دیا ہے جو تقسیم ہو جانے کے بعد بھی تعلیم اور اخلاق کے نقطۂ نظر سے ایک اہم ادارہ تھا اور کسی مستحکم ریاست سے بھی ٹکر لے سکتا تھا۔ اب ہمارے یہاں مذہبی مصلحین نہیں رہے۔ کوئی شخص بھی، جو اپنے آپ کو قومی ضمیر کی آواز بنانا چاہے، ریاستی صدروں اور بادشاہوں کے برابر اختیارات اور قوت حاصل نہیں کر سکتا۔ جب سے مارٹن لوتھر نے اصلاح مذہب کا بیڑا اٹھایا اور اس ضمن میں جرمن نوابوں کی معاونت حاصل کی، ریاست نے آہستہ آہستہ کلیسا کی جائیداد اور قوت پر قبضہ کر لیا اور پادریوں کی اخلاقی قیادت واضح طور پر زوال پذیر نظر آ رہی ہے۔

تاریخ کے طالب علم کے لیے مذہبوں کا انحطاط اور اخلاق کے دینیاتی مفروضوں کا انتشار، حال کو سمجھنے اور مستقبل کے بارے میں پیشگوئی کرنے کے سلسلے میں نہایت اہم چیزیں ہیں۔ کبھی بھی مذہبی یقین اتنا مضمحل نہیں ہوا اور شاید ہی کبھی کوئی اخلاقی نظام اتنے نشیب و فراز میں سے گزرا ہو جتنا کہ مسیحی نظام آج کل گزر رہا ہے۔ کیا ریاست، کلیسا کی امداد کے بغیر اجتماعی نظام کو قائم رکھ سکتی ہے؟ کیا اخلاق الہیاتی عقائد سے علیحدہ ہو کر باقی رہ سکتا ہے؟ کیا آج کل کے مدرسے، کلیسا اور

گھر کا صحیح نعم البدل ہیں؟ کیا یہ مدرسے، حکمت کے بغیر سائنس، ذہانت کے بغیر علم اور ضمیر کے بغیر چالاکی نہیں سکھاتے؟ کیا یہ مدرسے ماحول سے ایک ایسی میکانکی مطابقت پیدا کرنے کی تعلیم نہیں دیتے جس میں جمالیاتی شعور اور تخلیقی مقصد کی کمی ہوتی ہے؟

مذہب کا مطالعہ ہم بعد میں کریں گے، آیئے پہلے خاندان کا مطالعہ کریں۔ جہاں تک خاندان کا تعلق ہے، وہ انحطاط پذیر ہے۔ خاندان ہمیشہ تاریخ کی ہر تہذیب کی اساس رہا ہے۔ خاندان معاشرے اور اجتماعی زندگی کی اقتصادی اور تخلیقی وحدت رہا ہے، جس میں والدین کا اقتدار قائم تھا۔ اس کی حیثیت ایک تمدنی وحدت کی سی تھی، جو ادب اور فن کی تبلیغ کرتا تھا۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم کا ذمہ دار تھا۔ وہ ایک ایسی اخلاقی وحدت بھی تھا جو اشتراک باہمی اور تنظیم کے ذریعہ ان اجتماعی رجحانات کی ترتیب کرتا تھا، جو مہذب سماج کے اتحاد کی نفسیاتی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ریاست سے زیادہ اہم تھا۔ حکومتیں ٹوٹ جاتی تھیں لیکن اگر خاندان باقی رہتے تھے تو نظم و ضبط قائم رہتا اور ماہرین اجتماعیات ہمیشہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر خاندان مٹ گیا تو تہذیب ختم ہو جائے گی۔

لیکن آج جبکہ ریاست مستحکم سے مستحکم تر ہوتی جا رہی ہے، خاندان گھرانوں سے مکانوں اور بچوں سے کتوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ مرد اور عورتیں اب بھی اختلاط کرتے ہیں اور کبھی کبھی بچے بھی پیدا کرتے ہیں، لیکن یہ اختلاط اکثر شادی کی شکل اختیار نہیں کرتا اور شادی اکثر ولدیت نہیں ہوتی اور ولدیت اکثر تعلیم نہیں ہوتی۔ آزاد محبت اور طلاق شادی کی حکومت کو مختصر کر دیتے ہیں۔ ایجاد، ولدیت کو ختم کر دیتی ہے۔ مدرسہ، بچہ کو ماں سے جدا کر دیتا ہے اور ریاست، باپ سے اس کے اختیارات چھین لیتی ہے۔ اس کے بجائے استاد اور پولیس کے سپاہی، پرانے گھرانوں کا سا نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ صنعت، زراعت کی جگہ لیتی ہے اور فرد کا کام اجتماعی زراعت میں سما جاتا ہے۔ رائے دہندہ، پنچایت، ان اجتماعی اداروں کی جگہ لیتا ہے جن میں کنبوں کی نمائندگی ان کے بزرگ کیا کرتے تھے۔ اس قدیم ادارہ کے آثار اب وہ مکان رہ گئے ہیں جہاں وہ اکٹھے رہتے ہیں اور یہاں صرف وہ ناقابل اعتماد احساس باقی ہے جو مرد کو عورت سے اور بیٹوں اور بیٹیوں کو والدین سے وابستہ کرتا ہے۔ اجتماعی نظام میں مرکزیت پیدا ہو گئی ہے اور ریاست نے ساری ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔

لیکن ریاست، کیا یہ اتنا مستحکم ادارہ ہے (جو اقتصادی اور اخلاقی حقائق پر استوار ہے) کہ یہ علم، اخلاق اور فن کی میراث کے قیام، اضافہ اور تبلیغ کی ذمہ داری صرف اپنے کندھوں پر لے لے۔ یا کیا اپنے موجودہ سیاسی نظام کی وجہ سے یہ ان جہلا کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، جن کے لیے

علم اور فن دونوں نفرت انگیز ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی اکثر ریاستوں پر کمتر درجے کے انسانوں کی حکومت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اعلیٰ عہدوں کی شاہراہ وہ تنظیم ہے، جس میں وطن پرستی، تدبر اور ضمیر کا گزر نہیں؟ کیا وجہ ہے کہ بداخلاقی اور سیاسی فریب اتنے عام ہونے پر بھی عوام کو غیظ و غضب یا کسی عملی اقدام کی طرف مائل نہیں کرتے؟ کیا وجہ ہے کہ حکومت کا اہم ترین فریضہ آج جرائم کی پردہ پوشی اور امن کے معاہدوں کے دوران میں جنگیں لڑنا بن گیا ہے؟ کیا اسی ادارے کو کلیسا اور خاندان تہذیب کی قیادت سپرد کر رہے ہیں؟

زیادہ دولت کسی قوم کے لیے مفید بھی ہے اور خطرناک بھی۔ چونکہ صلاحیتیں مختلف ہیں، جوں جوں ایجادات جرات مند ذہنوں کی قوت میں اضافہ کرتی جاتی ہیں، دولت کی تقسیم غیر مساوی ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح طبقوں کا باہمی فصل بڑھتا جاتا ہے اور اس سے سیاسی نظام میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہے اور جوں جوں دولت بڑھتی ہے، تعیش، نسل کی جسمانی اور ذہنی توانائی کو مٹانا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ اپنی تکمیل، اپنے کام میں نہیں، بلکہ جسمانی لذتوں میں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ تفریح کی مسرت، تخلیق کے نشاط کی جگہ لے لیتی ہے۔ مردانگی کم ہو جاتی ہے اور ذہنی امراض بڑھنے لگتے ہیں۔ شخصیت کمزور ہو جاتی ہے اور ممکن ہے کہ مصیبت کے وقت قوم شکست کھا جائے۔ ایک جوان ادیب نے کئی سال ہوئے کہا تھا۔

"تاریخ، بربریت کے اعادہ کا نام ہے۔ ایک قوم، جو مادی حالات کی نامساعدت کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہے، اپنی بقا کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی اور کمزور قوم کو فتح کر لیتی ہے۔ عزم اور عمل کی عادتیں، جو نامساعد حالات میں بنی تھیں، اقتصادی خوشحالی پیدا کرتی ہیں۔ خوشحالی سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جاتا ہے، جو جسمانی عمل کو بنظر تحقیر دیکھتا ہے اور تعیش کے فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ فرصت سے تفکر پیدا ہوتا ہے۔ تفکر، عقائد اور رسوم کو مٹاتا ہے، مشاہدہ کی نزاکت پیدا کرتا ہے اور عزم عمل کو ختم کر دیتا ہے۔ فکر، تجزیہ کی مہم میں، اجتماع کے پیچھے فرد کی دریافت کرتا ہے۔ اپنے صحت مند وظیفہ سے محروم ہو کر وہ اپنے باطن کو دیکھتا اور اس طرح انا دریافت کرتا ہے۔ مشترک مفاد کا احساس کم ہو جاتا ہے اور شہری نہیں، فقط افراد رہ جاتے ہیں۔

دور دراز سے، نامساعد حالات کا مقابلہ کرتی ہوئی کوئی قوم جب کٹے ہوئے جنگل، آزاد راہیں، ہرے بھرے کھیت اور آرام کا تعیش دیکھتی ہے تو سوچنے اور آرزو کرنے لگتی ہے اور متحد ہو کر حملہ کر دیتی ہے اور پھر وہی چکر شروع ہو جاتا ہے"۔

۶- تہذیب کی بقائے دوام

یہ ہیں اس پیچیدہ مسئلہ کے اجزاء اور یہ ہیں ہماری تقدیر کے متعلق ہمارے شکوک۔ ہم تاریخ کے بنیادی مسئلہ سے اب آخر کس طرح دوچار ہوں؟

آیئے ہم اپنے مسئلہ کی حدود قائم کریں۔ ہم یہ نہیں جاننا چاہتے کہ یہ کرۂ ارض فنا ہو جائے گا یا نہیں۔ غالباً یہ فنا ہو جائے گا۔ ہم یہ نہیں پوچھتے کہ کوئی خاص قوم یا نسل ہمیشہ کے لیے قائم رہے گی یا نہیں۔ غالباً وہ قائم نہیں رہے گی۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی خاص تہذیب ایک غیر معینہ مدت تک قائم رہ سکتی ہے یا اس کی تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ وہ بار بار تباہ ہوتی رہے؟ تہذیب کوئی مادی چیز تو ہے نہیں جو اس کرۂ ارض کے کسی خاص مقام سے ہمیشہ کے لیے وابستہ رہے۔ تہذیب فنی خصوصیات اور تمدنی تخلیقات کا ایک غیر مرئی مرکب ہے۔ اگر یہ صفات، مادی قوت کے کسی اور مرکز پر منتقل ہو جائیں تو تہذیب باقی رہتی ہے۔ اور جب ریاست، افواج، سیاست دان اور پولیس کا وجود باقی نہیں رہتا، اس وقت بھی یہ قائم رہتی ہے۔

ان معنوں میں یہ کہنا غلط ہے کہ تہذیبیں تباہ ہو جاتی ہیں اور قومیں مر جاتی ہیں۔ یونانی تہذیب مری نہیں، فقط وہ سرزمین، جس نے کبھی ہومر اور سکندر کو پروان چڑھایا تھا، اب ایسے سپوت پیدا نہیں کرتی۔ یونانی تہذیب آج نظر نہیں آتی لیکن ایک اور قلمرو میں، انسانی حافظہ کی مملکت میں یونانی تہذیب زندہ ہے۔ ہومر اب بھی اکیلیز کے غیظ و غضب کے گیت گاتا ہے اور سکندر، لنگا کے ساحل پر یورش کرتا ہے۔ ہیسائیڈ اب بھی دیہاتی نغمے گنگناتا ہے اور پنڈار کھلاڑیوں کے کارناموں کو شعر و سخن کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ سولن قانون بناتا ہے اور تعلیم پاتا ہے اور کلائیستھنیز، جمہوریت کی آبیاری کرتا ہے۔ پیریکلیس ایگزاگورس کی باتیں سنتا ہے اور سقراط کے ساتھ ایسپشیا کی بارگاہ میں جاتا ہے۔ ائیسکلیس، پرومیتھیس کی للکار کو فضاؤں میں بکھیر دیتا ہے اور یوروپیڈیس فاتحین کو مفتوح ٹروجن قوم کے ساتھ رلاتا ہے۔ افلاطون اپنے غیر محدود جامعہ میں خاموشی سے خراماں ہے، جہاں آج بھی لاکھوں طلبا اس سے درس حاصل کرنے آتے ہیں۔ دیوجانس اب بھی استقامت سے اپنی شمع علم روشن رکھتا ہے اور ارسطو، کائنات کی تحلیل میں مصروف ہے۔ زینو، صدیوں کے فاصلہ سے اور ٹیس سے ہمکلام ہے اور ایپی کیورس، لیوکریٹس کے دوش بدوش چلتا ہے۔ سیفو، اینکریون کے ساتھ مل کر شعر کہتی ہے اور سکندریہ کا اقلیدس، ارشمیدس کو ریاضی کے مسائل حل کرتے دیکھتا ہے۔ یہ موت نہیں، یہ تو نسل کی روح رواں ہے۔

حافظہ اس قسم کی موت پر غالب ہے اور انسانیت کا حافظہ، پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم اور متمول ہے۔ محض قلم کی وجہ سے نسلی حافظہ اس قدر بھرپور نہیں تھا لیکن طباعت نے اسے بے حد

قوی بنا دیا ہے۔ مدرسے، اسے ہر شخص کی دسترس میں لے آتے ہیں۔ ہر روز کوئی نئی کل اس کی اعانت کرتی اور قبرستان سے کسی آواز کو زندہ کرتی ہے، جو صدیوں تک راگ الاپتی ہے اور ان مناظر، الفاظ اور افکار کو ان کی جنم بھومی سے اٹھا کر دوسرے براعظموں میں لے جاتی ہے تاکہ لوگوں کے حافظہ کی دولت میں اضافہ ہوتا رہے۔

ہاں، قومیں مرجاتی ہیں، پرانے خطے بنجر ہو جاتے ہیں اور انسان اپنے آلات اور اپنے فنون اٹھا کر کہیں اور چلا جاتا ہے لیکن وہ اپنے حافظے کو قائم رکھتا ہے۔ اگر تعلیم نے اس کے حافظہ میں عمق اور وسعت پیدا کی ہے، تو تہذیب اس کے ساتھ منتقل ہوتی ہے۔ وہ فقط نقل مکانی کرتی ہے۔ نئی سرزمین میں یہ لازمی نہیں کہ تہذیب اپنی بنیاد از سر نو رکھے یا دوسروں کے تعاون اور دوستی کے بغیر زندگی بسر کرے۔ ذرائع نقل و حرکت اور وسائل بیان و اظہار اسے اس سرزمین سے وابستہ رکھتے ہیں جو اس کی جنم بھومی ہے اور مادر وطن کی امداد جو نو آبادیوں کو میسر ہوتی ہے، نوجوان ملکوں کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے، جو والدین کی شفقت جوانوں کے لیے۔ وہ حفاظت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں، اخلاق، حکمت اور فن کے اسرار کو نئی نسلوں تک منتقل کرتے ہیں۔ تہذیبیں، انسانیت کی روح کی تخلیق ہیں۔ جب ہم لکھتے اور پڑھتے ہیں، اشاعت اور تجارت میں مصروف ہوتے ہیں، تار اور برقی لہریں، قوموں اور تمدنوں میں ربط باہمی پیدا کر رہی ہوتی ہیں اور ساری دنیا کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کرتی ہیں۔

اب یہ لازمی نہیں رہا کہ تہذیب مرجائے۔ ممکن ہے یہ انسان کے بعد بھی زندہ رہے اور کسی اعلیٰ تر مخلوق کی ملکیت بن جائے۔

۷۔ امریکہ کا مستقبل

اس ضمن میں مزید بحث کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہم یورپ، ایشیا اور امریکہ کو علیحدہ علیحدہ زیر مطالعہ لائیں، اس لیے کہ خود یورپ ہی کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں مختلف ملکوں میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً قدرت نے انگلستان اور یورپی ممالک مثلاً روس اور دوسرے مغربی ممالک کو مختلف امتیازی صفات عطا کی ہیں۔ انہیں صفات کی بنا پر ترکیہ کا شباب نو اور اطالیہ کا عہد جدید انہیں امتیازی حیثیت دیتا ہے۔ اس عہد نو میں ممکن ہے کہ اپی نائر کے شوریدہ سر دھارے اطالیہ کو پھر احیائے علوم کی دولت سے مالا مال کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ روس اپنے متعدد کسانوں کو صنعتی تعلیم دے کر انہیں زمین کے معدنی خزانے نکالنے پر مامور کرے اور اس طرح ایک مستحکم صنعتی نظام قائم کر لے اور اس کا شمار دنیا کی بڑی "طاقتوں" میں ہونے لگے۔ اسی طرح جرمنی کی

انفرادی اور اجتماعی صحت اسے اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ دوبارہ تجارتی دنیا کی قیادت حاصل کر لے اور اگر انگلستان کے عدیم المثال ارباب سیاست نے اقتصادی قوانین کے کسی پر فریب حربہ سے اس کی مدافعت نہ کی، تو وہ آہستہ آہستہ اپنی خارجی تجارت کھو بیٹھے اور پھر اسے اندرونی افلاس اور بیکاری سے دوچار ہونا پڑے اور فرقہ وارانہ تنازعوں میں اپنی قوت زائل کر کے اسے مشرق میں اپنا اقتدار کھونا پڑے۔

انہیں، قوموں کی تقدیر کو ایک ہی لپیٹ میں موضوع بحث نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر قوم کے لیے مستقبل ایک علیحدہ روپ دھارے گا، لیکن اگر ہمیں تقدیروں کی تقسیم کرنی ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ انگلستان اور فرانس خسارہ کی طرف جا رہے ہیں اور جرمنی اور روس منافع کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ کہ یورپ پیچھے ہٹ رہا ہے اور ایشیا آگے بڑھ رہا ہے اور امریکہ بلوغت حاصل کر رہا ہے۔ تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہو رہی ہیں۔ اس صدی کے خاتمہ پر چین، یورپ کے کسی ملک کے برابر صنعتی ترقی کر چکا ہو گا اور امریکہ کاروباری ذہنیت سے ثقافت، دولت سے فن اور سیاست دانی سے نظم و نسق کی طرف بڑھ چکا ہو گا۔

سپینگلر غلط کہتا تھا کہ کاروباری دور، انحطاط کا پیش خیمہ ہے۔ یہ صرف زراعتی رئیست کے لیے انحطاط کا باعث ہے جس کی جگہ کاروبار لیتا ہے۔ عبوری دور ایک زراعتی عہد کو پیریکلیز کے ایتھنز، آگسٹس کے روما اور میڈیسی کے فلورنس کے فعال تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ ان شہروں میں کاروبار اور صنعت کی گرم بازاری تھی اور یہ جاگیرداروں کے تصرف سے آزاد ہو چکے تھے۔ انفرادی کوشش، تجارت اور ثقافت، ایک پھلتی پھولتی تہذیب کی منزلیں ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ہر منزل لازمی ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگ نظمیں لکھیں، صنم تراشیں اور موسیقی یا فلسفہ تخلیق کریں، یہ لازمی ہے کہ وہ میدانوں کو صاف کریں، بیج بوئیں، معدنیات نکالیں، گھر بنائیں اور سڑکیں تعمیر کریں، ہزاروں مشینیں چلائیں تاکہ دولت پیدا ہو اور تخلیقی مساعی کے لیے فرصت عام ہو۔ زندگی فریضہ اولین ہے۔ یہ اچھی علامت ہے کہ ہم اس تمول پر شرمسار ہیں، جسے ابھی فن نے آنچ نہیں دی۔ ہماری شرمساری وہ ایک چبھتا ہوا محرک ہے، جو ممکن ہے ہمیں دولت سے تہذیب تعمیر کرنے پر مجبور کر دے، لیکن ثقافتی کمتری کا احساس کہیں ہمارا مرض ہی نہ بن جائے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہم یورپ کے کلیساؤں اور عجائب خانوں کی ستائش کرتے کرتے، اس کے ظلم و ستم، اس کے مذہبی اور نسلی امتیازات، اس کی عسکریت اور اس کی جبری بھرتی پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہم محض امریکہ کی دولت ہی کی طرف نہیں دیکھتے، جس پر یورپ کا ہر شہری رشک آمیز نظریں ڈالتا ہے (اور ہر ادیب اس کا کچھ حصہ حاصل کرنے کا خواہاں ہے) بلکہ اس کے دولت

مندوں کی تعلیمی فیاضی، اس کے باشندوں کے لاثانی تجسّس، علم اور ادب کے شوق کی طرف بھی ہماری نظر ہے۔

سپنگلر، کبھی امریکہ نہیں آیا۔ وہ ایک ایسی سرزمین کے پس منظر میں لکھ رہا تھا، جو جنگ سے شدید طور پر مجروح ہو چکی تھی۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ امریکہ میں شباب کی علامتیں اور خامیاں، انحطاط کے نشانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہم ابھی تک قومی عنفوان شباب کے دور سے گزر رہے ہیں۔ کوئی تین سو برس گزرے کہ زائرین یہاں آئے تھے، اور کوئی ڈیڑھ سو سال ہوئے کہ یہاں پہلی حکومت قائم ہوئی تھی۔ ایک ناپختہ ملک سے فن یا ذوق کی توقع رکھنا اسی قدر مضحکہ خیز ہے، جس قدر جوانوں سے مابعد الطبیعیاتی یا سیاسی صحت مندی کی۔ شباب کے نشوونما میں خامیاں بھی ہوتی ہیں اور گناہوں کی نمائش بھی۔

اس سے پہلے کبھی تاریخ میں کسی تہذیب کو اتنی وسیع اقتصادی بنیاد میسر نہیں آئی۔ ایک صحت مند آب و ہوا، جس میں ہر تندرست نشیب و فراز ملتا ہے۔ ایک زرخیز زمین، جو نہری اور فنی آبپاشی کے بعد سو گنی زرخیز ہو جائے گی۔ زمین کی تہوں میں ہر قسم کی معدنیات اور تیل، ریل گاڑیاں، جن کی سرعت دنیا کے لیے مثال ہے، روز افزوں ترقی کر رہی ہیں۔ آبی راہیں، ابھی تک ریل گاڑیوں کی وجہ سے بیکار ہیں لیکن ممکنات سے لبریز ہیں۔ مسلح اور آراستہ کارخانے، موجدین جن کی تنظیم اور مساعی کی مثال دنیا میں نہیں ملتی، سیاح اور ہواباز جو فضائی زبان میں رزمیے اور غزلیں کہتے ہیں۔ سرمایہ دار جو صنعت کو اپنا سرمایہ بخشتے ہیں۔ حکومت، جو سائنس کی نام لیوا ہے اور بصیرت میں ترقی کر رہی ہے۔ ہم اس دولت بے پایاں کو کس طرح صرف کریں گے؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمیں تباہ و برباد کر دے۔ ہمیں اپنی روحوں کی صحت کی خاطر اپنے آپ سے بار بار یہ کہنا چاہیے کہ فقط دولت ہی کسی قوم کو افضل نہیں بناتی، یہ گھر بنانے کی بجائے خاندان کو مٹا سکتی ہے۔ یہ فن کی سرپرستی کرنے کی بجائے حکومت کو بد اخلاق بنا سکتی ہے۔ یہ حکمت کی بجائے طاقت، خوش خلقی کی بجائے بد تہذیبی، ذوق کی بجائے تعیش پرستی کی جستجو کر سکتی ہے۔ یہ ہمیں تخلیقی یونان کی جگہ زوال پذیر روما بنا سکتی ہے۔ امریکہ ان دونوں میں سے کیا بننا چاہے گا؟

ہمارے اس مختلف نسلوں کے گھر کا کیا انجام ہو گا؟

میڈیسن گرانٹ نے صحیح کہا تھا کہ یورپی حکومتوں نے اپنے قید خانوں اور پاگل خانوں کے باسیوں کو بے پروا، دولت مند اور مہمان نواز امریکہ کے سپرد کر دیا۔ اس قسم کے عالیشان اعلان اکثر نصف حقیقت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمارے بعض مہاجرین رئیس تھے اور کچھ مجرم تھے۔ دونوں طبقے اتنے ممتاز نہیں تھے اور ممکن ہے کہ اب دونوں نے ایک دوسرے کا پیشہ اپنا لیا ہو۔ ماحول اور

فضا، وراثت کے ساتھ طرح طرح کے فریب کھیلتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ چوروں یا رئیسوں میں سے کس نے بہتر نسل چھوڑی ہے یا کس نے ہماری ترقی کے لیے زیادہ کوشش کی ہے۔

اینگلو سیکسن یہاں میدان ہار رہا ہے۔ شہری سیاست اور اخلاق اور ادبی تحریکوں میں اس کا تسلط ختم ہوگیا ہے۔ اس نے اپنے رقیبوں کے مقابلے میں زیادہ بچے پیدا نہیں کیے۔ اس نے سمجھا کہ اس کی صفات، اس کی طاقت اور اقتدار قائم رکھنے کے لیے کافی ہوں گی، لیکن وقت نے اسے شکست دی۔ نسلی پاکیزگی، جس نے ہمیں نیو انگلینڈ کا عہد عطا کیا تھا، ختم ہوئی۔ کئی سال کے بعد شاید ہمارے مہاجر، ایمرسن کا سا انداز یا نیو انگلینڈ کے گھرانوں کی سی تہذیب حاصل کر سکیں۔ ابھرتی ہوئی نسلوں کی پختگی سے پہلے ایک ناپختہ انداز اور دیہاتی زبانوں کا عہد آئے گا، لیکن آخر میں ایک نئی نسل پیدا ہوگی اور غالباً ایک نئی زبان ظہور میں آئے گی اور یقیناً ایک نیا ادب تعمیر ہوگا۔ بحیرۂ روم کا جذباتی اور فنکارانہ مزاج جب بے کیف پارساؤں سے خلط ملط ہوگا تو شخصیت اور احساس کا وہ امتزاج پیدا ہوگا جس کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ سینکڑوں اور قومیں اس ندی میں اپنا پانی بہائیں گی اور ہماری نسل، ہماری سرزمین کی طرح متمول ہوگی۔ وہ نسل جو اس طرح بوقلمی میں ربط پائے گی جو تہذیب عالم کا وارث بننے کے لیے لازمی ہے۔

جس طرح یورپ جنگ اور انقلاب سے بربریت کی طرف لوٹ آیا ہے، اسی طرح امریکہ ہجرت اور جمہوریت کی وجہ سے وحشت کی طرف جا رہا ہے، لیکن ہمارے یہاں ایک نئی نسل اور ایک نئی ثقافت جنم لیتی نظر آ رہی ہے۔ ہماری تقدیر، اقتصادی حالات کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ صنعت، حکومت اور فکر کے قائدین کے ہاتھوں میں ہے۔ انہیں نظر انتخاب سے کام لینا ہے۔

صحت مند آئین ہمیں وہ ذہنی اور لسانی حریت عطا کر سکتے ہیں، جو ہمیں بربریت پسند رواں کے دور سے محفوظ کر سکتی ہے۔ حکیمانہ قیادت کارخانہ داری کے امراض کو دور کر سکتی ہے، اوقات کار کو کم کر سکتی ہے، برقی طاقت کو کوئلے اور غلاظت کی جگہ دے سکتی ہے، صنعت کو شہروں کے باہر لے جا سکتی ہے اور عمارتوں کو ظاہری حسن کے ساتھ داخلی روشنی اور تعاون بخش سکتی ہے۔ شہری منصوبہ بندی میں دانش، غالباً طیاروں کی امداد سے ہمارے ان گنت شہریوں کو میدانوں اور ساحلوں پر بسا سکتی ہے۔ گھروں کے اخلاقی اختیار کو بحال کر سکتی ہے اور ان ذہنوں اور جسموں کو پھر صحت عطا کر سکتی ہے جو شہروں کے شور و غوغا سے مریض بن چکے ہیں۔ حکیمانہ فیاضی ہمیں ثقافتی اقدار کی بقا اور تبلیغ کے لیے سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہے۔ ہمارے مدرسوں اور جامعوں کی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ ہر حقیر اور اعلیٰ تعلیمی ادارے کے مدرسوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہونا چاہیے۔ تعلیمی تجربات کے راستہ میں کسی طرح کے خوف اور اندیشے کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں ہزاروں

مقابلے اور انعامات اور لاکھوں وظیفوں سے طلبا میں تقابل، مطالعہ اور تخلیق کی محرکات پیدا کرنی چاہئیں۔ تحقیق میں سائنس سے پوری آزادی سے کام لینا چاہیے لیکن اس کے فوجی اور صنعتی استعمال پر پابندیاں عائد کر دینی چاہئیں۔ ان فنکاروں کو پوری آزادی دینی چاہیے جو ہماری تجارتی اور تعلیمی عمارتیں بناتے ہیں اور ہمارے عظیم محسنین کو یہ چاہیے کہ لوگوں کو تعلیم دیں اور ہر شام مہذب موسیقی نشر کر کے لوگوں کی روحوں کو برگزیدگی کی دولت سے آشنا کر دیں۔

میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور نچلی منزل سے اعلیٰ موسیقی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ یہ بیتھوون کی موسیقی ہے۔ یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے دل کی آواز، جو مدت ہوئی مر چکا ہے، زمان و مکان کی حدود کو عبور کر کے لاکھوں روحوں کو صحت اور زندگی بخش رہی ہے۔ یہ عظیم الشان موسیقی ہے۔ اس میں ایک مکمل عہد کا اندوہ، آرزو اور نرم دلی پنہاں ہے۔

موسیقی ختم ہو گئی۔ ابھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ہے۔ ایک دوست، اس روحانی حسن کا، جو آسمانوں سے اس کے گھر میں نازل ہوا ہے اور ایک مردہ شخص کے پراسرار سفر شب کا ذکر کرنا چاہتا ہے، جس میں اس نے ہزاروں بے نور آنکھوں کو روشنی بخشی ہے اور اب بھی کمرہ تالیوں کی ان آوازوں سے گونج رہا ہے جو اس عظیم فنکار کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بجائی گئی تھیں۔

آیئے ہم بھی اپنے دلوں کا احساس تشکر اور جذبہ تحسین اس گونج میں شامل کر دیں۔

* * *

حصہ ہفتم

فلسفہ سیاست

باب ہفدہم

آزادی کے محاسن

۱۔ شراب اور آزادی

یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ دنیا کی سیاست اور اقتصادیات میں قدامت پرستی کو فتح اور مذہب، اخلاق، سائنس، فلسفہ اور ادب اور فن کے میدانوں میں آزادی کی جیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ہم نے اپنی حکومت کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دی ہے جو قدیم خداوندان صنعت کے پرستار ہیں اور ہم نے کچھ عرصہ کے لیے آقا اور مزدور کے تعلقات میں کسی نئے تجربہ کے تصور کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہم نے ان سرکاری افسروں کے گرد مقبولت کا ہالہ کھینچا ہے، جن کی ممتاز ترین صفت بزدلی اور کم ہمتی ہے۔ ہم باغیوں اور مصلحوں کو اس قدر تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اب ان پر ظلم و تشدد بھی روا نہیں رکھتے۔ دنیا کی حکومتیں حزم و احتیاط کی پابند بن کر بے بس ہو کر رہ گئی ہیں۔ زندگی میں اگر کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو وہ ارادی نہیں ہوتی، بس اچانک ہو جاتی ہے۔

لیکن مقام حیرت ہے کہ سرکاری دنیا میں ندرت سے اس قدر اجتناب کے باوجود ہمارے شہروں میں اخلاقی اور ادبی جدت کی بھرمار ہے۔ ہر طرف قدیم عقیدے اور اخلاقی اقدار کی اس قدر

تضحیک اور تردید ہو رہی ہے کہ ہر پیرانہ سال بزرگ کو اس میں قیامت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ سائنس سمجھتی ہے کہ اس نے قدامت پرستی پر فتح پالی ہے اور اپنی فتح کے نشہ میں اس میکانکی عقیدہ کو بڑے جوش اور سرشاری کے ساتھ اپنا رہی ہے، جو زندگی کے علاوہ، ہر چیز کی توجیہ کر سکتا ہے۔ جوان خود اعتمادی کے نشے سے سرمست ہیں کیونکہ ان کے پاس دولت ہے اور ان کے ہاتھوں میں وہ قلم ہے جس کی طراوش اخباروں کے صفحات کو زینت بخشتی ہے۔ ادب ہر مستند اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے اور ہر مستند نقاد ہر بیباک تجربہ کی تعریف میں رطب انسان ہے۔ کوئی شخص کلاسیکی کتابوں کی تعریف کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ شاعری اور مصوری میں انقلاب آفرینی اسی طرح متداول ہے جس طرح سیاست میں رجعت پسندی اور رواج پرستی۔ اسٹیج نے نسوانی جسم کی کبریائی صفات دریافت کرلی ہیں۔ کپڑے جمالیاتی احساس کے زیرِ اثر "فنکارانہ برہنگی" کا مظہر ہیں۔ اور شراب، جو کبھی رسوائے عالم تھی، اب ہر مذاکرہ کا موضوع، اور ہر مہذب گھرانے کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ سب کچھ ریاست کی قوت مطلق اور فرد کی آزادی کا ایک عجیب امتزاج ہے۔

ہم اس مضحکہ خیز تضاد کی توجیہ کیونکر کر سکتے ہیں؟ اس کا ایک سبب ہماری دولت ہے۔ وہی دولت جو ہمیں سیاسیات میں قدامت پرست بناتی ہے اور اخلاق میں انقلاب کی بیباکی عطا کرتی ہے۔ جب کیسے دولت سے پر ہوں تو رہبانیت اسی قدر ناممکن اور دشوار بن جاتی ہے جتنی انقلاب پرستی، پارسائی، شراب کے نشہ میں بدمست ہلاک نہیں ہوئی تھی۔ اس کی جان سونے چاندی کی زہر نے لی تھی۔

یہ حالت کسی حد تک ہمارے دلوں کی متضاد کیفیتوں سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک ہی روح آزادی کی سرمستی بھی چاہتی ہے اور ضبط و نظم کے تحفظ کی بھی خواہاں ہے۔ ایک ہی ذہن بیک وقت توانائی اور خوف کی دھوپ چھاؤں میں مبتلا ہے۔ فرد اپنی آزادی پر ناز کرتا ہے اور پولیس کا سہارا لیتا ہے۔ کبھی ہم ذاتیت کے پرستار بن جاتے ہیں اور کبھی آمریت کے ثناخواں۔ امریکہ میں بالخصوص ہم آزادی سے خائف دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد گو اخلاق کے معاملے میں سختی سے روایتی انداز کے پابند تھے لیکن سیاست میں آزاد رو تھے۔ وہ اخلاق کا احترام کرتے تھے لیکن ریاست سے دست و گریباں ہو جاتے تھے اور ہم ریاست کو خدا سمجھتے ہیں، لیکن اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم اخلاق کے معاملے میں لذت پرست ہیں لیکن ریاست کے لاکھوں قوانین کی متابعت کرتے ہیں۔ گو ہم سیاست کے غلام ہیں لیکن اخلاقی نقطہ نظر سے ہمیں رطل گراں کی آزادی حاصل ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ جب کوئی امریکی آزادی کا ذکر کرتا ہے تو اس کا اشارہ ذہن کی طرف

نہیں، پیٹ کی طرف ہوتا ہے۔ امریکہ کی فیڈریشن آف لیبر نے کئی برس ہوئے انقلاب کی دھمکی دی تھی۔ اس دھمکی کی بنا آزاد تجارت نہیں بلکہ ممانعت شراب تھی۔ آج امریکی شہری کا آزادی کا تصور یہ چاہتا ہے کہ ہر شریف انسان کو شراب پینے کی آزادی حاصل ہو اور ہر معزز عورت پوری طرح آزاد خیال ہو۔ یہ بات ان کے نزدیک اہم نہیں کہ ایک پولستانی مہاجر کے تنگک کی وجہ سے میساچیوزٹس کی ایک عدالت نے اسے سولی پر چڑھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ پنسلوانیا میں پرامن جلسوں کی ممانعت ہے۔ قدامت پرستی کے پیرانہ سال نمائندے، جو بڑھاپے کے خوف اور الم کو طفلانہ دینداری کی مدد سے کم کرنا چاہتے ہیں، ہر جگہ یہ قانون پیش کر رہے ہیں کہ حیاتیات کی سائنس کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے اور ڈارون اور اس کے تصورات پر قانونی پابندیاں عاید کر دی جائیں۔ اگر شراب پینے کی آزادی قائم رہے، آزادی افکار جہنم میں جائے۔ بادہ نوشی پہلے اور فلسفہ بعد میں۔ ہماری آزادی قانون نہیں چھین رہا ہے۔ ہمارے ذہنوں کا بے ضرر تساہل اس کا ذمہ دار ہے۔ مقرر معیاروں کے مطابق تعلیم، بڑھتے ہوئے ہجوم اور اجتماعی تحریکیں ہمیں شخصیت، کردار اور انفرادی فکر سے محروم کر رہی ہیں۔ جوں جوں گروہ بڑھ رہے ہیں، فرد مٹتے جاتے ہیں۔ ذرائع اظہار کی فراوانی نقل اور پیروی کو آسان بنا رہی ہے۔ بتدریج ہم سب ایک جیسے ہوتے جا رہے ہیں اور ہم سب کو لباس، اطوار و اخلاق، گھر کی آرائش اور ذہنی یکسانی، ایک طرح کا لطف و سرور محسوس ہوتا ہے اور یہ بات تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہماری اخلاقی آزادی بھی، کہیں ایک طرح کی نقالی ہی تو نہیں اور شراب بھی سوزاک کی طرح شاید اسی لیے فیشن میں داخل ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑی بہت بغاوت بھی بہرحال جمود سے بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ آزادی کا یہ نشہ ہمارے ذہنوں پر چھا جائے اور فکر کو اپنا معمول بنا لے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہم جبری تعلیم اخلاق کی مدافعت کرتے ہیں۔ شراب کی فقط اس لیے ممانعت کرنا کہ چند لوگ بدمست ہو کر بدعنوانیوں پر اتر آتے ہیں، ہماری حکومت کی بے بضاعتی کا اظہار ہے۔ جب حکومت چند احمقوں پر قابو نہیں پا سکتی، تو سب کو احمق بنانا چاہتی ہے۔ تہذیب شراب کے بغیر ناممکن ہے۔ تہذیب ضبط نفس کے بغیر ناممکن ہے اور جہاں آزادی ہیں وہاں ضبط نفس دم نہیں مار سکتا۔ موفسکو نے کہا تھا کہ وہ چیزیں، جن کی خودداری ممانعت کرتی ہے اگر قانون ان کی ممانعت کی تصدیق نہ لرے تو وہ زیادہ حد تک ممنوع رہتی ہیں۔ اگر ہم اعتدال کی تبلیغ پر اس رقم سے نصف خرچ کرتے، جو ہم نے ممانعت شراب کی پابندی کروانے پر صرف کی ہے تو ہم شاید اس وقت تک اپنی پوری قوم کو نشہ سے نفرت کرنے والی قوم بنا چکے ہوتے۔ آیئے ذرا ہم ان کی بھی سنیں جو ہر قسم کی آزادی کے نام لیوا ہیں۔ ممکن ہے ان کی باتیں ہمیں تقویت دے کر کچھ دیر کے لیے اپنے ان

گنت قوانین فراموش کرنے کی طرف مائل کر دیں اور ہم کچھ دیر آزادی کے پرستاروں کی معیت میں آزادی سے سیر کر سکیں۔

۲۔ آزادی کا مسلک

اس ضبط و نظم کا بیشتر حصہ جو آج انسانیت پر حاوی ہے، قانون کا رہین منت نہیں۔ اس کا سرچشمہ زندگی کے اجتماعی اصول اور انسان کی فطرت ہے۔ یہ سرچشمہ حکومت کے وجود سے پہلے بھی موجود تھا اور آج اگر حکومت ختم کر دی جائے تب بھی باقی رہے گا۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کا محتاج ہونا اور ایک کا دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا انسانی فطرت ہے۔ مذہب گروہوں کا ایک دوسرے سے ربط وہ رشتہ ہے جو لوگوں کو یکجا رکھتا ہے۔ درحقیقت معاشرہ اپنے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے، جسے حکومت سے منسوب کیا جاتا ہے"۔

یہ ساری باتیں جو اتنی غیر رسمی بے باکی اور سادگی کے ساتھ کی گئی ہیں، آخر کس کی کہی ہوئی ہیں؟ یہ باتیں بہادر اور ٹام پین کی ہیں جو دو انقلابوں کا مبلغ اور دو براعظموں کا معمار تھا۔ امریکہ کا یہ والٹیر انگریزی زبان میں اس صدی کی ترجمانی کر رہا تھا، جسے احیائے علوم کی صدی کہتے ہیں۔ کیونکہ "عہد خرد" میں، جب اقتصادی طاقت بے کار اور بے عمل رئیسوں کے ہاتھوں سے زندہ دل تاجر طبقہ کے قبضے میں آئی تو ہر روایت متزلزل ہوگئی۔ ہر رسم ٹوٹ گئی۔ ہر واہمہ نے انسان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور انسان نے اپنے آپ کو پہلی مرتبہ آزاد محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامی طور پر، ماضی نے حال پر سے اپنا تسلط ہٹا لیا ہے۔ بوربون کا پیرانہ سال خاندان برائے نام حکومت کرتا تھا۔ کلیسا اس سماج میں، جہاں تشکک کا دور دورہ تھا اور جہاں پادری بھی خردمندی کا مذاق اڑاتے تھے۔ دیہات میں قوی، لیکن شہروں میں بے بس تھا۔ ہر قانون کی گرفت میں لچک آگئی تھی، ہر اصول پر تنقید ہوتی تھی۔ کسی خوف یا تذمیم کے بغیر فن اور کردار کے ہر معیار کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ یہ وہ عہد تھا جس میں روسو نے ریاست کو ایک "برائی" قرار دیا تھا اور جیفرسن نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ حکومت بہترین ہے، جو کم سے کم حکومت کرتی ہے۔ یہ عہد فرد کا عہد تھا۔

انسانی تاریخ کے آغاز سے انسان نے اجتماعی پابندیوں کے خلاف بغاوت کی ہے اور انسان کی فطری بربریت نے ہر قانون کو اپنا دشمن سمجھا ہے۔ روسو نے کہا تھا "قوانین، جائیداد رکھنے والوں کے حق میں مفید ہیں لیکن بے زر لوگوں کے لیے مضرت رساں۔ قوانین نے کمزوروں پر نئے بوجھ لاد دیئے اور تواناؤں کو زیادہ توانائی بخشی۔ انہوں نے انسان کی فطری آزادی کو ہمیشہ کے لیے سلب

کر لیا۔ جائداد اور غیر مساوی تقسیم کے قانون کو ازلی اور ابدی مقام عطا کیا۔ ایک چالاک عمل غصب کو ایک اٹل حق بنا دیا اور تمام نسل کو، مزدوری، غلامی اور اندوہ کے بوجھ تلے دبا دیا۔ سب انسان آزاد پیدا ہوئے تھے اور آج وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں"۔

یہ امر غور طلب ہے کہ تاجر طبقہ کے نصب العین نے آزادی کی وہ طلب پیدا کی جو فردیت کو ایک دل آویز سیاسی فلسفہ بناتی ہے۔ ایڈم سمتھ نے یہ کہا تھا کہ قوموں کی دولت کا انحصار، فرد کی آزادی پر ہے۔ میرابو اور دوسرے مفکرین کا یہ خیال تھا کہ فطرت کو تجارت اور صنعت کے نظم و نسق کی آزادی دے دینی چاہیے اور ہربرٹ سپنسر نے بینتھم اور سٹوارٹ مل کی آزاد روایت کی پیروی میں ریاست کو تحلیل کرتے کرتے فقط ایک مرکزی نقطہ بنا دیا تھا، جو اس کی جائداد کی محافظ تھی۔ مفکرین سیاست نے متوسط طبقہ کی اس طلب کو منطقی حد تک پہنچا دیا کہ ہمیں جاگیرداروں کے ٹیکسوں، خاندانی بادشاہوں اور رئیسی خود پسندی سے نجات مل جانی چاہیے۔ اگر صنعت اور تجارت کی آزادی مفید ہے تو سیاست اور اخلاق میں بھی آزادی ہونی چاہیے۔ گوڈون کو یہ یقین تھا کہ انسانی فطرت قانون کے بغیر نظم و نسق قائم رکھ سکتی ہے۔ سب قوانین منسوخ کر دیئے جائیں تو انسان ذہن اور کردار میں وہ ترقی کرے گا جو اس سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ شیلے نے ان خیالات کو اس وقت شعر کا جامہ پہنایا، جب ان کے مصنف نے انہیں مسترد کر دیا تھا اور اس نے گوڈون کی بیٹی کے ساتھ ان خیالات پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ وطن پرست فکٹے نے فرد کو کائنات کی جڑ اور پھول قرار دیا اور حقیقت کو ایک ایسے ذہن کی تخلیق سمجھا جو خارجی اشیاء سے بے تعلق ہے۔ سٹرنر نے، جو ایک لڑکیوں کے جامعہ میں پڑھاتا تھا، اس فوق البشر کے تصور میں سکون قلب محسوس کیا جو ریاست کے بندھنوں سے آزاد ہوگا!" ریاست کا فقط ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے فرد کی آزادی پر حدیں قائم کرنا۔ اسے مطیع کرنا اور ایک عمومی حیثیت پر لے آنا۔ ریاست اسی حالت میں قائم رہتی ہے کہ فرد کو اس کے اختیارات حاصل نہ ہوں۔ "اپنے آپ کو سربلند کرو تو ریاست تمہارا پیچھا چھوڑ دے گی"۔ نیطشے نے یہ احتجاج کرتے ہوئے کہ میں نے کبھی سٹرنر کی تحریرات نہیں پڑھیں سٹرنر کے عقائد کی تبلیغ کی۔

زرتشت کہتا ہے "دنیا میں کہیں کہیں ابھی تک انسان موجود ہیں لیکن ہمارے یہاں فقط ریاستیں ہیں۔ دنیا میں جتنی بلائیں ہیں، ریاست ان سب میں زیادہ سرد مہر ہے۔ وہ سرد مہری سے جھوٹ بولتی ہے اور یہ جھوٹ مسلسل اس کے ذہن سے نکلتا رہتا ہے"۔ ریاست کہتی ہے "میں عوام ہوں" یہ بات سفید جھوٹ ہے؟ خالق اور تعمیر کرنے والے وہ تھے جنہوں نے عوام کی تخلیق کی اور انہیں ایک عقیدہ اور ایک محبت کے رشتے میں منسلک کیا۔ یہ خالق زندگی کے خدمت گزار

تھے۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ تخریب کے بانی ہیں، جو لوگوں کے لیے دام بچھاتے ہیں اور اس دام کو ریاست کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ریاست ہر نیک و بد کی زبان میں دروغ گو ہے۔ جو کچھ وہ کہتی ہے، جھوٹ ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے، چرایا ہوا مال ہے۔ جہاں ریاست ختم ہوتی ہے، وہی حقیقی انسان کی ابتداء ہے۔ میرے دوستو! جہاں ریاست ختم ہوتی ہے، ذرا اس نقطہ پر نظر ڈالو، کیا تمہیں وہاں فوق البشر کی قوس قزح اور پل کا جلوہ نہیں دکھائی دیتا؟"

آزادی مطلق کی یہ آرزو عالم گیر ہے۔ سقراط کے تلامذہ میں سے کلبی فطری زندگی کو آئینی حکومت پر ترجیح دیتے تھے اور ارسٹیپس کی طرح یہ چاہتے تھے کہ وہ کسی اور انسان کے آقا یا غلام بن کر نہ رہیں۔ رواقیوں میں سے چند مفکر اس جنت الارض کے متمنی تھے، جہاں ہر چیز مشترکہ ملکیت ہو اور آئینی علائق کم ہوں۔ ابتدائی مسیحیوں میں طاقت کا استعمال ممنوع تھا اور جب تک دولت کا دور دورہ نہیں تھا، لوگ امن اور دوستی کے رشتوں میں منسلک تھے۔ "اصلاح مذہب" کے عہد کا مسیحی آزادی کے گیت گاتا تھا اور شادی کی تنسیخ کو جنت حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم سمجھتا تھا۔ انقلاب فرانس میں مرات اور ببوف نے صبح آزادی اور شام ریاست کا اعلان کیا"۔ پروڈھون نے لکھا ہے کہ "انسان کی انسان پر حکومت خواہ اس کی صورت کچھ بھی ہو، غلامی ہے۔ سماج کا کمال، ضبط و نظم اور آزادی کے امتزاج سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی سماج میں انسان پر انسان کا اختیار اسی نسبت سے کم یا زیادہ ہوتا ہے، جس نسبت سے اس نے ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کی ہوں"۔ انقلابی روس میں ٹالسٹائے نے حکومت کی تعریف یہ کہہ کر کی تھی کہ "حکومت صاحب جائیداد لوگوں کا ایک اجتماعی ادارہ ہے، جو جائیداد کے تحفظ کے لیے وجود میں آتا ہے"۔ باکونین نے اپنی دولت اور جائیداد ترک کر کے یہ پیش گوئی کی کہ ۱۹۰۰ء میں تعلیم اتنی عام ہو جائے گی کہ ریاست ایک غیر ضروری ادارہ ہو کر رہ جائے گی اور لوگ فقط فطرت کے قوانین کی پابندی کیا کریں گے۔ کروپٹکن نے جو ایک شریف اور آزادی پسند رئیس تھا، یہ تصور پیش کیا کہ جنت الارض میں مردوں اور عورتوں کو فقط ایک گھنٹہ روزانہ کام کرنے کی ضرورت ہوگی اور کسی حد تک یہ بات ثابت کر کے دکھا دی کہ انسان سے انسان کی فطری معاونت ہر جامع اجتماعی نظام کی بنیاد رہی ہے اور جو ہر طرح کی ریاستی مجبوریوں سے کہیں زیادہ صحت مند اور موثر ہے۔ انگلستان میں ولیم مورس نے حکومت کی تعریف یوں کی کہ وہ ایک خوش گوار عدم ہے جہاں پارلیمنٹ کے ایوان بہشت کی کھاد کا ذخیرہ جمع کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ امریکہ میں ایمرسن نے کہا کہ "میرے لیے اپنی فطرت کے قانون کے علاوہ اور کوئی قانون مقدس نہیں اور میری نظر میں صرف وہ حق محترم ہے جو مجھے فطرت نے عطا کیا ہے"۔ وینمین نے کہا کہ "حکومت اس وقت کی تیاری کا نام ہے، جب انسان اپنے

آپ پر خود حکومت کریں گے" اور تھورو نے اپنی خوبصورت پنسلیں بناتے ہوئے کہا "میں خوشی سے اس اصول کو قبول کرتا ہوں کہ وہ حکومت بہترین ہے جو کم سے کم حکومت کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکومت بہترین ہے جو حکومت نہیں کرتی اور جب لوگ اس طرح کی حکومت کے لیے تیار ہوں گے تو انہیں اسی قسم کی حکومت مل جائے گی"۔

۳۔ مزاجیت

آزادی کے اس دلیرانہ مسلک کے متعلق آخر ہم کیا کہیں؟ اجتماعی نظام کہاں تک فطری ہے اور کتنی مدت تک وہ قانون کے سہارے کے بغیر چل سکتا ہے؟ انسان کو کس حد تک آزادی مل سکتی ہے؟

انسانی معاملات میں ہر مصنوعی چیز کا ایک فطری ماخذ ہے اور اس طرح کی ہر فطری چیز کی نشوونما مصنوعی ہوتی ہے۔ اظہار فطری ہے لیکن زبان مصنوعی۔ مذہب فطری ہے اور کلیسا مصنوعی۔ سماج فطری ہے اور ریاست مصنوعی۔ زبان اور دین کی طرح قانون کی اطاعت بھی اجتماعی تعلیم اور تدریس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ انسانی جبلتوں سے پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لیے ہر شخصیت میں ہمیشہ دل کی آرزو اور قانون کے خوف کے درمیان ایک پیہم کشمکش جاری رہتی ہے۔ اسی لیے باغی اجتماعی مقبولیت کے سہارے کسی مصنوعی اور تکلیف دہ پابندی کی خلاف ورزی کرنے میں ایک خاص لذت حاصل کرتے ہیں۔ ہم فطرتاً بد نظمی کو پسند کرتے ہیں لیکن تعلیم ہمیں نظم و ضبط سکھا کر شہری بناتی ہے۔

اگرچہ حریم روح میں ہماری حیثیت انتشار پسند وحشیوں کی سی ہے، لیکن کسی حد تک ہم میں فطرتاً یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ نظم اور نفاست کو پسند کریں۔ اجتماعی زندگی انسان کے مقابلے میں قدیم تر ہے اور حیوانوں کے مقابلے میں بھی قدیم تر ہے۔ ادنیٰ حیوانوں میں بھی اجتماع کی صلاحیت موجود ہے اور اس میں تقسیم کار کا رواج بھی ہے۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی زندگی فطرت کے اس تقسیم کار کی بہترین مظہر ہیں۔ فطرت اجتماعی زندگی میں اسی تقسیم کار کے اصول کے ماتحت مخلوق کی جسمانی ساخت میں بھی فرق پیدا کرتی رہتی ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں مستثنیات سے بھی کام لیتی ہے۔ چنانچہ کتا اسی طرح کے مستثنیات میں سے ایک ہے جو گوشت خور جانوروں کے زمرے میں شامل ہو کر بھی اس قدر سلیم الطبع ہے کہ اسے پالتو جانوروں میں سب سے پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ ہمادریاس بند کیڑوں کی جستجو میں پتھروں کو الٹتے پلٹتے ہیں اور جب انہیں کوئی بڑا کیڑا نظر آتا ہے تو سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور لوٹ میں شرکت

کرتے ہیں..... خطرہ کے وقت بھینسے، بھینسوں اور بچھڑوں کو ریوڑ کے اندر دھکیل دیتے ہیں اور باہر رہ کر حملہ کی مدافعت کرتے ہیں۔ خطرہ کی حالت میں گھوڑے سر جوڑ کر اور ٹانگیں باہر رکھ کر ایک دائرہ بنا لیتے ہیں جس طرح گال قوم کے لوگ جنگ کے وقت عورتوں کو درمیان میں رکھا کرتے تھے (یقیناً نپولین کے ذہن میں بھی بے بسوں کا تحفظ تھا جب اس نے اہرام مصر کی جنگ میں کہا کہ "گدھوں اور پروفیسروں کو درمیان میں رکھو) غالباً مدافعت کے اس اتحاد میں حیوانی اجتماع نے جنم لیا تھا اور اس کے ذریعہ انسانیت میں ایک اجتماعی جبلت پیدا ہو گئی۔

اس فطری بزم پسندی کے ساتھ خاندانی تعاون کو شامل کر لیجیے تو ایک فطری اجتماعی نظام کا تصور زیادہ قابل قبول ہو جاتا ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ "اجتماعی جبلت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب بچے خاصی مدت تک والدین کے پاس رہیں"۔ انسانیت کی برادری تاریخ کی طرح قدیم ہے۔ یہ ہزاروں خفیہ جماعتوں اور گروہوں کو زندگی بخشتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا وحشی موجود ہو، جس نے کبھی بھی انسانیت کے ساتھ ایک جسمانی تعلق اور ربط محسوس نہ کیا ہو، فطری دوست داری کے ساتھ والدین کی نگہداشت ہمیں امداد باہمی پر مائل کرتی ہے اور دوسروں سے ہمدردی محبت کی طرح فطری اور والدینی تحفظ کی طرح عالمگیر ہے۔ کانٹ حیران تھا کہ دنیا میں جس قدر رحم دلی ہے، اسی قدر انصاف کی کمی ہے۔ یہ غالباً اس لیے کہ رحم دلی، فطری ہمدردی کی ایک شکل ہے اور انصاف شعور اور خرد سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کم عدل پسند اور نسبتاً زیادہ رحم دل ہیں۔

اجتماع، ان فطری اور اقتصادی بنیادوں پر استوار ہو کر فرد میں وہ اجتماعی عادتیں راسخ کرتا ہے، جو بالآخر فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں اور یہ فطرت ہر قانون سے زیادہ نظم و نسق کی ضامن بنتی ہے۔ ہم جتنے زیادہ زندہ رہیں، اتنے ہی زیادہ بزم پسند ہوتے جاتے ہیں اور ہمسایوں کے لیے ہماری رواداری اسی حد تک بڑھتی جاتی ہے۔ ہم زیادہ نقال اور رسم و رواج کے زیادہ پابند ہو جاتے ہیں اور ان پابندیوں کے زیادہ خوگر، جو تہذیب کو طاقت کی نہیں، عادت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔ بر منظم نفسیاتی طاقت فرد کو اجتماعی رشتوں میں جوڑنا چاہتی ہے۔ کلیسا نے اپنی ابتداء ہی سے ان اخلاقی مواعظ کی بوچھاڑ کر دی، جن کا تھوڑا سا اثر، اس کی دینیاتی اساس اکھڑ جانے کے بعد بھی باقی ہے۔ جوں جوں والدانہ اور کلیسائی اختیارات کم ہوتے گئے، مدرسہ ان کی جگہ لیتا گیا۔ یہ بظاہر فرد کو اقتصادی اور فنی فتوحات کے لیے تیار کرتا رہا لیکن خاموشی سے یہ اس کے اخلاق پر یوں اثر انداز ہوتا رہا کہ وہ اس حکومت کو راس آ جائے جس کے ماتحت وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مدرسہ اس کی ساخت میں اجتماع کی مخصوص عادتیں اور اخلاق پیدا کرتا ہے اور بڑے انکسار کے ساتھ تاریخ کی

عیاں صداقتوں کو اس طرح چھپاتا ہے کہ اپنی قوم کا ماضی اس قدر درخشاں اور پر اجلال نظر آتا ہے کہ انسان اپنی قوم کے جاہ و جلال میں اضافہ کرنے کی خاطر ہر ممکن قربانی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر مدرسہ یہ کام نہ کر سکے یا فرد ہجرت کر کے اس سے فرار کرے تو اخبار اس کام کو جاری رکھیں گے۔ ایجادات، شہری اجتماع نے اس امر میں تعاون کرتی ہیں کہ ہر ذہن تک "خبریں" پہنچ جائیں اور ان کے بین السطور جو عقائد ہوتے ہیں وہ لوگوں میں رس بس جائیں۔

جب ہم ان اثرات پر نظر ڈالتے ہیں تو اچھے کردار کی طرف رجحانات اس قدر اٹل ہیں کہ انسان یہ سوال پوچھ سکتا ہے کہ اخلاق پھیلانے کے لیے قوانین کی کیا ضرورت ہے؟ سماج، فرد سے زیادہ صلیت رکھتا ہے۔ گمپلووکز کہتا ہے "انسان وہ اجتماع سوچتا ہے، جس کا وہ ایک حصہ ہے"۔ اس کا ضمیر بھی اس کے اجتماع کی آواز ہے۔ نپولین نے کہا تھا کہ "انسان، اخلاقی اور مادی حالات کی پیداوار ہے"۔ حیاتیاتی وراثت کی بنا پر ہم اپنے حیوانی ماضی سے وابستہ ہیں۔ اجتماعی وراثت کی بنا پر اور روایات کو اپنا لینے کی عادت کی بنا پر ہم اپنے انسانی ماضی سے وابستہ ہیں اور استحکام کی قوتیں ہماری جبلتوں میں اس قدر رچی ہوئی ہیں کہ ہمیں ریاست کے مصنوعی اخلاق کی ضرورت ہی نہیں۔

چونکہ یہ اثرات ہمارے حساس ترین عہد یعنی بچپن میں کام کرتے ہیں، ہم ان پر ایک کشمکش کے بعد ہی قابو پا سکتے ہیں۔ جس سے ہمارا ذہنی توازن معرض خطر میں آ جاتا ہے۔ جب ہم اپنے زمانہ اور اپنے ملک کے اخلاقی اصولوں کو خیرباد کہتے ہیں تو ہم پر ایک غریب الوطنی کی سی اندوہ ناک کیفیت چھا جاتی ہے اور جب ہم کوئی محفوظ قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ انہیں راہوں پر ہوتی ہے، جنہیں ماضی نے ہمارے لیے تراشا ہے۔ مطمئن لوگ وہ ہیں جو اپنے اجتماع کے اطوار و اخلاق اور اصول و قواعد کو بلا حیل و حجت اختیار کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں کسی امتیاز کے بغیر جذب ہو جاتے ہیں اور سپردگی کے امن میں جو محبت کی غنودگی کی مانند ہے، گم ہو جاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی جتنی وسیع اور عظیم ہوگی، فرد کو وہ اسی حد تک اس بات پر مجبور کرے گی کہ وہ ہر معمولی سی بات میں بھی اپنی انفرادیت کو مٹا دے۔ آخر کار ایک وسیع آبادی، ایک غیر متحرک جسم بن جاتی ہے۔ اجتماع کی فطری قدامت پسندی، ریاست کی خود پرستی سے بڑھ جاتی ہے۔ فرد جو اجتماع کا عکس ہوتا ہے تسلیم و رضا کا اتنا خوگر ہو جاتا ہے کہ قانون کی پابندیاں اور سزائیں غیر ضروری معلوم ہونے لگتی ہیں اور ہم وقتی طور پر اس عقیدۂ بے نظمی کے حامی بن جاتے ہیں، جس کے اکثر پیروؤں کو ہم جلاوطن کر دیتے ہیں، قید کر دیتے ہیں یا سولی پر چڑھا دیتے ہیں۔

۴۔ آزادی کی مشکلات

ہمیں مطمئن رہنا چاہیے کہ اس فلسفہ آزادی میں بہت سے نقائص ہیں۔ یہ فلسفہ طاقتوروں کے تشدد کو کسی حد تک نظرانداز کرتا ہے جو جبری حکومت ریاست کی تشکیل کرتی ہے، وہی حکومت ریاست کی عدم موجودگی میں اعلانیہ اور کھلم کھلا اور زیادہ الم اور ابتری کے ساتھ لوگوں پر جبر کرے گی۔ تہذیب کسی حد تک ظالم کے ظلم پر پابندیاں عائد کر کے ضبط و نظم پیدا کرتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کی نزاکت، طاقتوروں کے درمیان پیکار کے ممکنات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس نظام میں صرف چھوٹی ریاستیں نیک ہیں۔ سقراط نے ارسٹپس سے کہا کہ اگر انسانوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے تم یہ سوچو کہ حاکم اور محکوم کے تعلقات ختم ہو جائیں تو تم یہ دیکھو گے کہ طاقتور کس طرح کمزوروں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ ہر نئی ایجاد طاقتور کے ہاتھ کو مضبوط کرتی ہے اور سنگ دل زیرک بے وقوفوں نیک اور کمزور لوگوں پر اس ایجاد کی مدد سے زیادہ تصرف حاصل کر لیتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں ہر نشوونما ظالم اور مظلوم کے باہمی فصل میں اور اضافہ کرتی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، لیکن اجتماع، اعلیٰ قدروں پر استوار نہیں ہوا بلکہ اس کی بنیاد انسانی فطرت پر رکھی گئی ہے۔ اس کی قدریں اپنی فطرت پر پردہ پوشی کی ایک کوشش ہیں۔

پھر وہ اجتماعی محرکات، جن پر فطری نظام کھڑا ہے۔ ان انفرادی جبلتوں سے کہیں زیادہ کمزور ہیں۔ جو حصول دولت، پیکار اور غلبہ سے متعلق ہیں جو ہمارے اقتصادی نظام کی تہہ میں کار فرما نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ آزادی کی پکار بھی اس دل سے اٹھتی ہے، جو خفیہ طور پر طاقت کا بھوکا ہے۔ انسانی صیاد کی اسی بھوک کی وجہ سے آزادی پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ جو لوگ کسی حد تک کمزور ہیں، وہ اکثریت کے خیالات کے زیر اثر فرد کی آزادی کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں یہ ظالم و مظلوم کی باہمی کشاکش انقلاب کی صورت اختیار نہ کر لے۔ آزادی کی پہلی شرط اس کی پابندی ہے۔ زندگی متضاد قوتوں کے درمیان ایک توازن ہے۔ انسان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ پابندیوں کے بغیر ان کے قدرتی اختلافات اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ انسانیت ایک غیر متحرک تقسیم کی نذر ہو جائے گی۔ اہل فرانس نپولین سے محبت کرتے تھے کیونکہ آمریت کا پابند اور پیر ہونے کے باوجود وہ ہر صورت میں ذاتی صلاحیت اور ثقافت کی قدر کرتا تھا اور اس نے ایک عدیم المثال خوش حالی کی بدولت لوگوں کو وہ مساوات بہم پہنچائی، جسے بزدل لوگ آزادی سے بھی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس لیے آزادی کے عہد، عبوری دور ہوتے ہیں اور پابندی رواج اور تنظیم کے دوروں

کے درمیان محض وقفے بن جاتے ہیں۔ وہ اسی وقت تک قائم رہتے ہیں، جب تک غلبہ کے لیے دو نظاموں کی کش مکش شروع نہ ہو جائے۔ جب ایک نظام دوسرے پر غالب آجاتا ہے تو آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز بھی آزادی کے لیے اتنی مہلک نہیں، جتنا کہ انقلاب۔ ایک عینی بشر کا عظیم ترین المیہ اس کے نصب العین کی تکمیل ہے۔

کیا یہ وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں کہیں بھی کوئی ایسا نظام رونما ہوا، جو انسان کی فطری دولت داری پر استوار تھا، وہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی ریاست کے مصنوعی اور جبری سانچہ میں ڈھل گیا؟ یہ ایک وسیع مسئلہ ہے اور اس کا ایک جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یقیناً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خاندان کی جگہ فرد، سماج اور پیداوار کی اکائی بن گیا۔ بظاہر خاندان، بچہ کی نگہداشت اور پرورش کے معاملہ میں بھی اپنے حقوق کھو رہا ہے۔ فرزندانہ ادب اور برادرانہ وفا کی جگہ جدید روح نے فقط وطن پرستی کو اپنا اعلیٰ اخلاق بنا لیا ہے۔ اپنے وظائف سے محروم ہو کر، خاندان گل سڑ رہا ہے۔ بقا فقط خود پسند افراد کے حصے میں آئی ہے، جو ایک مشترکہ غلامی میں خود مختار ہیں۔ جب آقا غیر مرئی ہو تو غلامی بھی آزادی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شہروں میں لوگوں کا اجتماع، ہمسائیگی کے آداب کو ختم کر رہا ہے۔ خود پسندی کا ہر محرک اجتماع کی گمنامی میں آزاد ہے۔ سادہ دیہاتی زندگی کی طرح جہاں فطری نظام قائم ہے، قانون کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں فطری نظام کمزور ہے، وہاں آئین سازی کی افراط ہے۔ ریاست، فطری نظام کی جگہ لے رہی ہے، جس طرح، بڑی بڑی کمپنیاں، چھوٹے تاجر کی اور ریلیں گھوڑا گاڑیوں کی جگہ لے رہی ہیں۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے ہمیں ایک پیچیدہ کل کا جزو بنا دیا ہے اور ہم سے اجزاء کی وہ خود اختیاری چھین لی ہے، جو ہمیں اس وقت میسر تھی، جب خاندان اقتصادی طور پر ایک خود مختار اکائی تھا۔ سیاسی اور صنعتی آزادی ختم ہو رہی ہے اور اخلاقی ابتری بڑھ رہی ہے۔ خاندان اور مذہب اب سماجی نظام کی بنیاد نہیں رہے۔ اس لیے انسان میں فطری ضبط و نظم کی طرف سے جو انحراف روز افزوں ہے، صرف قانونی تشدد کی مدد سے کم ہو سکتا ہے۔ صنعت اور ریاست کی آزادی ختم ہو گئی ہے۔ آزادی اب صرف جنسی غدودوں میں باقی رہ گئی ہے۔

اگر پیداوار کے آلات وہی رہتے جو ہماری بربری سادگی کے زمانہ میں تھے تو ریاست اس قدر مہیب اور فرد شکن کبھی نہ بنتی۔ اس وقت ہر شخص کے پاس اپنے آلات ہوتے اور وہ اپنے حالات پر قابو پا سکتا۔ اس کی آزادی کی اقتصادی پناہ قائم رہتی اور سیاسی آزادی، سیاسی مساوات کی

طرح ایک بے معنی لفظ بن کر نہ رہ جاتی لیکن ایجادوں نے آلات کو زیادہ پیچیدہ اور زیادہ قیمتی بنا دیا۔ اس نے انسانوں کی قدر کو مشینوں کو استعمال کرنے کی اہلیت سے جانچنا شروع کر دیا اور بالاخر آلات کی ملکیت چند لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ خود کفالتی ختم ہو گئی اور آزادی، محض سیاست دان کا ایک قول بن کر رہ گئی۔ جس کے مزار پر ہم اکثر پھول چڑھاتے ہیں۔

ہر طرف سے ہم نشوونما کی ان موجوں کی زد میں آ گئے ہیں جو قدیم اور فطری آزادی کو بہا کر لے گئیں۔ ہمارے صنعتی تعلقات اتنے اہم ہیں کہ انہیں انفرادی اختیار کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض وظائف، مثلاً نقل و حرکت مالیات اور ذرائع اظہار اتنے قوی ہیں کہ آئینی پابندیوں کے بغیر وہ کسی وحشی درندہ کی طرح ساری صنعت کو تباہ کر سکتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ بات غنیمت ہے کہ یہ وظائف ریاست کے اختیار میں ہیں۔ اگرچہ ہمارے عہد میں ہر ریاست کو نااہل جانب دار اور بداخلاق ہونا پڑتا ہے۔ غالباً اقتصادی زندگی کا ہر اہم شعبہ قومی اختیار میں ہونا چاہیے اور صانع اور خریدار کے درمیان ہر رشتہ غیر ذمہ دار افراد کے تسلط سے آزاد ہونا چاہیے۔ پیداوار ہر صورت آزاد رہنی چاہیے۔

جب یہ تعلقات اور رشتے انصاف پر مبنی ہوں گے تو صانع اور خریدار کے رشتے انسانی ہوس سے قطع نظر آزاد ہوں گے۔ اقتصادی امراض اور ان دلالوں سے نجات حاصل کر کے جو مبادلے کے رشتوں کو سخت بنا رہے ہیں اور ہمارے عہد دولت میں ہماری صنعت کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری صنعت پھلے پھولے گی۔ انفرادی کوشش زیادہ آزادی ہو گی۔ امداد باہمی کے ادارے ہمارے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے حملوں سے محفوظ رہیں گے اور آزادی، اس طرح تربیت حاصل کر کے پہلے سے زیادہ گہری اور متمول ہو جائے گی۔

۵۔ جیفرسن کا تصور ریاست

ہم نے ریاست کی حمایت اور حق میں جو کچھ کہا ہے، اس میں ایک طرح کا جبر شامل ہے۔ اس لیے جیفرسن کا وہ تصور حکومت، جس میں حکومت کا عمل دخل کم سے کم ہوتا ہے۔ اپنی سادہ دلکشی کی بنا پر دل میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور ہر نیا قانون روح کی خود اختیاری کی توہین کے مترادف ہے۔ نظم آزادی کا ایک وسیلہ ہے۔ خود نصب العین نہیں۔ آزادی کی قدر و قیمت بے اندازہ ہے۔ کیونکہ وہ نشوونما کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا تھا جب ہم زندگی میں مختلف چیزوں کی قدر متعین کرنے لگتے ہیں تو بالاخر شخصیت کی اہمیت سب سے مقدم ہوتی ہے۔ ریاست انسان کے لیے بنی تھی۔ انسان ریاست کے لیے نہیں۔ وراثت کا مقصد اختلافات کا تحفظ تھا اور ہر رواج کسی

نظیر کی شکست کا نتیجہ ہے۔ ارتقاء اختلاف اور انقلاب کے سہارے پھلتا پھولتا ہے۔ اجتماعی ارتقاء ضبط و آئین کے ساتھ ساتھ اختراع اور تجربہ کا طالب ہے۔ تاریخ غیر مخفی قوتوں اور وحشی گروہوں کے علاوہ عظیم ذہنوں اور اختراعوں کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔

اگر ہم اپنی اقتصادی زندگی کی حد بندی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ذہن کی آزادی کی اور زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ ذہنی آزادی ہمیں کم از کم اتنی عزیز ہونی چاہیے جتنی جسمانی آزادی ایک حیوان کو ہوتی ہے۔ حیوان کو قید کر دیا جائے تو وہ کبھی اپنی اسیری پر مطمئن نہیں رہتا اور برابر بے چینی کے ساتھ آزادی کی راہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ ان قابل رحم اسیروں کو اور ان کی ان نگاہوں کو، جن میں آزادی کی تمنا افسردگی بن کر چھائی ہوئی ہے، ہم بغیر رنج و غم کے کسی احساس کے دیکھتے اور خاموش رہتے ہیں۔ غالباً اسی بے حسی کی سزا ہے کہ قدرت نے ہم سے وہ آزادی چھین لی ہے جو ہمارے آباؤ اجداد کو میسر تھی۔ وہ آباؤ اجداد جو حیوانوں سے باقاعدہ جنگ کر کے انہیں مارتے تھے لیکن انہیں قید کر کے اپنی نظر کے لیے سامان تفریح بنانے کے خیال سے اجتناب کرتے تھے لیکن جب ہم خود بھی اسیر ہیں اور شکوہ نہیں کرتے تو ان مقید حیوانوں کی آرزوؤں کا اندازہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

ایک چینی ضرب المثل ہے کہ جب کوئی قوم بہت سے قوانین بنانے شروع کر دے تو یہ سمجھ لو کہ اس پر بڑھاپا آ رہا ہے۔ قدیم تھورین ہر نئے قانون کے ناکام مجوز کو سزا دیتے تھے۔ کیونکہ وہ آزادی پر غیر ضروری پابندیاں عائد کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ امریکہ کے آئین ساز سال میں کوئی سولہ ہزار قانون بناتے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو ہم ایک چوروں کی قوم ہیں۔ جسے قانون کی نہیں تعلیم کی ضرورت ہے۔ کانگرس کے اجلاس امیروں اور غریبوں دونوں کے لیے خوف کا سرچشمہ ہیں اور غالباً اس خاموش احترام کی، جو ہمارے دلوں میں صدر کولج کے لیے تھا، وجہ یہ تھی کہ وہ بادشاہ انگلستان کی طرح فقط اپنا مشاہرہ وصول کرتا تھا۔ جب وہ کسی قانون پر خط تنسیخ کھینچتا تو لوگ ممنون ہوتے۔ ممکن ہے کہ یہ قانون اچھے رہے ہوں لیکن ایک اچھا قانون بھی قانون ہے اور اس کی میت پر کوئی ماتم نہیں کرتا۔

اگر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی لا آئینی میں بھی اتنی بڑی برائی نہیں، جتنی کہ وہ لوگ سمجھتے ہیں جو دوسروں کو نیکی کی تلقین کر کے اپنے ضمیر کو آسودہ کر لیتے ہیں تو یہ مفروضہ ہے کہ ہماری بہت سی بداخلاقی دیانت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہم بوڑھے بھی اپنی مفلس جوانی میں بدعنوانیاں کرتے تھے۔ ہم تخلیہ میں گناہ کرتے تھے اور بزم میں پارسا شکلیں لے کے جاتے تھے۔

آج کل کے جوان پردہ داری کے اتنے ماہر نہیں اور اپنے گناہوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے گناہ سطحی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتے جائیں گے۔ تجربہ انسانوں کو اتنا پختہ بنا دے گا کہ وہ توازن اور حیا کو بحال کر سکیں۔ ہم لوگوں کو شراب نوشی کی عادت سے اسی طرح روک سکتے ہیں کہ انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر برہنگی آج منظر عام پر نظر آتی ہے اور جنسی تحریک نے جنسی خوابوں کی جگہ لے لی ہے تو کیا ہوا؟ عادت آہستہ آہستہ، مناسبت کو بے کیف کر دے گی اور لباس کو آرزو کے التباسات پیدا کرنے کے لیے بحال کرنا پڑے گا۔

جوانوں کی اس عظیم الشان بغاوت کے برعکس بڈھے صرف قوانین کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ ہر بزدل اور حاسد آواز امریکہ کے آئین سازوں کو پکارتی ہے کہ اخلاق کی حفاظت کرو۔ کیونکہ چند ہوسناکوں نے اسٹیج کو جلب منفعت کی خاطر ناپاک کر دیا ہے۔ تھکے ہوئے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہر فلم اور ڈرامہ عام نمائش سے پہلے قانون کی نظروں کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ پہلے ہی پولیس کو یہ اختیار تھا کہ وہ ناپاکی کو دور کرنے کی خدمت انجام دے۔ نئی پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رائے عامہ افراط تفریط کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے اور کسی قانون سے زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ عین اس وقت جب امریکہ نے حقیقی معنی میں اپنا ادب، اپنا فن اور اپنا ڈرامہ پیدا کرنا شروع کیا ہے، ہم نے پارسائی کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تو ہمیشہ کے لیے اپنے نام پر طفلانہ حماقت اور تعصب کا داغ ثبت کر دیں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے چارلز دوم کرامویل سے بہتر ثابت ہو گا۔

خوش قسمتی سے زندگی جوانوں کا ساتھ دے رہی ہے اور جوانی زندگی کا۔ ممکن ہے ہماری اولاد خود کشی کو اپنا شعار بنا لے اور کھیلوں کو فلسفہ علم پر ترجیح دینے لگے اور شراب پینے سے پہلے دعا مانگنا ضروری نہ سمجھے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے نوجوان کس قدر صحت مند اور خوش ذوق ہیں۔ جوانوں کو خوش رہنا چاہیے۔ بہت جلدی وہ بوڑھے ہو جائیں گے اور جسم کی علالت انہیں نیک بنا دے گی۔ اگر اخلاق ہنگامی طور پر ضعیف ہو جائیں تو علم و حکمت کے اضافہ سے ان میں خود بخود توانائی آ جائے گی۔ جیسا کہ سقراط نے کہا تھا ہمیں منع کرنے کی بجائے تعلیم دینی چاہیے۔ اگر ہمیں دوسروں کے اخلاق کی اصلاح منظور ہے تو پہلے اپنا کردار بہتر بنائیں۔ مثال، درس اخلاق سے کہیں بہتر ہے۔ مثال کی آواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ اس سے آگے درس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اجتماع کے لیے ہم بہترین چیز یہ کر سکتے ہیں کہ اسے قوانین سے پابہ زنجیر نہ کریں۔ بلکہ اپنی زندگیوں کو برداشت، تحمل اور خودداری سے آراستہ کریں۔ ایک شریف انسان کا صرف اپنا

اخلاق ہوتا ہے۔ وہ وقت ضرور آئے گا۔ جب لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ حکومت کا اہم ترین فریضہ آئین سازی نہیں بلکہ تعلیم دینا ہے، قانون نہیں مدرسے بنانا ہے۔ ایک زیرک استاد کی طرح ایک عظیم سیاست دان، معلومات کے ذریعہ راہبری کرتا ہے اور ممنوعات اور فرامین کے ذریعہ تشدد طلب نہیں کرتا۔ اس کا اصول ہو گا۔ تعلیم پر کروڑوں خرچ کرو، جبر پر ایک دمڑی نہیں۔ ریاست جو امن پسند کسانوں پر ظالم گڈریوں کے حملوں اور ٹیکسوں سے پیدا ہوئی تھی، شاید پھر ایک سربلند قوم کی عظیم قیادت کا ذمہ لے لے۔ جس طرح کہ اس نے کچھ مدت کے لیے اینٹونائینیس کے عہد میں کیا تھا۔ ہمیں اپنی نسل کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری حکومت ہمیشہ سیاست دانوں کے ہاتھوں میں رہے گی۔ ہر روز علم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر روز ثقافت کا سرمایہ بڑھ رہا ہے اور ساری انسانیت پر چھا رہا ہے۔ بہت جلدی انسان ان کم علم انسانوں کو برداشت نہیں کریں گے، جنہیں ہم نے اتنے صبر و تحمل کے ساتھ اتنی مدت تک برداشت کیا ہے۔ ہمارے بچوں کے بچے ہماری آغوش پرورش میں پروان چڑھ کر اپنے اپنے حکام کا انتخاب ہم سے زیادہ بہتر طریقہ پر کریں گے۔ وہ آئین سازوں کا نہیں، اچھے استادوں کا مطالبہ کریں گے۔ وہ تنظیم نہیں، علم مانگیں گے۔ وہ تشدد اور جبر کے ذریعہ نہیں، بلکہ ذہانت کی عمومیت اور توسیع کے ذریعہ امن اور نظم و نسق حاصل کریں گے۔

* * *

باب ہشدہم

کیا جمہوریت ناکام رہی ہے؟

ا۔ جمہوریت کے ماخذ

جمہوریت جس کا بقول مونٹسکو کے بنیادی اصول نیکی ہے، دولت اور بارود سے پیدا ہوئی۔ توپوں اور بندوقوں نے جاگیرداری نظام کو پارہ پارہ کر دیا۔ جاگیردار شہسواروں کو پیادہ فوج کا شکار بنایا اور جنگ میں آقا اور غلام کو مساوی درجہ عطا کیا اور فیثاغورس کے بعد تعداد کو پہلی بار ایک بلند مقام دیا۔ سکے اور قرض نے تجارت اور اجتماع دولت کی راہیں آسان کر دیں۔ اس نے تجارت کے مرکزوں کے قریب بھرے شہر آباد کیے اور بندرگاہوں پر ایسی آبادیاں قائم کیں جو جاگیرداری کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس نے ایک بے کار رئیسیت کے مقابلے میں ایک توانا اور قوی تجارتی طبقہ پیدا کیا جو اپنی اقتصادی قوت کے مطابق سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

والٹیر اور روسو اس انقلاب کے رہبر تھے اور انہوں نے آزادی اور مساوات کے نعروں کو قبول عام بخشا اور ان کی لے پر متوسط طبقہ سیاسی غلبہ کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ابتدا میں آزادی کا مفہوم جاگیرداری ظلم سے نجات حاصل کرنا تھا اور مساوات کا مفہوم رئیسوں اور پادریوں کی لوٹ کھسوٹ میں تجارتی طبقہ کی شرکت تھی۔ گمان غالب ہے کہ شروع میں برادرانہ سلوک کا مفہوم بھی یہی ہو گا کہ رئیسوں اور پادریوں کے محلوں تک سرمایہ داروں، تاجروں، قصابوں، نان بائیوں اور مشعل سازوں کی آسانی سے رسائی ہو جائے۔ ان لفظوں کے ساتھ ہر مفہوم وابستہ کرنے والوں کو شبہ بھی نہیں تھا کہ سب بالغوں کو اپنے احاطے میں لے لیں گے۔ عورتیں تو بالخصوص ان کے دائرہ مفہوم میں شامل نہیں تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ عورتیں اور مزدور ہرگز یہ نہیں سمجھیں گے کہ ان اصطلاحوں کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے۔ جمہوری نظریہ کے خالق روسو کا خیال تھا کہ عورتوں اور

جائیداد نہ رکھنے والے لوگوں کو سیاسی قوت اور اقتدار حاصل نہ ہو۔ یہ دونوں طبقے روسو کے نزدیک عوام کے زمرہ میں شامل نہیں تھے۔ انقلاب فرانس کی اسمبلی کے قانون کی رو سے بالغ مردوں کے ۳/۴ حصہ کو رائے دہندگی کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے ہماری ریاستوں میں سے بعض میں رائے دہندہ کے لیے تھوڑی بہت جائیداد کا مالک ہونا لازمی تھا لیکن اینڈریو جیکسن کے عہد میں یہ حالات بدل گئے۔ ابتداء میں اور اب بھی جمہوریت کا مفہوم متوسط طبقہ کی حکومت ہے۔

چند اور اسباب نے بھی اقتصادی اسباب کی معاونت کی۔ اصلاح مذہب کی تحریک نے اس باغیانہ انفرادیت کے لیے راستہ صاف کیا جو اخوت انسانی کے جمہوری تصور میں مضمر ہے۔ تعصب اور وہم پرستی کے خلاف سائنس دانوں اور مفکروں کے حملوں کی جتنی زیادہ اشاعت ہوئی، لوگوں نے جنت پر کورانہ عقیدہ رکھنے کی جگہ اس ارضی جنت پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا، جس میں دانا اور احمق دونوں مسرت اور طاقت میں برابر کے شریک ہیں۔ صنعتی انقلاب نے لوگوں کو جانچنے کے لیے حسب نسب نہیں بلکہ تخلیقی قوت کو معیار بنایا حکومت کے اخراجات نے بادشاہوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تجارت پیشہ لوگوں کی طرف رخ کریں اور ادنیٰ مجالس آئین ساز کو زیادہ سے زیادہ طاقت دیں۔ طاقتور گروہوں کی باہمی رقابت نے رائے دہندوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ تاکہ غالب گروہ کا غلبہ قائم رہے۔ جب آقاؤں میں پھوٹ پڑی تو عوام ابھرے۔ جب مردوں میں پھوٹ پڑی تو عورتوں کی قوت اور اثر میں اضافہ ہوا۔ اب ہم سب اس دلدل میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور سوال یہ ہے کہ کون ہمیں اس دلدل سے باہر نکالے جب کہ سب کے سب اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

جب یہ اسباب یورپ میں برسر عمل تھے اور انہوں نے انگلستان، فرانس اور جرمنی میں ۱۶۸۸ء، ۱۷۸۹ء اور ۱۹۱۸ء میں انقلاب پیدا کیے اور ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کا پہلا دور جاری کیا۔ امریکہ کی جمہوری نشوونما نے ان کی تحریک کو سہارا دیا۔ ہمارا ۱۷۷۶ء کا انقلاب جو اب دور کے ڈھولوں کی طرح سہانا معلوم ہوتا ہے، انگلستان کے خلاف محض نوآبادیوں کی جنگ نہیں تھی۔ یہ غالباً باہر سے آنے والی رئیسیت کے خلاف متوسط طبقہ کی جنگ تھی۔ یہ ان سیاسی زلزلوں کے سلسلے کی ایک کڑی تھی، جنہوں نے مغربی دنیا کی اجتماعی سطح کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور جاگیردارانہ رئیسیت کو پارہ پارہ کر کے ہر جگہ عوامی حکومتوں کی داغ بیل ڈالی تھی۔

جس طرح کسانوں کی بغاوتوں نے یورپ میں نوابوں پر سرمایہ داروں کی فتح کو آسان تر بنا دیا۔ اسی طرح ہمارے ملک میں آزاد زمین کی فراوانی سے متوسط طبقہ کا عروج آسان ہو گیا تھا۔ جمہوریت، امریکہ کو راس آئی۔ کیونکہ امریکہ نے ابتداء ہی مساوات اور آزادی سے کی۔ اشتمالیت کی طرح جمہوریت تہذیب کے ابتدائی مراحل میں زیادہ واضح ہوتی ہے اور بعد کی پیچیدہ

اور تعیش پسند، منازل میں نظر نہیں آتی۔ ڈی ٹوک ول ۱۸۳۰ء میں یہاں کی اقتصادی مساوات کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ کانگرس سے مطالبہ کرو تو زمین مل جاتی تھی۔ جمہوریت اسی وقت حقیقی تھی، کیونکہ سیاسی مساوات کسی حد تک اقتصادی مساوات پر مبنی تھی۔ جو لوگ اپنی زمین پر رہتے تھے اور اپنی زندگی کے حالات کو بدل سکتے تھے، شخصیت اور اخلاق کے مالک تھے۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں جمہوریت پسند تھے۔ ان کی جمہوریت محض رائے دہندگی کی آزادی تک محدود نہیں تھی۔ ان لوگوں نے جیفرسن کو صدر بنایا۔

وہ جیفرسن، جو ٹام پین کی طرح کٹر تھا اور اس آدمی کی طرح قدامت پسند، جو ہر انیسویں سال ایک انقلاب چاہتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے، جنھوں نے ایمرسن کی خوداعتماد فردنیت اور وٹمین کی مدح عوام کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے یورپ میں امریکی کے متعلق یہ تصوم عام کیا تھا کہ وہ ایک زیرک، منفرد اور مختار شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ تصور آج کے سیاسی حالات میں اس قدر ناممکن ہے، جتنا کہ کسی جیفرسن کا صدارتی عہدہ کے لیے انتخاب۔

پھر ثانوی اسباب اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ تقابل کی آزادی نے ہماری ریاست کے ابتدائی ایام میں خوداختیاری اور شخصیت کے پھلنے پھولنے کے سامان پیدا کیے۔ اس وقت پیشہ ور مزدوروں کی تعداد آج کل سے زیادہ تھی۔ کیونکہ آج کل تو یورپ کے غیر پیشہ ور کسانوں نے ہمارے ملک میں آکر ہمارے شہروں کی بے بس پرولتاریت کی بنیاد رکھی ہے۔ اس زمانے میں لوگ فقط مزدور نہیں تھے۔ کسی خاص شعبہ میں کسی پیشہ کی مہارت کی بدولت انھیں انفرادی شخصیت حاصل ہوئی تھی اور انفرادیت کو وہ خوشگوار آزادی نصیب ہوئی تھی، جو آج کل ہم معیاری تعلیم اور اخباروں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ پھر کسی حد تک دیہات میں رہنے والوں کو اپنی تنہائی اور علیحدگی کی زندگی میں انفرادی آزادی بھی زیادہ میسر آتی تھی اور جمہوریت سے بہرہ ور ہونے کا بھی زیادہ موقع حاصل ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہماری قومی تنہائی، ان عظیم اور محافظ سمندروں کے درمیان ہمیں آزادی اور تحفظ بہم پہنچاتی ہے۔ یہ اور صدہا دوسرے اسباب تھے جنھوں نے مل کر امریکی جمہوریت کو حقیقی بنایا۔

۲۔ جمہوریت کا زوال

لیکن اب یہ سارے حالات ناپید ہیں۔ قومی علیحدگی، تجارت، وسائل نقل و حمل کی کثرت اور تخریبی مشینوں کی ایجاد سے ختم ہو گئی ہے۔ صانع، قاسم اور خریدار کی باہمی اور مشترکہ احتیاج نے شخصی علیحدگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب جب کہ کلیں، کلوں کو چلاتی ہیں۔ فنی مہارت محض

استثناء کی حیثیت رکھتی ہے اور سائنٹیفک تنظیم نے ہنر کو محض غیر انسانی تواتر کا درجہ دے دیا ہے۔ آزاد زمین ختم ہو گئی، فقط کرایہ داری باقی رہ گئی ہے۔

آزاد تقابل انحطاط پذیر ہے۔ کچھ عرصہ تک شاید یہ نئی تجارتوں مثلاً موٹروں کی تجارت کی شکل میں زندہ رہے لیکن تقابل ہر جگہ اجارہ داری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ دکاندار، جو کبھی آزاد تھا، آج ہر جگہ قاسم کے شکنجہ میں گرفتار ہے۔ اب وہ دکانوں کے سلسلوں کے آگے بے بس ہے، حتیٰ کہ کوئی ایسا مدیر، جو اخبار کا مالک بھی ہے، اب ناپید ہے۔ کیونکہ ہر جگہ ہزاروں اخبار بہتر طریقہ پر ایک ہی جھوٹ کی اشاعت کرتے ہیں۔ کاروباری سرمایہ داری، بنکروں اور ڈائریکٹروں کی تعداد کم ہو رہی ہے، لیکن لوگوں پر ان کا اختیار بڑھ رہا ہے۔ باغی متوسط طبقہ میں سے ایک نئی رئیسیت پیدا ہو رہی ہے۔ مساوات، آزادی اور اخوت اب سرمایہ داروں کے نصب العین نہیں رہے۔ متوسط طبقہ میں بھی اقتصادی آزادی سال بہ سال محدود ہوتی جا رہی ہے۔ جب آزادی تقابل، مساوات اور اجتماعی اخوت ختم ہونے لگے، سیاسی آزادی ایک فریب نظر ہے، اور جمہوریت محض ایک خواب۔

یہ سب کچھ انسانوں کی بدعنوانیوں کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ اقتصادی نشوونما کی غیر شخصی قوتوں کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔ انسان اسی وقت آزاد ہو سکتے ہیں، جب وہ صلاحیت اور طاقت میں برابر ہوں، لیکن اس صورت میں بھی ان کی مساوات، ان کی آزادی سے تباہ ہو جاتی ہے۔ طاقت اور صلاحیت میں لازمی وراثتی اختلافات، اجتماعی اور مصنوعی اختلافات پیدا کر دیتے ہیں اور ہر نئی ایجاد اور انکشاف سے طاقت زیادہ مضبوط اور ناتوانی زیادہ ناتواں ہوتی ہے۔ مساوات ایک غیر متوازن رشتہ ہے، ترازو کے دو پلڑوں کی طرح، جنہیں ایک مصنوعی توازن نے ایک دوسرے کے برابر بنا دیا ہے۔ جوں جوں تنظیم اور پیچیدگی بڑھتی رہتی ہے، مساوات کم ہوتی جاتی ہے۔ عدم مساوات اجتماعی ارتقا کی نوعیت میں مضمر ہے، کیونکہ اس سے وظائف میں اختصاص اور صلاحیتوں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے اور لوگوں کو اجتماع کے نقطۂ نظر سے غیر مساوی طور پر قدر و اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ "مساوات، دو نظاموں کے درمیان عبوری دور کی ایک منزل ہے، جس طرح آزادی دو ضابطوں کے درمیان ایک راستہ ہے"۔ غور کیجیے کہ امریکہ کی ابتدائی مساوات کس طرح ہزاروں اقتصادی اور سیاسی امتیازات کے نیچے دب کر رہ گئی ہے اور آج کل امیر اور مفلس کی درمیانی خلیج اتنی وسیع ہے کہ روما کی تہذیب کے بعد تاریخ کے کسی دور میں نظر نہیں آتی۔ رائے دہندگی کی مساوات سے کیا فائدہ، جب کہ طاقت ہی غیر مساوی طور پر منقسم ہوتی ہو اور سیاسی فیصلے، لوگوں کی اکثریت سے نہیں بلکہ ڈالروں کی اکثریت کی بنا پر کیے جاتے ہیں۔

اقتصادی مساوات کا عدم وجود ہماری سیاسی منافقت اور انحطاط کی بنیاد ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہیں۔ ہم اگر انہیں نظرانداز کر دیں تو مسئلہ کی نوعیت پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لیے آیئے ذرا اختصار کے ساتھ اس کا جائزہ لیں۔

ان اسباب میں سے ایک سبب امریکہ کی استعماری توسیع ہے یا سیاسی وجود کے حجم کی ضخامت، ریاست جتنی زیادہ وسیع ہوگی، اس میں شخصیت اور جمہوریت کو قائم رکھنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہوگا۔ وسیع آبادیوں پر حکومت کرنا زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ ان میں تساہل زیادہ ہوتا ہے اور ان کے لیے اپنے مصائب کے متعلق متفق ہونا یا عمل میں متحد ہونا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پیر-کلس اور کلیون، اگرچہ وہ اور باتوں میں اختلاف رائے رکھتے تھے، لیکن اس بات پر متفق تھے کہ جمہوریت، سلطنتوں کے لیے مفید نہیں ہے۔

پھر غور کیجئے کہ حکومت پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی حکومت، بادشاہ اس کے درباریوں اور اس کے حرم پر مشتمل تھی اور آج وہ ہزاروں برسرپیکار گروہوں کے ایک ساتھ زندگی ممکن بنانے کی کل ہے۔ اس کے کردار میں جو لوگ سب سے کم اہم حصہ لیتے ہیں، انہیں بھی اپنا پورا وقت دینا پڑتا ہے۔ آج منصفوں کے عارضی اور عوامی انتخاب یا ایتھنز کی طرح بے خبر لوگوں کے اجتماع کے فوری فیصلوں سے یہ حکومت نہیں چل سکتی۔ قدرتی طور پر ہر جماعت، ہر ادارے اور ہر پارلیمنٹ میں "کلیس" پیدا ہوتی ہیں۔ جمہوریت ان جتھے بندیوں کی اساس بہم پہنچاتی ہے۔ رائے دہندہ نون، تیل، لکڑی، کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ان ہزاروں مسائل سے کیونکر باخبر رکھ سکتا ہے۔ جو اس کی جماعت، انجمن یا ادارہ کو درپیش ہیں۔ وہ اپنی جماعت کے متعلق سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ تو بے خبر ہے۔ جمہوریت بے خبر لوگوں کی حکومت کا نام ہے۔

اسی لیے جنگ میں جمہوریت سب سے پہلے مجروح ہوتی ہے۔ ڈی ٹوکسول نے پیش گوئی کی تھی کہ امریکہ کو اس وقت جمہوریت سے کنارہ کشی کرنی پڑے گی جب وہ اپنے آپ کو یورپ کی سیاست اور جنگوں میں الجھا دے گا۔ میکالے نے کہا تھا کہ "بہت سی فوجوں نے برے کمانداروں کے ماتحت خوش حالی کی زندگی بسر کی ہے۔ لیکن کسی اچھی مجلس مباحثہ کے ماتحت نہیں کی"۔ مزدور انجمنیں اسی لیے آمریت کی طرف مائل ہوتی ہیں کہ ان کا کام دفاع اور جنگ ہوتا ہے۔ رجعت پسند یہ بات جانتے ہیں اور ضبط تولید کی جگہ کبھی کبھی جنگ شروع کر دیتے ہیں تاکہ قومی اتحاد میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔ جمہوریت جنگ کا علاج نہیں۔ بلکہ جنگ، جمہوریت کا علاج ہے۔ غالباً جب ہمارے سیاسی رہنما ایک اور بین الاقوامی جنگ شروع کریں تو یہ علاج پائیدار ثابت ہو۔

ہماری جمہوریت کی ناکامی کا آخری سبب، دنیا میں تعلیم کی کمی ہے۔ ایمرسن نے کسی موقع پر کہا تھا کہ "عوام کی نادانی ہمیشہ طاقت کو بے باکی کی ترغیب دلاتی ہے"۔ ذہنی آزمائشوں کی بنا پر جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ ان سے ان لوگوں کے تصورات کی تائید ہوتی ہے۔ جنھوں نے پچھلے بیس برس کے انتخابات دیکھ کر بعض نتائج مرتب کیے ہیں۔ نظریہ جمہوریت نے یہ فرض کر لیا تھا کہ انسان ایک باشعور حیوان ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یہ بات منطق کی کسی کتاب میں پڑھ لی تھی، لیکن انسان ایک جذباتی حیوان ہے، جو کبھی کبھی باشعور بھی بن جاتا ہے اور اپنے جذبات کے ذریعہ وہ ہزاروں فریب کھا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ لنکن کا یہ قول صحیح ہو کہ آپ لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آپ ان میں سے اکثر کو بے وقوف بنا کر ایک بڑے ملک پر حکومت کر سکتے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کرہ ارض پر ہر منٹ میں دو سو نئے احمق پیدا ہوتے ہیں اور یہ جمہوریت کے لیے برا شگون ہے۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف جمہوریت ہی ناکام نہیں رہی بلکہ ہم خود بھی ناکام رہے ہیں۔ ہم نے طاقت حاصل کرنے کے بعد شعور اور آگہی کو پختہ کرنے کی طرف سے غفلت برتی۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ کثرت مقدار اور طاقت کا راز ہے۔ حالانکہ ہمیں زندگی کی ایک پست سطح کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ رائے دہندوں کی تعداد میں جتنا زیادہ اضافہ ہوگا، اسی حد تک ان آدمیوں کا معیار جنہیں ہم اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں اور ان صفات کا معیار جن کی بنا پر یہ انتخاب کیا جاتا ہے، پست ہوتا جائے گا۔ ہم اپنے چنے ہوئے حکام سے کسی قسم کی عظمت اور دور اندیشی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچھے خطیب ہوں اور ہمیں فاقوں نہ مرنے دیں۔ بیکن نے کہا تھا کہ قدیم مفکر یہ کہا کرتے تھے کہ جمہوریت کی حیثیت ایک سمندر کی سی ہے اور مقرر کی ہوا کی سی۔ درحقیقت ہمیں اس بات کی پروا نہیں کہ ہم پر کون حکومت کرتا ہے۔ ہم اس بات کا بہت کم شعور رکھتے ہیں کہ ہم پر حکومت کی جا رہی ہے۔ جس طرح پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ ہم جاگیرداروں کے ذریعہ مالیہ ادا کرتے ہیں اس لیے ہم کوئی ٹیکس نہیں دیتے۔

والٹیئر ملوکیت کو جمہوریت پر ترجیح دیتا تھا۔ کیونکہ ملوکیت کے لیے ہمیں ایک شخص کو تعلیم دینا ہوتی ہے اور جمہوریت کے لیے کروڑوں کو اور اس سے پہلے کہ ہم دس فیصدی کو تعلیم دیں، موت ان سب کو آن لیتی ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ شرح پیدائش، ہمارے نظریوں اور ہمارے منصوبوں کو الٹ پلٹ دیتی ہے جو "کم لوگ" تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے کنبے چھوٹے ہوتے ہیں اور جن "زیادہ لوگوں" کے پاس تعلیم کے لیے وقت نہیں، ان کے کنبے بڑے ہوتے ہیں۔ ہر نسل کے تقریباً سب گھروں میں علم کا حصول ان کی مالی اہلیت کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس لیے

سیاسی آزاد فکری ہمیشہ کے لیے بے سود ثابت ہوتی ہے۔ ذہانت کی تبلیغ جہلا کی شرح پیدائش کے دوش بدوش نہیں چل سکتی۔ یہی پروٹسٹنٹ مذہب کی خامی ہے۔ مذہب کو بھی قوموں کی طرح، جنگوں سے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ بقا اولاد یا آئندہ نسل کی نوعیت سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی لیے جمہوریتیں، قدامت پسند ہوتی ہیں۔ اناطول فرانس اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ گروہ نئی چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ بسمارک جانتا تھا کہ عوام بادشاہی نقطہ نظر کی حمایت کریں گے۔ اس بوڑھے کلبی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ میرے نزدیک براہ راست انتخاب اور ہمہ گیر رائے دہندگی کا حق کسی مصنوعی انتخابی قانون سے زیادہ قدامت پسندانہ اقدام کی ضمانت ہے۔ عورت نے آسانی سے حق رائے دہی حاصل کر لیا کیونکہ مختلف جماعتوں کے قائد یہ سمجھتے تھے کہ عورتیں قدامت پرستی کی حمایت کریں گی۔ سوئزرلینڈ کے آزاد منش لوگوں نے کچھ اصلاحیں نافذ کیں، جس میں عوام کی رائے شماری بھی شامل تھی۔ قدامت پسندوں نے یہ اصلاحیں عوام کے استصواب رائے کے لیے ان تک پہنچائیں۔ لیکن انہوں نے سب اصلاحیں مع استصواب رائے کے اصول کے مسترد کر دیں۔ ۱۹۱۸ء میں انگلستان میں رائے دہی کے حق کی توسیع سے وہاں ایک نہایت رجعت پسند حکومت قائم ہو گئی۔ آسٹریلیا میں جبری رائے دہی کے قانون کی وجہ سے ممکن رائے دہندگان کی تعداد جہاں ۱۹۱۳ء میں ساٹھ فیصدی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں نوے فیصدی ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پسندوں نے بہت بڑی اکثریت کے ساتھ حکومت جیت لی۔ امریکہ میں حق رائے دہی کی توسیع کے متعلق سر ہنری مین نے پیش گوئی کی تھی کہ "یہ نہایت بے ہودہ خیال ہے کہ توسیع حق رائے دہی سے ترقی میں اضافہ ہو گا۔ نئے افکار، نئے انکشافات، نئی ایجادیں اور زندگی کے نئے فنون پھلیں پھولیں گے۔ گمان غالب ہے کہ اس سے ایک مضرت رساں قسم کی قدامت پرستی پھیلے گی"۔ ہمیں اس متعصب انگریز کے ساتھ اتفاق کرنا پڑے گا کہ جمہوریت عظیم اذہان کی دشمن اور فن سے بے تعلق ہے۔ یہ ان چیزوں کی قدر کرتی ہے جو اوسط ذہن کی سمجھ میں آ جائیں۔ وہ فلمی محلات تعمیر کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس نے پار تھینون بنا لیا ہے۔ اگر ایتھنز کی اسمبلی کی بات مانی جاتی تو پار تھینون کبھی نہ بنتا۔

اکثریت کا ذہنی تشدد ملوکیت کے سیاسی ظلم و ستم کی طرح نہایت مہیب ہو سکتا ہے۔ بعض امریکی ریاستوں میں، تھوڑے علم سے کچھ زیادہ علم رکھنا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ انفرادیت کے یہ جمہوری شکوک، نظریہ مساوات کا نتیجہ ہیں اور چونکہ سب انسان برابر ہیں، رائے شماری سے کوئی حقیقت بھی ثابت کی جا سکتی ہے اور کوئی رسم مقدس بن سکتی ہے۔ جمہوریت، محض مشینی عہد کا نتیجہ نہیں۔ نہ یہ محض مشینوں کی بدولت حکومت کرتی ہے، بلکہ یہ اپنے اندر خود ایک خطرناک

مشین رکھتی ہے۔ جاہلانہ جبر کا وہ بے پناہ بوجھ جو اختلاف کو ختم کرتا ہے۔ غیر معمولی ذہن کو دباتا ہے اور غیر روایتی کمال کی دل شکنی کرتا ہے۔ امریکہ کی طرح اور کہیں بھی تعلیم کو اتنی مالی امداد میسر نہیں، لیکن کسی اور ملک میں اس کا اتنا کم احترام اور اتنا کم استعمال نہیں ہوتا جتنا امریکہ میں۔ ہم نے فیاضی سے مدرسے، کالج اور جامعے بنائے ہیں لیکن آج جب کہ وہ بن گئے ہیں اور بھرے بھرے نظر آتے ہیں، ہم نے تعلیم کو انتظامی عہدوں کے لیے نااہلیت کا معیار سمجھ لیا ہے۔

۳۔ جمہوریت کے طریقہ ہائے عمل

اس ملک میں جہاں حکمران اقلیت عوامی حمایت کا لباس اوڑھتی ہے، ایک خاص طبقہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کا وظیفہ حکومت کرنا نہیں بلکہ اس منصوبہ کے لیے لوگوں کی منظوری حاصل کرنا ہوتا ہے جو حکمران اقلیت کو پسند ہو، ہم اس خاص طبقہ کو سیاست دان کہتے ہیں۔ ہم ان کا ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔

سیاست دان جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں اور لوگوں کو ایسے گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، جو ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ انسانیت کی فطری جماعت پسندی ان جماعتوں کو کامیاب بنا دیتی ہے۔ یہ قبائلی وفاداری کے آثار ہیں۔ آسٹریلیا کے وحشی اپنے وسیع براعظم کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر فقط اس لیے جاتے ہیں کہ جنگ میں ان لوگوں کا ساتھ دیں جو انہی کا سا ٹوٹم (قبیلہ کا نشان) پہنتے ہیں۔ ٹوٹم آج بھی تنظیم میں مدد دیتا ہے اور وہ جماعتیں جو ہاتھی یا گدھے کو اپنا نشان بناتی تھیں، ہماری جماعتوں سے زیادہ یک جہتی سے کام کرتی تھیں۔

جماعتی تنظیم مہنگی ہوتی ہے اور اسے فرشتوں کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی وہ حقیقت پسند غنی، جو کلبوں، سیر و تفریح اور مہموں کے اخراجات برداشت کرتے ہیں، اس کے عوض وہ نمائندوں کا انتخاب کرنے، بعض عہدے اور معاہدے حاصل کرنے، تکلیف دہ قوانین سے تحفظ حاصل کرنے اور آئین سازی کے مشکل کام میں خاموشی سے دخل اندازی کرنے پر مطمئن ہیں۔ "جو لوگ نمائندے نامزد کرتے ہیں، وہی حکومت کرتے ہیں" عوام کسی کو نامزد نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بدنظمی اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ ان پر فقط اتنا بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نوازشوں کو عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کریں گے۔ ایک مختصر اور منظم اقلیت ایک طرف سارے ووٹ ڈال کر کسی انتخاب میں فیصلہ کن طاقت حاصل کر سکتی ہے۔ مشین اس لیے فتح پاتی ہے کہ وہ ایک بٹی ہوئی اکثریت کے خلاف ایک متحدہ اقلیت ہے۔ غالباً کارلائل کا یہی مطلب تھا، جب اس نے کہا تھا کہ "جمہوریت اپنی نوعیت ہی میں متناقض بالذات ہے۔ اس کا نتیجہ صفر ہے"۔ اس جوشیلے جمہوریت

پسند روسو نے کہا، صحیح جمہوریت نہ کبھی وجود میں آئی ہے نہ آئے گی کیونکہ یہ بات فطری نظام کے خلاف ہے کہ اکثریت، اقلیت پر حکومت کرے۔ تمام سیاست منظم اقلیتوں کی باہمی رقابت پر مشتمل ہے۔ عوام محض تماش بین ہیں جو فاتح کی حوصلہ افزائی اور شکست خوردہ کی تضحیک کرتے ہیں۔ اس پیکار کے فیصلے اور انجام میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔

ان حالات میں رائے دہی بے معنی چیز ہے اور یہ فقط اس لیے جاری رہتی ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی رہے کہ وہی قانون بناتے ہیں اور اس طرح اجتماعی نظام کی چولیں ڈھیلی نہ ہونے پائیں۔ مونٹسکو نے کہا ہے کہ جمہوری نظام میں، یہ ممکن ہے کہ ٹیکس دوسرے ملکوں سے زیادہ ہوں۔ لیکن لوگ ان کی مدافعت نہیں کرتے کیونکہ ہر شہری انہیں اپنی خدمت میں ایک نذر عقیدت سمجھتا ہے۔ شہری ریاست ہے اور صدر، عوام کا غلام ہے۔ اس طرح لوگوں کی نخوت کی تسکین کرو، تو وہ سب کچھ ماننے کے لیے تیار ہیں۔

ان حالات میں انتخاب سے فقط ایک ہی فائدہ ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کی بیدار توجہ سے تعلیمی مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات اصلی مسائل کی چالاک پردہ پوشی سے یہ مواقع بیکار جاتے ہیں۔ اس سیاست دان کی کوئی حیثیت نہیں جو لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا دینے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۱۹۱۷ء میں کینیڈا کے انتخاب میں جبری بھرتی کے مسئلہ کو اس لیے چھپایا گیا تھا کہ جبری بھرتی کی تجویز کی شکست سے کینیڈا میں فرانسیسی طبقہ تسلط حاصل کر لے گا۔ انگریز طبقہ بیک آواز انگریز تسلط کے حق میں اٹھا اور جبری بھرتی کی تجویز کامیاب ہو گئی۔ ایک اچھی نمائش کسی قسم کی سیاسی بیہودگی کو قابل قبول بنا سکتی ہے۔ انتخابات فریب اور شور و غوغا کا مقابلہ بن جاتے ہیں۔ اور جس طرح اچھے دلائل میں شور و غوغا کم ہوتا ہے، حقیقت، انتشار میں کھو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر غور کرو کہ اضلاع یہ چاہتے ہیں کہ طاقت دیہاتی قدامت پسندوں کے ہاتھوں میں رہے۔ وہ متحرک مخلوق، جو خانہ بدوشی کی وجہ سے حق رائے دہی سے محروم ہو جاتی ہے، انتخابات میں بددیانتی اور تشدد سے کام لیتی ہے۔ بس یہ ہے جمہوریت۔ ان حالات میں ایک ووٹ اسی قدر قیمت رکھتا ہے، جتنا کہ ایک ریلوے ٹکٹ اس وقت جب لائن مستقل طور پر مسدود ہو۔ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ ۱۸۸۵ء میں اسی فیصدی رائے دہندگان نے ووٹ دیئے اور ۱۹۲۴ء میں صرف پچاس فیصدی نے؟ یا یہ کہ ذہین انسان ایک گھنٹہ رجسٹر ہونے اور ایک گھنٹہ ووٹ دینے پر ضائع نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دونوں نمائندے اس کے نمائندے نہیں ہیں؟

پھر بھی فرض کیجیے کہ ہم ووٹ دے چکے ہیں۔ انتخابات ختم ہو گئے اور منتخب لوگ واشنگٹن

پہنچ گئے تاکہ ہماری کانگرس کو زینت بخشیں۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں کئی ذہنی صدموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر اوسط قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں ندرت فکر کی صلاحیت سرے سے مفقود ہوتی ہے۔

لیکن اب ہمارے نمائندہ کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جو اسے اب تک پیش نہیں آئے تھے۔ اسے الیکشن میں کامیاب ہونے کے لیے اپنے حلقہ، علاقہ اور ضلع کے ارباب اقتدار سے وفاداری پوشیدہ اثرات اور خفیہ معاہدے کرسکنے کی صلاحیت کی ضرورت تھی۔ اسے تقریریں کرنے، الزام لگانے اور دوسروں کے لگائے ہوئے الزامات کی تردید کرنے اور خودنمائی میں ماہر ہونے کی ضرورت تھی اور پھر اسے بے طلب چندہ مانگنے، طاقتوروں پر مہربانیاں کرنے اور ہر ایک سے عہد و پیمان کرنے میں مہارت کی ضرورت تھی، لیکن اب جو مسائل اسے واشنگٹن میں درپیش ہیں، وہ اقتصادی مسائل ہیں۔ یہ مسائل زمین کی ملکیت، خام مواد، کوئلے کی کانوں، تیل کے کنووں، آبی طاقت، پیداوار، تقابل نقل و حرکت، رسل و رسائل، جہازرانی، ہوابازی، پنچایت، تقسیم، منڈیوں اور مالیات کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کی تفاصیل صرف ماہرین ہی کو معلوم ہوتی ہیں اور اس شخص کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوتی ہیں جس نے فقط ریشہ دوانیوں میں مہارت حاصل کی ہو۔ ہمارا نمائندہ اخباروں کے پیچھے پناہ لیتا ہے اور اس سے جس طرح ووٹ دینے کو کہا جاتا ہے، ووٹ دیتا ہے۔

جوں جوں حکومت زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، منتخب نمائندے کم سے کم اہم اور ماہرین زیادہ اہم ہوتے جاتے ہیں۔ منتظمین، آئین سازوں کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں کیونکہ منتظمین، ماہرین کی مجالس سے امداد حاصل کرتے ہیں۔ پریزیڈنٹ ہارڈنگ کے عہد حکومت میں کانگرس کے اراکین کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا کہ ایک پیریڈ میں انہیں چند ماہرین کے پیچھے بیٹھنے کی جگہ ملی۔ سینٹ نے اس معاملہ پر باقاعدہ احتجاج کیا اور مسٹر ہارڈنگ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا جواب دیا، لیکن اس واقعہ نے یہ ظاہر کردیا کہ حالات کا رخ بدل رہا ہے۔ "نمائندہ حکومت" ختم ہوچکی تھی۔ جمہوریت نے اپنے عہدوں پر ذہین آدمیوں کو متعین کرنے کی کوئی راہ نہیں پائی تھی اور جب جمہوریت اخبار پڑھ رہی تھی یا تقریریں کررہی تھی، ذہین لوگ طاقت حاصل کررہے تھے۔

کیا یہی وجہ تھی کہ ہم اتنے اصرار سے اپنے اعدا کو جمہوریت اختیار کرنے کی شہ دے رہے تھے؟ نیٹشے اس رجحان کا ذکر کرتا ہے "جو ہمسایہ حکومت کی جمہوریت کی پشت پناہی کرتا ہے کیونکہ یہ طرز حکومت قوم کو ناتواں بنا دیتی ہے اور اس سے جنگ کرنے کی اہلیت چھین لیتا ہے"۔ غالباً

چونکہ جمہوریت نااہل، بداخلاق، کند ذہن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت دے دیتی ہے، اسی لیے اطالیہ، ہسپانیہ، یونان، روس، پولینڈ اور پرتگال میں جمہوریت آمریت میں تبدیل ہو گئی ہے اور شاید فرانس میں بھی یہی حالات پیدا ہو جائیں۔ ہماری حالت دیکھیے، سیاسی اصلاح کی تحریکیں شکست کھا گئی ہیں اور جہاں کہیں انہیں فتح ہوئی ہے، وہ اس طرح کہ اصلاح، حکمران اقلیت کے ایما کے عین مطابق تھی۔ اوسط ذہن کامیاب ہو چکا ہے۔ ہر جگہ ذہانت، جمہوریت سے پناہ مانگ رہی ہے۔ احمق لوگ، انسانیت کے گھوڑے پر سواری کر رہے ہیں۔

ہاں یہ ایک جانبدار نظریہ ہے، یہ ایک مکمل تجزیہ نہیں ہے۔ جمہوریت کی خوبیاں اکثر بار مدح و ستائش کا خراج حاصل کر چکی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت کا اقلیتوں پر ستم، اقلیتوں کے اکثریت پر ظلم سے بہتر ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی جمہوری بے بسی، قابلیت کی اس موت سے بہتر ہے جو دور رئیسیت میں خاندانی اقتدار کے تشدد سے ظہور میں آتی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جمہوریت نے عام انسان کی خودداری میں اضافہ کیا ہے، جس طرح کہ اس نے غیر معمولی ذہن کو کچل کے رکھ دیا ہے۔ آج رائے دہندہ کو وہ آزادی حاصل ہے کہ اس میں کسی قدر جرات اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم میں سے کسی کو اب غلامی کا شعور نہیں ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ اس ملک کا صدر بن سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اشکال حکومت، جمہوریت سے بدتر ہوں، لیکن ہم جتنا زیادہ تجزیہ کرتے ہیں، اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس شکل حکومت میں کم سے کم اہلیت اور خلوص ہے۔ چونکہ سیاسی طاقت بے معنی ہے، جب تک کہ اقتصادی اور فوجی طاقت اس کی پشت پناہی نہ کرے۔ ہمہ گیر حق رائے دہی محض ایک قیمتی نمائش ہے۔ آمریت میں ایک خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ زیادہ دیانتدار ہے۔ نپولین نے کہا تھا کہ "طاقت مطلق کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ عمل کرتی ہے اور زبان بند رکھتی ہے"۔ تعلیم کے بغیر جمہوریت حدود کے بغیر منافقت ہے۔ اس کا مطلب انتظامی صلاحیت کا سیاست میں انحطاط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی حاکم طبقہ کے علاوہ خاصے خرچ پر سیاست دانوں کے طبقہ کو قائم رکھا جائے، جو حکام کی مدد کرتے ہیں اور محکوموں کو فریب دیتے ہیں۔

آخری سبب غنڈوں کی حکومت ہے۔ ہمارے بڑے شہروں میں مجرم آزادی اور مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ قانون ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی طاقتور گروہ سے وابستہ ہیں تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ کوئی جرم کریں گے تو انہیں گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اگر گرفتار ہو گئے تو انہیں عدالت سزا نہیں دے گی۔ اگر سزا مل گئی تو انہیں قید خانہ میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اگر بھیجا بھی گیا تو انہیں وہاں سے فرار کی اجازت ہوگی۔ اگر اپنے پیشہ کے عمل میں وہ قتل

کردیئے جائیں تو انہیں تزک و احتشام سے دفن کیا جائے گا۔ یہ ہے جمہوریت کا انجام!

اگر ہم اس بدی کو برداشت کرتے رہیں گے تو ہم پرلے درجہ کے بزدل ہوں گے۔ اگر ہم جمہوریت کی ترمیم نہیں کر سکتے اور اسے اس کے معائب سے پاک نہیں کر سکتے تو ہمیں چاہیے کہ اپنا آئینی نظام کسی چھوٹی قوم کے سپرد کر دیں اور کسی بادشاہ کو در آمد کر لیں۔

۴۔ عطائی نسخہ

آخر ہم کیا کریں؟

مصلح کو بھی یہ جاننا پڑے گا کہ بہت کم اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور اس میں بھی خاصی دیر لگ جائے گی۔ بہترین منصوبہ کا مطلب یہ ہو گا کہ تعلیم، ایجاد اور سائنسی تحقیق سے ذہن کی تربیت کی جائے، تعداد کم کی جائے، جسم کو میکانکی طاقت سے گراں تر بنایا جائے، پرولتاریت کو ختم کیا جائے اور انسانیت کو عہد نو، کے لیے آزاد کیا جائے۔ درحقیقت تعلیم کے علاوہ ان مسائل کا اور کوئی حل نہیں ہے۔ جب تک لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے، شہروں میں برائی ختم نہیں ہو گی۔ لیکن اگر لوگوں نے یہ سب کچھ افلاطون کے لیے نہیں کیا، تو ہمارے لیے کیوں کریں گے۔ اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شرح پیدائش تعلیم کے ساتھ کیا کیا فریب کھیلتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کو یکجا کیا جائے۔ یہ لوگ ہر شعبہ سے منتخب کیے جائیں تاکہ وہ ہمارے آئینی نظام کو دوبارہ زندہ کریں۔ کانگرس اور ریاستوں میں نئی ترمیمیں تجویز کریں اور ان ترمیموں کی اپنے پیشہ کے اقتدار اور دولت مندوں کی دولت سے پشت پناہی کریں۔

تیسرا بہترین منصوبہ یہ ہے:

جدید جمہوریت کے معائب کی وجہ ہمارے سیاستدان ہیں۔ آیئے ہم سیاست دانوں، اور نامزدگی کے اصول کو ختم کر دیں۔

ابتدا میں ہر شخص اپنا طبیب خود تھا اور ہر گھر میں اپنی ضرورت کی دوائیں موجود ہوتی تھیں۔ لیکن جوں جوں طبی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا، ایک عام انسان کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ تمام فہرست ادویہ کو حفظ کر لے۔ لوگوں کا ایک خاص گروہ اٹھا اور انہوں نے اپنا وقت طب کے مطالعہ پر صرف کیا اور ماہر طبیب وجود میں آئے۔ لوگوں کو عطائیوں سے محفوظ کرنے کے لیے طب کے ماہرین کو اعلیٰ خطاب اور سندیں دی گئیں۔ اب حالات یہ ہیں کہ جب تک کسی نے یہ سند حاصل نہ کی ہو، قانون اسے طبابت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم اب عطائیوں کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہمارے امراض کا علاج کریں یا ہماری زندگی کو خطرہ میں ڈالیں۔ ہم معالج سے یہ توقع

رکھتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کا قیمتی حصہ طب کے مطالعہ پر قربان کر چکا ہو گا۔

لیکن جو لوگ، ہمارے اجتماعی امراض کا علاج کرتے ہیں اور کروڑوں جانوں کو جنگ اور امن میں خطرہ میں ڈالتے ہیں اور جن کے اختیار میں ہماری جائیداد اور ہماری آزادی ہے، انہیں کسی مہارت یا مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ یہ کافی ہے کہ وہ صدر کے دوست ہوں، جماعت کے وفادار ہوں، خوبرو اور خوش اخلاق ہوں، گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوں، کندھوں پر ہاتھ مارتے ہوں، بچوں کو چومتے ہوں اور خاموشی سے احکام کی بجا آوری کرتے ہوں اور موسمی پیانہ کی طرح خوش آئند وعدوں سے معمور ہوں۔ اور چاہے وہ کچھ ہوں، قصاب یا حجام، دیہاتی، وکیل یا اخبار نویس، سور کے گوشت کو ڈبوں میں بند کرنے یا شراب بیچنے والے، اس سے ہمیں غرض نہیں۔

آیئے، اب ہم ایک خوشگوار نقشہ تیار کریں۔ فرض کرلیں کہ ہمارے بڑے جامعے، سیاسی نظم و نسق کا ایک شعبہ کھول دیتے ہیں۔ ایک شعبہ، جو نظریات تک محدود نہیں، بلکہ سیاسی عمل اور عملی تفاصیل سے متعلق ہے۔ وہ شعبہ نہیں جو تاریخ سیاست، یا فلسفہ ریاست یا ملوکیت، رئیسیت، جمہوریت، اشتراکیت یا ذاتیت پر بحث و تمحیص یا ان کا موازنہ کرتا ہو، بلکہ وہ شعبہ، جو اپنے طلبا کے ساتھ شہری نظام کو عمل میں دیکھنے جائے۔ وہ شعبہ، جو شہری مسائل کو ایک سیاسی مقرر، یا ایک وفادار ہاتھی یا گدھے کی طرح نہ دیکھے، بلکہ ایک سائنس دان کی طرح یا اس منتظم کی طرح دیکھے جس کی تربیت اور اہلیت اسے فن تنظیم سے آگاہ رکھتی ہے۔ اگر اس قسم کا نصاب اسی باقاعدگی اور تکمیل سے بنایا جائے، جس طرح کہ طبی اداروں کے نصاب مکمل ہوتے ہیں تو یقیناً سنجیدہ مزاج لوگ اس کی طرف کھنچیں گے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کو میدان سے بھگا دے گا جو اب محض خودنمائی اور تقریروں کے ذریعہ طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ابتدا میں اس نصاب کے لیے فقط چند لوگ ہوں گے، کیونکہ انہیں اس نصاب کی تکمیل کے بعد کوئی سیاسی عہدہ حاصل کرنے کا یقین نہیں ہو گا، لیکن شہری منتظمین کے منصوبہ کی تبلیغ سے راہیں نکلیں گی۔ یہ مدرسے طبی مدرسوں کی طرح تعداد میں بڑھیں گے اور کامیاب شہری منتظمین کو یہ دعوت دی جائے گی کہ وہ معلمین کی قیادت سنبھالیں۔

یہ سب کچھ ممکن ہے۔ اب بھی ہمارے بڑے جامعوں میں اس قسم کے نصاب موجود ہیں جو ان انتظامی مدرسوں کی سنگ بنیاد بن سکتے ہیں۔ لیکن جمہوریت کی ترمیم میں دوسرا قدم زیادہ تخیلی قوت کا طالب ہے۔ فرض کیجئے کہ جہاں یہ مدرسے انسانوں کو حکومت کے لیے آراستہ کر رہے ہیں، بعض دوسرے ادارے تحریر و تقریر سے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے آقاؤں سے علم و فضل طلب کریں اور انہیں ان کی صلاحیت کے مطابق مشاہرہ دیں۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس

خیال پر متفق ہو جائیں کہ کوئی سیاسی جماعت کسی ایسے شخص کو نامزد نہ کرے، جو انتظامی تربیت سے معرا ہو۔ یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ نامزدگی کا اصول بالکل ختم ہو جائے اور تربیت یافتہ منتظمین اپنے آپ کو انتخاب کے لیے پیش کریں۔ لوگوں کا انتخاب صرف انہیں لوگوں تک محدود ہو اور اس طبقہ کے اندر غیر محدود۔ یہ انتخاب آج کل کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہوگا اور منتخب لوگ یقیناً اپنے عہدہ کے اہل ہوں گے۔ یہ صحیح معنوں میں جمہوریت ہوگی اور اسی قسم کی جمہوریت اس حقیقت پسند دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔

کیا اس قسم کی ترمیم سے جمہوریت کی روح مٹ جائے گی؟ نہیں جمہوریت کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ ہر بالغ اپنے بڑے افسروں کے انتخاب میں شریک ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بالغ سیاسی عہدوں کا متمنی اور اہل ہو۔ پیدائش، عمر اور رہائش کی پابندیاں اب بھی ہیں۔ ان کے ساتھ خاص تعلیم کی پابندی، حکومت کی پیچیدگی کے نقطۂ نظر سے لازمی ہے۔ یہ تجویز نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کر کے جمہوریت کی توسیع کرے گی اور ان پر چند خصوصیات کی شرط لگا کر جمہوریت کو محدود بنا دے گی۔ ہمارا موجودہ نظام غیر جمہوری ہے کیونکہ وہ دو امیدواروں میں سے انتخاب پر مبنی ہے اور یہ بات بنیادی جمہوریت کے اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ یہ تعلیم اور اقتصادی مواقع کی مساوات کو نظر انداز کرتی ہے۔ اگر ہر تعلیم یافتہ شخص کو، جو ایک خاص معیار کمال حاصل کر چکا ہو، مدرسے، کالج اور یونیورسٹی میں ریاست کی طرف سے وظیفہ ملا کرے، تو ہر شخص کے لیے اعلیٰ عہدوں کی راہ کھلی ہو۔ مواقع کی مساوات، جمہوریت کی جان ہے۔ ہم نے جمہوریت کے ڈھانچہ کو اپنا لیا ہے، لیکن اس کی روح سے محروم ہیں۔ ہمیں ہر جگہ قابلیت کے لیے تمام راہیں کھول دینی چاہئیں اور اشکال حکومت کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔

یقیناً اس نسخہ میں خامیاں ہیں، جنہیں ہمیں نصب العین کے نہیں بلکہ موجودہ حالات کے مقابلہ میں رکھنا ہے۔ ہوٹلوں اور شراب خانوں کی جگہ یونیورسٹیوں کو ذریعہ نامزدگی بنا کر ہم نے یہ فراموش نہیں کیا کہ یونیورسٹیوں میں بھی ریشہ دوانیاں ہو سکتی ہیں اور گریجویٹوں کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ درجات کا ہے۔ غالباً ایک شخص جسے سائنسی تربیت حاصل ہو یا وہ شخص جو ایک ایسا نصاب چنتا ہے جس کے لیے اسے طویل مدت تک محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے، اپنی خودداری اور دیانت کا زیادہ پاس رکھے گا۔ سیاست دانوں کے مقابلے میں سائنس دانوں کا اخلاق زیادہ اچھا ہوتا ہے اور اگرچہ شعبہ طب میں بھی چور اور عطائی ہوتے ہیں، یہ ان چند شعبوں میں سے ایک ہے، جن میں "دیانت" آمدنی پر اثرانداز ہو سکتی ہے۔

جہاں تک یونیورسٹیوں کا تعلق ہے، سوال یہ نہیں کہ وہ جدت پسندی یا قدامت پرستی کی

تعلیم دیں گی یا نہیں؟ علم انصرام کو ان بلند بانگ تقسیموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یقیناً طاقت اس وقت بھی اسی زور کے ساتھ حکومت کرے گی لیکن اس کا انداز حکومت بہتر ہوگا، جس میں حماقت، بدمعاشی اور بے حرمتی کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ ہم یہاں اجتماعی مسئلہ کا کوئی حل پیش نہیں کر رہے جس کی بدولت کمزور، طاقتوروں پر حکومت کرنے لگیں گے۔ غالباً ایک ہوشیار اقلیت، ایک کم ہوشیار اکثریت پر حکومت کرتی رہے گی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں جس کے ذریعہ جمہوریت، قدرت کے اس غیر منصفانہ فرمان کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ہمارا مقصد جنت کی تخلیق نہیں، ہم تو صرف اس کے خواہش مند ہیں کہ جو حکومت بھی ہو اسے انسانی شخصیت کی حدود کے مطابق بہتر اور قابل تر بنایا جائے۔ یہ سیاست کا مسئلہ ہے اور یہاں ہم اسی سے دوچار ہیں۔

آج کل ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بداخلاقی اور جہالت منتخب لوگوں کے فطری حقوق ہیں۔ ہم اس روایت کو بدلنے کی ہر تجویز کو مضحکہ خیز سمجھتے ہیں لیکن حکومت ہمیشہ نااہل نہیں رہی۔ انگریز اب بھی اپنے سیاست دانوں کو تربیت دینے اور منصفوں میں انصاف پسندی پیدا کرنے کے لیے مشہور ہیں اور جرمن حکام شہر اپنے شہروں کو دنیا کے بہترین مقام بنا دیتے ہیں۔ کوئی چیز ناممکن نہیں، ہم صرف یہ سوچنے کے عادی ہوگئے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔

ہم نے جو کچھ تجویز کیا ہے، یہ ایک پرانا خیال ہے۔ یہ سقراط، افلاطون، بیکن، کارلائل، والٹیئر اور رینان کا خواب تھا۔ غالباً اس کی خواب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، یا غالباً جب ہم سب خواب و خیال ہو جائیں تو یہی حقیقت بن جائے۔ ایک طویل مدت تک اس کی حقیقت فقط خواب ہی کی رہے گی۔ تعلیم و تربیت کے کئی عہدوں کے بعد لوگوں کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے قابل لوگوں کو سیاسی عہدوں پر مامور کرنے کی پوری کوشش نہ کی اور جمہوریت کی علم دشمنی کو ختم کرنے کی طرف توجہ نہ کی اور ان صلاحیتوں کو، جو آج جلب منفعت میں مصروف ہیں، اجتماعی بہبود پر مامور نہ کیا اور اپنے دفتروں، سیاسی عہدوں، آئین ساز مجلسوں میں ان لوگوں کو لانے کے منصوبے نہ بنائے، جو کم سے کم اتنی انتظامی تربیت حاصل کر چکے ہوں، جتنی کہ ہم غیر اہم پیشوں کے لیے حاصل کرتے ہیں تو جمہوریت یقیناً ناکام ہے۔ اور یہ دنیا کے لیے بہتر ہوتا اگر امریکہ نے لوگوں کی امیدوں کو ابھارا نہ ہوتا۔

* * *

باب نوزدہم

رئیسیت (۱)

۱۔ رئیسیت کا احیا

۱۷۷۶ء اور ۱۷۸۹ء میں یورپ میں جو واقعات پیش آئے، انہیں رئیسیت کے موضوع پر عوام کا آخری فیصلہ سمجھنا چاہیے۔ جارج سوم کے ہوش و حواس اور لوئی ششم کے سر کے ساتھ دنیا سے رئیسیت کا خاتمہ ہو گیا اور آج لوگوں کے دلوں میں اس کا کوئی احترام باقی نہیں۔ رئیسیت کے سارے ظاہری شان و شکوہ اور جلال کے باوجود دنیا اب جمہوریت کی طرف مائل ہے۔ اس لیے رئیسیت کے موضوع پر از سرِ نو غور کرنے کا نہ کوئی محل ہے اور نہ مجاز۔ یقیناً اس قسم کی ہر تجویز روحِ عصر کے خلاف سمجھی جائے گی۔ پھر بھی ہم اس موضوع پر جو کچھ کہیں گے، وہ اس خیال سے نہیں کہ اس سے حالات میں کوئی تبدیلی پیدا ہونے کی توقع ہے۔ ہمارے لیے تو یہی کافی ہے کہ ذہن کی بین الاقوامی قلمرو میں ہم ان دیکھے دوستوں سے تبادلہ خیال کریں اور پھر امریکہ میں جو دنیا کے اور ملکوں سے کہیں زیادہ، جمہوریت سے واقف ہے، غالباً جمہوریت کی اس فطری آماجگاہ میں ہم چند ایسے مفروضوں کو اپنا سکتے ہیں، جو صحتِ فکر کی راہیں کھول دیں۔

ان مفروضوں کو اس طرح تحلیل کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم امریکہ میں، جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ یعنی اس نے ہمیں نہ عوامی حکومت دی ہے نہ برگزیدہ لوگوں کی حکومت۔ اگر کسی سادہ دل ناظر کا یہ خیال ہے کہ امریکہ کے لوگ اپنے ملک پر حکمران ہیں اور جنگ یا امن، اقتصادی پالیسی یا ٹیکس یا عہدوں کی نامزدگی میں ان کا کوئی ہاتھ ہے تو اس کے لیے یہ بہتر ہو گا کہ وہ ان صفحات کا

---

(۱) ARISTOCRACY کے لیے اردو میں اشرافیت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن میں نے رئیسیت کے لفظ کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ مجھے ARISTOCRACY سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

مطالعہ نہ کرے اور اگر کچھ ناظریہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت نے ہمیں بہترین یا عقلمند ترین لوگوں کی حکومت عطا کی ہے تو وہ بھی ان صفحات کو نہ پڑھیں۔

لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت ناکام رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اسے قطعی حقارت کی نظر سے دیکھ کر مسترد کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ بلاشبہ اس میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں مضمر ہیں۔ یقیناً عوامی حکومت نے لوگوں کو حکومت کرنے کے ان طریقوں کے مقابلے میں کہیں کم نقصان پہنچایا ہے، جس کی جگہ اس نے لی ہے۔ اوسط قسم کے لوگوں کے ماتحت زندگی بسر کرنا، بادشاہوں کا ہدف ستم بننے سے کہیں بہتر ہے۔ غالباً جمہوریت کی ناگزیر ناکامی اس کی اساس میں اس حد تک مضمر نہیں تھی، جتنی اس کی ہیئت اور ساخت میں۔ جمہوریت نے اگر قدیم رئیسی نظام کے کچھ پہلو اپنا لیے ہوتے تو شاید یہ ایک ایسا سیاسی نظام تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی، جو اس نظام سے بہت بہتر ہوتا، جس میں ہم اب زندگی بسر کرتے اور احمقوں کو برداشت کرتے ہیں۔

یہ ایک ایسا امکان ہے، جس کی کھوج کرنے میں شاید کوئی حرج نہ ہو۔ آخر وہ رئیسیت کیا تھی، جو اعلیٰ ارباب سیاست کی تربیت کرتی تھی، فن کو جلا دیتی تھی اور ان لوگوں کی تخلیق کرتی تھی، جنہیں عزت زندگی کے مقابلے میں زیادہ عزیز تھی۔ کیا اس میں ایسی صفات ہیں، حکمت جن کی آبیاری کرنا پسند کرے گی۔ کیا اس کے محاسن کو جمہوریت کی خوبیوں میں ملا کر دونوں کے معائب دور کیے جا سکتے ہیں؟ اور کیا اس سے کسی اچھے نتیجے کی توقع ہو سکتی ہے؟ کیا رائے عامہ کے ذریعہ حکومت کے اعلیٰ افسروں کا تقرر کرنے کے بجائے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں اور بہترین اخلاق کے لوگ خود بخود ان کی طرف متوجہ ہوں۔

۲۔ طرزہائے حکومت

یہ بات ماننی پڑے گی کہ رئیسیت اپنی شکست کے ایام میں بھی فلسفیوں میں مقبول رہی ہے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، سسرو، موفسکو، والٹیر، ڈی ٹوکول، ٹین، رینان، اناطول فرانس، گوئٹے، نیطشے، برک، میکالے، کارلائل، ایمرسن ستیانا اس بات سے واقف تھے کہ ایتھنز، روما، پیرس یا واشنگٹن میں جمہوریت کا کیا رنگ رہا تھا۔ اس کے باوجود ان سب نے اتفاق رائے (صرف سپنوزا ایک استثناء تھا) خدائے قدوس سے یہ دعا مانگی کہ ہمیں بہترین لوگوں کی حکومت عطا کر! آخر رئیسیت میں وہ کیا بات تھی جو ان لوگوں کو پسند آئی؟

فلسفیوں میں سب سے زیادہ حقیقت پسند فلسفی بوناپارٹ نے ایک جگہ کہا ہے کہ ”قوموں

اور انقلاب کے زمانوں میں رئیست ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اگر جاگیرداروں اور نوابوں کو ختم کرکے اسے مٹانا چاہو، تو یہ متوسط طبقہ کے امراء میں منتقل ہو جاتی ہے اور اگر اسے وہاں سے بھی مٹا دو تو یہ مزدوروں اور عوام کے قائدین کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے"۔ فٹز جیمز سٹیفن نے کہا ہے! تم قانون خواہ کسی طرح بناؤ، تم عوام کی رائے دہندگی کو موزوں سمجھتے ہو تو اسے بھی اختیار کر لو۔ لیکن ہر صورت میں تم مساوات سے دور رہو گے۔ اس لیے کہ سیاسی طاقت فقط شکل بدلتی ہے، اپنی فطرت نہیں بدلتی۔ حکومت کو چھوٹے چھوٹے ذروں میں کاٹنے کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ ذروں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے، وہی حکومت کرے۔ حکومت ہمیشہ طاقتور کے ہاتھ میں رہے گی۔ اگر حکومت کی نوعیت فوجی ہے تو اچھا سپاہی حاکم بن جائے گا۔ اگر حکومت ملوکیت ہے تو وہ صفات جو بادشاہ اپنے مشیروں، سپہ سالاروں اور منتظموں میں پسند کرتے ہیں، طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ خالص جمہوریت میں وہ لوگ حاکم ہوں گے جو ریشہ دوانیاں کرتے ہیں"۔ یہ ایک مختصر تجزیہ ہے، جس میں تفصیلات کو نظر انداز کیا گیا ہے لیکن ایک اساسی بیان کی حیثیت سے کافی ہے۔

درحقیقت حکومت کی صرف دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک انسان کی حکومت اور چند انسانوں کی حکومت۔ اکثریت کی حکومت ایک عبوری دور میں آتی ہے اور اکثر و بیشتر ایک مفید فریب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقلیتیں تنظیم کر سکتی ہیں۔ اکثریتیں نہیں کر سکتیں۔ حکومت رئیست یا ملوکیت ہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نظریاتی طور پر، ملوکیت کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ نپولین کی اعلیٰ منتظمانہ اہلیت کے ماتحت ہر چیز (سوائے آزادی کے) مرکوز رہتی ہے اور کامیاب رہتی ہے۔ لیکن جدید تاریخ میں ملوکیت نادر ہے۔ ایوان، پیٹر، فریڈرک، لوئی چہاردہم اور بوناپارٹ صحیح معنوں میں بادشاہ تھے لیکن اکثر و بیشتر بادشاہ کسی خاص طبقہ کی حکومت میں محض ایک قیمتی نمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً آخری زار اور قیصر، محض امیر طبقہ کے نمائندے تھے۔ کیا (امریکی انتخابات کو چھوڑ کر) دنیا میں انگلستان کے بادشاہ کے محل کے سامنے سپاہیوں کی آمد و رفت سے زیادہ مضحکہ خیز چیز کوئی اور بھی ہے؟

ہم یہاں اس عام عذر یا تاویل سے متاثر نہیں ہوں گے کہ برطانوی ملوکیت سلطنت کو یکجا رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ سے محبت کرتے ہیں، لیکن جو چیز نو آبادیوں کو یکجا کرتی ہے، وہ لوگوں کے جذبات نہیں، بلکہ تحفظ اور تجارت کی ضروریات ہیں۔ یہ محض روایت ہے جو ان بادشاہوں کو اپنے تختوں پر متمکن رکھتی ہے۔ فرانس ٹامپسن نے کہا ہے "یورپ کے تمام ممالک

میں 'سوائے دو کے 'ملوکیت محض ایک بے سود علامت ہے''۔

ہم یہ اصول تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ہر حکومت کے پس پردہ ایک طاقتور طبقہ کارفرما ہوتا ہے اور سیاسی تجزیہ کا پہلا اصول ہے ''طاقتور کو تلاش کرو''۔ یہ طبقہ عسکری، تجارتی یا رئیسی کسی نوعیت کا ہو سکتا ہے، یعنی حاکم اقلیت سپاہیوں کی ہو سکتی ہے جو سپہ سالاروں کو تخت پر بٹھاتی ہے، یا امیر تجارتی طبقہ جو صدروں اور بادشاہوں کے ذریعہ حکومت کرتا ہے یا قدیم خاندانوں کے اراکین جو زمینوں کے مالک ہونے کی حیثیت سے قیادت اور اقتدار کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے رئیس اس طرح استدلال کرتا ہے کہ رئیسیت کا بدل زردار یا تشدد کی حکومت ہے۔ رومی رئیسیت کے انحطاط سے جنگجو بادشاہ برسراقتدار آ گئے۔ فرانس اور انگلستان کی رئیسیت کے انتشار کے بعد وہاں پونڈ، ڈالر اور فرینک کی حکومت قائم ہوگئی۔ جمہوریت ایک عسکری حکومت کی مدافعت کر سکتی ہے لیکن کسی انتخابی نظام دولت کو طاقت حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ فوجی حکومت کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ حکومت ان خاندانوں تک محدود کر دی جائے، جن میں حکومت کرنے کی صفات اور روایات موجود ہیں۔ فقط ایک رئیسیت ہی نئے دولت مند طبقہ کے اقتدار کا توڑ ہے۔ صرف یہی طبقہ ہے، جو ایک قوم کے اخلاقی اور ثقافتی اقدار کو سٹہ بازی، منڈی اور کارخانوں کے معیاروں اور آدرشوں کا محکوم بننے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

۳۔ سیاست دانی

یہ سب باتیں ناپسندیدہ نہ سہی لیکن مشتبہ ضرور ہیں۔ رئیسیت کی حمایت میں پہلے ہی یہ کہنا کہ یہ وراثتی حکومت ہے، اس کے خلاف جاتا ہے۔ لیکن آیئے ہم رئیسیت کے علمبردار کی باتیں کسی روک ٹوک کے بغیر سنتے جائیں۔ اس کی جانبداری کو نظرانداز کر دیں، اس سے اختلاف کرتے ہوئے بھی اس سے کچھ سیکھیں۔

رئیسیت کا علمبردار اہلیت کی وراثت کو ایک اچھی حکومت کے لیے لازمی سمجھتا ہے۔ کوئی شخص پوری طرح سیاست کا اہل نہیں ہوتا، جب تک وہ اس فضا میں رچی ہوئی نہ ہو، جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ بقول نیطشے ''اسے فقط ذہن کی نہیں، بلکہ خون کی ضرورت ہے'' اور یہی چیز نپولین میں نہیں تھی۔ وہ ایک صوبائی جرنیل کا بیٹا تھا اور باوجود کوشش کے وہ ایک اصلی رئیس کا سا توازن اور تدبر حاصل نہ کر سکا۔

پھر نیطشے کے خیال کی رو سے قیادت کے لیے ''عظیم رئیس خاندانوں کی ضرورت ہے، جن میں حکومت اور نظم و نسق کی روایات رس بس گئی ہوں۔ پرانے خاندان کئی نسلوں تک صحیح

عزم اور صحیح رجحانات کے ضامن ہوتے ہیں"۔ اس لیے رئیس "پیدائش کے اتفاق" کے تصور کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ پیدائش کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں، بلکہ ایک اصول ثانیہ ہے۔ یہ صدیوں کی ترقی کا نتیجہ اور مستقبل کی استعداد اور قابلیت کی ضمانت ہے۔ ہم حیوانوں کی نسل کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ ہم فقط ان کے ماں باپ کا نہیں، بلکہ کئی کئی نسلوں کا پتا لگاتے ہیں۔ رئیسیت کا علمبردار اسی طرح انسانوں کی نسل کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہ اسی طرح وراثت کو اہم سمجھتا ہے، جس طرح جمہوریت پسند مواقع کو، یا اشتراکی ماحول کو اہم جانتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے رتبہ سے کم لوگوں میں شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ دوسری نسل سے ایک دوسری جنس کی طرح متنفر ہوتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر یا جماعتی روایات کے اثر سے یہ جانتا ہے کہ نسلوں کے اختلاط سے شخصیت کمزور ہو جاتی ہے، چاہے بعد میں وہ بتدریج ایک نئ اور بہتر نسل کا باعث بن جائے۔

لیکن اعلیٰ مناصب کے لیے اہلیت کی وراثت اچھے حکام کی تخلیق کے لیے لازمی ہے۔ چند لوگوں کو پیدائش ہی سے الگ کر دیا جائے تاکہ انہیں ذہن اور شخصیت کی نشوونما کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ زندگی، دولت اور تہذیب، دونوں کے حصول کے لیے بہت مختصر ہے۔ زندگی میں ان میں سے صرف ایک ہی چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ انسانیت کا فائدہ اسی میں ہے کہ چند لوگوں کو انفرادی اقتصادی کشمکش سے محفوظ رکھا جائے۔ "مزدوری کے بغیر زندگی بسر کرنے کا امکان ذہنی ترقی کے لیے لازمی ہے" رئیسیت اسی لیے سیاستدانوں کی تربیت کے لیے بہترین مدرسہ ہے۔

جمہوریت پرست یہ نہیں سمجھتا کہ اہل سیاست کی تربیت کے لیے ایک معمولی ہنرمند کی تعلیم سے زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ حالیہ تبدیلیوں سے پہلے انگلستان کے قائد، پہلے گھروں میں پھر ایٹن اور ہیرو میں اور پھر آکسفورڈ اور کیمبرج میں اور پھر معمولی عہدوں کے محنت طلب فرائض میں اعلیٰ عہدوں کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ انگریزی تہذیب کا، اس کے جذبہ حریت کے بعد بہترین پہلو یہ ہے کہ اس کی یونیورسٹیاں تجارت اور سرمایہ سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر سلطنت کے حکام پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ ظالم حاکم تھے، لیکن لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی ستم گری ان کی حکومت کے لیے کس قدر لازمی تھی اور یہ وہی لوگ تھے، جنھوں نے ننھے انگلستان کو ساری دنیا سے زیادہ بلند کر دیا۔

جمہوریت میں لوگوں کو سیاست کے لیے تیار کرنا بے سود ہے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ رواج اور انتخابات کے امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اچھی تربیت انہیں شریف مفکر بنا دے گی۔ یعنی وہ ایسے لوگ بن جائیں گے، جو انتخاب کی ہماہمی اور شوروغوغا

سے اجتناب کرتے ہیں۔ سینٹ بیود نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جمہورت قابلیت کو گوشہ گیری اختیار کرنے پر مجبور کر دے گی۔ رینان نے پیش گوئی کی تھی کہ جمہوریت بدمعاشوں اور عطائیوں کو حکومت سپرد کر دے گی۔ ۱۸۳۰ء میں ڈی ٹوک ول نے امریکہ کے دوسرے سفر کے بعد لکھا تھا ”آج امریکہ میں قابل ترین لوگوں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیئے جاتے اور یہ ماننا پڑے گا کہ جمہوریت کی ترقی سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ امریکی سیاستدانوں کی نسل پچھلے پچاس برس میں نمایاں طور پر کمزور ہو گئی ہے“۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈی ٹوک ول مر چکا ہے اور آج ہمیں نہیں دیکھ رہا۔

۴۔ قدامت پسندی

رئیس کے لیے نظم و ضبط حکمت کی ابتدا ہے اور تبدیلی گناہ کا چکر۔ آزادی ایک قیمتی چیز ہے لیکن ضبط و نظم کے بغیر آزادی کیونکر ممکن ہے؟ اور اگرچہ رئیسیت، سیاسی آزادی پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس انفرادیت کشی سے بدتر ہے جو بے کیف اکثریت کے مجنونانہ دباؤ سے ظہور میں آتی ہے۔ ضبط و نظم کے ساتھ ایک قوم کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایک باقاعدہ پالیسی پر قائم رہے۔ رئیسیت کے ذریعہ سیاست انتخاب کے جوئے سے آزاد ہو جاتی ہے اور ان کاموں کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے، جن کی تکمیل کے لیے کئی نسلیں درکار ہیں۔ رومی سینیٹ یا الزبتھ کے عہد کی پارلیمنٹ کی طرح ایک رئیسی ادارہ ایک اجتماعی تسلسل یا بقا کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے مقاصد، افراد کی موت یا سیاسی مہموں کی منافقت سے فنا نہیں ہو جاتے۔ ڈی ٹوک ول کہتا ہے ”تقریباً وہ تمام قومیں جنہوں نے دنیا کی تقدیر کو عظیم منصوبوں کی تخلیق اور تشکیل سے متاثر کیا ہے، سب رئیسی اداروں کے ماتحت زندگی بسر کرتی رہی ہیں“۔

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی حکومت، تجربہ یا تبدیلی کے راستہ میں رکاوٹ ہے، لیکن یہ ہے بہت صحت مند، ایک آزاد خیال سیاست دان بھی، اگر وہ ماضی سے آگاہ ہے، یہ جانتا ہے کہ دس نئے خیالوں میں سے نو ضرور غلط ہوں گے۔ تاریخ کا تلخ ترین مذاق یہ ہے کہ اکثر وہ عقائد، جن کے لیے لوگوں نے جانیں دی ہیں، بعد میں مضحکہ خیز ثابت ہوئے ہیں۔ تغیر کو روکنا برا، لیکن لازمی ہے۔

ہم یہاں سائنس اور ادب کی مثال سے فریب کھا جاتے ہیں۔ چونکہ تجربہ ان کی جان ہے، ہم اس نتیجہ پر جا پہنچتے ہیں کہ بہترین حکومت وہ ہے جو تغیر کی راہیں کھلی رکھتی ہے۔ لیکن سماج کوئی معمل نہیں اور انسان (سوائے میدان جنگ کے) اپنے آپ کو چیر پھاڑ کے لیے پیش نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ سائنس میں بھی ہمارا تجربہ بے بس حیوانوں یا بے جان چیزوں تک محدود رہتا ہے۔ لیکن جب سائنس کے انکشافات کے انسانوں پر اطلاق کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہم قدامت پسندوں کی طرح

محتاط ہو جاتے ہیں۔ ہم سیاسیات میں نہیں بلکہ غذا اور ادویہ کے معاملہ میں تغیر کی مدافعت کرتے ہیں۔ خیالات سے کھیلنا اور زندگیوں پر تجربہ کرنا برابر نہیں۔

لیکن جہاں کروڑوں زندگیوں کا سوال ہو، تغیر کی مدافعت ضروری ہے۔ بڑے اجسام آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں۔ ان میں بے نظمی پھیلانا، صحت اور تنظیم بحال کرنے سے آسان ہے۔

طب کی طرح سیاست میں ایک مرض کا علاج ایک اور غیر متوقع مرض پیدا کر دیتا ہے۔ سماج کا تانا بانا ہمارے اجسام اور اذہان سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ کیونکہ یہ کروڑوں رشتوں اور رابطوں پر مشتمل ہے۔ اگر انہیں الگ چھوڑ دیا جائے تو یہ باہمی رشتے کوئی سازگار صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جب منتخب حکمت یا مجتمع عامیت ان اہم رابطوں کو قانون کی مصنوعی باقاعدگی میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو نتیجہ وہی ہوتا ہے، جو چلتے وقت ٹانگوں کا تجزیہ کرنے سے ہوتا ہے۔

اگر سماج ریاضی، علم الاشکال یا کسی اور علم کی طرح جو زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، کوئی منطقی نظام ہوتا تو صورت بالکل مختلف ہوتی۔ لیکن سماج ہماری شخصیت کی طرح ایک سلسلہ نشوونما ہے، کوئی اصول یا قیاس نہیں۔ ٹین نے کہا تھا کہ سماج کو کسی آئینی مفکر نے کسی گہرے اصول کے مطابق منظم نہیں کیا بلکہ اسے کئی نسلوں نے ضروریات زمانہ کے مطابق ڈھالا ہے۔ یہ منطق کی نہیں، تاریخ کی تخلیق ہے اور نیا مفکر جب اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی بے ربط اساس، الجھی ہوئی عمارت اور مرمت کے واضح نشان دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ ہر بچہ کو اس تردید کا علم ہے جو برک نے روسو کے خیال کی، کی تھی کہ "سماج ہم عصروں کے درمیان معاہدہ سے نہیں بنا بلکہ یہ ایک غیر شعوری اور تدریجی عمل ہے اور اس میں اگر کوئی میثاق ہے تو وہ فقط ماضی، حال اور مستقبل کا باہمی میثاق ہے"۔ ماضی سے قطع تعلق کرنے سے وہ عدم تسلسل پیدا ہوتا ہے، جو جنون پیدا کرتا ہے اور وہ اجتماعی نسیان جو صدموں اور حادثوں سے پیدا ہوتا ہے، فرد کی ذہنی صحت اس کے حافظہ کی بقا پر مبنی ہے اور سماج کی ذہنی صحت اس کی روایات کی بقا پر دونوں حالتوں میں تسلسل کی شکست سے نیوراتی عمل پیدا ہوتا ہے، جو زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ پیٹر نے جب روس کو ایک ہی نسل میں مغرب زدہ بنانا چاہا تو یہی نتیجہ نکلا اور جب لینن نے اسے ایک ہی نسل میں اشتراکی بنانا چاہا، تب بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا۔

۵۔ حکومت اور تہذیب

اخلاق اور تہذیب کے مسائل پر غور کیجیے۔ جمہوریت نے لوگوں کے دلوں میں ایک خوف پیدا کر دیا ہے، جسے ضمیر کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا اس نے وہ آرزوئے احسن بھی پیدا کی ہے، جو

رئیس میں جذبہ خودداری کی تخلیق کرتی ہے؟ کیا ایک رئیس، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، کبھی لوگوں کو یہ حکم دے گا کہ انہیں شراب نہیں پینی چاہیے؟ کیا رئیسیت میں آج کل کی سی بازاری موسیقی یا رقص پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی رئیس منافق بھی ہو سکتا ہے جو عوام کی خوشامد کر کے انہیں اپنا گرویدہ بنائے؟ کیا جمہوری گروہوں میں ایک سوقیانہ انداز فکر و عمل نہیں ہوتا جو رئیسیت کے سایہ عاطفت میں کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا؟

پروفیسر روس کہتا ہے "امریکیوں میں تجارتی اقدار، رئیسیت کے زیر اثر نہیں رہتیں۔ پرانی دنیا میں حکمران طبقہ تاجر کے نقطۂ نظر سے نفرت کرتا نظر آتا ہے اور اس بات پر فخر کرتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو حظ اٹھانے کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ چونکہ یہ رئیسی نقطہ نظر عوام تک پہنچ جاتا ہے اس لیے یورپ میں کاروبار صرف کاروباری طبقہ تک محدود ہے"۔ غالباً یہ موازنہ اب صرف امریکہ کے خلاف نہیں جاتا۔ یورپ بھی جمہوریت کے شکنجہ میں ہے اور وہ بھی اپنا اخلاق ادنیٰ طبقوں سے حاصل کرتا ہے لیکن امریکہ میں تجارت کے قائدین نے ایسی روایات پیدا کر لی ہیں، جو رئیسیت کا شیریں ثمرہ ہوتی ہیں۔

جمہوریت پرست کے دل میں بھی رئیسیت کی مخصوص پسندیدہ صفات مثلاً چال ڈھال کی توانائی اور سہولت، ذوق کی نفاست، مذاق اور بیان کی احتیاط، فطری خودداری اور فیاضی کے لیے ایک رشک آمیز ستائش کے جذبات موجود ہوتے ہیں اور وہ ایک نجیب انسان کی خوش خلقی سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے "ہر انگریز نوابوں سے محبت کرتا ہے" اور بقول اناطول فرانس "جمہوریت پسند، نجابت سے زیادہ کسی چیز کا احترام نہیں کرتا"۔ جمہوریت میں اجتماعی کامیابی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے رئیسوں کے انداز اختیار کرنا۔ امریکہ میں ایک کامیاب مقرر بننے کے لیے فقط ایک ہی شرط ہے اور وہ ہے انگریزوں کا طرز گفتار اختیار کرنا۔

یہ بات قابل عفو اور فطری ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک نجیب شخص کی تعمیر میں کئی نسلیں صرف ہوتی ہیں۔ کوئی مفلس شخص جو بچپن ہی سے اقتصادی جنگ کی غلاظتوں میں مبتلا رہا ہو، شاید ہی ذہن و جسم کی وہ پاکیزگی اور نفاست، وہ باحیا خودداری اور متانت پیدا کر سکے، جو اس شخص میں موجود ہیں، جسے ابتداء ہی سے زندگی کی آسائشیں حاصل رہی ہیں۔ دنیا کو اب یہ طے کرنا ہے کہ دونوں میں سے کسے انتخاب اور اختیار کرے۔ اس نفاست طبع کو جو اوپر کے طبقہ سے بتدریج نچلے طبقہ کی طرف آتی ہے یا اس سوقیانہ مزاج کو جو نیچے سے اوپر کی طرف ابھرتا ہے۔

ان دونوں مزاجوں کا اختلاف، اس ادب سے واضح ہے جو ان دو طرح کی حکومتوں اور زندگی کے طریقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ استثناء کو چھوڑ کر، جو زندگی کے متعلق ہر کلیہ میں ہوتی ہے،

رئیسیت کا ادب کلاسیکی صورت اختیار کرتا ہے اور جمہوریت کا ادب رومانی صورت۔ کچھ عرصہ کے لیے سائنس اور اشتراکیت کے اثرات نے ہمیں "حقیقت پرستی" کا عہد عطا کیا جس میں ادب نے طبیعات کی معروضیت کا منہ چڑایا اور زندگی کے معائب اور ناانصافیوں کو بے نقاب کیا۔ لیکن درحقیقت ادب کی رقابت کلاسیکی ذہن اور رومانی تخیل کے تضاد میں اسی طرح نظر آئی جس طرح سیاست میں موروثی اور اکتسابی دولت کی رقابت نظر آتی ہے۔ ایک جمہوری عہد اپنے صنعتی اور تجارتی وجود کی بے کیفی کو رومانی ادب سے دور کرتا ہے۔ وہ اپنی دکانوں اور کارخانوں کی بے کیف زندگی سے مجنونانہ محبت کے افسانوں میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن رئیس اپنے جذبات کے بے قابو ہونے اور زبان کے بے لگام ہونے پر شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کا تخیل ہمیشہ عقل کے ماتحت رہتا ہے۔ ادب اور زندگی میں ضبط اس کی جان ہے۔ وہ کم گوئی سے کام لے سکتا ہے لیکن مبالغہ نہیں کرتا۔ وہ خاموشی سے بولتا ہے تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سن لیں۔ وہ مونتئین کے مضامین یا روح قوانین لکھ سکتا ہے لیکن ایمیل یا لے مذرابل کبھی نہیں لکھ سکتا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ادب کی تعمیر ہر طرح کی کتابوں اور دنیا کی تعمیر ہر طرح کے آدمیوں کے بغیر ناممکن ہے۔

عموماً رئیسیت فنون اور علوم کی حمایت کرتی ہے اور فیاضی سے غیر معمولی افراد کی سرپرستی کرتی ہے۔ ٹارڈ کہتا ہے کہ رئیسیت نئے خیالات کو اپنانے میں پہل کرتی ہے اور وہ خواہ کہیں جنم لیں، چند تعلیم یافتہ لوگوں میں سب سے پہلے پناہ حاصل کرتے ہیں، جن کے ذریعہ وہ ادنیٰ طبقہ تک پہنچتے ہیں۔ ستیانا کہتا ہے کہ "ابھی تک تہذیب ان خصائل کی تبلیغ اور عمومیت کا نام تھا، جو خاص خاص مرکزوں سے وابستہ رہے ہیں"۔ رینان کہتا ہے کہ "تمام تہذیب، رئیسیت کا کرشمہ ہے"۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ "جمہوریت میں سائنس روبہ انحطاط ہو جائے گی، جونہی عوام اس کے مفہوم سے واقف ہو گئے"۔ سمز کہتا ہے "جماعتیں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔ عوام روایات کو قائم رکھتے ہیں"۔ لے باں کہتا ہے "تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہم اپنی ترقی کے لیے چند مختص افراد کے رہین منت ہیں، ذہین مخترع تہذیب کی رفتار کو تیز کرتا ہے۔ دیوانے اور پاگل ہی تاریخ کی تخلیق کرتے ہیں"۔ یہ حقیقت ہے۔

۶- جمہوریت اور انتشار

عوام خود بھی رئیسیت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ سیاسیات اور افکار میں قدامت پرست ہوتے ہیں اور وہ اس حکومت کو اچھا سمجھتے ہیں جو آہستہ آہستہ اپنے استعماری مقاصد کی تکمیل کی کوشش کرتی ہے۔ وہ دباؤ کے زیر اثر انقلاب بپا کرتے ہیں لیکن وہ غیر منتخب قوت کے دائمی پرستار ہوتے

ہیں۔ اطالیہ کے لوگ اپنے آمر کا نام فخر و مباہات سے لیتے تھے۔ بالخصوص جب وہ اس کے ماتحت نہیں رہتے تھے۔ یہ واقعہ کہ اس نے جمہوریت کے تمام علائم کو ختم کر دیا' انہیں بالکل ناگوار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ انگلستان میں وہ اخبار' جنہیں عوام پڑھتے ہیں' رئیسوں کے متعلق خبروں سے بھرے ہوتے ہیں اور دو میں سے ایک دکان شاہی نشان کی نمائش کرتی ہے یا اس بات کو فخر سے بیان کرتی ہے کہ اس کی اشیاء بادشاہ سلامت خریدتے ہیں۔ سوائے ایک استثناء کے ۱۹۲۷ء میں امریکی اخباروں کا مقبول ترین فرد ایک انگریز شاہزادہ تھا اور مقبول ترین عورت بلقان کی ایک ملکہ تھی۔

یہ ممکن ہے کہ آج لوگ پہلے سے زیادہ خوش ہوں۔ ایجادات نے ان کی آسائشوں اور ان کی طاقتوں میں اضافہ کر دیا ہے اور دولت نے انہیں سفر اور دلچسپی کے نئے سامان بہم پہنچائے ہیں لیکن زندگی کے اس تنوع اور ہماہمی کے ساتھ روح کا اضطراب بڑھ رہا ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ وجود ایک ظالمانہ مقابلہ اور عزائم کی پیکار ہے۔ وہ لباس' موٹر اور مکان کے لیے ایک لامتناہی تناؤ ہے۔ "نیا سماج" اناطول فرانس نے کہا "ہر قسم کی امید کو برماتا ہے اور انسان کی تمام قوتوں کو تحریک دیتا ہے۔ زندگی کی کشمکش پہلے سے زیادہ تند و تیز ہے۔ فتح زیادہ غالب اور شکست زیادہ ظالم ہے۔

رئیسیت کے ضبط و نظم کے ساتھ دلوں سے امن اور سکون ختم ہو گیا ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے سماج' مختلف چھتوں کی ایک عمارت ہوتا تھا' جن کے درمیان کوئی زینے نہیں تھے۔ کسان کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن اوپر چڑھنے کی آرزو نہیں کرتے تھے اور رئیسیت ان کے حملوں کے بغیر پھل پھول رہی تھی۔ ٹلیرینڈ نے کہا ہے "جو لوگ ۱۷۸۹ء سے پہلے زندہ تھے' انہوں نے زندگی کی لذتیں نہیں محسوس کیں"۔ لیکن آج ہر شخص ایک شدید بخار میں مبتلا ہے۔ اسی بخار سے ہماری دولت اور ہمارے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص صدر بن سکتا ہے اور اس کا نتیجہ وہ بے تاب اور مستقل آویزش ہے' جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نظر نہیں آئی۔ امن غیر مساوی لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ مساوات کا دعویٰ جنگ کا باعث بنتا ہے۔ جمہوریت' سیاسیات' اقتصادیات اور روح میں کشمکش پیدا کرتی ہے۔ ہر چہرہ پر فکر اور اضطراب نقش اور کندہ ہے اور ہر گھر میں اسی وجہ سے غم و اندوہ کی فراوانی ہے۔ جب سماج انسانوں کے عزم و ذہانت کے فطری اختلافات کو تسلیم کر لے گا اور مساوات پر مبنی منافقانہ اداروں کو مسمار کر دے گا' تب لوگ امن حاصل کریں گے۔ اس وقت سماج مقابلہ سے خوش خلقی' کمیت سے کیفیت' تخیل سے ذہانت اور دولت سے فن کی طرف ترقی کرے گا۔

۷۔ رئیسیت کی خامیاں

یہ ہے رئیسیت کے حق میں استدلال۔ اس استدلال میں جمہوری عناصر کو قطعی نظرانداز کیا گیا ہے۔ آیئے ہم پہلے ان تفصیلات پر نظر ڈالیں، جو ہمیں قائل نہیں کر سکیں اور اس کے بعد باقی تفصیلات کو اپنے فلسفہ میں سمونے کی کوشش کریں۔

رئیس نے اپنے حق میں سب دلائل بڑی جانب داری کے ساتھ نہیں کیے ہیں اور بہت سے نکتوں کی صراحت نہیں کی۔ آیئے ہم فرض کرلیں کہ رئیسیت زیرک تر سیاست دان اور زیادہ دور اندیش انسان پیدا کرتی ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان کی ہنرمندی عوامی بہبود پر صرف ہوگی۔ رئیسیت شاذ و نادر ہی عوام کے ساتھ وہ ربط پیدا کرتی ہے جو ذہن کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنا اکثر وقت رقیبوں کو روسیاہ کرنے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے میں خرچ کرتی ہے اور لوگوں کی طرف قطعی توجہ نہیں کرتی۔

اب ذرا رئیسیت کی جنگجوئی پر غور کیجئے۔ جنگ شکار کی طرح ان کے لیے کھیل تھی۔ دشمن شکار تھا اور جنگ کرنے والے لوگ محض ان کے شکاری کتے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی فیاضی سے جنگ میں قربان کر دیتے تھے۔ ان کی ہمت اور جرات مسلم ہے۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کبھی کبھی متوسط طبقہ سے کم ظالم اور کینہ پرور بھی ہوتے ہیں۔ لائیڈ جارج کا خیال تھا کہ قیصر کو روشنی کے کھمبے سے باندھ کر پھانسی دے دی جائے لیکن لینڈاؤن نے اسے احتیاط کی تلقین کی۔ فرانس کے جمہوریت پسند اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ اپنا آخری بچہ بھی قومی مفاد پر قربان کر دیا جائے۔ لیکن شہنشاہ چارلس نے منکسرالمزاجی سے امن کی درخواست کی لیکن ہمیں "گلاب کی جنگ" بھی یاد ہے۔ لوئی چہاردہم کے جارحانہ حملے بھی یاد ہیں۔ فریڈرک کی ہوسناکی، پولستان کی تقسیم اور وہ وفاق بھی یاد ہیں، جنہوں نے بیس برس تک بوربون خاندان کو فرانس کے تخت پر متمکن کرنے کے لیے جنگیں لڑیں۔

طاقت اپنی غیرذمہ داری اور احساس کی شدت کے مطابق لوگوں کو خراب کرتی ہے۔ رئیسیت اکثر ظالم ہوتی ہے۔ اسپارٹا کے لوگ اپنے غلاموں سے ظلم روا رکھتے تھے۔ روما کے نواب اپنے قرض داروں پر جبر کرتے تھے۔ انگریز نواب، اپنے آئرستانی کسانوں پر تشدد کرتے تھے۔ ایسی رئیسی ثقافت میں کیا شان ہے، جو اس بربریت پر اتر آئے جو رومی سپارٹکس کے پیروؤں سے یا کلائیو اور ہیسٹنگز ہندوستان کے لوگوں سے روا رکھتے تھے۔ یہ بات شاید اب صحیح نہ ہو لیکن یہ اصول قابل عمل ہے کہ "کوئی شخص اس قابل نہیں کہ دوسرے کی رضا کے بغیر اس پر حکومت کرے"۔ جمہوری نصب العین میں اگرچہ ہر بات کی حیثیت فقط نصب العین کی ہے لیکن اس میں بہت عمدہ ممکنات پنہاں ہیں۔ یہ نصب العین ہر شخص کو یہ جرات دلاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری اپنے کندھوں

پر لے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط بناتا اور نگاہ کو بلند کرتا ہے۔ منتشر افراد کا ملک، جو ضبط و نظم کی راہ پر گامزن ہے، غلاموں کی اس قوم سے بہتر ہے، جس کی پناہ گاہ فقط انقلاب ہے۔

ہاں ثقافت اقلیت کا تعیش ہے اور شاید خاصی مدت تک رہے لیکن جو شخص حقیقت سے آگاہ ہے، کبھی رئیسیت کو فن اور علم کے ساتھ وابستہ نہیں کرے گا۔ ترقی چند مخصوص لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن ان چند لوگوں کو ترقی دینے کی یہ صلاحیت لازماً وراثت کی بنا پر نہیں حاصل ہوتی۔ جدید سائنس کی نشوونما، یقیناً صنعت اور رسل و رسائل کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ وہ معاملات ہیں، جن میں رئیس کبھی دل چسپی نہیں لیتا۔ کبھی کبھی کاؤنٹ رمفورڈ کی طرح بعض رئیس بھی سائنس سے کھیلتے ہیں لیکن اگر ہم اس فہرست سے ان لوگوں کے نام خارج کر دیں، جنھوں نے اپنے کارناموں کی بدولت نواب کا خطاب حاصل کیا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ سائنس سراسر متوسط طبقہ کی تخلیق ہے۔

اور یہی حال فن کا ہے۔ رئیسیت فن کی تخلیق نہیں کرتی، محض اس کی سرپرستی کرتی ہے۔ تاریخ فن کے زریں عہد، رئیسیت کے عہد نہیں، وہ یورپ یا مصر کے جاگیرداری عہد نہیں۔ یہ عہد وہ ہیں، جو ایک نئے متوسط طبقہ کے عروج سے وابستہ ہیں اور ان کی شان و شوکت محلوں میں نہیں بلکہ آزاد شہروں اور تجارت کے مرکزوں میں ہے۔ یونانی ڈراما، یونانی تاجروں نے پیدا کیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ا-سیکلس، سوفوکلیس اور یوروپیڈیس کے ڈرامے دولت مندوں نے اس لیے سٹیج کیے تھے کہ وہ اس طرح اپنی ریاست کا اعزاز بڑھانا چاہتے تھے۔ گوتھک کلیسا کسی نواب نے نہیں بلکہ تاجروں کی انجمنوں نے تعمیر کیے تھے۔ وہ نزاکت ماب نواب نہیں بلکہ دنیادار تاجر تھے جنھوں نے یوکرٹیس، ہوریس اور ورجل کی امداد کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انگریز رئیسوں نے شیکسپئر کی مالی امداد کی تھی لیکن احیائے علوم کے اخراجات میڈیکی کے مہاجنی خاندان نے برداشت کیے تھے۔ رئیسوں نے جانسن پر نزیا چیٹرٹن کو مدد دینے سے انکار کر دیا اور اپنے بائرن اور شیلے کو ملک بدر کر دیا۔ لیکن کاروبار اور صنعت کی بڑھتی ہوئی دولت نے انیسویں صدی کے انگلستان اور فرانس کے پرزور ادب کی پرورش کی۔ صرف جرمنی میں فریڈرک اعظم، وائمر کے ڈیوک کارل آگسٹ اور بوریا کے بادشاہ لڈوگ کی مثالوں سے رئیسیت اپنی حمایت میں کوئی معقول بات کہہ سکتی ہے۔

درحقیقت رئیس فنکاروں کو مزدووں کا درجہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ مصری رئیسیت انہیں سمجھتی تھی۔ رئیس زندگی کے فن کو فن کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور وہ کبھی اس فنکارانہ جانفشانی کے لیے تیار نہیں ہوتا جو عظمت ذہن کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ ادب تخلیق نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ایسے ادب کو جس کا مقصد اشاعت ہو، خودنمائی سمجھتا ہے۔ کوئی رئیس اپنی تحریروں میں ربلیز کی طرح آزادی سے بیباک مزاح پیش نہیں کر سکتا یا میکاولی کی طرح سیاسی اسرار نہیں بیان کر سکتا یا

روسو کی طرح اتنے جوش و خروش سے تبلیغ نہیں کر سکتا یا اناطول فرانس کی طرح شاندار مضامین یا افسانے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ اناطول فرانس (جو کہ ایک کتب فروش کا بیٹا تھا) کی خوبی اس کی دل آویز چوٹیلی مایوسی ہے۔ رئیس کی تربیت اس طرح ہوئی ہے کہ وہ آخرت کا مضحکہ اڑائے۔ کیونکہ وہ اس دنیا کو اپنے قبضہ قدرت میں لا چکا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ جدید رئیسیت پر ایک بے نیاز اور سطحی لذت پسندی حاوی ہے۔ ایک مکمل انتشار جس میں اعلیٰ درجے کے حقوق پوری طرح حاصل ہوتے ہیں لیکن ذمہ داریوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ وراثت کے تنگ نظریہ اور شادی کے چند مرصع خاندانوں تک حد بندی کی وجہ سے انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ نسل جسمانی طور پر کمزور اور اخلاقی طور پر ناتواں ہو جاتی ہے اور ایک صدی میں ذہنی عظمت سے اوسط ذہنی صلاحیت تک پہنچ جاتی ہے۔ پیٹر اعظم اور نکولا اول، ولیم اورنج اور جارج سوم کے درمیان صرف چند نسلوں کا فاصلہ تھا۔ سٹوارٹ، بوربون، ہیپبرگ ہوہیزولرن اور رومنوف خاندان انحطاط پذیر ہوگئے۔ یہ نظریہ کسی شہادت کا محتاج نہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ وراثت میں ولیم بھی ہوتے ہیں۔ فریڈرک بھی۔ اس کے فوائد کم ہیں اور نقصان زیادہ۔ ذہنی عظمت کسی طبقہ کے لوگوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اسکے پھلنے پھولنے کے امکانات وہاں زیادہ ہیں، جہاں اسے بافراغت روزی میسر ہو لیکن وہی عظمت اپنے انہماک کی سختیوں سے خستہ و شکستہ ہو کر بالاخر خشک اور بے برگ و بار رہ جاتی ہے۔ وراثتی رئیسیت عوام کے صبروشکر، قناعت اور کم ہمتی کی وجہ سے خاصی دیر تک قائم رہی ہے۔ لیکن ہیپبرگ خاندان کی معیاد، پاپائیت کے مقابلہ میں کیا ہے؟ یورپ کے اہم حاکم پاپائے روم تھے اور عظیم ترین ادارۂ حکومت کلیسا تھا۔ لیکن کلیسا میں وراثت کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور کوئی کسان بھی پاپائے روم بن سکتا تھا۔ تاریخ کی مستحکم ترین حکومت ایک رئیسی جمہوریت تھی۔ غالبًا کسی دن ہم بھی اس قسم کی حکیمانہ حکومت قائم کریں گے۔

۸۔ ایک اور عطائی نسخہ

انسانی حکومت کے پیچیدہ مسئلہ میں اگر ہم پر کوئی بات پوری طرح واضح ہے تو صرف یہ کہ سیاسی وراثت کا اصول دراصل انتشار کا اصول ہے۔ کیونکہ یہ حماقت کی حفاظت اور تبلیغ کرتا ہے۔ موروثی ناقابلیت کے ذریعہ نظم و نسق کی راہیں مسدود کرتا ہے اور ایک مستحکم ریاست کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس لیے کہ ہر صلاحیت کی جو فرد کے اندر موجود ہو، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، آبیاری ہونی چاہیے تاکہ وہ ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔ جمہوریت کے الفاظ و اقوال کے پس پردہ یہی اہم حقیقت پوشیدہ ہے کہ اگرچہ افراد یکساں نہیں ہو سکتے لیکن مواقع

مساوی ہو سکتے ہیں اور یہ کہ فرد کے حقوق، عہدہ اور طاقت کے حقوق نہیں بلکہ وہ انسانی حقوق ہیں جو اس کی قابلیت کی آزمائش کا ہر راستہ اس پر کھلا رکھیں اور اس میں عہدہ اور طاقت حاصل کرنے کی اہلیت کی پرورش کریں۔

رئیسیت بہترین لوگوں کی حکومت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ حکومت خاندانی ہو، لیکن ہم اس قسم کی رئیسیت کے محض خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اس کے نہ ہونے سے ہم اس قدر زبوں حال ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم نوابوں کی حکومت چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بہترین انسانوں کی حکومت چاہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری ملاقات ان مردوں اور عورتوں سے ہوتی رہتی ہے، جو کارہائے نمایاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن سیاست کی راہیں ان پر بند ہیں۔ جمہورت کو یہ راہیں کھول دینی چاہئیں۔

اس مسئلہ کا حل بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ہمارے انحطاط نے زندگی میں کلبیت پیدا کر دی ہے اور ہر تجویز کے بارے میں ہمارا ردعمل ایک مایوس تبسم ہوتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دنیا ہمیشہ اسی طرح رہی ہے اور ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔ ہم اب جب کہ بہت زیرک ہو گئے ہیں، حیوانوں کی حکمرانوں پر راضی ہیں۔ شاید والٹیئر صحیح کہتا تھا کہ عقلمند انسان دنیا کو بعینہٖ اسی طرح چھوڑنے پر قانع ہے، جس طرح کہ اس نے اسے پیدائش کے وقت پایا تھا۔ لیکن جنت الارض کا تصور ہمارے لہو میں بس گیا ہے اور ہمیں مطمئن ہو کر بیٹھنے نہیں دیتا۔ رئیسیت میں بھی چند خوبیاں ہیں۔ ہمیں انہیں تلاش کرنا ہے اور انہیں اس جمہوری نمائش کی حقیقت کے ساتھ مربوط کرنا ہے۔

۱۹۵۹ء میں امریکہ میں میئر کے انتخاب کا تصور کیجئے۔ یہ انتخاب اب تک ایک جمہوری انتخاب ہے۔ ہر مرد اور عورت عہدوں کے لیے صرف ان لوگوں کو منتخب کرتا ہے، جن سے وہ بہترین کام کی توقع رکھتا ہے۔ یہ انتخاب سب انتخابات سے زیادہ جمہوری نوعیت کا ہے۔ کیونکہ آج کل الیکشن میں ہمارا انتخاب عموماً دو یا تین اشخاص تک محدود ہوتا ہے، جو چند خاص طبقوں کے نمائندے ہوتے ہیں، جن پر ہمارا اعتماد نہیں ہے۔ لیکن اس خیالی انتخاب میں ایک سو کے قریب نمائندے ہیں۔ یہ انتخاب آزاد ہے۔

یہ سو نمائندے کیونکر نامزد ہوئے؟ کیا انہیں سو جماعتوں نے نامزد کیا ہے؟ کیا وہ ریشہ دوانیوں یا کسی جماعت سے وفاداری کی وجہ سے نامزد ہوئے ہیں؟ نہیں۔ وہ کسی راستہ سے نہیں آئے۔ انہوں نے محض اپنے نمائندہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اپنے مقاصد واضح کر دیئے ہیں اور بس۔

انتخاب، نامزدگی کے بغیر؟ جماعتوں کا نامزدگی پر اختیار ختم ہوا۔ کیا ہر شخص اپنے آپ کو

میئر، گورنر یا صدر بننے کے لیے پیش کر سکتا ہے؟ نہیں۔ کوئی شخص اس معاملہ میں آزاد نہیں۔ فقط اس کی قابلیت اور تجربہ اور تربیت اسے پیش کرتے ہیں۔ انتخاب کا میدان چاہے کتنا ہی وسیع ہو، اس طرح کوئی نااہل شخص نہیں چنا جا سکتا۔

ان میں سے ہر شخص نے اپنی زندگی اپنے آپ کو اس عہدے کا اہل بنانے پر صرف کر دی ہے۔ اس نے کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور پھر سیاسی انصرام کے جامعہ میں چار برس کے لیے شدید محنت سے عملی تربیت حاصل کی ہے۔ حکومت اس کے لیے طب، انجینئرنگ یا قانون کی طرح ایک فن یا علم ہے۔ وہ محض ایک عہدہ نہیں ہے جو اسے ہر ممکن طریقہ سے حاصل کرنا ہے۔ وہ آخر کار علم کے ذریعہ صراحت اور صحت فکر اور مشقت کے ذریعہ پاکیزگی سے آراستہ ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ کم کوش میدان میں رہ گئے ہیں اور اب وہ آزاد ہیں کہ اپنے آپ کو امریکہ کے کسی چھوٹے شہر کا میئر بننے کے لیے پیش کریں۔ اگر اس نے کسی چھوٹے شہر کی دو مرتبہ قیادت کی ہے تو وہ کسی دوسرے درجہ کے شہر کا میئر بن سکتا ہے۔ اگر وہ دو مرتبہ اس قسم کے شہر کا میئر رہ چکا ہے تو وہ کسی بڑے سے بڑے شہر کا میئر بننے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اگر وہ دو مرتبہ کسی بڑے شہر کا میئر رہ چکا ہے تو وہ گورنری کے انتخاب کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ایک ہی ریاست کا دو مرتبہ گورنر رہ چکا ہے تو وہ صدارت کا متمنی ہو سکتا ہے۔ تربیت اس کو نامزد کرتی ہے اور ہماری یونیورسٹیاں، جو کہ امریکی زندگی کے بہترین ثمر ہیں، ہمارے منتظمین کی تربیت گاہیں بن جائیں گی۔ نظم و نسق کا تانا بانا قائم رہے گا۔ کسی ایک طبقہ کا تسلط قائم رہے گا۔ لیکن اس تانے بانے کی بنیاد تربیت اور ذمہ داری پر ہوگی اور جمہوریت باقی رہے گی۔ انتخاب میں رئیسیت اس میں اس طرح شامل ہوگی کہ حکومت اب بہترین لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ لیکن یہ جمہوریت، نااہلیت اور بدعنوانیوں کے بغیر ہوگی اور یہ رئیسیت، وراثت اور موروثی استحقاق کے بغیر ہوگی۔

یہ تجویز ناقابل عمل اور یقینی ہے اور بظاہر مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی ہے لیکن کون سی تجویز ایسی نہیں تھی؟ کیا الزبتھ کے عہد میں کوئی کلرک واشنگٹن اور میرابو کے متعلق پیش گوئی کر سکتا تھا؟ یا واشنگٹن کے عہد میں عورتوں کے حق رائے دہی کے متعلق کوئی پیش گوئی کی جا سکتی تھی؟ یا گرانٹ کے زمانہ میں کوئی ممانعت شراب کا تصور کر سکتا تھا؟ ہر چیز جب تک ہو نہ جائے، ناممکن ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج نے سیاست دانوں کو تعلیم دی۔ کیا ہماری یونیورسٹیاں ایسا نہیں کر سکتیں۔ چین نے کئی صدیوں تک عہدے ان لوگوں تک محدود کر دیئے، جنہیں تعلیم و تربیت نے ہر قدم پر آزمایا تھا لیکن جب ۱۹۱۱ء میں جمہوری خیالات نے چین پر یلغار کی تو یہ نظام ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس میں ہر شخص کو مساوی مواقع حاصل تھے۔ ایک صدی تک جرمنی کے شہروں میں اس قدر تنظیم اور صفائی تھی کہ ان کا ثانی ملنا محال تھا۔ اس لیے کہ ان کا انتظام انہیں لوگوں کے ہاتھوں

میں تھا، جنہیں انتظامی تربیت حاصل تھی۔

لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے بڑے جامعوں میں حکومت کے مدرسے ہیں یا ایسے نصاب ہیں، جو ان مدرسوں کے مرکز ہیں۔ ماہرین کے خلاف عناد ختم ہو رہا ہے اور سنسناٹی کی طرح کے شہر خاص طور پر تربیت یافتہ لوگوں کو اپنے نظم و نسق کے لیے متعین کرتے ہیں۔ امریکہ میں تقریباً ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ ہمارے انتخابات نہایت مضحکہ خیز ہیں اور اس مضحکہ خیز کھیل کے قائدین اس بات پر متفکر ہیں کہ ووٹروں کی نصف تعداد ووٹ نہیں دیتی۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس بد نظمی کی حقیقت کو دیکھیں اور بے باکانہ یہ کہیں کہ ہم اس وقت تک ووٹ نہیں دیں گے، جب تک کہ ہم صحیح منتظمین کا انتخاب کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ ہماری اپنی بزدلی اور کم ہمتی ہے کہ رائے عامہ حالات سے بے خبر رہتی ہے جو آدھی قوم کو اس یقین کے باوجود خاموش رکھتی ہے کہ جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ آیئے ہم اپنی زبانوں کو قوت گویائی بخشیں۔

ایک قلم کار بس یہ تجویز پیش کر سکتا ہے۔ لیکن سوچئے کہ اثر و رسوخ والے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک سو مجلسوں کو صحیح معلومات حاصل ہوں۔ ایک سو مقرر رائے دہندگی کے لیے تعلیم و تربیت کو اہم قرار دیتے ہوں۔ پھر دیکھئے کہ صاحب فہم و فراست کی رائے کس طرح عوام تک پہنچتی ہے۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور تعصبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور آخر کار کہیں نہ کہیں لوگ اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ سیاسی عہدہ کو تربیت یافتہ اصحاب کے لیے مخصوص کر دیں۔ پھر ایک شہر دوسرے کی نقل کرے گا۔ حتیٰ کہ سب پاک صاف ہو جائیں گے اور چور اور ناپاک روحیں سرکاری عہدوں اور بازاروں سے غائب ہو جائیں گی۔

ہم بڑے بوڑھے اب امید کے سہارے نہیں جی سکتے۔ ہمارے دل اس طرح مجروح ہوئے ہیں کہ ہم ہر جوش و خروش اور جذبہ اصلاح کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ہمارے کالجوں میں ایک نئی نسل تربیت پا رہی ہے۔ مزاج میں جو ہم سے کم رومانوی اور زیادہ جری بہادر اور واقف کار ہے۔ جب ان میں سے چند لاکھ جوان متحد ہو کر باہر نکلیں گے تو یقیناً ہماری اجتماعی زندگی کے مصائب کا خاتمہ کر دیں گے۔

* * *

باب بیستم

ہم نے جنت الارض کیونکر بنائی

۱۔ جنت الارض کے فوائد

آسکر وائلڈ نے کہا ہے "دنیا کا کوئی نقشہ جس میں "جنت الارض" کا وجود نہیں، اس قابل نہیں کہ اس کی طرف دیکھا بھی جائے کیونکہ یہ اس سرزمین کو نظرانداز کر دیتا ہے جہاں انسانیت ہمیشہ لنگرانداز ہوتی رہتی ہے۔ جب انسانیت وہاں پہنچتی ہے تو پھر نظروں کو دور تک پھیلاتی ہے اور کوئی بہتر سرزمین دیکھ کر جہاز کا رخ اس کی طرف کرتی ہے۔ ترقی جنت الارض کے حصول کا دوسرا نام ہے"۔

کیا یہ بات سچ ہے؟ کیا جنات الارض کبھی حاصل ہوئی ہیں؟ آج کل انسان کی ترقی کا تصور مروجہ انداز فکر کے خلاف جاتا ہے۔ مشنگک کہتا ہے "تاریخ مدور انداز میں حرکت کرتی ہے۔ جو چیز بالخصوص تہذیب، عروج حاصل کرتی ہے، اسے زوال بھی ہوتا ہے۔ ہماری ترقی محض سطح سمندر کا ہنگامی مدوجزر ہے۔ سمندر کی تہہ ہمیشہ ساکن اور غیر متحرک رہتی ہے۔ جنت الارض محض ہمارے تخیل کی فضائی پرواز ہے جو حیات و موت کی کشمکش کے اندوہ کو کم کر دیتی ہے لیکن ایک توانا شخص ان جراحتوں کو مصنوعی مرہموں کی مدد کے بغیر برداشت کرتا ہے اور اگر اسے نسیان کی ضرورت ہے تو وہ اپنے آپ کو آج کے معاملات اور تفاصیل میں کھو دیتا ہے اور کل کی فکر نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوتا رہا ہے وہی ہوگا، صرف انداز بیان بدلتے رہتے ہیں"۔

ہم ناشکرگزار وحشی ہیں اور اب جبکہ ایجادات نے ہم پر آسائشوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ ہم مال و دولت کے انبار میں ایک رومان پسند دوشیزہ کی طرح رہتے ہیں اور کسی دور دراز سرزمین کے خزانوں کے متمنی ہیں، جو محض اس لیے دل فریب ہیں کہ وہ دور ہیں۔ ہمارے مفکروں نے عالمگیر

مدرسوں کے خواب دیکھے تھے۔ ہمارے یہاں یہ مدرسے ہیں اور ہم عالمگیر یونیورسٹیوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ کبھی انسان برہنہ تھے' اب وہ لباس پہنتے ہیں' لیکن انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ دوسرے لوگ زیادہ قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔ کبھی انسان بھوکے تھے اب محض خوش خوری کی وجہ سے لاکھوں موت کا شکار بنتے ہیں۔ لیکن ہم بھولے سے بھی ان آسائشوں کا شکر ادا نہیں کرتے جن کی فراوانی ہمارے لیے موت کا باعث بنتی ہے۔ شیکسپیئر کے زمانہ میں بھی بڑے شہر راتوں کو تاریکی میں لپٹے ہوتے تھے اور بازار غیر محفوظ ہوتے تھے۔ آج (جبکہ بازار ابھی تک غیر محفوظ ہیں) رات کے خطرات کم ہوگئے ہیں اور بجلی کی برکت کی بدولت ہر جگہ نور کی بارش ہوتی ہے۔ تاہم لوگ بے کل ہیں اور گزرے ہوئے زمانہ کو یاد کرتے ہیں۔ کبھی چھ برس کے معصوم بچے اور کئی بچوں کی مائیں چودہ گھنٹے روز کام کرتی تھیں اور اپنی مشینوں کے پاس رات بسر کرتی تھیں۔ آج بچوں کو مدرسوں میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر دنیا پر حکمرانی کریں اور لاکھوں عورتیں ایسی بیکاری میں زندگی بسر کرتی ہیں جو ان کی بڑی بوڑھیوں کو ہرگز پسند نہ آتی' لیکن وہ کتنی خوش ہوتیں اگر انہیں ایک چیز اور نصیب ہو جاتی۔ یورپ کا سفر یا سمندر کے کنارے ایک مکان! مزدوروں کو تنظیم لور جرات کی وجہ سے بہتر مزدوری ملنے لگی ہے۔ وہ آج زیادہ قابل احترام ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ ہیں۔

لیکن افسوس! انہیں ابھی آمریت حاصل نہیں ہوئی۔ کسی زمانہ میں ہمارے سپہ سالار عالمگیر جنگ کا انتظار کیا کرتے تھے' لیکن اب انہوں نے جنگوں کو آزما لیا ہے۔ وہ اب سیاروں کی طرف دیکھتے ہیں تاکہ مشتری کے باشندوں کو اسلحہ مہیا کر سکیں۔ آج ادیب اتنے زیادہ ہیں کہ پہلے کبھی نہیں تھے۔ ایجاد' رسل و رسائل اور اشتہاروں نے کتابوں کی فروخت اس قدر عام کر دی ہے کہ بائرن اور میکالے بھی دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ اناطول فرانس' بہترین نثر لکھنے کی وجہ سے کروڑ پتی بن جاتا ہے' لیکن ان کامیاب انسانوں کے دلوں میں کس قدر درد و اندوہ موجود ہے۔ اناطول فرانس کہتا ہے! "اگر تم میرے دل کے اندر دیکھ سکو تو تم ششدر رہ جاؤ گے۔ دنیا میں کوئی ذی حیات مجھ سے زیادہ محزوں نہیں"۔ اے حسین زبان کے آقا! تو نے سینکڑوں عہدوں اور سرزمینوں کے فنون اپنے گرد جمع کیے۔ تو نے ارباب حل و عقد اور انقلاب پرستوں کے دلوں کو مسحور کیا۔ تو اپنے زمانہ میں ر-بلز' مونٹین' والٹیئر اور فرانس کے دوسرے شاہان ادب کا بھائی تسلیم کیا گیا۔ تیرے پاس دولت اور فرصت تھی اور تو نے کسی انسان کی کمزوری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر تجھے بھی خوشی حاصل نہیں تھی تو وہ پھر کہاں مل سکتی ہے اور ہم کم مایہ لوگ اسے کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا وجہ ہے کہ ہماری دولت یاسیت کو جنم دیتی ہے اور ہماری تسخیر فطرت نے ہمیں سلا ہو کی طرح فتح کے بعد بھی ناخوش رکھا ہے۔

جنت الارض کی تکمیل ہو چکی ہے لیکن صرف خارجی دنیا میں۔ اگر، جیسا کہ بعض فلسفی سمجھتے ہیں، خارجی دنیا کی کوئی حقیقت نہیں تو کوئی ہماری بے چارگی کا اندازہ کرے۔ ہم بدلے ہیں لیکن کتنی ست رفتار سے۔ ہمارے لیے روئے زمین کو بدلنا براعظموں کو، بری، بحری اور فضائی راستوں سے ملانا اور کوئلے اور فولاد کو ہزاروں آسائشوں میں تبدیل کرنا آسان تھا، لیکن اپنی روح میں سے ہولناکی، جنگجوئی اور ظلم کے جذبات کو خارج کرنا ہمارے لیے آسان نہیں، کیونکہ یہ جذبات کئی نسلوں کی کشمکش اور افلاس کے حملوں کی وجہ سے ہماری فطرت میں بس گئے ہیں۔ ہم وہی کچھ ہیں جو کچھ ہمیں مجبوریوں نے بنایا ہے، لیکن ہم اب بھی وہی کچھ ہیں، حالانکہ اب دنیا کو اس قسم کے کردار کی ضرورت نہیں۔

اس لیے ہماری بے کلی اور بے قراری جائز ہے، لیکن یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں کہ ہم اس سائنس کے ممنون نہ ہوں، جس کی بدولت دنیا ہمارے لیے نصف "جنت الارض" بن گئی ہے اور باقی نصف کا انحصار بھی اسی نصف جنت پر ہے۔ سائنس کے یہی انعامات، روحانی اطمینان کی اساس ہیں۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ باغ عدن میں ہماری حیثیت حیوانوں کی ہے اور ہم اس حسن کے مستحق نہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس بات پر آمادہ نظر آ رہے ہیں کہ اس حسن کو مکروہ صنعتوں سے برباد کر دیں۔ ہم جہاں کہیں بھی اپنا گھر بناتے ہیں، وہاں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہم حسن کا بے جا استعمال کرتے ہیں، اسی طرح ہم علم کو غلط استعمال میں لاتے ہیں۔ ہم نے اپنی قوتوں میں بے طرح اضافہ کر لیا ہے لیکن ہمارے منصوبوں اور ارادوں میں اب تک وہی پستی اور تنگ نظری ہے جو کبھی افلاس اور زبوں حالی کے زمانہ میں تھی۔ ہم مادی طور پر توانا اور قد آور ہوتے ہوئے بھی روحانی حیثیت سے بونے ہیں۔ جنت الارض، سوائے انسانی روح کے ہر جگہ موجود ہے۔

اس لیے یہ جنت الارض جو ہم اب تعمیر کریں گے، اس کا تعلق انسانی قوموں کی توسیع سے نہیں بلکہ انسانی روح کی کشادگی سے ہے۔ ہمارے اذہان اور ہمارے عزائم کی ترمیم اور اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی بہتر دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قابل بن سکیں جو ہمارے علم کی طرح واضح اور ہماری قوت کی طرح مستحکم ہو گی۔ چونکہ انسانی جہالت نے ہر جنت الارض کے تصور کو برباد کیا ہے، اس لیے اگر ہم سب سے پہلے اپنے دلوں اور اپنے ذہنوں کو آلائشوں سے صاف کر لیں تو باقی حالات خود بخود سنبھل جائیں گے۔

آیئے ہم اس سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جائیں۔ بچے باغ میں کھیلتے رہیں اور ہم اپنے آپ کو اپنے تخیل کے سپرد کر دیں۔

۲۔ میئر جاگتا ہے

میئر وقت سے پہلے جاگ اٹھا کیونکہ سورج کی روشنی اس کی ناک پر پڑ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ہوش میں آیا۔ وائٹ ہاؤس مدہم ہوگیا اور پھیلتی ہوئی روشنی نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا۔ اس نے پھر سونے کی کوشش کی لیکن وہ سو نہ سکا۔ وہ سوچنے لگا ”اوہ خدا! میں میئر ہوں۔ میں میئر کیونکر بنا؟ میں کتنا خوش نصیب ہوں! اور اس خوش نصیبی کی راہ میں کتنے حوادث آئے؟ اگر میں ٹامی برک کو نہ جانتا......... اس کی یہ بڑی نوازش تھی کہ اس نے مجھے نامزد کیا۔ لیکن دس سال پہلے مجھے یہ بات کیوں نہیں معلوم تھی کہ میں میئر بن جاؤں گا۔ اگر مجھے علم ہوتا تو میں اس کی تیاری کرتا۔ کتنا مشکل کام ہے یہ؟ یہ کام ریلوے اسٹیشن کے انتظام یا کنبہ پالنے کے کام سے مشکل تر ہے۔ میں نے اس قسم کی تربیت حاصل نہیں کی۔ میں نے شاید زندگی میں ایک کتاب بھی نہیں پڑھی، لیکن اب میں لاکھوں انسانوں کی زندگی کا ذمہ دار ہوں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں، وہ لوگوں کو برباد یا آباد کر سکتا ہے۔ میرا عمل ان لوگوں پر بھی اثر انداز ہوگا، جن کے آباؤ اجداد بھی ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ ان کے مسائل نے مجھے بوکھلا دیا ہے۔ رسل و رسائل مکاری، مالیات مکاری، منڈیاں مکاری، عمارت سازی مکاری، صفائی مکاری، صحت عامہ مکاری، تعلیم مکاری--- اوہ، یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہے۔ یہ تو سینکڑوں آدمیوں کا کام ہے، میں تنہا اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا“۔

دن زیادہ روشن ہوگیا۔ میئر نے انگڑائی لی اور بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں کو سہلانے لگا۔ یکایک اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔

”آہا، مجھے یہی کچھ کرنا چاہیے۔ یہ اقدام سیاستدانوں کو متحیر کر دے گا۔ یہ کام پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں ’یونیورسٹیوں سے بہترین سائنس دانوں، بنکوں سے بہترین مہاجنوں، مدرسوں سے بہترین مدرسوں، کلبوں سے بہترین عورتوں، معملوں سے بہترین موجدوں، بہترین منتظموں اور مزدوروں کے بہترین قائدوں کو بلاؤں گا اور ان سے یہ التجا کروں گا کہ وہ میری امداد کریں“۔

”او خدا، میں سیاست دانوں سے تنگ آگیا ہوں۔ وہ کوئی کام نہیں کرنا چاہتے، صرف چیزیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف مشاہرہ چاہتے ہیں۔ ہر عہدہ کے لیے ان میں سے دس

امیدوار موجود ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس کام کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں ان سے تنگ آگیا ہوں"۔

میئر بستر سے باہر نکل ایا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر تازہ ہوا میں سانس لینے لگا۔

"ہمارے شہر میں کئی بڑے آدمی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سامنے پہاڑی پر کچھ سائنس دان رہتے ہیں جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ دنیا کے بعض بڑے تجارتی اداروں کے ڈائریکٹر بھی یہاں رہتے ہیں۔ یہاں ایک شخص نظم و نسق کے فن سے بھی واقف ہے۔ ہم اس کی قابلیت سے کیوں فائدہ حاصل نہ کریں؟ میں انہیں اعلیٰ عہدوں کے لالچ بھی نہیں دلا سکتا اور تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ میں انہیں ان عہدوں پر مامور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر میں ان سے کہوں! حضرات! مجھے آپ کی مدد چاہیے 'کیا آپ سب مل کر میری رہنمائی کے لیے ایک مجلس مشاورت نہیں بنا سکتے؟ میرا خیال ہے وہ ضرور اپنا کچھ وقت مجھے دیں گے۔ مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ میں شہری تعمیر کی ایک کمیٹی قائم کرلوں......"

میئر نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر خدا سے دعا مانگی:

"اے خدا' مجھے ہمت عطا کر!"

۳۔ وہ عظیم مجلس مشاورت

اس عظیم مجلس مشاورت کی تشکیل کی خبر شہر میں آناً فاناً پھیل گئی۔ افسر اپنے مستقبل کے متعلق خوفزدہ ہو گئے' لیکن دوسرے سب لوگ خوش ہوئے۔ سیاسی حلقے نے بھی بظاہر خوشی کا اظہار کیا' لیکن انہوں نے خفیہ طور پر یہ بات میئر کے گوش گزار کر دی کہ اگر یہ منصوبہ کسی طرح بھی جماعت کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

مجلس کا اجلاس' یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا۔ اخباری نمائندوں نے بھی کافی تعداد میں اس میں شرکت کی لیکن عوام سے یہ التجا کی گئی کہ وہ اس میں شریک نہ ہوں۔ مجلس پچاس ارکان پر مشتمل تھی' جو مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے شعبہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا۔ اس مجلس میں صرف تاجر' جائیداد فروش' سیاستدان' ادیب اور فلسفی شامل نہیں تھے۔

میئر نے انتہائی انکسار کے ساتھ ان سے یوں خطاب کیا!

"خواتین و حضرات! آپ کو یہاں جمع ہونے کی زحمت دی گئی ہے کیونکہ ہمارا شہر اب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس کا نظم و نسق ایک آدمی کے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ کئی

سیاست دان مل کر بھی اس کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اب ہمیں اقتصادیات اور نظم و نسق کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے شہر اپنی عظیم شخصیتوں سے مستفیض ہوں۔

"ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ہمارے مسائل کا بغور مطالعہ کیجئے اور اپنی تجاویز پر کڑی تنقید کیجئے۔ انہیں انسانی فطرت اور ہمارے شہر کی مالیات کی حدود کے اندر رکھئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ہر اس تجویز کی پوری حمایت کروں گا، جسے آپ کی یا عوام کی بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کسی شدید مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ شہری اصلاح کا معاملہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں اور اس سے کسی جماعت کے حقوق پر اثر نہیں پڑتا۔ ہم سب انتشار میں مبتلا ہیں اور ہمیں مل کر اس میں ربط پیدا کرنا ہے۔ یہ شہر آپ کا ہے، آپ ہی اس کی اصلاح کیجئے"۔

اس موقع پر اخباروں نے اس مجلس کی حمایت کی۔ اس مہم کی تضحیک بہت آسان تھی۔ ان بزدل اور بے پروا سائنس دانوں کا مذاق اڑانا اور یہ پیشگوئی کرنا کہ اس مجلس کی تشکیل سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور یہ بتانا کہ یہ (بزعم خود) نیک لوگ اپنا اخلاق تن آسانوں پر عائد کرنا چاہتے ہیں، بہت سہل تھا۔ لیکن میئر نے شہر کے ہر اہم اخبار کے مالک یا مدیر کو بھی مجلس میں شامل کر لیا تھا۔ یہ نہایت معقول اقدام تھا۔ اس عزت افزائی کی وجہ سے اخباروں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اس موقع پر اخباروں نے وہ کام کیا جس کی عوام ہمیشہ ان سے توقع رکھتے تھے، یعنی یہ کہ وہ عوام کی تربیت کریں گے۔ انہوں نے اپنے بہترین نامہ نگاروں کو اس مجلس کی روئیداد مرتب کرنے پر مامور کیا اور اپنے اداریوں میں اس عظیم مہم کی جی کھول کر حمایت کی۔

کچھ لوگوں نے اس مجلس کا مذاق اڑایا۔ عوام نے اس کی طرف سے بے نیازی کا اظہار کیا، لیکن مجلس کے ایک ہفتے کے اجلاس کے بعد جو تجاویز پیش کی گئیں، لوگ ان پر سخت برہم ہوئے۔ مجلس کے ماہرین حیاتیات نے یہ کہا کہ تولید پر پابندیاں لگانی چاہئیں۔ صرف وہی لوگ بچے پیدا کرنے کے حقدار ہیں جو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہیں۔ سارے شہر میں اس تجویز کے خلاف پرزور احتجاج ہوا۔ یہ کون سے ماہرین ہیں جو ہمیں یہ بتانے آئے ہیں کہ ولدیت ہر شخص کا حق نہیں ہے۔ اگر اخبار اس تجویز کی حمایت نہ کرتے تو بڑا ہنگامہ برپا ہوتا۔ تجویز کے الفاظ یہ تھے:

"مجلس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تعمیر نو کا آغاز، نسل کی جسمانی صلاحیتوں کی اصلاح سے ہوتا ہے۔ ہم جب تک صحت مند لوگوں کو بچے پیدا کرنے کی اور غیر صحت مند لوگوں کو تولید سے پرہیز کرنے کی ترغیب نہیں دیں گے، ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔

"لیکن اس معاملہ میں کسی امتناعی آئین سازی کی ضرورت نہیں۔ ہم محض ہر ذہین مرد اور

عورت کے سامنے یہ تجویز پیش کر رہے ہیں۔ ہم قانون کی پابندیاں عائد کرنے کی بجائے محض ان کی نیک نیتی پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ہم صرف اپنے آپ پر جبر کریں گے۔

”اس لیے ہم، اس مجلس کے ارکان یہ عہد کرتے ہیں اور (ان کی رضامندی سے) اپنے بچوں کی طرف سے بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کی اجازت کے بغیر بچے پیدا نہیں کریں گے۔ ہم افراد اور جماعتوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اس اصول کو علی الاعلان تسلیم کرلیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ذہین لوگ سب سے پہلے اسے قبول کریں گے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ان کی قائم کی ہوئی مثال سے دوسرے لوگ متاثر ہوں گے۔

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ غیر صحت مند لوگوں کو شادی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، لیکن انہیں طبی مشورہ سے ضبط تولید پر عمل کرنا چاہیے۔

”ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اس اصول سے مطابقت زیادہ عام ہو جائے گی۔ اگر اس پر عمل کرنے والوں کا، حادثات، بیماری، بے کاری، بڑھاپے اور موت کے خلاف بیمہ کروا دیا جائے اور سب ماؤں کو پرورش کے اخراجات بہم پہنچائے جائیں۔ ہم نیکی کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں، برائی کی ممانعت نہیں۔

”آخر میں ہم اخباروں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع کے بارے میں معلومات کو عام کریں اور ہر شخص پر یہ اضح کر دیں کہ ہر نسل کی ذہنی اور جسمانی صحت ہی پر ہماری ترقی کا دارومدار ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر شخص کے جذبہ وطن پرستی کو جوش میں لائیں کہ یہ ضبط نفس ہمارے شہر کی تعمیر کی راہ میں پہلا قدم ہے“۔

اس تجویز کے آخر میں مجلس کے سب ارکان کے دستخط تھے، سوائے ایک کے۔

اس اعلان سے زیادہ متشکک مزاج کے نکتہ چینوں کی رگ پھڑکی۔ کچھ نکتہ چینوں نے لوگوں کی سادہ دل رجائیت کا مذاق اڑایا، کہ توسیع نظم سے شہر کی تعمیر نو کی جا سکے گی۔ ایک نقاد نے فریڈرک اعظم کی وہ بات دہرائی جو اس نے اپنے اس وزیر تعلیم سے کہی تھی جو عالمگیر تعلیم سے انسانیت کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ ”میرے عزیز زدلنز، تم اس ذلیل نسل کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنی اچھی طرح میں جانتا ہوں“۔ لیکن بہت سے لوگ اس نئے تصور حکومت سے خوش ہوئے کہ جبری حکومت کی جگہ تعلیم لے لے گی اور بدی کی ممانعت کی بجائے اب زور صحت مند اقدام پر ہو گا۔

اور پھر منظوری کے عہد و پیمان آنے شروع ہوئے۔ شہر کے طبیبوں نے ایک خاص اجلاس بلایا اور متفقہ طور پر اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے پروفیسروں نے اور

اسکول کے مدرسوں نے اسے منظور کیا۔ اخباروں کے کارندوں، صنعتی کیمیا کے ماہروں اور ماہرین موسیقی نے بھی اس کی منظوری دی۔ اس کے بعد اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل طلبا نے اسناد لیتے وقت اسے برضا و رغبت قبول کیا۔ آہستہ آہستہ رائے عامہ کی اکثریت نے اسے شہریت کے اعلان میں شامل کرلیا۔ پہلی مہم کامیاب رہی۔

۴۔ تعلیم کے ذریعہ حکومت

ایک ہفتہ کے بعد دوسری تجویز مجلس کے تعلیمی شعبے نے پیش کی، جو اخباروں میں شائع ہوئی۔ تجویز یہ تھی:

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ حکومت کے بنیادی فرائض، عوام کی صحت کی نگہداشت کرنا اور بچوں اور بالغوں کو پوری تعلیم دینا ہیں۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر کے خرچ سے ہسپتال قائم کیے جائیں، جہاں ہر مرض کا علاج مفت اور مکمل طریقے پر ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے مدرسوں میں جسمانی تربیت کو بھی وہی مقام ملنا چاہیے جو ذہنی تربیت کو حاصل ہے۔ ہمارا خیال یہ بھی ہے کہ صحت اقوام، دولت اقوام سے زیادہ اہم ہے اور یہ کہ خوشی کا راز صحت میں مضمر ہے۔ ہم ہر صحت مند کھیل کی تربیت اور صفائی کے فن کی ہمت افزائی کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ کھیلوں کے تماشائی بننے کے رجحان کی ہمت افزائی نہ کی جائے اور کھیل میں ہر شخص کو شریک کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ تعلیم پر مسرفانہ اخراجات کرنا ہمارے شہر کا امتیاز بن جائے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ سب مدرسوں کے مشاہرے بڑھا دیئے جائیں تاکہ معلم اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں کے ہم پلہ بن جائیں۔ ہم یہ تجویز بھی کرتے ہیں کہ تمام نادار طلبا کو وظیفے دینے چاہئیں تاکہ شہر اپنے جوانوں کی ممکن صلاحیتوں سے مستفید ہو سکے۔ ہمارا خیال یہ بھی ہے کہ سائنسی تحقیقات کو مالی امداد ملنی چاہیے تاکہ ایجادات کی فراوانی سے میکانکی طاقت میں اضافہ ہو اور انسان کی غلامی کا جلد از جلد خاتمہ ہو سکے۔

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ مدرسوں کے نصاب میں سے جنگ کے متعلق تمام تعریفی کلمات ختم کر دیئے جائیں۔ ہمارے لوگوں کو اس بات کا پورا موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنے فطری رجحانات امن کی نشوونما کریں اور دفاع کے تمام لازمی اقدامات کی حمایت اور سرپرستی کریں۔

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہم نجی مدرسوں کی ہمت افزائی کریں اور تجربات تعلیم میں دلچسپی لیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قوم کا کردار، قول، اخبار، اجتماع اور عبادت کی آزادی سے بنتا ہے۔ شہر کے

اچھے نظم و نسق کے ساتھ ہمیں ذہن کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ مدرسہ کو اجتماع کا ذہنی مرکز بنا دینا چاہیے، جو صبح و شام کھلا رہے تاکہ لوگ اس سے جسمانی اور ذہنی استفادہ کر سکیں۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ مدرسوں کو اخلاق کی تعمیر کی ذمہ داری اپنے اوپر لینی چاہیے تاکہ دوسری اخلاقی قوتوں کے انحطاط سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے، مدرسہ اسے پورا کر سکے اور یہ کہ کوئی تعلیم مکمل نہیں سمجھی جا سکتی جب تک کہ وہ فرد کی شخصی آرزوؤں اور اجتماعی ذمہ داریوں میں مطابقت نہ پیدا کرے اور اس میں یہ میلان نہ پیدا کر دے کہ وہ اپنے کردار کو اجتماعی بہبود کے مطابق بنائے۔

"ہم اپنے اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کے سامنے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اخباروں کو تعلیم کا ایک موثر وسیلہ بنائیں۔ ہم امیر طبقہ کے فیاض لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مالی امداد دے کر اخباروں کے ذریعہ سائنس، تاریخ، ادب اور فن کی تعلیم کو عام کر دیں گے۔

"آخر میں ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہر شعبہ میں تعلیم بالغاں کو عام کیا جائے اور یہ کہ مدرسوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی اسناد، ان کی شخصیت کے نشوونما میں محض ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ کہ تعلیم محض ایک فریضہ اور تیاری نہیں بلکہ انسانیت کی ثقافتی میراث کے ساتھ خوشگوار بے تکلفی پیدا کرنے کا دوسرا نام ہے"۔

ان تجاویز پر سوائے دو کے سب ارکان نے دستخط کیے۔

ٹیکس ادا کرنے والوں کے علاوہ ہر شخص نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا۔ طبیب اس بات پر خوش ہوئے کہ مجلس نے صحت کی اہمیت پر زور دیا۔ اور لوگوں نے اس خبر کا خیر مقدم کیا کہ اب ہسپتال غریبوں کی چیر پھاڑ کا معمل نہیں رہیں گے۔ مدرس اعلیٰ تنخواہیں حاصل کرنے کے خیال سے خوش ہوئے اور ہر معلم کے کنبہ نے اپنی آمدنی کے اضافہ سے اخراجات میں اضافہ کر دیا۔ ان گنت ہونہار جوانوں نے، جو افلاس کو اپنی عظمت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے، سرکاری وظیفوں کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اخباروں نے اپنے اعلیٰ منصب کو پسند کیا اور لڑکے اور لڑکیاں جنت الارض کی کھلی تفریح گاہوں کے تصور سے مسرور ہونے لگیں۔

لیکن اہل جائیداد کی ایسوسی ایشن کے صدر 'ٹوڈر بلیک' نے ایک احتجاج شائع کیا، جسے ہر اہل جائیداد نے پسند کیا۔ اس نے لکھا:

"یہ واضح ہے کہ میسر کی اصلاحی مجلس نے اس غیر ضروری اعلان کے بعد کہ وہ ساری نسل انسانی کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اب سادہ لوح عینیت پسندوں کا شکار بننا منظور کیا ہے۔ ہم نے یہ توقع کی تھی کہ یہ مجلس اپنی تجاویز کو عقل و دانش کی حدود کے اندر رکھے گی، لیکن ہمیں اب اندازہ

ہوا کہ سب اقدامات محض ایک نئی جنت الارض تعمیر کرنے کا پیش خیمہ تھے۔

"یہ منصوبہ کہ ہم سب مزدوروں کو پی ایچ ڈی بنا دیں، کسی فلسفہ معلم کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر بالغ ذہن یہ جانتا ہے کہ ہماری اقتصادی دنیا میں صرف چند عہدے ایسے ہوتے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے کالج ہمارے مناصب کی تعداد سے زیادہ گریجوایٹ پیدا کر رہے ہیں۔ ملک میں گریجوایٹوں کی بھرمار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گریجوایٹ صنعت کے ساتھ زندگی کو سازگار نہ پا کر اپنی ذاتی بے کلی کو انقلابی ہیجان میں تبدیل کر دیں گے۔ کوئی ہوش مند انسان ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کی تجویز نہیں کرے گا اور ہر تجربہ کار مدرس اس تعداد میں کمی کرنے کے وسیلے سوچے گا۔

ہماری مجلس کی تجاویز، جدید عہد کی اس پالیسی کے عین مطابق ہیں کہ نوجوانوں کو خوش رکھو۔ ہر شخص آج کل کے جوانوں کے گناہوں کی تعریف کرتا ہے اور ان کی خود پسندی انقلاب پرستی، اسراف اور بداخلاقی کو نظرانداز کرتا ہے۔ والدین اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے جائیداد چھوڑتے ہیں اور بچے ساری جائیداد تعیش میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ کالج، جہاں ہم اپنی اولاد کو بھیجتے ہیں محض ورزش کے اکھاڑے اور بے یقینی کے مدرسے ہیں۔ ہمارے جوان دہریوں کو مفت اعلیٰ تعلیم دینا اور ان کے لیے تالاب اور کتب خانے تعمیر کرنا ایک مضحکہ خیز تجویز ہے۔

کیا کوئی ہمیں یہ بتائے گا کہ اس منصوبہ کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟ پہلے ہی مدرسوں اور کالجوں کے اخراجات یوں ہی اہل جائیداد پر گراں ہیں۔ اگر یہ تجاویز کامیاب ہو گئیں تو ٹیکس کیا ہوگا؟ ہر اہل جائیداد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جب قومی حکومت نے اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ یوں لے لیا اور شہر نے باغیوں کی فصل کھڑی کرنے کے لیے اس پر ٹیکس عائد کیے تو اس کے پاس باقی کیا رہ جائے گا۔

ہم میئر سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ اس مضحکہ خیز ہنگامہ کو ختم کرے اور مجلس سے یہ کہے کہ وہ اپنی تجاویز کے لیے مالی امداد خود مہیا کرے۔

آپ کا مخلص
تھیوڈر بلیک

۵۔ لکھ پتیوں کی اشتراکیت

اس خط سے شہر کے لوگوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔ جب مجلس نے نکتہ چینوں کی نکتہ چینی کو نظرانداز کر کے اپنی تیسری رپورٹ تیار کی تو اختلاف بہت

بڑھ گیا۔ یہ افواہ پھیل گئی کہ رپورٹ نے مجلس کے اندر انتشار اور نفاق پیدا کر دیا ہے اور لوگوں نے یہ دیکھا کہ پچاس میں سے سات ارکان نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ رپورٹ یہ تھی:

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر کے منتظمین شہر کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی خوراک کی نگہداشت کریں گے اور اخباروں کے تعاون سے وہ ہر ہفتہ معینہ قیمتوں کی فہرست شائع کریں گے اور وہ لوازمات زندگی کی غیر ضروری تضیع کی مخالفت کریں گے۔

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر رفاہ عامہ کو اپنے ہاتھوں میں لے لے اور اپنے ہائیڈرو الیکٹرک کے کارخانے خود بنائے اور ریاستی کارخانوں کی تعمیر میں مدد کرے۔ اس طرح بجلی منافع کے بغیر فروخت ہو سکے گی اور شہر دھوئیں سے پاک ہو جائے گا اور ساری صنعت صحت مند اور پاکیزہ ہو جائے گی۔

”ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ شہر کے رسل و رسائل شہر کی ملکیت بن جائیں۔ کرایہ میں اضافہ یا تخفیف محض خرچ کے مطابق ہونا چاہیے اور ان آسائشوں کی نشوونما اس خیال سے ہونی چاہیے کہ انسان اژدحام سے بچے اور آبادی دیہات میں پھیل جائے۔

”ہم اجارہ دار کمپنیوں کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے اسالیب کار کی نگہداشت ہونی چاہیے اور ان کے منافع پر پابندیاں عائد کرنی چاہئیں تاکہ شہر کے لوگوں کے لیے معمولی کرایہ پر مکان بنیں اور اس طرح گھریلو زندگی شاداب ہو اور وہ ایک بار پھر اخلاق اور اجتماعی نظام کا سرچشمہ بن جائے۔

”ہم ان فیاض امراء کے ممنون ہیں جن کی بدولت ہمارے بڑے عجائب خانے اور اسباب موسیقی ممکن ہوئے۔ ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ یہ انعام ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچائیں گے۔ ہم موجودہ کام کی ترقی چاہتے ہیں تاکہ فنون کا ادراک اور شعور پیدا ہو تاکہ اعلیٰ ذوق، ذہنی عظمت کا محرک بنے اور احساس حسن ہمارے شہر کو سربلندی عطا کرے“۔

تیسری تجویز کے سلسلے میں لوگوں نے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بعض لوگوں نے اسے دھیمی تعریف یا ہلکے استہزا سے ٹھکرا دیا۔ چونکہ اس کی تجاویز سارے معاشرے کے لیے مفید تھیں، ان سے کسی ایک محدود جماعت کو زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے کسی خاص گروہ نے ان کی حمایت نہیں کی اور وہ توجہ جو پہلی غیر معمولی تجاویز کو نصیب ہوئی تھی، کسی اور تجویز کو نہ مل سکی۔ لوگ رسل و رسائل اور گیس کے بارے میں کسی جذبہ یا جوش و خروش کا اظہار نہ کر سکے اور جس طرح کسی گھر کا جلنا کسی گھر کی تعمیر سے زیادہ جاذب توجہ ہوتا ہے، اسی طرح جب مجلس نے اپنی تجاویز کی تفصیلات کی وضاحت کی تو لوگوں کی دلچسپی ختم ہو گئی اور جہاں شہر کی خامیوں اور خرابیوں

کے بارے میں لوگوں میں اتفاق تھا، وہاں انہیں دور کرنے کے لیے لوگوں کے پاس ہزاروں منصوبے تھے اور کوئی ایک تجویز ایک معمولی اقلیت کے علاوہ کسی اور کو پسند ہی نہیں آتی تھی۔

وہ تھوک فروش جو شہر کے تاجروں کے ہاتھ وہ اشیا فروخت کرتے تھے، جنہیں انہوں نے سمندر میں نہیں ڈبویا تھا، دونوں جماعتوں کے قائدین پر یہ دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ مجلس کو چھوڑ دیں۔ گیس اور بجلی کی کمپنیوں نے اس شورش میں کم حصہ لیا کیونکہ ان کا اعمال نامہ شرمناک حرکات سے کم سیاہ تھا۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ اگر انہیں قیمتیں مقرر کرنے کی اجازت ہوگی تو وہ خوشی سے گیس اور بجلی شہر کی میونسپلٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا کریں گے۔ بعض نقل و حمل کی کمپنیوں نے کمیٹی کی تجاویز کے سیاق و سباق کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کی تاویل یہ کہہ کر کی کہ وہ "کرایوں میں اضافہ" چاہتے ہیں اور بہت سے لوگ یہ بات پڑھ کر مجلس کے سخت خلاف ہو گئے۔ سرمایہ داروں نے اس تجویز کے خلاف شدید احتجاج کیا کہ کمیٹی منافع پر پابندیاں عائد کرے۔ غیر شادی شدہ لوگوں نے تبلیغ تولید کا مذاق اڑایا۔ اس تمام بحث و تمحیص کا لب لباب یہ تھا کہ "ان خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟"

۶۔ "جنت الارض" کے لیے سرمایہ

تشکیل کے کوئی ایک مہینہ کے بعد مجلس نے اپنی چوتھی اور آخری رپورٹ شائع کی اور جلسہ نامعلوم مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔ شہر کے لوگ متحیر تھے کہ اس رپورٹ پر بھی پہلی رپورٹ کی طرح، سوائے ایک کے سب ارکان کے دستخط ثبت تھے۔ رپورٹ یہ تھی:

"ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ جمہوریت کو زیادہ آزاد اور پابند کر دینا چاہیے تاکہ ہر شخص کو یہ موقع حاصل ہو کہ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ عہدہ کے قابل بنائے اور اعلیٰ عہدے صرف انہیں لوگوں کے لیے مخصوص کر دیئے جائیں جو ان کے اہل بن چکے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سیاسی نظم و نسق کے مدرسے قائم کیے جائیں اور ان میں ہر شخص، خواہ وہ گریجوایٹ نہ بھی ہو، امتحان داخلہ پاس کرنے کے بعد داخل ہو سکے۔ ان مدرسوں میں تعلیم اتنی ہی جامع اور قابل عمل ہو جتنی کہ طب کے مدرسوں میں ہوتی ہے۔ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہماری سیاسی جماعتیں اپنے نمائندے ان مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا سے منتخب کیا کریں اور یہ کہ وہ اپنی نامزدگی صرف ان مردوں اور عورتوں کے لیے مخصوص کر دیں، جو ان مدرسوں کے گریجوایٹ ہوں اور جنہوں نے کسی ادنیٰ حیثیت میں دو سال کام کیا ہو۔ ہم شہری تحقیق کے شعبہ کی امداد کرنے کو تیار ہیں تاکہ اس کی کارروائی ہر جگہ شہری حکومت کے جدید اسالیب کے مطالعہ اور شہر کے ہر افسر کے اعمال کے تجزیہ تک پھیلائی جا سکے۔

”اس رپورٹ اور اس سے پہلی رپورٹوں کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ہم اس ضمن میں یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ناکاشتہ زمین، سامان تعیش، ایک خاص قیمت سے زیادہ کے تحفے اور تمام سامان تفریح پر (جو عوام کی جسمانی اور ذہنی نشوونما میں ممد و معاون نہیں ہوتے) ٹیکس لگا دیا جائے۔ مزید برآں بلدیہ کو طویل مدت کے لیے اقرار نامے جاری کرنے چاہئیں تاکہ وہ نسلیں، جو ان آسائشوں سے مستفیض ہوں گی، اس استفادہ کی کچھ قیمت ادا کریں۔

”یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ مالیہ کا یہ وسیلہ ناکافی ہو گا، ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ جو لوگ اسے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ایک تعمیری فنڈ میں چندہ ادا کیا کریں، جس کا انصرام ایک غیر سیاسی ادارہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ ہم اس ضمن میں اخباروں کی امداد چاہتے ہیں کہ وہ اس فنڈ کو ہماری دولت کے مطابق متمول کر دیں گے اور ہم قابل اور دولت مند اصحاب کے جذبہ حب الوطنی اور دور اندیشی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری معاونت کریں گے۔ ان کی امداد کے بغیر تعمیر رکے گی تو نہیں، لیکن اس کی رفتار سست ہو جائے گی۔ ان کی امداد کے ساتھ تعمیر ایک ہی نسل میں مکمل ہو سکتی ہے اور ہمارے شہر کی عظمت کو اس مقام پر پہنچا سکتی ہے کہ وہ ایتھنز، فلورنس اور روما کی عظمت کا حریف بن جائے۔

”اس ضمن میں ہم، اس مجلس کے ارکان، یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ، اگلے پانچ سال تک اس فنڈ میں دیتے رہیں گے“۔

۷۔ لیکن در حقیقت

اس آخری فقرہ کے اثر کو کون دور کر سکتا ہے؟

اس کی بدولت عوام کی وہ توجہ اور امداد، جس سے مجلس محروم ہو گئی تھی، اسے پھر حاصل ہو گئی اور چونکہ شہر میں بیکار زمین کی مقدار زیادہ نہیں تھی۔ ٹیوڈر بلیک بھی حیران رہ گیا ”ہماری ساری آمدنی کا پانچواں حصہ“۔ یہ عظیم الشان فیاضی ہے، کیونکہ مجلس کے ارکان میں سے بعض اصحاب ملک کے متمول ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور اشتراکی ارکان بھی بہت مالدار تھے۔ یقیناً مثالی ریاست اب دور نہیں ہے۔

ان ہمت افزا حالات میں وہ لوگ جو ابتدا ہی سے مجلس کے خیر خواہ تھے، اب زیادہ جرات سے اس کی حمایت کرنے لگے۔ انہوں نے یہ امر واضح کیا کہ یہ تجویزیں نہایت محتاط اور موزوں ہیں اور یہ کہ سوائے ایک دو ارکان کے، تمام رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں نے ان پر دستخط کیے ہیں۔ اخباروں نے چاروں رپورٹیں یکجا کر کے شائع کیں تاکہ لوگ اس روشن اور صحت مند اجتماع کا

مجموعی طور پر تصور کر سکیں، جس کی تخلیق کا بیڑا اس مجلس نے اٹھایا تھا۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ مثالی ریاست محض آسائش اور تعیش کے کل پرزوں پر مشتمل نہیں تھی بلکہ اس کا بنیادی مقصد عوام کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا تھا۔ ان اقدامات اور مساعی کے ذریعہ جو نسل پیدا ہو گی، وہ اپنے لیے خود آسائشیں تخلیق کر لے گی اور کل پرزوں کا غلام بنے بغیر انہیں استعمال میں لا سکے گی۔

اور اخباروں کی اعانت کے ساتھ تعمیری فنڈ سرعت سے بڑھنے لگا۔ بہت سے افراد اور کنبوں نے اس شرط پر اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ اس کی نذر کر دینا منظور کیا، کہ بلدیہ ان تجاویز کو قبول کر لے۔ مجلس کے ایک رکن نے خاموشی سے پانچ کروڑ ڈالر اس فنڈ کو عطا کر دیے، جو اس نے ایک تعلیمی فنڈ کے لیے جمع کیے تھے۔ عورتوں نے اپنے زیورات دیے۔ مرتے ہوئے لوگوں نے اپنا ترکہ دیا اور مختلف اداروں نے اپنے ارکان کے چندوں سے معقول رقوم اکٹھی کیں۔ مجلس کے التوا کے دو مہینے بعد اس فنڈ میں دس کروڑ ڈالر جمع ہو چکے تھے۔

اب معاملہ بلدیہ کے اراکین کے ہاتھوں میں تھا۔ جس دن میئر کو یہ تجاویز پیش کرنی تھیں، سب اراکین حاضر تھے اور تماشائیوں کی گیلری بھری ہوئی تھی۔ تماشائیوں کے چہرے مسرت اور شادمانی سے فروزاں تھے۔ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ آج عہد زر سے عہد زریں تک پہنچنے کی مہم کی پہلی ڈرامائی منزل کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ میئر نے یہ رپورٹیں پڑھ کر سنائیں اور یہ وضاحت کی کہ یہ تجاویز علیحدہ علیحدہ پیش کی جائیں گی۔ اس نے اراکین سے یہ پرزور اپیل کی کہ وہ انہیں منظور کر لیں۔ “مجھے یہ امید ہے” اس نے کہا “کہ اگر یہ تجویزیں کامیاب ہو گئیں تو مستقبل ہمارے عہد کو ایک حسین یادگار کی حیثیت سے محفوظ رکھے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میرے عہد کے خاتمہ سے پہلے ان تجاویز پر عملدرآمد شروع کر دیں”۔

جب میئر نے اپنی تقریر ختم کی تو ایک رکن نے ان تجاویز کے خلاف ایک تقریر کی، اس نے کہا:

“جناب والا، میں ان تجاویز کو اشتراکیت کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ ہمارے قائدین صنعت کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اشتمالی شیخ چلیوں کے ہر طفلانہ منصوبہ کو منظور کر لیا ہے۔ ان تجاویز کے پس پردہ مجھے ماسکو کے سرخ ہاتھ کام کرتے نظر آ رہے ہیں۔ میں ان تجاویز کی اس لیے مخالفت کروں گا کہ میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور کسی خارجی طاقت کے غلبہ کو کسی حالت میں منظور کرنے پر آمادہ نہیں ہوں”۔

تماشائی ہنسے، لیکن بلدیہ کے اراکین نے اس تقریر کو باصد متانت سنا۔ ان میں سے ایک

نے اس خیال کی تضحیک کی کہ یہ تجاویز اشتراکی نوعیت کی ہیں‘ لیکن تیسرے مقرر نے اپنی خطابت کے زور سے مباحثہ کا رنگ بدل دیا۔ وہ ایک خوفناک شکل کا بڈھا معمار تھا‘ جس نے مزدور انجمنوں کے ذریعہ بلدیہ تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس نے جذباتی گھن گرج کے ساتھ کہا:

”حضرات‘ یہ تجاویز محض روس کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کے مترادف نہیں‘ بلکہ بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے برابر ہیں۔ یہ مجلس کیا ہے؟ امیروں کا ایک کلب! ان کی یہ پیشکش کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک قلیل حصہ دینے کو تیار ہیں‘ دراصل سارے شہر کو اپنے قبضہ قدرت میں لینے کا ایک بہانہ ہے۔ ان کے اس فنڈ کا اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہے کہ وہ (ہم نہیں وہ) اپنے حسب منشا ہمارے شہر کو تبدیل کر دیں؟ سامان نقل و حمل کو خریدنا‘ محض ایک بہانہ ہے کرائے بڑھانے کا۔

اور یہ بھی دیکھیے حضرات! کہ کمیٹی کے اراکین نے جنگ کے تقدس پر حملہ کیا ہے۔ یہ دریدہ دہنی کی انتہا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے متمنی ہیں کہ ہم ان بہادر سپوتوں اور عظیم الشان جرنیلوں کی مدح و ستائش میں ایک لفظ نہ کہیں‘ جنہوں نے ہمارے لیے آزادی کی جنگیں لڑیں‘ ملک کو محفوظ بنایا اور دنیا میں جمہوریت کا علم بلند لیا۔

”اور ان تمام تجاویز میں مذہب غائب ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ مذہب سرے سے غائب ہے۔ اس کے برعکس یہ فتنہ پرور اشارہ موجود ہے کہ مذہب نے اپنا اخلاقی اثر کھو دیا ہے اور مدرسوں کی یہ نوجوان استانیاں اخلاقیات کو مذہب کی جگہ دیں گی۔ اخلاقیات! آپ نے دیکھا؟ اخلاقیات! اخلاقیات آخر ہے کیا؟ میں جانتا ہوں یہ کیا ہے؟ یہ مذہب کے استیصال کے لیے ایک حربہ ہے۔ اس مجلس کے آدھے ارکان دہریے ہیں یا کبریائی وحدت کے قائل ہیں‘ تثلیث کے نہیں اور یا وہ یہودی ہیں۔ میں شروع ہی سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس مجلس میں ضرورت سے زیادہ یہودی موجود ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں ضرورت سے زیادہ یہودی!

”اور جناب والا! کس طرح ان لوگوں نے آپ کو احمق بنایا ہے!

آپ‘ ہماری طرح گلیوں میں پل کر اس اعلیٰ منصب کے مستحق بنے ہیں اور یہ لوگ آپ کے منہ پر یہ کہہ رہے ہیں کہ سب میئر‘ یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے چاہئیں۔ یہ سکول ماسٹر ہمیں یہ بتانے آئے ہیں کہ شہر کا نظم و نسق کس طرح کرنا چاہیے؟ یہ لوگ اس جمہوریت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے آئے ہیں جس کی خاطر ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی جانیں دینے سے گریز نہیں کیا اور جسے ہمارے بھائی بندوں نے فرانس کے میدانوں میں اعدا کے حملوں سے محفوظ رکھا۔ یہ لوگ دیانت دار مزدوروں سے اعلیٰ مناصب کا استحقاق چھین رہے ہیں۔ انہیں شرم آنی چاہیے۔ اگر ان

میں سے ایک تجویز بھی پاس ہوئی، ایک تجویز بھی جو ہماری حکومت کو برباد اور ہمارے حسین شہر کو بے حرمت کر دے گی، تو ہم سب کو شرم آنی چاہیے"۔

ان تجاویز پر کئی دن تک بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ میئر نے ہر تجویز کے لیے مستقل مزاجی سے جنگ لڑی اور بہت سے اراکین نے اس کی حمایت کی اور تماشائیوں نے ان تجاویز کی حمایت میں ہر تقریر اور ہر ووٹ پر والہانہ طور پر تالیاں بجائیں۔ ایک ہفتہ کے آخر میں معاملہ طے ہو گیا اور لوگ گھروں کو واپس چلے گئے۔ ان میں سے ایک تجویز بھی کامیاب نہیں ہوئی۔

تاہم اس شجر کا سایہ سکون پرور ہے اور ان بچوں کی ہنسی کس قدر خوشگوار ہے!

◆

حصہ ہشتم

مذہب ------ ایک مکالمہ

مکالمہ کے افراد

اینڈریو	ایک دہریہ	میتھیو	ایک کیتھولک
ایریئل	میزبان	پال	ایک پروٹسٹنٹ
کلیرنس	ایک لاادری	فلپ	ایک مورخ
الیستھر	ایک یہودی عورت	سدھا	ایک ہندو
سر جیمز	ایک ماہر علم الانسان	تھیوڈور	ایک یونانی
کنگ	ایک چینی	ولیم	ایک ماہر نفسیات

مکالمہ تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ	باغ میں
دوسرا حصہ	کمرہ میں
تیسرا حصہ	کتب خانہ میں

باب بست ویکم

باغ میں

مذہب کی تشکیل

۱۔ مادہ میں روح دیکھنا

ایریئل: آیئے ہم گل لالہ کی کیاری کے گرد بیٹھ جائیں۔ ہم "گول باغ" کے سردار ہیں۔ ہم نے حلف اٹھایا ہے کہ ہم مذہب کی مدافعت یا مخالفت کریں گے۔ آؤ میتھیو اور اینڈریو۔ یہ بنچ ذرا اٹھا کر رکھو۔ ہم میں سے جو لوگ غروب کے منظر کو پسند کرتے ہیں، سورج کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائیں۔ اس طرح اب ہم کارروائی شروع کریں۔

پال، ایریئل، تم نے ہمیں یہاں کیوں جمع کیا ہے؟

ایریئل، میں نے آپ سب کو یہاں اس لیے جمع کیا ہے، کہ آپ مذہب کے بارے میں بحث کریں۔ مجھے اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے لیکن یہ میرے لیے شدید ذہنی الجھن کا باعث بھی ہے اور شاید میری طرح بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی پریشان کرتا ہو۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ مذہب کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ مذہب کی مختلف صورتوں کی قدر و اہمیت کیا ہے؟ اس زمانہ میں مذہب کو کیا حیثیت حاصل ہے اور امریکہ میں اس کا مستقبل کیا ہے؟

پھر آپ یہ بھی بتائیے کہ میری روح فانی ہے یا غیر فانی اور یہ کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں؟

کلیرنس: یہ بحث نہایت مختصر ہو سکتی ہے اگر ہم متفق ہو جائیں۔

ایریئل: لیکن مجھے آپ کے اختلافات سے دلچسپی ہے۔ میں نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ آپ سب ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ اگرچہ میں یہ جانتی ہوں کہ آپ ایک دوسرے کو غلطی پر سمجھتے ہیں، پھر بھی میں یہ توقع رکھتی ہوں کہ آپ متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے خوشگوار مراسم قائم کریں گے۔ ہم اس بحث کا آغاز کس طرح کریں؟

اینڈریو: اصلاحوں کی تعریف سے۔ پہلے یہ بتائیے کہ مذہب کا کیا مطلب ہے؟

ایریئل: نہیں، تعریفیں ایک نہایت تھکا دینے والا مشغلہ ہے۔

فلپ: میں نے ایک مرتبہ مذہب کی مختلف تعریفیں جمع کی تھیں، شاید مجھے ان میں سے چند یاد بھی ہوں۔ شلائرماخر نے مذہب کو احتیاج مطلق کا احساس کہا تھا۔ ہیولاک ایلس نے اسے "دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کا وجدان" کہا ہے۔ گلبرٹ مرے نے کہا ہے کہ "مذہب ہمیں کائناتی قوتوں کے ساتھ متعلق کرتا ہے"۔ سینگر کہتا ہے کہ "یہ وہ مابعد الطبیعیات ہے، جسے ہم محسوس کرتے ہیں۔ یعنی وہ ماورائے فہم حقیقت جو یقینی ہے۔ وہ مافوق الفطرت طاقت جو حقیقی ہے اور زندگی اس غیر مرئی حقیقت میں وجود رکھتی ہے"۔ پروفیسر شوٹ ویل کہتا ہے "مذہب کسی پر اسرار حقیقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے"۔ ایوریٹ ڈین مارٹن اس کی یوں تعریف کرتا ہے کہ "یہ پر اسرار وجود کا علامتی ادراک ہے، جو انسان کی "انا" کے وظائف میں تحلیل ہو جاتا ہے"۔ رائناخ کہتا ہے کہ "یہ ان ادام کا مجموعہ ہے جو ہماری صلاحیتوں کی نشوونما میں حائل ہوتے ہیں"۔

میتھیو: اس سے زیادہ مضحکہ خیز اور جانب دارانہ تعریف میں نے نہیں سنی۔

ولیم: یہ سب تعریفیں ژولیدہ ہیں۔

فلپ: ٹائیلر کی تعریف شاید آپ کو پسند آئے۔ وہ کہتا ہے کہ "مذہب محض روحانی شخصیتوں پر ایمان لانے کا نام ہے"۔

سر جیمز: لیکن کچھ دیوتاؤں کے متعلق بعض لوگوں کو یہ یقین ہے کہ وہ مادی وجود رکھتے ہیں اور مذہب میں ایمان کے علاوہ پرستش بھی شامل ہے۔

فلپ: آپ کے نزدیک مذہب کی تعریف کیا ہے؟

سر جیمز: میرے نزدیک یہ ان برتر طاقتوں کی رضاجوئی کا نام ہے، جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ قدرت اور انسانی زندگی کی راہنمائی اور ضبط و نظم کی ذمہ دار ہیں۔

ایریئل: تو آپ کا مطلب ہے کہ یہ مافوق الفطرت ہستیوں کی پرستش کا نام ہے۔

سر جیمز: آپ نے اس پیچیدہ بات کو جس اختصار کے ساتھ بیان کیا، اس کا شکریہ قبول کیجئے۔

ایریئل: اچھا پھر مذہب کا آغاز کیونکر ہوا؟

اینڈریو: لیوکر-ٹیس کا جواب اس ضمن میں بہترین ہے۔

”خوف نے دنیا میں دیوتاؤں کی تخلیق کی“ وحشی زندگی کو ہزاروں خطرات درپیش تھے اور شاید ہی کبھی وحشی لوگ قدرتی موت مرتے ہوں۔ تشدد یا مرض لوگوں کو پختہ عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے۔ جب وحشی انسان واقعات کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ ان کے اسباب کو شخصی سمجھتا ہے اور اپنے جسم کی مثال سے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ ہر مادی چیز میں روح موجزن ہوتی ہے اور اس کے اعمال کی ذمہ دار ہے۔ کیا آپ نے کبھی کتے کی آنکھوں میں وہ تحیر اور خوف دیکھا ہے جس کے سامنے ہوا ایک کاغذ کو اڑا دیتی ہے؟ وہ ہوا کو نہیں دیکھتا۔ مجھے یقین ہے کہ کاغذ میں اسے کوئی روح نظر آتی ہے، جو اسے حرکت میں لاتی ہے۔ اس کتے کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مذہبی ہے۔ وہ ایک وحشی فطرت پرست ہے۔ اس طرح مذہب کا آغاز ہوا۔

ایریئل: کیا ہم ان کی باتیں مان لیں، سر جیمز؟

سر جیمز: اگر آپ چاہیں تو مان لیجئے۔ جس منزل کو ”اینڈریو“ پہلی منزل کا نام دے رہے ہیں، وہ حقیقت میں دوسری منزل ہے، جس میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ طاقت کئی روحوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جو منفرد چیزوں میں جاری و ساری نظر آتی ہے۔

سدھا: یہ ابتدائی عقیدہ یا ایمان نہایت صحیح تھا۔ وہ جدید سائنس کے اس نظریہ سے زیادہ مختلف نہیں کہ تمام مادہ دراصل قوت ہے۔

سر جیمز: یہ قدیم عقیدہ ہمارے یہاں کئی شکلوں میں موجود ہے۔ کسی زمانہ میں پہاڑ، دریا، چٹانیں، درخت، ستارے اور آسمان، روحوں کی خارجی اشکال متصور ہوتے تھے اور آج کل بھی ہم ان قدرتی اشیاء کو شخصی قوتیں سمجھتے ہیں۔ یونانی یہ سمجھتے تھے کہ آسمان خداوندا یورانوس کا جسم ہے۔ چاند، سائیلینی دیوی کا زمین گیئی دیوی کا اور سمندر پوسیڈون دیوتا کا۔

تھیوڈور: جناب! تعلیم یافتہ یونانی کے لیے یہ ساری بات محض شاعری تھی۔

سر جیمز: ایک عام یونانی کے لیے یہ ایک واضح اور بین حقیقت تھی لیکن ہر ملک کے عوام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ابتدائی جرمنوں اور سیکنڈ نیویا کے لوگوں کے لیے جنگل، جنوں، بونوں، دیوؤں اور اس قسم کی غیر مرئی مخلوق سے بھرے ہوتے تھے۔ آئرستان کے سادہ لوح کسان اب تک پریوں کے وجود کے قائل ہیں اور ان کے اثر سے خوف کھاتے ہیں۔ آئرستان کے احیائے ادب

سے پریوں کو خارج کر دیجئے تو محض نثریاتی رہ جاتی ہے۔ امریکی ہندی کبھی کبھی اپنے انحطاط اور تنزل کو اس واقعہ سے منسوب کرتے ہیں کہ سفید لوگوں نے درختوں کو کاٹ دیا ہے جن کی روحیں سرخ لوگوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ جزائر مولکا میں پھلتے پھولتے درختوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو حاملہ عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے قریب کسی شور یا فساد کی اجازت نہیں ہوتی کہ کہیں حاملہ عورت کی طرح ڈر کر وہ وقت سے پہلے اپنا پھل نہ گرا دیں۔ ایموئنا میں جب چاول کے کھیت ہرے بھرے نظر آتے ہیں تو ان کے گرد و نواح میں کسی بلند آواز کی اجازت نہیں ہوتی کہ کہیں وہ "اسقاط" کا شکار نہ ہو جائیں۔ گال میں ڈروئیڈ اپنی مذہبی رسوم میں شاہ بلوط کی امربیل جمع کرتے تھے۔

اریئل: امربیل کے ساتھ آج بھی مذہبی رسوم وابستہ ہیں لیکن ہمیں کچھ اور بتایئے سر جیمز۔

سر جیمز: روح مظاہر کا یہی نظریہ ستاروں پر بھی چسپاں کیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر ایک رہنما روح بستی تھی۔ بابل کے لوگ سات سیاروں کو کبریائی صفات دیتے تھے اور اپنے ہفتہ کے دنوں کو ان کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ بابل ہی میں علم نجوم نے جنم لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیارے انسانوں کی تقدیر پر حاوی ہیں۔ آج تک ہمارے اخبار ہر مہینہ نجومی کے زائچے شائع کرتے ہیں اور ہم اپنی گفتگو میں علم نجوم کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے قبائل میں چاند گرہن کے وقت لوگ خوفناک آوازیں بلند کرتے ہیں تاکہ وہ عفریت جو چاند پر حملہ کر رہے ہیں' بھاگ جائیں۔ ایتھنز نے اینگزا گورس کو جلا وطن کر دیا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ سورج کوئی دیوتا نہیں بلکہ آگ کا گولا ہے۔ مسیحیت نے ان روحوں کو فرشتوں میں تبدیل کر دیا۔ کیلریہ سمجھتا تھا کہ ہر ستارے کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے جو اس کی گردش میں اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ تقدس کا جو ہالہ ہم صوفیا اور اولیا کے گرد دیکھتے ہیں۔ دراصل سورج کی پرستش کا ایک باقی ماندہ اثر ہے۔ جاپان کے میکاڈو کو آج بھی جاپانی سورج دیوتا سمجھتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ روح مظاہر کا نظریہ مذہب کی بنیاد ہے اور اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز میں ایک روح موجود ہوتی ہے۔

فلپ: اس ابتدائی روح مظاہر پرستی کی ایک صورت ذکر پرستی بھی تھی۔

سر جیمز: ہاں' وحشی قبائل ان اندرونی اعضا کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے جو تناسل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انہیں صرف ظاہری اعضا کا علم تھا اور ان سے کبریائی صفات منسوب کرتے تھے۔ وہ ان کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھے اور سمجھتے تھے کہ ان مین تخلیقی روحیں موجود ہیں۔ اس بنا پر ان اعضا کی پرستش کی جاتی تھی۔

سدھا: میرے خیال میں مذہب کا یہ تصور نہایت معقول ہے۔ ان اعضا ہی میں زرخیزی اور نشو ونما کا معجزہ نظر آتا ہے۔ یہ اعضا تخلیقی قوت کے پیکر ہیں۔ تناسل کے علائم، لنگم اور یونی، اب تک ہمارے ملک میں ان کی پرستش ہوتی ہے اور انہیں تحفظ کی علامتیں سمجھا جاتا ہے۔

فلپ: مصر کی قدیم دستاویزیں یہ بتاتی ہیں کہ مصر میں ذکر پرستی قدیم ترین ادارہ ہے۔ رومن لوگ ذکر کی علامتیں تعویذ کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے تاکہ ان کی زرخیزی میں اضافہ ہو۔ وہ اپنے میلے ٹھیلوں میں تناسل کے طلسم کو مناتے تھے۔ لوشین بڑے بڑے میناروں کا ذکر کرتا ہے جو تقریباً دو سو فٹ اونچے ہوتے ہیں اور جو افروڈائیٹس کے مندر کے سامنے ذکور کی طرح کھڑے ہیں۔

اینڈریو: میں سمجھتا ہوں کہ ہر عبادت بالخصوص عورتوں میں جذبہ محبت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سینٹ تریسا کے تصورات بھی جنسی احساسات اور جذبات کے ساتھ وابستہ تھے۔ اگر ہم کرافٹ ا۔بنگ اور ہیولاک ایلس سے اتفاق کریں تو ہر مقدس شخصیت کی یہی حالت ہوتی ہے۔ چونکہ میرا تجربہ ان میں سے صرف ایک جذبہ تک محدود ہے۔ اس لیے میں اس موضوع پر اس سے زیادہ بحث کرنے سے قاصر ہوں۔

سر جیمز: غالباً مذہبی احساس میں جنس کی شرکت کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شجر پرستی، چوکنٹھے میناروں اور یورپ میں آغاز بہار منانے کے لیے جو جھنڈے گاڑے جاتے ہیں، ان کی توجیہ جنسی اصطلاحوں میں کرنا غالباً صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح جو رسوم ختنہ کے ساتھ وابستہ ہیں، ان کی بھی کوئی اس طرح کی توجیہ مناسب نہیں۔

تھیوڈور: ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تناسل سے متعلق یہ قدیمی رسوم جنسی نہیں، مذہبی نوعیت رکھتی تھیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے انہیں تعیش کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ لیکن ابتدا میں قوت تناسل کو جامہ تقدیس پہنایا گیا۔ میرے نزدیک اسے غلیظ سمجھنے کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ ہم اسے مقدس سمجھیں۔

اینڈریو: اسے غلیظ سمجھنا غیر ضروری ہے۔

ایرئیل: اچھا اب اور کچھ بتائیے۔ سر جیمز! روح مظاہر مذہب کی تشکیل کا پہلا عنصر ہے۔ اس کا دوسرا عنصر کیا ہے؟

۲- سحر

سر جیمز: دوسرا عنصر جادو ہے۔ دنیا کو روحوں سے بھر کر اور ان پر قابو نہ پا سکنے کی وجہ سے وحشی قبائل نے انہیں خوش رکھنے اور اپنی طرف مائل کرنے کی ٹھانی۔ بقول رائناخ "جادو 'روح مظاہر' کا حربہ ہے"۔ بالعموم اس کی شکل ہمدردانہ صحر کی ہوتی ہے اور جوشہ دینے کی صلاحیت پر مبنی ہے۔ وحشی عبادت گزار بارش لانے کے لیے خود یا اپنے جادوگر کی مدد سے زمین پر پانی لنڈھاتا ہے۔ آج تک بلقان اور جرمنی کے بعض حصوں میں بارش کی کمی کے زمانہ میں ایک جوان لڑکی کو برہنہ کر کے اس پر پانی ڈالا جاتا ہے اور جادو کے منتر پڑھے جاتے ہیں۔ کافر لوگوں کو جب قحط باراں کا اندیشہ ہوتا تو وہ اپنے مذہبی رہنما سے کہتے کہ وہ چھتری ہاتھ میں لے کر کھیتوں میں چلے پھرے۔ سماٹرا میں بانجھ عورت ایک بچے کا بت بنا کر اسے اپنی گود میں رکھ لیتی ہے تاکہ اس کا بانجھ پن دور ہو جائے۔ جزائر بابر میں بانجھ عورت سرخ کپڑے کی گڑیا بنا کر اسے دودھ پلاتی ہے اور جادو کا ایک منتر پڑھتی ہے۔ لوگوں میں یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ اس عورت کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اور لوگ اسے مبارکباد دینے آتے ہیں۔ بورنیو کے ڈیاک قبیلہ میں جب کسی عورت کو دردزہ شروع ہوتا ہے تو جادوگر خود اس طرح کی حرکتیں کرتا ہے جیسے اس کے یہاں بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دردزہ کم ہو جاتا ہے اور بچہ جلدی پیدا ہو جاتا ہے۔ چند لمحوں کی حرکات کے بعد جادوگر اپنی کمر سے ایک پتھر گراتا ہے اور ایک ایسا منتر پڑھتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنہیں پتھر کی نقل کر کے باہر نکل آئے۔ تاریخ کے بہت سے مشہور علاج جادو کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک کے عالم ڈاکٹر جیمز جے۔ والش نے ایک نہایت دل فریب کتاب میں جادو کے قصے لکھے ہیں۔ اگر کسی کے جسم پر پھوڑا ہو گیا ہے تو اسے شہاب ثاقب کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وہ گر جائے تو اپنے چہرہ کو صاف کر لیجیے' تمام پھوڑے ختم ہو جائیں گے۔ اگر وہ نہ ختم ہوں تو یقیناً اس کی وجہ یہی ہو گی کہ آپ نے تیزی سے کام نہیں لیا۔ التمیرا کے غاروں کی دیواروں پر حیوانوں کی جو تصویریں بنی ہیں' ان پر تیروں کی بارش کی وجہ غالباً جادو کے اثر سے جانوروں کو مارنا ہے۔ زمانہ وسطی میں لوگ اپنے دشمنوں کے مسحور کرنے کے لیے ان کے موم کے مجسموں پر کیل گاڑ دیتے تھے۔ آج بھی ہم لوگوں کے مجسموں کو جلاتے ہیں۔ جب پیرو کے لوگ یہ رسم ادا کرتے تھے تو کہتے تھے کہ اپنے دشمنوں کی روحیں جلا رہے ہیں۔

اینڈریو: میرا خیال ہے سر جیمز! کہ آپ کا یہ محبوب نظریہ ہے کہ "جادو سے مذہب پیدا ہوا ہے"۔

سر جیمز: "روح مظاہر" کے نظریہ سے شاعری پیدا ہوتی ہے۔ جادو سے ڈراما پیدا ہوتا ہے

اور روحوں کی تسخیر کی آرزو سے سائنس پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی جادو کی رسم ناکام رہتی ہے تو جادوگر کی شہرت میں فرق آتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ جادو کی ایک کامیابی کو یاد رکھتے ہیں لیکن اس کی بہت سی ناکامیوں کو بھلا دیتے ہیں۔ جادوگر کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ اسباب و علل کا مطالعہ کرے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے فطری ذرائع اختیار کرے۔ ان وسائل کے ساتھ جادو کی رسم استعمال کرتے ہوئے وہ اپنی کامیابی کو جادو سے منسوب کر سکتا تھا اور اپنی اس شہرت میں اضافہ کر سکتا تھا کہ وہ دیوتاؤں کی تسخیر کر سکتا ہے۔ پرانے جادوگر معجزہ گر اور پروہت سے طبیب اور حکیم، منجم اور ماہرین فلکیات اور ماہرین کیمیا بنے۔ ہر شعبہ میں ہمارے سائنس دان ان پرانے جادوگروں کے وارث ہیں۔ اس ایک سرچشمہ کی بدولت مذہب اور سائنس، مابعد الطبیعیات اور طب جیسی چیزیں تاریخ انسانی میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔

بعض مقامات پر جادوگر کا فن یا جادو کے منتر اتنے مشہور ہو چکے ہیں کہ اگر جادوگر خدا کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے تو لوگ اسے دیوتاؤں کی ڈھٹائی پر محمول کرتے ہیں، جادوگر کی ناکامی پر نہیں۔ یونان میں بعض اوقات جوان آدمی اگر اپنے شکار میں ناکام رہتے تو "پاں" کے صنم کو پیٹتے تھے۔ اطالوی ماہی گیر اگر اپنی دعاؤں کے باوجود زیادہ مچھلی نہ پکڑ سکیں تو "کنواری مریم" کے بت کو دریا میں پھینک دیتے ہیں چینی لوگ، اگر ان کی دعائیں ناکام رہیں، کسی دیوتا کے صنم کو بازار میں ذلیل کرتے ہیں اور اسے گالیاں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "او ذلیل روح! ہم نے تجھے شاندار مندر رہنے کو دیا، تجھے آراستہ پیراستہ کیا، ہم نے تجھے اچھا کھانے کو دیا، ہم نے تیرے سامنے قربانی پیش کی اور پھر بھی تو اتنا ناشکر گزار ہے"۔ ان عجیب و غریب رسوم، میں وحشی لوگ تقدیر کے اس تصور کے قریب تھے جو دیوتاؤں اور انسانوں سے برتر ہے اور جو یونانی تہذیب کا طغرائے امتیاز ہے۔

ایک طرف تو وہ ہمیں وحدت الوجود کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری طرف سائنس کی طرف۔

ایرئیل: مجھے پتا نہیں چلا کہ ان سب باتوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ لیکن شاید یہ سب کچھ ضروری ہے۔

سر جیمز: آپ کو اتنی جلدی نتائج کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ تاریخ یا سائنس کے کسی موضوع کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ بہتر ہے کہ ہم اپنے آپ کو واقعات اور حقائق سے آشنا کریں۔ اگر آپ فوراً کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں تو یہ نتیجہ چند واقعات کو منتخب کرے گا اور آپ باقی واقعات کو نہیں دیکھ سکیں گے۔

ایرئیل: آپ صحیح کہتے ہیں آپ کی تنبیہہ حق بجانب ہے۔ اچھا آپ اپنی بات جاری رکھیے۔

سر جیمز: جادو سے نہ صرف ڈراما اور سائنس پیدا ہوئے، بلکہ مذہبی رسوم قربانی اور دعا کی رسوم بھی پیدا ہوئیں۔ بہت سی دعائیں اب تک لوگوں کے لیے جادو کے منتروں کی طرح ہیں، جنہیں وہ بار بار دہراتے ہیں۔ تعویذ، بددعا اور دعائے خیر بھی جادو سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن سب سے زیادہ اہم اور مقبول حیثیت زراعت کے رسوم کی تھی۔ وحشی قبائل نشوونما کی قوتوں کو نر اور مادہ میں تقسیم کرتے تھے۔ چیزوں کا مشاہدہ کرنے اور ان کے متعلق سوچنے کا شخصی طریقہ، غیر شخصی طریقہ سے پہلے ظہور میں آتا ہے، جس طرح نظریہ روح مظاہر، مابعد الطبیعیات سے پہلے پیدا ہوا۔ ایک بچے کا خدا سپنوزا کے خدا سے کہیں زیادہ واضح اور مرئی ہے۔ فلسفہ کا ایک نقصان یہ ہے کہ وہ ہمیں موجودات کی بجائے عمومی کلیے دیتا ہے اور ہمارے شباب کے جیتے جاگتے خدا کی جگہ ایک غیر مرئی مطلق کو لا کھڑا کرتا ہے جسے ہم انسانی پیکر میں نہیں دیکھ سکتے۔

ہر سال ہر نسل کا اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اچھی فصل کیونکر پیدا کی جائے۔ وحشی لوگ اس مسئلہ کو سائنٹیفک انداز سے نہیں حل کر سکتے تھے۔ وہ جادو کی مدد لیتے تھے وہ دھرتی ماتا سے کہتے تھے کہ تو ہمیں اس مرتبہ اچھی فصل عطا کرنا۔ اس ضمن میں تخم ریزی کے زمانہ میں وہ ذکری میلے مناتے اور اس طرح زمین کو زرخیز کرتے اور وقتی طور پر اخلاقی پابندیوں کو خیرباد کہہ دیتے۔ بعض ممالک میں لوگ اس زمانہ میں ایک بادشاہ اور ملکہ یا ایک دولہا اور دلہن چنتے اور شادی کی رسوم ادا کرتے تاکہ زمین زرخیزی کی طرف مائل ہو۔ اکثر اوقات دولہا اور دلہن کو مجامعت کرنا پڑتی تاکہ فطرت اچھی طرح سمجھ جائے کہ اس سے کیا توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں۔

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ان باتوں کا مذہب سے کیا تعلق ہے۔ ذرا صبر کیجئے، جب آپ مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کریں گے تو آپ کو اپنے مذہب کی حیثیت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ وحشی انسان بھی ہماری طرح اچھی فصل کا محتاج تھا۔ اس کے پاس قحط اور خشک سالی کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ اچھی فصل کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ اسے یہ خیال آیا کہ دھرتی ماتا کی بارگاہ میں ایک انسان اور اپنی رحم دلی کے عہد میں ایک حیوان کی قربانی دے۔ یہ خون، زمین کی تہوں میں رچ کر دیوی کی رضاجوئی کا باعث بنے گا اور زمین کو زرخیز بنا دے گا۔ ایکیوڈور کے ہندی تخم ریزی کے وقت انسانی خون اور دل کی قربانی دیتے تھے۔ پونی کے ہندی بھی یہی کچھ کرتے تھے اور بنگال کے قبائل میں یہ رسوم نہایت ظالمانہ انداز میں ادا کی جاتی تھیں۔ دھرتی ماتا کی بارگاہ میں بعض اوقات کسی مجرم کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ ایتھنز کے باشندے چند مجرموں کو اس مقصد کے لیے ہمیشہ علیحدہ رکھ لیتے کہ ضرورت کے وقت ان کی جانیں دیوتاؤں کے حضور میں نذر کر دیں۔ جب کبھی طاعون یا قحط کی وبائیں ان پر حملہ آور ہوتیں تو وہ دو مجرموں کو ذبح کر دیتے، ایک قبیلہ کے

مردوں کی طرف سے اور ایک قبیلہ کی عورتوں کی طرف سے یہ ہے نیابتی کفارہ کے تصور کا سرچشمہ۔

ایرئیل: غالباً! لیکن میں اسے مسیحیت کا ایک اساسی عنصر نہیں کہوں گا۔ میں اس بات پر بہت حیران ہوا کہ امریکہ میں جو فرقہ ثانوی اور غیر ضروری مذہبی عناصر کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، اپنے آپ کو بنیاد پرست کے نام سے یاد کرتا ہے۔ میں آپ کا مہمان ہوں۔ مجھے یہ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن میں تو اسے "سطحیت پرست" کا نام دوں گا لیکن کیا میں یہ داستان جاری رکھوں؟

ایرئیل: آخری منطقی حد تک جاری رکھئے!

سر جیمز: صحیح علمی جذبہ یہی ہے۔ ہر سال تھار گیلیا کے میلے میں ایتھنز کے باشندے دو بکریوں کو سنگسار کرتے تاکہ دیوتا ان لوگوں کے گناہ معاف کر دے۔ بسا اوقات یہ جانور ایک سال پہلے ہی چن لیا جاتا اور بارہ مہینے تک اس کی پرستش کی جاتی لیکن موسم بہار میں اسے قتل کر دیا جاتا اور بعض حالات میں خاصی اذیتیں دینے کے بعد قاتل کیا جاتا۔ یقیناً لوگوں کے آزار پرست جذبات ان پارسا رسوم میں تسکین پاتے تھے۔ اس کے بعد وحشیوں کی رسوم کے مطابق منتخب جانور کو پچھلے سال کے مقتول جانور کی روح کی تجسیم سمجھا جاتا، جس طرح بہار کو دھرتی ماتا کا احیا سمجھا جاتا تھا۔

دیوتا کو موت اور احیا کی اساطیر مغربی ایشیا اور شمال مشرقی افریقہ کے مذاہب کا لازمی جزو بن گئیں۔

دیوتا کو قتل کرنے کی رسم سے اسے کھانے کی بہتر رسم پیدا ہوئی کیونکہ وحشی یہ سمجھتا ہے کہ جو چیز وہ کھاتا ہے اس کی طاقت اس میں آ جاتی ہے۔ پہلے پہل لوگ مقتول کا خون پیتے اور گوشت کھاتے تھے، لیکن تہذیب کی ترقی کے ساتھ لوگوں نے جانور کی جگہ آٹے کے صنم بنانے شروع کر دیئے اور انہیں کھانے لگے۔ قدیم میکسیکو میں دیوتا کا بت چنے، بیج اور سبزیوں سے بنایا جاتا اور اسے ان لڑکوں کے خون میں گوندھا جاتا، جو اس خاص مقصد کے لیے قربان کیے جاتے تھے۔ لوگ روزہ رکھنے کے بعد اس بت کو مذہبی عقیدت کے ساتھ کھا جاتے۔ پروہت ان مجسموں پر جادو کے منتر پڑھتے اور انہیں غذا سے دیوتا بنا دیتے۔

میتھیو: آپ اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے کہ مسیحی مذہب کے کفارہ اور عشائے ربانی کے تصورات محض اس لیے غلط ہیں کہ ان سے مماثل تصورات وحشی قبائل میں بھی پائے جاتے ہیں۔

سر جیمز: نہیں، بالکل نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تصورات صحیح ہوں۔ میں اس مسئلہ پر قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ رسوم بتدریج زیادہ مہذب ہوتی گئیں۔ ابتدائی رسوم آدم خور قبائل میں موجود تھیں۔ وہاں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دیوتا کا ذوق سردار قبیلہ کے ذوق کے مشابہ

ہو گا۔ جب آدم خوری کا دور ختم ہوا تو انسانوں کی جگہ حیوانوں کی قربانی دی جانے لگی۔ غالباً اس تبدیلی کی جھلک ہمیں ابراہیمؑ اسماعیلؑ اور دنبے کی داستان میں نظر آتی ہے لیکن وحشیوں کے مذہبی راہ نما گوشت خور تو تھے ہی انہوں نے جلدی ہی قربانی کے جانور کے لذیذ حصے اپنے لیے الگ کرنے کے طریقے نکال لیے۔ وہ ہڈیاں چربی میں لپیٹ کر خدا کے حضور میں پیش کر دیتے۔

اینڈریو: اس وقت تک خدا کو حاضر و ناظر نہیں سمجھا جاتا ہو گا۔

۳۔ ٹوٹم اور تحریم

سر جیمز: انسان حیوانوں کے محتاج تھے اور بڑے بڑے درندوں سے ڈرتے تھے۔ اس حقیقت سے مذہب میں ایک تیسرا عنصر ”ٹوٹم پرستی“ پیدا ہوا۔ ٹوٹم ایک ہندی لفظ ہے، جس کا مطلب علامت ہے۔ شمالی امریکا کے ہندی ایک صنم بناتے تھے، جو کسی ایسے جانور یا پودے کی نمائندگی کرتا تھا، جس میں ان کے قبیلہ کی روح موجود ہوتی تھی۔ ٹوٹم پرستی اکثر و بیشتر شکاری عہد کے ساتھ وابستہ رہی۔ لیکن زراعتی عہد میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ اسی طرح مقدس فاختہ، مچھلی اور بھیڑ، یہودی اور مسیحی مذاہب میں شامل ہوئیں۔

کلیرنس: ہم سب ٹوٹم پرست ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ بارہ سنگھے اور کچھ ہرن کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگ ہاتھی اور بعض جمہوریت کی بہترین علامت ”گدھے کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگ شیر اور بعض تھاب کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے مقدس جذبات کے اظہار کے لیے حیوانوں کی ضرورت ہے۔

فلپ: ۱۹۲۷ء میں جاپان کی حکومت نے یہ فرمان جاری کیا کہ وہ سب مندر اور درگاہیں جلا دی جائیں، جن میں لومڑیوں، سانپوں اور دوسرے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

ولیم: غالباً یہودا اور اس کے ہم عصر خداؤں کی درشت مزاجی، وحشی درندوں کی پرستش کی یادگار تھی۔ ایک عبوری دور میں لوگوں نے خدا کا تصور اس طرح باندھا کہ اس کا چہرہ انسان کا سا اور نچلا دھڑ حیوان کا سا ہے۔ ابوالہول اس کی ایک مثال ہے۔ جب انسان اور حیوان کی باہمی جنگ کی جگہ انسان اور انسان کی باہمی جنگ نے لی تو لوگوں نے خدا کو ایک سپہ سالار کی حیثیت دے دی۔ حیوان نہیں تھا بلکہ فوجوں کی قیادت کرتا تھا۔ لیکن وہ بدستور درشت مزاج رہا۔ ٹارڈ بتاتا ہے کہ شوہر کی طرح زیادہ سخت گیر دیوتا زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا تھا۔

ایریئل: آپ مرد کس قدر وسیع علم پر حاوی ہوتے ہیں۔ ہم بیچاری عورتوں کو بچوں کی تربیت اور خود آرائی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آپ کا مقابلہ کر سکیں۔ سر جیمز، آپ نے

مذہب کے تین ماخذ بتائے ہیں۔ نظریہ روح مظاہر، جادو اور ٹوٹم پرستی۔ کیا اس کے اور بھی ماخذ ہیں؟

سر جیمز: دو اور ہیں۔ تحریم اور آباء پرستی۔ لکڑی کا وہ صندوق جس میں توریت کی الہامی تختیاں محفوظ تھیں۔ بڑی مقدس چیز سمجھی جاتی تھی۔ اسے صرف مذہبی رہنما چھو سکتے تھے۔ جب داؤدؑ اسے یروشلم لے جانا چاہتے تھے تو انھوں نے اسے ایک بیل گاڑی پر لاد دیا"۔ بیل لڑکھڑائے اور قریب تھا کہ صندوق گر جائے لیکن ایک شخص نے لپک کر اسے سنبھال لیا۔ خدا نے فوراً اس کی روح قبض کر لی۔ کیونکہ اس نے ایک فرمان کی خلاف ورزی کی تھی۔ اکثر امتناعی احکام اخلاقی رسوم کی نوعیت رکھتے تھے جو قبیلہ کی بقا کے لیے اس قدر لازمی سمجھے جاتے تھے کہ انہیں مذہبی تقدس عطا کر کے ان کی اہمیت واضح کی جاتی تھی۔ دس فرمان، اس کی ایک مثال ہیں۔ ایرانی بتاتے ہیں کہ ایک دن زرتشت پہاڑ پر عبادت کر رہا تھا کہ خدا، چمک اور گرج کے پردے میں اس پر ظاہر ہوا اور اسے "کتاب قوانین" عطا کی۔ کریٹ کے اساطیر کے مطابق بادشاہ مائنوس نے کوہ ڈکٹا پر خدا سے قوانین حاصل کیے۔ یونانی روایت کی رو سے ڈائیونیسس کو آئین ساز کا لقب ملا۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں دو پتھر کی تختیاں اٹھائے ہوئے ہے جن پر اس کے قوانین کندہ ہیں۔ یہ حاکم کی حکومت کو مستحکم کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔ شاید بادشاہوں کے کبریائی حقوق بھی اسی میلان کے آثار میں سے ہیں۔

کلیرنس: یہ نہایت مفید طریقہ ہے اور آج کل بھی کبھی کبھی استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ آباپرستی

ایرئیل لیکن "سر جیمز" یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے مذہب کی تاریخ تو بیان کی لیکن خدا کا ذکر نہیں کیا۔

سر جیمز: خدا، مذہب کی آخری منزل ہے۔ آپ بچوں کی طرح یہ سوال پوچھ رہی ہیں کہ "خدا کو کس نے بنایا؟" کہ یہ دیوتاؤں کا بحر ناپیدا کنار، یہ کھلے میدانوں، جنگلوں اور آسمانوں کی روحیں، ہمارے خدا میں کیونکر تبدیل ہو گئیں؟ آپ کو وہ قدیم کہانیاں یاد ہیں جن میں دیوتا، حیوانوں اور انسانوں کی شکلیں اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ فصلوں اور حیوانوں کے دیوتا نیم انسانی دیوتا بن گئے تھے۔ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ زئیس دیوتا نے ایک بطخ کا روپ دھار لیا اور جب ہم "الو کی آنکھوں والی اتھین" اور "بچھیا کی آنکھوں والی ہیرا" کی کہانی پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ شک گزرتا ہے کہ یونانی قبائل اپنے نئے خداؤں کے تصورات کو ان تصورات

میں جذب کر رہے ہیں جو عہد قدیم میں وہ اپنے ٹوٹموں کے بارے میں باندھا کرتے تھے۔ ولیم نے ابوالہول کا ذکر کیا ہے‘ جو عبوری دور کے ان دیوتاؤں کی ایک مثال ہے‘ جو نیم انسان اور نیم حیوان ہوتے تھے۔ ولیم کو اس کی مثال کے لیے اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کے اپنے عجائب گھر میں نیم انسان اور نیم حیوان اصنام موجود ہیں۔ نیم بیل اور نیم انسان صنم‘ نیم اسپ اور نیم انسان صنم‘ نیم طائر اور نیم زن صنم‘ نیم ماہی اور نیم زن صنم۔ دراصل یہ ایک انسان نما خدا کے تصور کا پیش خیمہ تھے۔ آبا پرستی نے اس انقلاب کو مکمل کر دیا۔

آبا پرستی غالباً خواب میں مردوں کے ظہور سے شروع ہوئی ہے۔ ان بھوتوں کے ظہور سے خوف پیدا ہوا اور لوگوں نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ جو لوگ زندگی میں طاقت ور‘ تنومند تھے‘ مرنے کے بعد بھی کسی حد تک ان کی طاقت کو محسوس کیا جاتا تھا۔ مردوں کا خوف مذہب کی ابتدائی منازل میں سب سے زیادہ موثر عنصر تھا۔ نظریہ روح مظاہر سے جادو پیدا ہوا اور آبا پرستی سے مذہب پیدا ہوا۔ بعض وحشی اقوام میں خدا کے لیے وہ لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ”مردہ انسان“ ہے۔ یہوداہ کے معنی طاقتور آدمی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک طاقتور سردار ہوگا۔ مصر‘ روما‘ میکسیکو اور پیرو میں لوگ بادشاہ کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ سکندر نے اپنے آپ کو خدا بنا لیا تھا۔ کیونکہ جن اقوام کو اس نے فتح کیا تھا‘ ان کے یہاں بادشاہ خدا کے مترادف تھا۔ اس مرتبہ کے بغیر وہ سکندر کو اپنا حاکم تسلیم ہی نہ کرتے۔ اب ان طاقتور انسانوں کی روحوں کی رضا جوئی بھی کرنا پڑی۔ ان کی تکفین و تدفین کی رسوم کا بھی یہی مقصد تھا کہ ان کا جنازہ بھی کبریائی شان و شکوہ کے ساتھ اٹھے۔ دنیا کے سرداروں کے حضور میں جس انکسار اور نیاز کی ضرورت ہوتی ہے‘ وہی آداب خدا کی بارگاہ میں منتقل کر دیے گئے۔ دست بستگی‘ رکوع و سجود‘ مدح و ستائش‘ جو سردار کی اطاعت کی علامتیں تھیں۔ اب عبادت ربانی کی نشانیاں بن گئیں۔ آج تک کوئی کیتھولک محراب متوفی اولیاء کے اصنام کے بغیر مکمل نہیں ہوا۔ ان معنوں میں آبا پرستی‘ چین اور جاپان تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ تبدریج ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔

یونانی اور دوسری قدیمی اقوام اپنے مردوں سے حاجت روائی کی طلب گار ہوتی ہیں اور مسیحی اپنے اولیا سے۔ مردوں کی دنیا ان کے لیے اتنی حقیقی ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ خاصی قیمت ادا کر کے ان تک اپنے پیغام بھیجتے ہیں۔ ایک سردار اپنے ایک غلام کو بلا کر اس کے سامنے پیغام پڑھتا ہے اور پھر اس کا سر کاٹ دیتا ہے۔ اگر سردار کوئی بات بھول جائے تو وہ ایک اور غلام کا سر کاٹ کر پہلے کے پیچھے بھیج دیتا ہے۔ مردہ انسان کی روح کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کو وہ مافوق الفطرت قوت ”مانا“ حاصل ہے‘ جو بعد کے دیوتاؤں کو حاصل تھی‘ اس لیے نہایت حزم و احتیاط

سے اس کی رضا جوئی کی جاتی۔ مذہب، مُردوں کی رضاجوئی سے پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ مُردوں کی محبت میں تبدیل ہو گیا۔ ایک خونخوار انسان سے بھی اس کے مرنے کے بعد محبت کی جا سکتی ہے۔

اس سے اگلا قدم خدا کا وہ تصور تھا، جس نے اسے باپ بنا دیا۔ جدید مذہب میں خدا کی والدیت ایک نازک روحانی رشتہ ہے۔ ہم خدا کے متعلق یہ نہیں سوچتے کہ وہ جسمانی طور پر بچے پیدا کرنے کا اہل ہے۔ لیکن یونانیوں اور دوسری پرانی اقوام میں خدا کی والدیت جسمانی تھی۔ انسانی نسلیں مختلف دیوتاؤں کی اولاد تھیں اور ہر شجرہ کی ابتدا میں کسی دیوتا کا نام موجود ہوتا۔ یہ تصور (جو یونانیوں اور یہودیوں میں موجود تھا) کہ خدا نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، بعد میں نظر آتا ہے۔

اس طرح رفتہ رفتہ آخر کار انسانوں نے ایک انسانی خدا کا تصور باندھا۔ ارتقا کی یہ منزلیں خاصی مدت میں طے ہوئیں۔ انسانی خدا کے ظہور سے پہلے کئی صدیوں تک روحوں کے سمندر تھے۔ چٹانوں، درختوں اور سیاروں کی روحیں تھیں، تناسل اور زرخیزی کی روحیں تھیں، حیوانی خداؤں کی روحیں تھیں۔ اور آخر کار، آباؤ اجداد اور امرا کی پرستش سے انسانی خدا پیدا ہوا۔ پنسر کا خیال تھا کہ مذہب آباء پرستی سے پیدا ہوا۔ اور تیسری صدی قبل مسیح میں یوریمیرس نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا۔ لیکن آبا پرستی مذہب کی ابتدائی منزل نہیں۔ اس سے پہلے وہ دور آئے جن میں کوئی انسان نما خدا موجود نہیں تھا۔ لیکن آبا پرستی کی نمود سے مذہب میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ اس ادارہ نے مذہب کو انسانیت بخشی۔ اس نے خدا کے تصور کو پہلے ایک طاقت اور بعد میں ایک نیک انسان کے تصور کے سانچے میں ڈھالا۔ اس نے یہودیہ، یونان اور روما کے عظیم مذاہب کے لیے راستہ صاف کیا۔

اب کوئی اور شخص اس داستان کو سنبھالے۔

۵۔ فطرت پرستی

ایریئل: سر جیمز، آپ نے ہمیں جن ذہن افروز حقائق سے آگاہ کیا ہے، ان سے میرے عام اسلوب فکر میں ایک ہلچل سی مچ گئی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ پال اور میتھیو نے آپ کی باتوں کو نہایت صبر اور تحمل سے سنا ہے۔ اب وہ ہمیں بتائیں گے کہ ان کو کہاں کہاں آپ سے اختلاف ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اب تھیوڈور ہمیں یونانیوں کے مذہب کے متعلق کچھ بتائے۔ فطرت پرستی یقیناً ایک دلچسپ مذہب ہو گا۔

تھیوڈور: محترمہ، میں یونانی کہے جانے کا مستحق نہیں ہوں۔ آج کل کے یونانی دراصل سلاو ہیں۔ ان کی نسل بہت قدیم نہیں ہے۔ چینیوں کی طرح انہیں ان کا تمدن ورثہ میں نہیں ملا۔ وہ

امریکیوں کی طرح ایک نئی قوم ہیں، جو ایک نئی ثقافت کی تعمیر کر رہے ہیں لیکن میں نے اپنے ملک کے قدیم مذہب کا شوق و ذوق سے مطالعہ کیا ہے اور میں خوشی سے اس کے متعلق گفتگو کروں گا۔ دراصل مجھے پہلے ہی یہ توقع تھی کہ آپ مجھ سے یہ کہیں گے کہ میں یونانیوں کے مذہب کا ذکر کروں، اس لیے میں اپنے ساتھ سر گلبرٹ مرے کا ایک قول لکھ کر لایا ہوں۔

سر جیمز: میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر زمانہ امن کا ہو تو وہ ایک نہایت رحم دل انسان ہیں۔

تھیوڈور: انہوں نے میرے ملک کا ذکر بہت اچھی طرح کیا ہے۔ سر گلبرٹ کہتے ہیں کہ ”ہر شعبہ زندگی کی طرح مذہب میں بھی قدیم یونان نے بالکل شروع سے ابتدا کی اور سعی پیہم سے مرتبہ کمال تک پہنچ گیا۔ شاید ہی دنیا کا کوئی خطرناک واہمہ ہو، جس کا نقش ہمیں یونانی مذہب میں نظر نہ آتا ہو اور شاید ہی روحانی معراج کی کوئی منزل ہو، جس کی گونج ہمیں تھیلیس سے لے کر پولوس رسول تک کے ادب میں سنائی نہ دیتی ہو“۔ شاید میں آپ کو اس عظیم الشان ارتقا کی ایک جھلک دکھا سکوں۔ اور یہ واضح کر سکوں کہ سر جیمز کے شاندار تجزیہ کا اطلاق یونان کے مذہب پر کس طرح ہوتا ہے۔

ابتدا میں دوسری قوموں کی طرح یونانیوں کو بھی درختوں، ستاروں، حیوانوں اور پودوں میں روحیں موجود دکھائی دیتی تھیں۔ غالباً ان کا پہلا معبود آسمان تھا۔ زئیس کے معنی لاطینی ڈئیس اور سنسکرت کے ڈی کی طرح، آسمان کے تھے۔ امریکہ میں بھی آپ کہتے ہیں، ”آسمان ہماری حفاظت کرے!“ اور میں آسمان سے ملتجی ہوں“ گویا آسمان اور خدا ہم معنی الفاظ ہیں۔ سب سادہ دل یہ سمجھتے ہیں کہ خدا بادلوں کے اوپر رہتا ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں رواقی مفکر، کرپس نے خداؤں کی یہ فہرست بنائی تھی، ”سورج، چاند، ستارے، قانون اور وہ انسان جو دیوتا بن گئے ہیں“۔

سب سے پہلی رسوم جن کا ہمیں علم ہے، زراعتی رسوم تھیں۔ ان رسوم کا مقصد زمین کو زرخیز بنانا تھا۔ کیا آپ نے شاہزادی ڈانٹی کی کہانی سنی ہے۔ جس نے اپنے آپ کو ایک مینار میں محبوس کر لیا تھا اور زئیس دیوتا سنہری بارش کا روپ دھار کر اس تک پہنچا تھا۔ علماء یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ان قدیم رسوم سے پیدا ہوئی ہے، جن میں زمین (ڈانٹی زمین کی دیوی تھی) آسمان کے دیوتا کی باران رحمت سے سرسبز و شاداب کی جاتی تھی۔ یقیناً آپ نے ڈیمٹر اور پرسیفنی کی کہانی سنی ہوگی اور شاید آپ نے برطانوی عجائب گھر میں ڈیمٹر کا شاندار بت دیکھا ہو۔ ڈیمٹر اناج کی دیوی تھی، اس کی بیٹی پرسیفنی کو کوئی دیوتا برزخ میں اڑا کر لے گیا، لیکن ڈیمٹر کے نالہ وبکا کی وجہ سے پرسیفنی کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ فصلیں کاٹنے کے زمانہ میں دنیا میں آسکے، لیکن موسم سرما میں اسے پھر برزخ

میں جانا پڑتا۔

اینڈریو: ''اگر ہمیں جہنم میں جانا ہی ہے تو یہ بہتر ہے کہ ہم گرمیوں کی بجائے سردیاں وہاں گزاریں۔

تھیوڈور: یہ کہانی ایک علامتی تمثیل ہے جس کا اشارہ زمین کی سالانہ زرخیزی اور شادابی کی طرف ہے۔ سب اساطیر اس لیے بنائی گئی ہیں کہ وہ زراعتی رسوم کی توجیہہ کریں۔ حسین افروڈائٹ' جسے یونانیوں نے بابل کی دیوی اشتر کا پیکر عطا کیا تھا' عہد قدیم کی اناج کی دیویوں میں سے ایک دیوی تھی اور اس کا میلہ بہار کی بیداری پر مسرت کا اظہار کرنے کے لیے منایا جاتا تھا۔ یقیناً آپ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ایسٹر' پہلے بہار کا (اور اشتر کا) میلا تھا۔

میتھیو: کلیسا نے اپنی کبریائی حکمت کے ساتھ 'فطرت پرستوں کے تہواروں کو اپنا لیا اور لوگوں کے رسم و رواج کو مسیحی مذہب کے سانچے میں ڈھال دیا۔

تھیوڈور: افروڈائٹ' فطرت اور انسان کی زرخیزی کی ایک حسین علامت تھی۔ قدما' نسوانی پارسائی کا اتنا احترام نہیں کرتے تھے جتنا کہ جدید زمانہ کے لوگ......

کلیرنس: تھیوڈور' آپ جدید زمانہ کے لوگوں سے واقف نہیں ہیں۔

تھیوڈور: میں محض یہی کہوں گا کہ قدما زمانہ وسطیٰ کے عیسائیوں اور پیورٹنوں کی طرح نسوانی پارسائی کو قابل احترام نہیں سمجھتے تھے۔ وہ صرف عورت کی زرخیزی کی قدر کرتے تھے۔ وہ محبت کی پرستش کرتے تھے۔ سچی جسمانی محبت کی بھی' جس میں کھل کھیلنے کی بیباک کیفیت موجود ہوتی تھی۔ وہ افروڈائٹ' یا اشتر یا وینس کی طاقت' شان اور حقوق کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو شخص دیوی کو محبت کے کبریائی جنون کا خراج نہیں دیتا' وہ بد قسمت ہے۔ ایشیائے کوچک کے بعض حصوں میں ہر عورت کا مذہبی فریضہ تھا کہ وہ مندر کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے اور اپنا آپ ہر اس اجنبی کے سپرد کر دے' جو اس کی طرف مائل ہو اور پھر اپنی کمائی دیوی کی بارگاہ کی نذر کر دے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا' سر جیمز؟

سر جیمز: یقیناً! مندر ان عورتوں سے بھرے ہوتے تھے جو اجنبیوں کے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی تھیں۔ ان میں سے بعض کو کئی کئی سال تک اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا۔

تھیوڈور: ایڈونس بھی بابل کے دیوتاؤں سے اخذ کیا گیا تھا۔ یہودی اسے تمز کہتے تھے اور کبھی کبھی ایڈون' جس کے معنی ہیں آقا یا خدا۔ یونانی یہ سمجھتے تھے کہ یہ لقب' خدا کا نام ہے۔ بابل اور یونان کی روایتوں کی رو سے ایک وحشی سور نے ایڈونس کو قتل کر دیا تھا۔ غالباً وہ پرانے یہودیوں کے حیوان معبودوں کا انسانیت مآب پیکر تھا۔ سال میں ایک مرتبہ لوگ سور کو ذبح کرتے اور اسے

ایک عام ضیافت میں کھاتے، لیکن پارسا لوگ ایڈونس کا ماتم کرتے اور چند دن کے بعد وہ اس کے احیاء کی رسم مناتے۔

سر جیمز: غالباً اس کی موت اور احیا کی روایت ان زراعتی رسوم سے اخذ کی گئی ہے، جن میں زمین کی موت اور احیا کو علامتی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ مذہب کے نشوونما میں ہر جگہ ایک غیر شخصی قوت کو شخصیت کا جامہ پہنایا جاتا ہے اور پھر ایک دیومالا جنم لیتی ہے۔

تھیوڈور: یہی حال ڈائیونیس کی روایت کا ہے۔ وہ انگور کا دیوتا تھا، جس طرح ڈیمیٹر اناج کی دیوی تھی۔ دوسرے زراعتی دیوتاؤں کی طرح وہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہوا، جس طرح زمین خزاں میں مرجھا کر بہار میں پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کی مرگ و احیا کا بھی تہوار منایا جاتا۔ اس رسم سے ڈائیونیس کا تھیٹر پیدا ہوا اور ایکلیس، سوفوکلیس اور یوروپیڈیس کے شاندار ڈرامے معرض وجود میں آئے۔ یہ ڈرامے ڈائینوسس کی عبادت کا ایک حصہ تھے۔ اور ان کا موضوع ہمیشہ ایک مذہبی نوعیت رکھتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ طربیہ بھی انہیں تہواروں سے پیدا ہوا۔ جلوسوں کے آگے لوگ ذکری علامتیں لے کر چلتے تھے اور اس ذکری جشن سے جس میں جنسی مزاح اور جنسی نغموں کی بھرمار ہوتی تھی، طربیہ پیدا ہوا۔ اس لیے آپ اوسٹوفینز کے بیباک مزاح کو عفو کی نظر سے دیکھیں۔ کوئی باعزت عورت اس کے ڈرامے نہیں دیکھتی تھی۔

سر جیمز: یہ ڈراما محض مردوں کا ڈراما تھا جو بز دیوتا کے اعزاز میں کیا جاتا تھا۔

تھیوڈور: آپ ٹھیک کہتے ہیں، سر جیمز! ڈائیوسس نے ایک مقدس بکرے کی جگہ لے لی تھی، جس طرح دوسرے انسانی دیوتا مقدس حیوانوں کی جگہ لے چکے تھے۔ لوگ ڈائینوسس کی ابتدا نہیں بھول سکے تھے۔ وہ اس کی بارگاہ میں ایک بکرے کو قربان کر دیتے اور اسے ایک بکرے کے پیکر میں ڈھالتے۔ اس جلوس کے پیش رو بکرے کی شکل کے نقاب پہنتے۔ مقدس حیوان ہر دیوتا کے تصور کے ساتھ وابستہ تھے۔ ہومر کی شاعری میں خداؤں کو انسانیت بخشنے کے عمل میں آباپرستی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یونانیوں کے لیے انسان اور خدا کے درمیان خلیج ناقابل عبور نہیں تھی۔ ایک عظیم شخصیت دیوتا بن سکتی تھی اور ایک دیوتا ایک عظیم شخصیت بن سکتا تھا۔ دیوتا انسانوں سے ملتے جلتے تھے اور تقریباً ہر لحاظ سے (اپنے محاسن و معائب میں بھی) انسانوں کی مانند تھے۔ ان کا طغرائے امتیاز ان کا غیرفانی ہونا تھا۔

جب مختلف آباپرست گروہ ایک ریاست میں ایک جا ہوتے تو ان کے خدا ایک خاندان کے نظام میں منسلک ہو جاتے۔ بالاخر شعرا نے قدیم روایات کو شعر و سخن کا پرشکوہ جامہ پہنایا اور اولمپس کے دیوتاؤں نے جنم لیا۔

اینڈریو: کبھی آپ نے غور کیا ہے، تھیوڈور! کہ اولمپس کے دیوتا، اپنی حکومت کی ترتیب ہمارے صدر کے کابینہ کے نمونہ پر کرتے تھے، مثلاً منروا سیکرٹری آف سٹیٹ تھا، نیپٹون (نیپچون) بحریہ کا وزیر تھا، ڈیمیٹر وزیر زراعت تھا، ہرمیز ڈاک خانہ کا ڈائریکٹر تھا، مارس، بری افواج کا وزیر تھا اور ہیرا وزیر داخلہ تھا جس کا کام ازیس یا صدر کی چند زوجگی کے میلانات کو قابو میں لانا تھا۔

تھیوڈور: ہاں، لیکن ان کے اور بھی کئی دیوتا تھے۔ یونانی ہر چیز کا، حتیٰ کہ حادثہ کا بھی دیوتا بنا لیتے تھے۔ سب پرانی اقوام زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ایک دیوتا بنا لیتی تھیں۔ رومنوں نے یونانی دیوتاؤں کو اپنا کر ان کی تعداد کو دوچند کر دیا۔ فضا دیوتاؤں اور جنوں سے لبریز ہو گئی۔ ابیی اونا دیوی ان بچوں کی حفاظت کرتی تھی، جو گھر سے باہر ہوتے تھے۔ ڈومی ڈوکا انہیں گھر واپس لے آتی تھی۔ انٹرڈیوکا ان دو حالتوں کے علاوہ دوسری حالتوں میں ان کی حفاظت کرتی۔ کیوبا سونے کی حالت میں ان کی نگہداشت کرتی۔ ایڈوکا، انہیں کھانا کھانے کی تعلیم دیتی۔ فیبولینس انہیں پڑھنا لکھنا سکھاتی۔ سٹیٹینس انہیں کھڑا ہونے کی تعلیم دیتی۔ غرض اسی طرح سینکڑوں اور دیوتا تھے۔ کینی کی تسخیر کے بعد ہینی بال روما کی طرف بڑھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے خواب دیکھا کہ کوئی آواز اسے واپس چلے جانے کو کہہ رہی ہے۔ اس نے اس آواز کی متابعت کی اور ممنون رومنوں نے وہاں ایک دیوتا کی درگاہ بنائی اور اس کا نام رڈیکولس رکھا، یعنی وہ خدا جو لوگوں کو واپس بھیج دیتا ہے۔ ہر کھیتی، ہر گھر اور ہر راہ گزر کا ایک دیوتا تھا۔

اینڈریو: تو کیا نگہبان فرشتوں اور ولیوں کی پرستش ان رومنوں کے دیوتاؤں کی مسیحی میراث تھی؟

تھیوڈور: غالباً۔

اینڈریو: ان تمام دیوتاؤں کے سارے سارے دن پرستش کرتے رہنا کتنی مصیبت کی بات ہوتی ہوگی۔ اناطول فرانس نے بروسون سے کہا کہ مجھے پہلا کبریائی فرمان پسند نہیں کہ "صرف خدائے واحد کی عبادت کرو"۔ میں تمام دیوتاؤں، تمام مندروں اور تمام دیویوں کی عبادت کرنا چاہتا ہوں۔ اناطول فرانس سب کو اس لیے پسند کرتا تھا کہ اسے ان کی عبادت نہیں کرنا پڑتی تھی، لیکن یونانی اور رومن تو ان سب کی پرستش کرتے تھے۔

تھیوڈور: ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں، ایک عام یونانی اپنے دیوتاؤں سے ڈرتا تھا، اور ان کی رضاجوئی میں خاصا وقت صرف کرتا تھا۔ فطرت پرستی محض عیاشی نہیں تھی، پھر بھی اس مذہب میں حسن اور خرد کی فراوانی تھی۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ فطرت کی قوتوں کو شخصی ہیئت دے دی جائے اور بہت سے دیوتا، خدائے واحد سے اس لیے بہتر ہیں کہ وہ فطرت کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کو اچھی

طرح سے ادا کر سکتے ہیں۔ اس ایمان اور عقیدے سے فن کی مختلف شکلیں پیدا ہوئیں۔ تدفین سے بت تراشی اور فن تعمیر پیدا ہوئے۔ مذہبی جلوسوں سے تمثیل پیدا ہوئی اور اس وقت جو مذہبی گیت گائے جاتے تھے، ان سے موسیقی اور شاعری کے فنون نے جنم لیا۔ پھر فن نے مذہب میں حسن بھرنا شروع کیا اور قدیم دیوتاؤں کو شان و شوکت عطا کی۔ ہومر اور ہیسائیڈ نے اولمپس کے دیوتاؤں کو واضح اور متعینہ شخصیت بخشی اور فائیڈیاس میں نے انہیں عظمت اور تقدس عطا کیا۔ آپ شاید یہ کہیں گے کہ جب فائیڈیاس کے دیوتاؤں نے جنم لیا تو ہومر کے دیوتا مر چکے تھے۔ عوام نے خطرناک اور شہوت پرست دیوتا بنائے تھے۔ فنکاروں نے ان میں بہترین انسانی صفات کے نقش بھرے اور انہیں یونان کے تہذیب و تمدن کے نشوونما کی علامتیں قرار دیا۔ ہیسائیڈ کی حکایات کا خوں آشام زئیس کس قدر مختلف ہے۔ اس عظیم الشان قادر مطلق سے جسے ایکیلس کے توانا تخیل نے تخلیق کیا اور سوفوکلیس کی متین حکمت نے اعلیٰ صفات کے جامہ سے آراستہ کیا۔ اکثر کتابوں میں اس حقیقت کا ذکر آتا ہے کہ فن مذہب کا رہین منت ہے لیکن اس حقیقت کا کوئی ذکر نہیں آتا کہ مذہب فن کا رہین منت بھی ہے۔

تاہم یہ بات یونانی قدامت پرستوں کے حق میں بری ثابت ہوئی کہ ڈراما، ڈائنوسس کی رسوم سے پیدا ہوا، کیونکہ ڈراما، ادب بن گیا اور ادب نے فلسفہ کی شکل اختیار کی اور فلسفہ قدامت پرستی کا تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ سوفوکلیس کے ایمان وحدت کے بعد دوسرا قدم یوروپیڈس کا تشکک تھا۔ اس کے دوست پروٹیگورس کا یہ قول قابل ذکر ہے کہ "ہمیں معلوم نہیں کہ دیوتاؤں کا وجود ہے کہ نہیں"۔ آپ نے دیکھا میرے عزیز کلیرنس کہ آپ دنیا کے پہلے لاادری نہیں"۔

کلیرنس: میرا بھی یہی خیال تھا۔

تھیوڈور: درحقیقت ڈرامے سے ایک خیال پیدا ہوا، جس نے قدیم دیوتاؤں کو مسمار کر دیا۔ اور وہ خیال تھا تقدیر۔ وہ تقدیر جو دیوتاؤں اور انسانوں کی زندگی پر حاوی ہے۔ اس سے عالم گیر فطری قانون کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مفکروں کا رہین منت ہے۔ علم کی ترقی سے لوگوں نے فطری توجیہات ڈھونڈنا شروع کیں۔ قبل سقراط کے فلسفیوں نے دیوتاؤں کی جگہ پانی، ہوا اور آگ کو لا کھڑا کیا۔ سوفسطائیوں نے لوگوں کو شک کرنے کا اسلوب سکھایا اور فطری توجیہ کے اصول کو حتمی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوشمند نوجوان دہریہ بن گیا۔ افلاطون کے عہد میں یونان کا ابتدائی مذہب کھوکھلا ہو چکا تھا۔ "قوانین" میں افلاطون کہتا ہے "چونکہ اکثر لوگ اب خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور حلف بیکار ہو گیا ہے۔ عدالتوں کو اب محض اثبات و تردید ہی پر اکتفا کرنا چاہیے"۔

کلیرنس: ہم امریکہ میں بھی بہت جلد اسی مقام پر پہنچنے والے ہیں۔ پھر بھی بعض سادہ لوح

لوگ امریکہ کی ترقی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

پال: آپ نے یہ نہیں بتایا تھیوڈور کہ سقراط بھی خدائے واحد پر ایمان رکھتا تھا اور عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے وقت اس نے اپنے اس ایمان کا اعلان کیا تھا۔

تھیوڈور: ہاں افلاطون کی تحریروں میں ایک شدید مذہبی کیفیت نظر آتی ہے لیکن سقراط کا خدا، محض ایک سلبی خدا ہے اور ارسطو کا خدا، ایک سرد مہر کمال جو خود ستائی میں مستغرق ہے۔

کلیرنس: ایک قیاس جو خود نگری میں ڈوبا ہوا ہے۔

تھیوڈور: اور اپی کیورس کے دیوتا بے عمل بادشاہ تھے، جنہیں انسانوں کے معاملات اور مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اریئیل: وہ ایک نہ ختم ہونے والی بزم کی مانند تھے۔

تھیوڈور: اریئیل! کس عمدگی سے آپ نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اب میں اپنا بیان ختم کروں۔ میں صرف ایک دو لمحے اور چاہتا ہوں۔ پرہو اور متشککین کے زمانہ تک یونان کے دیوتا مرکھپ چکے تھے۔ وہ صرف ادبی طبقہ کے لوگوں کے لیے زندہ تھے۔ اب ایک لاادری ثقافت پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے حقیقت کے تجسس کو ترک کر دیا اور تسلیم و رضا پر قانع ہو گئی۔ اس نے فن کی لذتوں اور لذت کے فنون کا مطالعہ کیا اور ایک مائل بہ فنا کائنات کے حسن انحطاط کا مشاہدہ کرنے لگی۔ ایک لحاظ سے یہ یونان کی پختگی کا زمانہ تھا، جیسے تمام متمدن لوگوں نے طامس ہارڈی جارج میرڈتھ جارج کلیمنسو اور اناطول فرانس کی پختگی سے خوشہ چینی کی ہو۔

پال: فلسفیوں کی فتح ہوئی لیکن اپنی فتح کے سرور میں وہ ایک بات بھول گئے۔ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کیا ایک اخلاقی نظام جسے اس کی مافوق الفطرت اساس سے محروم کر دیا جائے، انسانوں کو وہ ضبط نفس نہیں سکھا سکتا جو طاقت اور استحکام کے لیے لازمی ہے۔ اس کا انجام وہی ہوا جو غالباً ہماری تہذیب کا بھی ہو گا کہ اخلاق ختم ہو گیا، نفسی نفسی کا دور دورہ ہوا، جرم، خودکشی اور بدکاری عام ہو گئی۔

تھیوڈور: لیکن عوام کے سینہ میں مذہب پھر کروٹیں لینے لگا۔ ڈیلفی اور ڈیلوس کی قدیم بارگاہیں ایلوا کی رسوم اور سکندری فوجوں کی واپسی کے ساتھ یونان میں مشرقی مذاہب کے نفوذ نے، اس شکست خوردہ قوم کے لیے وہ سامان تسکین بہم پہنچایا، جس کی وہ خواہش مند تھی۔ آرفک مسلک پھر مقبول ہو گیا تاریکیاں سب پر حاوی نہیں ہوں گی، نیک لوگ جنت میں جائیں گے، برے لوگ بھی وہاں جا سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے وارث پادریوں کی جیب گرم کرتے رہیں۔

آرفک مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی اندوہ، ٹائیٹنس کے اس گناہ کی وجہ سے ظہور میں

آیا کہ اس نے خدا کی نافرمانی کی تھی۔ اس ابتدائی گناہ کی وجہ سے روح کو جسم میں مقید کر دیا گیا اور صرف راہبانہ طرز حیات اور پیہم عبادت ہی اسے جسم کے حبس سے نجات دلا سکتی ہے۔ افلاس زدہ لوگوں کو یہ مسلک بہت پسند آیا۔ اجتماعی مذہب ختم ہو گیا لوگوں نے ذاتی نجات کے گن گانے شروع کیے اور دنیوی آلام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مسلک اختیار کیا۔ الہیاتی عالم‘ اس شکست خوردہ زندگی سے زیادہ حقیقی بن گیا۔ اس پاکیزگی کے عہد میں مسیحیت آئی اور روح یونان نے روح مشرق کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

ایریئل: شکریہ‘ تھیوڈور! سر جیمز نے ہمیں مذہب کے آغاز کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں‘ اور آپ نے ہمیں اس کی موت اور احیا سے باخبر کیا‘ آیئے اب ہم کھانا کھائیں‘ کھانا کھاتے ہوئے ہم دیوتاؤں کی تقدیر پر غور کریں گے۔

⁂

باب بست و دوم

کھانے کی میز پر

کنفیوشس سے مسیح تک

۱۔ کنفیوشس

کنگ: میرے عزیز دوست تھیوڈور! آپ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس سے میرے ملک کی خدمت کا پہلو نکلتا ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کریں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ مشرق کے متعلق مغرب کا نظریہ حد درجہ خارجی ہے۔ آپ ایشیا کے حجم کا بھی تصور نہیں کرتے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ یورپ اس عظیم براعظم کا محض ایک شاخسانہ ہے اور ایشیا نہ صرف آپ کے مذاہب بلکہ آپ کی زبانوں اور آپ کی نسلوں کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ایشیا ایک نہایت وسیع خطہ زمین ہے تو شاید آپ اس کے متعلق اتنی جلدی کلیہ طرازی نہ فرمائیں۔ آپ ایک براعظم کے بارے میں یک قلم اس طرح کے فیصلے صادر نہیں کر سکتے۔

ایریَیل: بہت خوب کنگ! ہمیں کچھ اور باتیں بتایئے۔

کنگ: ایشیاء کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا مشرق قریب کا اسلامی ایشیا لیکن وہاں بھی کتنی مختلف نسلیں آباد ہیں! عثمانی ترک، یہودی نژاد عرب اور یہودی، ایرانی اور افغان، قفقازی اور آرمینین۔ دوسرا تصوف پسند ایشیا یا پاک و ہند کا براعظم جس کے متعلق سدھا ہمیں بہت سی باتیں بتائیں گے۔ تیسرا حصہ سائبیریا جس میں منگول، روسی، کوریا اور جاپان کے لوگ شامل

ہیں، جن کے اختلافات کی وجہ سے ان کے متعلق کوئی کلیہ قائم کرنا آسان نہیں اور چوتھے چین، جہاں دنیا کی قدیم ترین اور جدید ترین قوم آباد ہے۔ ہم امریکہ کو اس قدر اہمیت کیونکر دے سکتے ہیں جب کہ اس کی تہذیب محض دو سو سال اور ہماری تہذیب پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ مغرب کی ترقی پسندی اور مشرق کے جمود کے تصاد کا ذکر مضحکہ خیز ہے۔ کتنی مرتبہ چین کی مختلف تہذیبوں میں ترقی کے مسئلہ پر ہنگامے بپا ہوئے ہیں۔ چین نے سب مسلک آزمائے ہیں اور ان سے بیزار ہو چکا ہے۔ وہ پروٹیگورس کی طرح ہے، جس نے سب باغیانہ خیالات آزمانے کے بعد رسمی تصورات کی پابندی شروع کر دی۔ اس نے ان آزمائشوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک خیال اور دوسرے خیال، ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کے بارے میں اپنے جذبات میں ہیجان بپا کرنا غلط ہے۔ جب تک آپ نے ہمیں صنعت، جمہورت اور دولت کی ہوس کا نشہ نہیں پلایا تھا، ہم اپنے رسم و رواج اور امن کے تواتر سے مطمئن تھے۔ اگر ترقی محض ایک سطحی تبدیلی ہے تو چین ٹھیک کہتا ہے کہ ہر رسم اپنی جگہ اچھی ہے اور ہل جوتنے کی زندگی اتنی ہی اچھی ہے، جتنی کہ صنعت اور تجارت کی پریشان زندگی۔ وہ سادہ کسان جو کھیتی باڑی کرتا ہے اور اپنے آباؤ اجداد کی قبور کی حفاظت کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے، اتنا خوش اور مطمئن ہے جتنا کہ دنیا کا کوئی اور انسان ہو سکتا ہے۔

اریئیل: کنگ! ہمیں چینی مذہب کے متعلق کچھ بتایئے۔

کنگ: مادام! چین میں ایک مذہب نہیں ہے۔ چین میں بدھ مذہب ہے، اسلام ہے۔ بعض لوگ ارواح اور اصنام کی پرستش کرتے ہیں، بعض مقدس جانوروں کی۔ میں موخر الذکر کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ اوہام دنیا میں ہر جگہ کسانوں کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ سوائے نوجوان قوم پرستوں کے، ہر مذہب میں آبا پرستی کا عنصر موجود ہے، جس کے ذریعہ مردے زندہ لوگوں کی زندگیوں پر حاوی ہیں۔ وہاں لاؤزے کا مذہب تاؤ یا صراط بھی ہے (جو کہ بڑی حد تک بدھ مت میں جذب ہو چکا ہے) اب بھی نفس کش صوفی پیدا کر رہا ہے اور وہاں کنفیوشس کا مذہب ہے جو کئی سو سال سے چین کے تعلیم یافتہ طبقے کا مذہب رہا ہے۔ ان مذاہب میں سوائے اس کے کہ وہ چینی ہیں، اور کوئی صفت مشترک نہیں۔ انہیں مشرقی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اگر وہ مشرقی تھے تو مسیح اور سقراط بھی مشرقی تھے۔ لاؤزے کا مذہب بنیادی اصولوں میں مسیح کے مذہب سے بہت ملتا جلتا ہے اور کنفیوشس کا فلسفہ بڑی حد تک سقراط کے فلسفہ سے مماثل ہے۔ میں آپ کو لاؤزے کے چند اقوال سنا دوں؟

"ظلم کے بعد رحم کر۔ بھلے لوگوں کے ساتھ میں بھلائی کروں گا۔ برے لوگوں کے ساتھ

بھی میں بھلائی کروں گا تاکہ وہ بھلے بن جائیں۔ وفاداروں کے ساتھ میں وفا کروں گا۔ بے وفاؤں کے ساتھ، بھی میں وفا کروں گا تاکہ وہ وفادار بن جائیں۔ جو دوسروں پر اعتماد نہیں کرتا' وہ ان میں اعتماد نہیں پائے گا۔ پیچھے رہو اور تم آگے پہنچ جاؤ گے۔ جو شخص انکسار سے کام لیتا ہے' وہ محفوظ و مامون رہے گا۔ جو اپنا سر جھکاتا ہے' اسے سربلند کیا جائے گا۔ جو شخص عظمت کا متمنی ہے' وہ انکسار کو اپنی زندگی کی اساس بناتا ہے۔ جو شخص اپنی طاقت کا شعور رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کمزور بنا کر خوش ہے' وہ انسانیت کا مجسمہ ہے۔ عالم ہو کر بھی اپنے آپ کو جاہل سمجھنا حکمت کا کمال ہے۔ حکیم اپنے دل کی دولت کا شعور رکھتے ہوئے اس کی نمائش نہیں کرتا۔ وہ خوددار ہے لیکن اپنے لیے کسی اعزاز کا خواہاں نہیں۔ فطرت کی ہر چیز خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے۔ وہ معرض وجود میں آتی ہے اور کسی اور چیز پر قبضہ نہیں کرتی۔ وہ اپنا فرض ادا کرتی ہے اور کوئی دعوئ نہیں کرتی۔ سب چیزیں اپنا فریضہ ادا کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ جب کوئی چیز اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو پھر اپنے ماخذ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ ماخذ کی طرف رجوع کا مطلب سکون یا تقدیر کی تکمیل ہے۔ رجعت ایک دائمی قانون ہے۔ اس قانون کا شعور حکمت ہے۔ انا کی رضا سے کوئی کام نہ کرو لیکن رضائے مطلق کے مطابق زندہ رہو تو تمہارے سب کام پورے ہو جائیں گے"۔

میتھیو: بہت خوب لیکن اس میں مذہب کا عنصر بہت کم ہے۔

کنگ: اس لحاظ سے کنفیوشس میں تو مذہب اور بھی کم ہے۔ اس نے مافوق الفطرت اصطلاحیں استعمال ہی نہیں کیں اور اسے حیات بعد ممات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب ایک شاگرد نے اس سے پوچھا کہ روحوں کے بارے میں انسان کے کیا فرائض ہیں؟ تو اس نے جواب دیا "ہم زندہ لوگوں کے متعلق اپنے فرائض ادا کرنے سے پہلے مردوں کی روحوں کے متعلق کیونکر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں" اور جب اس شاگرد نے موت کے بارے میں سوال کیا تو کنفیوشس نے جواب دیا "زندگی کا علم حاصل کرنے سے پہلے ہم موت کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟" انسانی فرائض کو سنجیدگی سے ادا کرنا اور دوسرے لوگوں کا احترام کرنا حکمت کی جان ہے۔

کنفیوشس کا مذہب وحدت الوجود کا مذہب تھا' جو سپنوزا کے فلسفہ کے بہت قریب ہے۔ ذرا ان اقوال پر غور کیجئے۔ کیا یہ سپنوزا کی اخلاقیات کے اقتباس نہیں معلوم ہوتے؟

"حق خدا کا قانون ہے۔ حق کا مطلب اپنے وجود کا حق ادا کرنا ہے۔ اخلاقی قانون ہمارے وجود کا قانون ہے۔ حق کے ذریعہ ہم سے خارجی اشیاء وجود میں آتی ہیں۔ یہ حق مطلق غیر فانی ہے اور غیر فانی ہونے کی وجہ سے یہ اپنے وجود کا سبب خود آپ ہے اور اس وجہ سے لامنتہی ہے۔ یہ شعور کے بغیر معقول اور ماورائے ادراک ہے۔ چونکہ یہ لامتناہی اور دائمی ہے۔ یہ سارے وجود میں

سمایا ہوا ہے"۔

کنفیوشس نے دنیا کو کوئی دین، کوئی مسلک نہیں بلکہ ایک اعلیٰ اخلاقی نظام عطا کیا۔ اعلیٰ انسان کا مسلک۔ بعض جگہ اس کے اقوال مسیح کے اقوال سے ملتے جلتے ہیں۔ مسیح سے پانچ سو برس پہلے اس نے کہا تھا "جس سلوک کی آپ دوسروں سے توقع نہیں رکھتے، وہ دوسروں سے روا نہ رکھیں"۔ لیکن وہ سقراط، ارسطو اور گوئٹے سے بہت مشابہ ہے۔ وہ اخلاق اور ذہانت کو مترادف قرار دیتا ہے اور انکسار اور نرم مزاجی کی نہیں بلکہ شخصیت کے پورے نشوونما کی تلقین کرتا ہے۔ جب میں چین میں طالب علم تھا تو مجھے اس کے اقوال حفظ کرنے پڑے تھے۔ میں کئی گھنٹے تک آپ کو وہ سنا سکتا ہوں۔

"اعلیٰ انسان کیا ہے؟ جو احترام کے ساتھ اپنی شخصیت کی تربیت کرتا ہے۔ اعلیٰ انسان جانبدار نہیں، کشادہ دل ہوتا ہے۔ عام انسان کشادہ دل نہیں، جانب دار ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسان سوجھ بوجھ کے ساتھ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اپنے الفاظ کے باعث تباہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بولنے سے پہلے عمل کرتا ہے اور اپنے قول کو اپنے عمل کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہ مناظرہ نہیں کرتا۔ وہ اعتدال کی راہ پر چلتا ہے...... ان گنت چیزیں انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ جب اس کی پسند اور ناپسندیدگی کسی قانون کے مطابق نہیں ہوتی تو اس کی فطرت خارجی اشیاء کی فطرت کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ اعلیٰ انسان ہر چیز اپنے اندر ڈھونڈتا ہے۔ ادنیٰ انسان ہر چیز دوسروں سے طلب کرتا ہے۔ اعلیٰ انسان پریشان رہتا ہے کہ وہ حق تک کیونکر پہنچے۔ وہ اس لیے فکرمند نہیں ہوتا کہ کہیں وہ مفلس نہ ہو جائے۔ وہ اپنے اندر استعداد کی کمی کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے اس لیے نہیں کہ دوسرے اسے نہیں جانتے۔ وہ صفت جس میں کوئی اعلیٰ انسان کی برابری نہیں کر سکتا، اس کا وہ کام ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔

۲۔ تصوف

سدھا: میرے عزیز کنگ! لیکن یہ مذہب تو نہیں۔ یہ محض اخلاق ہے اور اخلاق بھی اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لیے، جنہیں اخلاق کی غالباً کوئی ضرورت ہی نہیں۔ مذہب اخلاق کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے اور اس چیز کے بغیر اخلاق ایک ایسی آگ ہے جو دور ہونے کی وجہ سے اپنی حرارت تم تک نہیں پہنچا سکتی۔ مذہب کوئی نظریہ نہیں اور یہ محض کوئی عقلی چیز بھی نہیں۔ یہ ایک احساس ہے جس میں کل کا ادراک روح کو یکایک جذب کر لیتا ہے۔ خود غرضی کو سپردگی اور علیحدگی کو ربط کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ معلوم نہیں مغرب کے لوگوں پر یہ احساس کبھی طاری ہوتا ہے کہ نہیں؟

فلپ: جیکب بوہم اور سینٹ فرانسس پر یہ احساس طاری ہوا تھا۔

اینڈریو: پال بلڈ کہتا تھا کہ یہ احساس اشیر کے اثر سے طاری ہو جاتا ہے۔

سدھا: یہ مثالیں تو ایسی ہیں جنہیں ہم مستثنیات کہہ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مذہب کا اثر بہت کم ہے۔ ہندوستان میں جزو اور کل کے ربط کو مذہب کی جان سمجھا جاتا ہے، کسی شخص کو ہم محض اس لیے متدین نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک نظریہ پر ایمان لے آیا ہے اور اس کی متعلقہ رسوم ادا کرتا ہے۔

ہمارے مذہبی پیشوا یعنی برہمن، اپنے خدا برہما کی نسبت سے برہمن کہلاتے ہیں لیکن یہ لفظ (برہما) کی ایک شخصیت کے لیے نہیں بلکہ ایک مکمل حقیقت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ برہمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف برہما ایک لامحدود حقیقت ہے۔ انسانوں کی علیحدگی فریب ہے۔ جب آپ یہ محسوس کریں کہ آپ کی شخصیت پگھل رہی ہے اور آپ بحرِ وجود میں مطمئن ہو کر تیر رہے ہیں اور اس جذب کے علاوہ ہر چیز آپ کو حقیر معلوم ہو، تب آپ کو معلوم ہو گا کہ مذہب کیا ہے اور خدا کیا ہے۔ آپ خود خدا کا ایک جزو بن جائیں گے۔

ایرئیل: مجھے تھورو کا ایک فقرہ یاد آ رہا ہے۔ "ایک گرم دن جب میں ندی کے ست رو پانی پر بہتا ہوں تو میں زندہ نہیں رہتا اور وجود پا لیتا ہوں"۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں پرندوں کو چہچہاتے سنتا ہوں تو اپنے آپ کو ایک "بڑے حیوان" کا جزو سمجھتا ہوں۔

سدھا: مادام! مجھے یہ قول یاد ہیں۔ یہ کتنے حسین قول ہیں! کیا آپ کو معلوم ہے کہ تھورو ہندو فلسفیوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "چونکہ میں ہندو فلسفہ کو بہت پسند کرتا ہوں، میرے لیے چاول ہی مناسب غذا ہیں"۔

کلیرنس: لیکن یہ لازمی نہیں کہ یہ "احساس کل" مذہبی نوعیت ہی رکھتا ہو۔ ایک مرتبہ ایک ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے میں نے دریچہ میں سے نیلے آسمان پر سرخ بادل دیکھے۔ اس عظیم گنبد کے حسن سے میں بے حد متاثر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک مقدس کل کا ایک بے حیثیت جزو ہوں۔ لیکن یقین جانئے کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں۔

اینڈریو: محض کل کے ساتھ وصل کا سرور ہی ہندو مذہب کی جان نہیں، اس کے علاوہ عبادت، جنس اور تثلیث اس کے خاص عناصر ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کرشن جی مہاراج نے جو اس تثلیث میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، انسان کا روپ دھارا اور دنیا کو نجات دلوا دی۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب دیوتاؤں اور دیویوں سے بھرا پڑا ہے۔ رائناخ کہتا ہے کہ "ہندو دیوتاؤں کی آماجگاہ ایک گھنے جنگل کی مانند ہے"۔ لوگ "احساس کل" کے متوالے نہیں۔ وہ محض ایک دلچسپ لیکن

ناقابل یقین افسانہ سننا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو سدھا کا یہ صوفیانہ سرور مرغوب نہیں۔ انہیں یہ افسانہ پسند ہے کہ ایک دیوتا نے ایک سمندر کا سارا پانی پی لیا اور دوسرے نے ایک رات میں دس ہزار باکرہ عورتوں کے ساتھ ہم بستری کی۔ اس کے بعد انہیں رسمیں منانے کا چسکا ہے۔ مثلاً وہ گنگا میں اپنے ہاتھ دھوتے ہیں (جیسے گنگا کسی چیز کو پاک کر سکتی ہے) منتر پڑھتے ہیں اور اپنی تقدیر کو ذکری تعویذوں کی کبریائی قوت کے سپرد کر دیتے ہیں۔ سچ بتایئے۔ سدھا! کیا میں صحیح نہیں کہہ رہا؟

سدھا: جی نہیں! لیکن آپ نے مذہب کی روح اور جسم کو آپس میں الجھا دیا ہے۔ آپ کے فلفی یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی مشین یا ڈھانچہ ہی اس کی روح ہے۔ عام لوگ جن کی رسوم کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے، کبھی کبھی لمبے روزے رکھ کر اپنے آپ کو نڈھال کر لیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ فاقوں میں کوئی لذت یا تسکین ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کی مدد سے انسان انا کے احساس سے آزاد ہو کر کل میں جذب ہو جاتا ہے۔ میں نے ان سادھوؤں کو دیکھا ہے جو اپنی مٹھیاں اتنی مدت تک بند رکھتے ہیں کہ ان کے ناخن ان کی ہتھیلی کو چیر کر دوسری طرف سے باہر نکل آتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بالکل فراموش کر دیا تھا یا بدھ کی مثال لے لیجئے۔ مسیح کی طرح اس نے بھی روایتی مذہب کو مصائب و نقائص سے منزہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ان مکھیوں کو مارنے سے انکار کر دیا جو اس کا ناک میں دم کیے رکھتی تھیں۔ وہ ان شیروں کی طرف بھی مائل بہ کرم تھا، جو ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو کھا جاتے تھے۔ عیسائیوں کی طرح وہ جنت اس کا مطمح نظر نہیں تھی، جس میں سب خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ خواہش کی فنا اس کا مقصد تھا۔ تاکہ شخصیت روح کائنات سے ہم آغوش ہو جائے۔ "نروان" کا یہی مطلب ہے۔ آپ "انا" کے احساس سے پاک ہو جائیں تو آپ کی روح دائمی حقیقت میں سما جاتی ہے۔

اینڈریو: میرا خیال ہے کہ ہم سب کو "نروان" مل جائے گا۔ بدھ مذہب کی دہریت مجھے پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے خدا کے تصور کے بغیر ہی ایک نہایت توانا مذہب تعمیر کر لیا تھا۔

سدھا: اگر خدا سے آپ کی مراد ایک عظیم الشان شخصیت ہے تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ لیکن اگر خدا سے مطلب روح کل ہے تو آپ کا بیان صحیح نہیں۔

اینڈریو: میں نے سنا ہے کہ بعض روایات کی رو سے بدھ ایک باکرہ عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر دیوتا کی پیدائش فطری تولید کی توہین کرتی ہے، جو کبھی ہر دیوتا اور دیوی کے وجود کی علامت اور سرچشمہ تھی۔

سدھا: آپ کو ان افسانوں کو سطحی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس طرح آپ اس حکمت سے محروم رہ جائیں گے جو ان میں استعارۃً "اور کنایۃً" بیان کی گئی ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ

یہ باتیں مذہب کی جان نہیں ہیں۔

اینڈریو: آپ کا مطلب ہے کہ یہ باتیں مذہب کے بدن پر مکھیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سدھا: جی ہاں آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ شاید دس بیس سال میں' مغرب کے لوگ مذہب کے معنی سمجھنے لگیں۔ اب آپ مذہب کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ آپ مشینوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور آپ کے خیالات ہمیشہ زر و جواہر کی طرف مائل رہتے ہیں۔ لیکن جنگ صنعت کو تباہ کر دے گی اور یورپ اور امریکہ اندوہ و الم کے محیط میں غرق ہو جائیں گے۔ اس وقت انفرادی دولت اور شخصی تفاخر ختم ہو جائے گا۔ اس رنج و الم کے سیلاب میں لوگ پھر خدا کا شعور حاصل کریں گے۔ خدا کو جو ایک بے نام روح اور زندگی ہے' ایک ہندو مفکر نے خدا کا تصور ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "خدا وہ عدم ہے جو درخت کے سارے حصے کاٹ دینے کے بعد رہ جاتا ہے"۔ اب بھی جب آپ جسمانی لذتوں اور مادی چیزوں سے تنگ آتے ہیں تو مشرق ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مسیحی سائنس آپ لوگوں میں مقبول ہو رہی ہے اور ان لوگوں میں جنہیں روح کل سے اپنی جدائی کا احساس ہے' تھیوسوف عقیدہ کی کشش بڑھ رہی ہے۔ کسی نہ کسی دن آپ ہندوستان کو اور مذہب کو سمجھ جائیں گے۔

تھوڈور: آپ شاید صحیح کہہ رہے ہیں۔ مذہب کی تاریخ روح یونان اور روح مشرق کی پیہم آویزش کی داستان ہے۔

۳۔ یہودیت

ایلستھر: میں سدھا کی طرح یہ محسوس کرتی ہوں کہ ہم نے مذہب کے چند اہم عناصر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم "خدا کے لیے" کہتے تو ہیں لیکن ہمارے لیے یہ فقط تین الفاظ ہیں۔ حالانکہ مذہب ان الفاظ کے معنی سے دلچسپی رکھتا ہے۔ مذہب یہ چاہتا ہے کہ ہم سب کام خدا کے لیے کریں۔ انسان کش لذتوں سے محروم رہیں اور اس آخری اور قطعی نظام یعنی خدا کے لیے اندوہ و الم برداشت کریں۔ یہی بات مذہب کا نچوڑ ہے اور اس کے بغیر اخلاق بے جان مشین کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کی بدولت یہودی مذہب دوسرے مذاہب سے ممتاز ہے۔

اریئل: ہاں مجھے افسوس ہے کہ ہم نے مذہب کے بارے میں اتنی باتیں کیں اور دنیا کی سب سے زیادہ مذہبی قوم کا ذکر نہیں کیا۔ ایلستھر تم ہمیں یہودی مذہب کے اصولوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔

ایلستھر: یہ داستان شروع سے آخر تک حسین نہیں ہے۔ کیونکہ اس نہایت سنجیدہ مذہب

کی ابتدا نظریہ روح مظاہر اور توہمات میں دبی ہوئی ہے۔ ابتدائی یہودی چٹانوں، مویشیوں، بھیڑ بکریوں اور غاروں اور کنوؤں کی روحوں کی پرستش کرتے تھے۔ وہ علامتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کے یہاں ایک وحشیانہ قسم کے جادو کا استعمال عام تھا۔ حتیٰ کہ وہ ایک بکس میں پانسے پھینک کر خدا کی مرضی کا پتا چلانے کی کوشش کرتے تھے۔

اینڈریو: ہم آج بھی خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لیے یہ کھیل کھیلتے ہیں۔

ایلستھر: اس مذہب میں ذکری علامتوں کی پرستش کا بھی رواج تھا۔ سانپ اور بیل کو ذکری علامتیں سمجھا جاتا تھا اور بال دیوتا نر اصول کا پیکر تھا جس کا کام مادہ زمین کو زرخیز اور شاداب بنانا تھا۔ تقریباً تمام یہودی تہوار زراعتی رسوم سے پیدا ہوئے ہیں۔ مزاتھ کا تہوار جو کی فصل کاٹنے سے متعلق تھا۔ شبواوتھ گندم کی فصل کو کاٹ چکنے پر منایا جاتا تھا اور سکوتھ میں انگوروں کے توڑنے کی خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ پیساچ، بھیڑ بکریوں کے پہلے بچوں کی پیدائش سے تعلق رکھنے والا تہوار تھا۔ ایک بھیڑ کو ذبح کیا جاتا اور اس کے گوشت پر ایک ضیافت قائم ہوتی۔ اور اس کا لہو دروازے پر چھڑکا جاتا تاکہ حریص خدا کی حرص پوری ہو۔ اس کے بعد اس رسم کا مطلب یہ نکالا گیا کہ خدا نے مصریوں کے پہلے بچوں کو قتل کروا دیا تھا لیکن یہودیوں کی پہلی اولاد کو اس طرح محفوظ رکھا کہ ان کے دروازوں پر بھیڑ کا خون چھڑک دیا لیکن یہ توجیہہ مذہبی پیشواؤں کی من گھڑت تھی۔ یہ رسم کنعانیوں سے لی گئی تھی جو بھیڑ کے بچے کو دیوتا کی بارگاہ میں قربان کرتے تھے۔ ابتدا میں بھیڑ کنعان کے ایک قبیلہ کا ٹوٹم تھی اور پھر یہ مسیحیت میں مسیح کی علامت بن گئی۔ اس مذہب میں دوسرے ٹوٹموں کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ یہوداہ کو اکثر بیل کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور سور کا گوشت یہودیوں کے لیے اس لیے حرام ہے کہ سور ابتدائی یہودیوں کا ایک ٹوٹم تھا۔

اینڈریو: کیا کہا؟ میں سمجھتا تھا کہ اس خیال کی بنیاد حفظان صحت کے کسی اصول پر ہے اور تمام مشرق قریب میں سور اس لیے حرام ہے کہ اس کے کھانے سے مہلک امراض پیدا ہوتے ہیں۔

ایلستھر: رابرٹسن سمتھ اور سلومن رائناخ، جو ایک دوسرے سے بہت کم اتفاق کرتے ہیں اس روایتی توجیہ کو بیک زبان مسترد کرتے ہیں۔ انجیل میں کہیں بھی کسی مرض کو غلیظ جانوروں کے گوشت سے منسوب نہیں کیا گیا۔ مرض ہمیشہ روحوں کے غیض و غضب سے پیدا ہوتا رہا ہے اور صحیح علاج بدروح کا بدن سے اخراج ہے۔ حفظان صحت ایک یونانی تصور ہے۔ اینڈریو! آپ کو معلوم ہے کہ رائناخ، حفظان صحت کے خیال کو حرمت خنزیر کا سبب قرار دینے کو جہالت کا اظہار سمجھتا ہے۔

اینڈریو: میں نے یہ توجیہ رینان کی ایک تصنیف میں پڑھی تھی۔

ایلستھر: رائناخ نے رینان کا مذاق اڑایا ہے۔

اینڈریو: کسی دن ماہرین علم انسان' رینان کا مذاق اڑائیں گے۔ میں ان مستند حضرات کے ناموں سے متاثر نہیں ہوا۔ یہودیوں کے اخلاقی نظام میں حفظان صحت کے بہت سے عناصر موجود ہیں۔ اس لیے حرمت خنزیر کو حفظان صحت کے خیال سے منسوب کرنا کوئی ایسی غیر معقول بات نہیں لیکن آپ اپنی بات جاری رکھئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔

ایلستھر: موسوی نظام میں "دس احکام" کی فہرست ایک ایسا عنصر ہے جو حفظان صحت کے اصول سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ لیکن یہ احکام بھی ایک وحشیانہ سادگی سے آراستہ تھے۔ ان کا موضوع قبیلہ پروری ہے' انسانیت کا احترام نہیں۔ انہیں پیغمبروں کا انتظار کرنا تھا۔ "تم قتل نہیں کرو گے" اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ یہودی جنگ نہیں کریں گے' کیونکہ بسا اوقات یہوداہ نے قتل عام کا بھی حکم دیا ہے۔

کلیرنس: ہاں! جیسا کہ خداوند نے موسیٰؑ کو حکم دیا تھا اور اس کے مطابق انہوں نے مدیانیوں سے جنگ کی اور سب مردوں کو قتل کر دیا...... موسیٰؑ ان سے کہنے لگا "کیا تم نے سب عورتیں جیتی بچا رکھی ہیں..... اس لیے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں' ان کو قتل کر ڈالو"۔

ایلستھر: ہاں اور اس وحشت و بربریت ہی سے انسان کی بعض بہترین اخلاقی اقدار نے جنم لیا۔ موسوی نظام اس ترقی کا ایک نہایت اہم سبب تھا۔ اس نے یہودیوں کے کردار کو استحکام بخشا اور باقاعدگی اور فلسفیانہ رحمت کشی کی تعلیم سے ان میں یہ قوت پیدا کی کہ ان مصائب اور آلام کا بہادری سے مقابلہ کریں جو بعد میں مسیحی دنیا نے ان پر نازل کیے۔

یہ پہلا نظام تھا جس نے پارسائی کے بعد صفائی کو اہمیت دی اور انسانی جسم کو وہ حرم سمجھا جس کی نگہداشت مذہبی خلوص اور سپردگی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ اکثر اوقات لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ نظام عمورابی کے نظام سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن یہ پہلا نظام تھا جس نے غلاموں کے ساتھ نرمی کے برتاؤ کی تلقین کی اور اس کے جشن طلائی کے ادارہ میں تو ہمیں اشتراکیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ "زمین ہمیشہ فروخت نہیں ہوتی رہے گی۔ کیونکہ میں زمین کا مالک ہوں...... اور تم پچاسویں سال کو مقدس سمجھو گے اور سب باشندوں کے لیے آزادی کا اعلان کرو گے۔ یہ تمہارے لیے ایک تہوار ہو گا' اور تم ہر شخص کو اس کی ملکیت لوٹا دو گے اور ہر شخص کو اس کے کنبہ میں بسا دو گے"۔ یہ یہودیوں کا عمل نہیں، محض نصب العین تھا لیکن دوسری قومیں اس نصب العین سے بھی محروم تھیں۔

آپ نے خون آشام خدا، یہوداہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ جنگ کا دیوتا تھا اور ابتدائی یہودیوں کا ایک قبائلی خدا۔

یرمیاہ نے کہا "اوہ یہوداہ، تمہارے شہروں کی طرح تمہارے دیوتا بھی متعدد ہیں اور جب نعومی نے روت سے کہا "تمہاری بہن تمہارے لوگوں اور تمہارے خداؤں کے پاس واپس چلی گئی ہے" تو روتھ نے جواب دیا "تمہارے لوگ میرے لوگ ہیں اور تمہارے خدا میرے خدا ہیں"۔ قبیلہ سے انتقال کرنے کا مطلب دیوتاؤں کو بدلنا تھا۔ یہ "چند خدائی" اس زمانہ تک قائم رہی جب کہ پینٹیاٹیوک لکھی گئی۔ اس لیے کہ تخلیق کائنات کی کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہوداہ نے یہ دنیا تخلیق کی اور اس کے بعد ایلوہیم نے (اور ایلوہیم کا مطلب بہت سے خدا ہے) تخلیق کائنات اور جنت العدن کی کہانی ایشیائے کوچک کی مختلف قوموں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ محض پادریوں کا وہم تھا کہ یہ کائنات ۰۰۷ قبل مسیح میں تخلیق ہوئی۔ یہ کہانی ایرانیوں، فنیشیوں، کلدانیوں اور بابل کی مذہبی روایتوں میں موجود ہے۔ ۸۰۰ قبل مسیح میں ہسایئڈ نے اس یونانی روایت کا ذکر کیا ہے کہ مبارک لوگوں کے جزیرہ میں ایک درخت پھوٹا جس کی ٹہنیوں پر سونے کے سیب لگے جو انسانوں کو بقا و دوام بخشتے تھے۔

سدھا: ہمارے یہاں بھی اسی قسم کی ایک روایت ہے۔ وید میں لکھا ہے کہ شوجی مہاراج نے آسمان سے ایک انجیر کا درخت پھینکا اور عورت سے کہا کہ وہ مرد سے کہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے دوام حاصل ہوتا ہے اور اس طرح مرد کی آزمائش کرے۔ مرد نے وہ پھل کھا لیا اور شوجی نے اس پر لعنت بھیجی اور درد و اندوہ کو اس کی قسمت بنا دیا۔

کنگ: قدیم چین کی ایک کتاب "چی کنگ" میں یہ لکھا ہے:

"سب چیزیں پہلے مردوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن عورت نے اپنی ہوس علم سے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ ہمارے آلام کا سبب آسمان نہیں بلکہ عورت ہے۔ آہ بدنصیب عورت! تم نے وہ آگ سلگائی جو ہمیں بھسم کر رہی ہے اور یہ آگ روز بروز بڑھ رہی ہے"۔

فلپ: ان روایتوں کے پس منظر میں یہ احساس موجود ہے کہ جنس اور علم بدی کے سرچشمے ہیں، جو ایک معصومیت کی شادمانی کے جانی دشمن ہیں۔ یہ موضوع پوری انجیل میں شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے۔ اسی ضمن میں عورت کی تضحیک کے سلسلے میں یہ پر معنی فقرہ بھی ہے کہ "جو شخص علم میں اضافہ کرے گا وہ دکھ میں اضافہ کرے گا"۔ مسیح نے بھی جنسی محبت کی مذمت کی ہے اور بچوں کی حکمت کو سراہا ہے۔

کلیرنس: اس میں شبہ نہیں کہ ان باتوں میں خاصی صداقت ہے۔ کیا ہم اب اس وقت کے

مقابلے میں جب ہم علم سے محروم تھے، زیادہ غمگین اور افسردہ نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے بچوں کے معصوم چہروں کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ غالباً اس لیے کہ وہ جنس اور علم دونوں کی قید سے آزاد ہیں اور یہ چیز ہمارے لیے باعث رشک ہے لیکن ایستھر! ہم آپ کے بیان میں مخل ہو رہے ہیں۔

ایستھر: صرف دو باتیں اور باقی رہ گئی ہیں۔ یہودی وحدت ربانی کے قائل تھے اور انہوں نے معاشرتی عدل کی تلقین کی۔ ان ابتدائی دیوتاؤں کی قبائلی حیثیت دراصل قبیلہ کی اقتصادی خود اختیاری اور علیحدگی پر مبنی تھی۔ جب قبائلی زندگی میں تجارت کی نشوونما ہوئی اور اقتصادی حیثیت سے لوگوں کو ایک دوسرے کا محتاج ہونا پڑا تو قبائل آپس میں مل گئے اور مختلف دیوتاؤں کے خصائل بھی ایک دوسرے میں رس بس گئے۔ آخر کار قبائلی طرز فکر سے ہٹ کر ساری انسانیت کے بارے میں سوچنا ممکن ہوگیا اور اس طرح خدائے واحد کے تصور نے جنم لیا۔ -سعیاہ نے سب سے پہلے اس عظیم خدا کا ذکر کیا "خدائے عظیم کو دیکھو جس نے اپنی ہتھیلی پر تمام پانیوں کو سنبھال رکھا ہے، جس نے افلاک کی گردش کو معین کیا ہے اور جو زمین کی خاک کو اپنی مٹھی میں لے کر پہاڑوں اور چٹانوں کو ترازو کے پلڑوں میں تولتا ہے..... دیکھو کہ اقوام اس کے لیے ایک مشکیزہ میں پانی کے ایک قطرے کی مانند ہیں..... دیکھو کہ وہ جزیروں کو اس طرح اٹھاتا ہے جیسے وہ کوئی چھوٹی سی چیز ہوں"۔ اس کے بعد ایوب نے خدا کا تصور اس طرح باندھا کہ وہ نظام کائنات ہے۔ اس منزل پر یہودیوں کا مذہب، جو جادو اور توہمات سے شروع ہوا تھا، سپنوزا کی بلند نظری کے قریب جا پہنچا اور اس نے جدید سائنس کی بنیادیں تعمیر کیں۔ لیکن وحدت خدا سے زیادہ اہم انسانیت، ترک جنگ اور اجتماعی عدل کے تصورات کی تخلیق تھی۔

کلیرنس: ترک جنگ؟ ہم ابھی تک یہ غور کر رہے ہیں کہ اس کے متعلق غور کریں کہ نہ کریں۔

ایستھر: عاموس یروشلم میں آیا، دروازے میں کھڑا ہوگیا اور انسان کے نئے مذہب کا اعلان کرنے لگا "چونکہ تم غریبوں پر ستم کرتے ہو اور ان سے گندم کا خراج لیتے ہو، تم نے ترشے ہوئے پتھروں کے مکان بنائے ہیں لیکن تم ان میں رہ نہیں سکو گے۔ تم نے انگور کی فصل تیار کی ہے، لیکن تم اس کی شراب نہیں پی سکو گے۔ لعنت ہے ان پر جو یہاں آرام سے رہتے ہیں، جو مرمریں بستروں پر لیٹتے ہیں اور جو صوفوں پر استراحت کرتے ہیں"۔ بارگاہوں میں قربانیاں دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ خدا ان سے کہے گا "میں تمہارے تہواروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اگرچہ تم میرے لیے لذیذ غذاؤں کے تحفے لاتے ہو، میں انہیں قبول نہیں کروں گا۔ میں تمہارے نغموں کے شور سے بیزار ہوں۔ اپنے ساز اٹھا لے جاؤ۔ لیکن انصاف اور نیکی کی راہ صاف

کرو یا دیکھیے ۔سعیاہ کیا کہتا ہے:

"خدا عوام کے بادشاہوں اور حاکموں سے محاکمہ کرے گا۔ تم نے انگور کی ساری فصل ہضم کر لی۔ تم نے مفلسوں کا حق چھین لیا اور اپنے گھر بھر لیے۔ تم کیوں لوگوں کو مارتے پیٹتے ہو اور مفلسوں کو خاک میں روندتے ہو۔ لعنت ہے ان لوگوں پر جو کئی گھروں اور کئی کھیتوں کو ملا کر ان پر ملکیت حاصل کرتے ہیں۔ تم محاکمہ اور محاسبہ کے دن اور اس تنہائی اور بربادی کے دن کیا کرو گے کہ جو دور سے تم تک پہنچے گا؟ تم اس وقت کس کو مدد کے لیے پکارو گے اور اپنی شان و شوکت کو کیا کرو گے؟ خدا نے کہا۔ تمہاری قربانیوں کی کثرت تمہیں کیا فائدہ پہنچائے گی؟ میں بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کی قربانیوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میری روح تمہاری ضیافتوں سے متنفر ہے۔ وہ میرے لیے دکھ کا باعث ہیں۔ میں انہیں قبول نہیں کرنا چاہتا۔ جب تم اپنے ہاتھ میری طرف پھیلاؤ گے تو میں اپنی آنکھیں بند کر لوں گا۔ ہاں جب تم مجھ سے دعا مانگو گے تو میں اسے نہیں سنوں گا۔ تمہارے ہاتھ خون آلود ہیں۔ انہیں دھوؤ تاکہ تم پاک ہو جاؤ۔ میری آنکھوں کے سامنے سے اپنے اعمال یا بدی کو دور لے جاؤ۔ گناہوں سے احتراز کرو، نیکی کرنا سیکھو، شعور حاصل کرو، مظلوموں کی مدد کرو، یتیموں پر رحم کرو، بیواؤں کی وکالت کرو"۔

اینڈریو: بہت خوب، کتنی زوردار زبان ہے!

الیسٹر: تاریخ مذہب ادب میں اس سے زیادہ خوبصورت تحریر نہیں ہے۔ رینان نے کہا تھا کہ یونانیوں نے ذہن کو حریت بخشی لیکن یہودیوں نے انسان کو اخوت عطا کی۔ یونان کے پاس ثقافت تھی لیکن اس کے پاس دل نہیں تھا۔ اس کے فلسفیوں نے بھی غلامی کے نظام کی حمایت کی۔ یونانیوں نے فن اور سائنس تخلیق کیے لیکن یہودیوں نے دنیا کو معاشرتی عدل اور 'حقوق انسانی کے تصورات دیے............... آج وہ عربی قومیں جنہوں نے اسے فتح کیا تھا اور اس پر ظلم ڈھائے تھے، روحانی طور پر اس کے آگے سر جھکاتی ہیں اور ان اقدار کی آرزو کرتی ہیں، جو اس نے دنیا کو عطا کی تھیں۔

اینڈریو: سعیاہ سے ٹرانسکی تک!

الیسٹر: ہاں مسیحیت کی موت کے بعد اشتراکیت دنیا کا مذہب ہو گی۔

۴۔ مسیحیت

اریئل: تم بہت اچھی ہو۔ الیسٹر! تم نے میرے دل میں اپنی قوم کے لیے فخر و مباہات

کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ اب آپ میں سے کون ہمیں مسیحیت کے متعلق باتیں بتائے گا؟

شوخ اینڈریو! تم نہیں۔ کیونکہ تم اس میں صرف کیڑے ڈالو گے۔ میتھیو! تم بھی نہیں۔ کیونکہ تمہیں مسیحیت سے بہت محبت ہے۔ فلپ! تم اگر چاہو تو غیر جانب دار ہو سکتے ہو۔ تم ہمیں تاریخی پس منظر بتاؤ۔ پھر ہم باقاعدہ جنگ کریں گے۔

میتھیو: میں نے ابھی تک سب کچھ نہایت صبر سے سنا ہے لیکن میں اب اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب کے تقابلی مطالعہ کی بارگاہ پر ہر مذہب کی انفرادیت کو قربان کیا جا رہا ہے۔ فلپ ہمیشہ غلط بات کہتا ہے لیکن میں اسے قابل عفو سمجھتا ہوں۔

فلپ: میتھیو! تم ایک سچے مسیحی کی طرح باتیں کرتے ہو لیکن تم جلد ہی اپنی نیک دلی پر نادم ہو گے، مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ ایریئل مسیحیت کو ایک جامع پس منظر میں دیکھنا چاہتی ہے۔ بقول شخصے، تناظر ہی سے کسی واقعہ کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ مسیحیت تاریخی واقعات کے دو رجحانات سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک یروشلم، سکندریہ، انطاکیہ ایتھنز اور روما میں، ایک بے بس اور نومید پرولتاریت کا صنعتی اور تجارتی تصرف، دوسرے یہودیوں کی اخلاقی اقدار کا یونانیوں کے فلسفہ اور دینیات سے ربط اور امتزاج۔

سلیمان کے زمانہ سے یروشلم ان تجارتی شاہراہوں کا مرکز بن چکا تھا، جو خلیج فارس کو فینیشا، بحیرۂ روم کو شام اور بابل کو فارس سے ملاتی تھیں۔ ان آسانیوں کی وجہ سے یہاں کے یہودیوں نے اپنی تجارت کو ترقی دی اور دولت کی فراوانی سے امیر اور غریب کے درمیان خلیج بہت وسیع ہو گئی۔ وہ یہودی جو بابل سے واپس آئے تھے، قلاش تھے۔ یونانی اور رومی فوجیں حملہ آور ہوتیں او یہاں کے ہزاروں غریب جوانوں کو غلام بنا کر لے جاتیں۔ مسیح کے بچپن کے زمانہ میں رومن ناصرہ کے آس پاس بہت سے شہروں کی آبادی کو غلام بنا کر فروخت کر چکے تھے۔ بحیرۂ روم کی بڑی بندرگاہوں میں ہر جگہ ایک مفلس اور قلاش طبقہ جنم لے رہا تھا اور ان میں ایک ایسا مذہبی تصور پیدا ہو رہا تھا، جو ان کے آقاؤں کے خلاف جاتا تھا۔ امیر لوگ اگرچہ وہ پوشیدہ طور پر لاادری تھے لیکن بظاہر متداول مذہبی رسوم کی حمایت کرتے تھے۔ مفلس لوگوں نے ایک ایسا اخلاقی نظام بنایا، جس کے نزدیک ان کی ناتوانی، بدنصیبی اور افلاس ایک خوبی تھی۔ انہوں نے ایک ایسا ضابطہ دین تیار کیا تھا، جس کی رو سے مفلس جنت میں اور ارباب دولت جہنم میں جائیں گے۔ اسی بنا پر نیطشے نے مسیحیت کی مذمت کی کہ یہ ایک طاقتور انسان پر ایک کمزور انسان کی فتح کی علامت ہے۔ پرولتاریت ایک ایسے مذہب کے لیے تیار تھی جو مظلوم کی حمایت کرے، نرم دلی اور منکسر المزاجی کی تلقین کرے اور ایک ایسی بہشت کی بشارت دے، جو اس دنیا کے بدنصیبوں کو جاودانی مسرت عطا

کرے۔ جدید مسیحیت کے لیے یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ وہ امیروں کی دولت اور غریبوں کی محبت کو کسی طرح ہم آہنگ کرے۔

میں مسیح کی اخلاقیات اور اشتمالیت کو اس ناانصافی اور افلاس کے پس منظر میں دیکھتا ہوں۔ یقیناً مسیح ایک اشتمالی تھا۔ کیونکہ اس کا یہ ایمان تھا کہ زندگی کی تمام بنیادی ضروریات سب کی ملکیت ہیں اور امیروں کو چاہیے کہ اپنی دولت میں غریبوں کو برابر کا شریک بنائیں۔ بقول نیطشے ' مسیح اگر آج زندہ ہوتا تو اسے سائبیریا بھیج دیا جاتا لیکن امیر یا غریب جو بھی اس کی سادہ داستان پڑھتا ہے' اس کی طرف مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ یقیناً تاریخ کی سب سے زیادہ پر اثر شخصیت ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس کی تعلیمات بعد میں ایک دین اور کلیسا کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ اس لیے کہ جب اس دین اور کلیسا کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا تو لوگ غالباً انسانیت کے اس عظیم ترین معلم کو بھول جائیں گے۔

اس کا اخلاقی نظام' اپنی سادگی اور اصلیت کے اعتبار سے بہترین یہودیوں کی اخلاقی اقدار کا ترجمان تھا۔ کلاوسز نے ہمیں بتایا ہے کہ مسیح اپنے زمانے کی روح سے علیحدہ نہیں تھا۔ اسے اسرائیل کے پیغمبروں اور اخلاقی معلموں کی بیباک گھن گرج ورثہ میں ملی تھی۔ پال جو مسیح سے پہلے گزرا ہے' مسیح کی طرح کہتا ہے "اپنے ہمسایہ پر اخلاقی حکم نہ لگاؤ جب تک کہ تم اپنے آپ کو اس کی حالت میں نہ رکھ لو"۔ "میرا انکسار میری سربلندی ہے اور میری سربلندی ہی میرا انکسار ہے"۔ دوسروں سے ایسا سلوک نہ کرو جو تم نہیں چاہتے کہ وہ تم سے کریں۔ یہ ہے قانون کی اصلیت' باقی سب تفسیر ہے۔ ویلو ہاؤس نے کہا "مسیح مسیحی نہیں تھا۔ وہ ایک یہودی تھا"۔ رینان نے کہا "مسیحیت' یہودیت کا ایک کارنامہ ہے اور بقول ہائنے یہ ایک یہودی بدعت تھا"۔

بہرحال اس نے یہودیت میں ایک ایسے عقیدے کا اضافہ کیا' جو مسیح کی شخصیت اور زندگی کے ساتھ مسیحیت کی مقبولیت کی توجیہ کرتا ہے۔ اپنی تبلیغ کی ابتدا میں مسیح نے آخرت کا بہت کم ذکر کیا۔ اس نے خدا کی بادشاہت کا اس طرح ذکر کیا کہ گویا وہ زمین ہی پر حاصل ہو جائے گی۔ بشرطیکہ ہم روح کو ایک بے لوث پاکیزگی میں بسا لیں۔ بقا کا تصور یہودی مذہب کا لازمی عنصر نہیں ہے۔ اپنے اقتدار کے زمانے میں یہودیوں نے اس تصور کو غیر لازمی قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ فرد کو اجتماع میں سما جانا چاہیے اور انفرادی نجات کے بجائے ریاست کی فلاح و بہبود کی فکر کرنی چاہیے۔ ایوب اپنی نسل کا پہلا شخص تھا جس نے شخصی بقا کے تصور پر غور کیا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جب تک میں یہ نہ جانوں کہ خدا اس دنیا میں ایک عدل پسند انسان کی بدنصیبی کا بدلہ اسے ایک دوسری دنیا میں دے گا' میں ایک اچھے خدا پر ایمان نہیں لا سکتا۔ جب یہودی فتح کی طرف سے مایوس ہو گئے

تو ان کی مقدس کتابوں میں ایک ایسی جنت کا ذکر آنے لگا، جس میں اعمال کا انتقام یا انعام ملے گا۔

یہی حال مسیح کا تھا۔ جب وہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت قائم کرنے سے مایوس ہو گیا تو اس نے اس بادشاہت کو بہشت میں منتقل کر دیا۔ اس نے روز حشر کا ذکر اس طرح کیا کہ اس دن نصف انسانی نسل، جس میں دنیا کی اکثر حسین عورتیں بھی ہوں گی، ایک ایسی ابدی جہنم کے سپرد کی جائے گی، جس کی آگ کبھی نہ بجھے گی اور انسان کبھی نہیں مرے گا۔

میتھیو: تمہارے اس خاکہ میں مجھے خدا کا نرم دل بیٹا کہیں نظر نہیں آتا۔

فلپ: غالباً ہم دونوں کے خاکے غلط ہیں۔ فلسفے کا ایک حسن یہ ہے کہ اس کی کوئی بات یقینی نہیں ہے۔ اس لیے فلسفی نہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور نہ لوگوں کو جنگ اور مردم کشی کی آگ میں جھونکتے ہیں۔ اگر مسیح کے آخری زمانے میں مجھے اس کی تعلیمات میں ایک عجیب سی تلخی نظر آتی ہے تو وہ اس لیے کہ میں اس کے اخلاقی عقیدوں کی روشنی میں اس کے کردار کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اخلاقی عینیت، میرے نزدیک مسیحیت کی جان ہے اور یقیناً انسان کو مہذب بنانے کی بہترین کوشش ہے۔ میں اس معجزے پر اکثر حیران ہوتا ہوں کہ بندر اور جنگل سے ایک ایسا انسان پیدا ہوا، جس میں ساری کائنات کے متعلق سوچنے، اس سے محبت کرنے اور اس کے لیے دکھ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔

میتھیو: کیا تم نہیں سمجھتے، فلپ کہ صرف کوئی دیوتا (یا خدا) ہی اس طرح دکھ برداشت کر سکتا اور محبت کر سکتا تھا۔

فلپ: اس ضمن میں بھی ہم متفق نہیں ہیں۔ مسیح کے اخلاقی عقیدہ میں بھی بہت سے قابل اعتراض عناصر موجود ہیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں میں یہ جرات ہے کہ ہم علی الاعلان یہ کہہ سکیں کہ مجموعی طور پر مسیح کی اخلاقی تعلیم ناقابل عمل ہے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنی زندگی کے متعلق یہ سوچنا چھوڑ دیں کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے۔ ہم ہوا کے طیور یا باغ کے پھولوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہمسایوں سے اس طرح محبت کرنا، جس طرح ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں، مشکل ہے اور دشمنوں سے محبت کرنا تو بالکل ناممکن ہے۔ فطری انتخاب اور جہد البقاء کے اصولوں کے ماتحت جینے والوں انسانوں کی دنیا میں عدم تشدد جارحانہ ظلم اور استعماریت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ وہ قوم جو اپنے دشمنوں سے محبت کرتی ہے، حرف غلط کی طرح صفحہ مستی سے مٹ جائے گی۔

کنگ: لاؤزے نے بھی کہا تھا "اپنے دشمنوں سے محبت کرو" لیکن کنفیوشس نے جواب دیا "تو پھر رحم و کرم کا معاوضہ کیونکر ادا کرو گے۔ نیکی کے بدلے نیکی کرو، لیکن بدی کے بدلے انصاف

کرو"۔

پال: آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ مسیح کے عقائد بحیثیت مجموعی ناقابل عمل ہیں، وہ ایک بربریت زدہ انسانیت کی تہذیب کے لیے بالکل ضروری تھے۔ مسیحیت ہماری نسل کی فطری وحشت کو اعتدال کی سطح پر لے آئی اور دو ہزار برس کی تبلیغ سے انسان کے کردار میں کچھ نہ کچھ فرق پڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم یونانیوں اور رومنوں سے زیادہ رحم دل، فیاض اور امن پسند ہیں۔ ہم نے غریبوں پر استحصال بے جا کرنے میں کمی کر دی ہے۔ بربریت میں گداز اور نرمی پیدا کی ہے اور انسان کی شخصیت کو بلند و ارفع بنایا ہے۔

فلپ: میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ جب مسیح نے اس اعلیٰ طرز عمل کی تبلیغ کی تو اس کے ذہن میں اپنے مرید اور پیرو تھے۔ وہ انہیں ایسی راہبانہ تعلیم دینا چاہتا تھا کہ ان کی شخصیت دنیا کی تحریص و ترغیب گناہ کے خلاف مستحکم ہو جائے۔ اسی طرح افلاطون نے اپنی فلسفی ملوک کو راہبانہ اشتمالیت کی تعلیم سے انسانی خامیوں سے محفوظ رکھنا چاہا۔ مسیح اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ تم شادی نہ کرو اور چیزوں کی ملکیت کی ہوس نہ کرو۔ وہ انہیں راہب سمجھتا ہے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اکثر لوگ شادی اور جائیداد کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہوں گے۔ اس کے نظریہ کے متعلق اس غلط فہمی نے کہ وہ ساری انسانیت پر حاوی ہے، مسیحیت کو ایک خوش گوار منافقت کی صورت دے دی اور اسے ناقابل عمل بنا دیا۔

اینڈریو: مجھے اس قابل احترام استاد کی یہ بات ناپسند ہے کہ وہ جسم کے خلاف تھا اور انسانی جبلتوں کی سادہ لذتوں سے بیزار۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک یہودی پیورٹن تھا۔

میتھیو: تم غلط سمجھے ہو۔ اس نے پانی کو شراب میں تبدیل کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس کے عہد کے احمق یہ کہتے تھے کہ وہ شرابیوں اور گناہ گار عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتا ہے۔ وہ ایک ماں کی طرح جسمانی گناہ کو برداشت کرتا تھا۔ کیا تم اس عورت کی کہانی بھول گئے جو زنا کرتی پکڑی گئی تھی۔

فلپ: اس کہانی کی صداقت مشکوک ہے۔ لیکن محض یہ واقعہ کہ وہ تحریر میں لائی گئی۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسیح کی شخصیت میں عورت کے لیے ایک خاص قسم کی نرم دلی موجود تھی۔ امرا کی پرزور مذمت اور مفلسوں سے شدید محبت نے اسے دو ایک صدیوں میں دینیاتی کہانیوں کا مرکزی کردار بنا دیا۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ اس قسم کی روایات کا بھوکا رہتا ہے اور اسی قسم کی قدیم روایات نے مسیحی مذہب کی تشکیل کی۔ خدا کے بیٹے کا تصور، وہ ناجی جو باکرہ کے بطن سے پیدا ہوگا، انسانوں کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر اپنی جان دے دے گا اور پھر قبر سے

اٹھے گا۔ مسیحیت سے پہلے کے بہت سے مذاہب میں موجود ہے۔ ہندوستان میں تقریباً یہی اوصاف کرشن میں پائے جاتے ہیں مصر میں ہورس میں اور میکسیکو میں کیو ٹسالیکوٹل میں۔

تھیوڈور: عام یونانیوں کی روایت ہے کہ آرفیس قتل کیا گیا تھا۔ وہ برزخ میں اترا اور از سرنو زندہ ہوا۔ یہی کہانی پرومیتھس، ایڈونس اور ہیر-کلیس کے متعلق بھی مشہور ہے۔

سر جیمز: وہ خدا جو انسان بن جاتے ہیں، قدیم مذاہب میں بہت عام ہیں۔ چین میں ان تمام خداؤں کے نام، پیکن کے محکمہ نوآبادیات کے رجسٹر میں درج تھے، جو انسان کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ایک سو ساٹھ خداؤں نے دنیا میں زندہ رہنے کے لیے سرکاری لائسنس حاصل کیا تھا۔ مسیح کا تصور اس قربانی کے بکرے سے پیدا ہوا، جسے لوگ مارنے کے لیے چن لیتے تھے تاکہ اس کی موت ان کے گناہوں کا کفارہ بن سکے اور ارض و سما کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کر سکے اور زمین پر پھر گندم کے پودے ہرے بھرے نظر آئیں۔ یہ روایت تقریباً ہر قوم میں دہرائی گئی ہے۔

ایستھر: سترہویں صدی میں زباتی زیوی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ مسیح ہے جسے خدا نے یہودیوں کی نجات کے لیے بھیجا ہے۔

سر جیمز: اس کے بعد بھی اسی قسم کا ایک اور مسیح آیا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں کنٹکی میں ایک شخص نے اعلان کیا کہ وہ خدا کا فرزند اور انسانیت کا ناجی ہے۔ ہزاروں آدمی اس پر ایمان لائے اور اس کا پیغام مقبول عام ہوتا گیا۔ دفعتاً" اس کے ایک پیرو نے اس سے یہ درخواست کی کہ وہ اس خطہ کے جرمنوں سے جرمن زبان میں خطاب کرے۔ اس نے کہا "یہ لوگ انگریزی زبان سے نابلد ہیں اور یہ امر قابل افسوس ہوگا کہ وہ محض اسی بنا پر جہنم میں جھونکے جائیں"۔ نئے مسیح نے یہ اعتراف کیا کہ اسے جرمن زبان نہیں آتی۔ اس کے پیرو نے حیرت سے کہا "تم خدا کے بیٹے ہو اور تمہیں جرمن زبان نہیں آتی"۔ اس واقعہ کے بعد کنٹکی کے مسیح کی مقبولیت ختم ہوگئی۔

فلپ: مسیح کو خدا بنانے کے بعد ابتدائی مسیحیوں کو مقدس عدد ثلاثہ کو منطقی شکل میں ڈھالنے اور وحدت کبریائی کو قائم کرنے کے لیے چند دینیاتی تصورات تراشنے پڑے۔ لیکن یہودیوں کا خدا، جنگ اور طاقت کا خدا تھا اور غربا جنہیں مسیحیت پسند آئی تھی، رحم و کرم کے خدا کے متمنی تھے، اس لیے یہوداہ نے وفات پائی اور "خدا" ہمارے باپ نے جنم لیا۔ اس خدا کی ہمہ گیری کو شر کے وجود سے ہم آہنگ بنانے کے لیے یہ لازمی ہوگیا کہ شر کا بھی ایک دیوتا شیطان یا لیو سیفر بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئے مذہب کو بحیرۂ روم کی اقوام کی اس رسم کی مطابقت کرنی تھی کہ خدا تین ہوتے ہیں۔ ہندوؤں، مصریوں، فینشیوں، شامیوں اور رومنوں نے تین خداؤں کی پرستش کو اپنا اصول بنایا تھا لیکن یہودیوں کی تحریک وحدت نے مسیحیت کے تین خداؤں

کو تثلیث میں پرو دیا اور سکندریہ کے فلسفیوں نے اسے یونانی فلسفے اور روایت کے سانچے میں ڈھالا۔ مسیحی علماء نے نئے مذہب کی تعبیر وحدت ربانی کے نظریہ کے مطابق کی لیکن عوام نے اسے اپنے چند خدائی کے مقبول تصور کی تصدیق سمجھا۔ مریم نے وینس‘ افروڈا‘ اشتر‘ آئیسس اور مادر عظیم کی جگہ لے لی۔ مریخ‘ میقائیل اور مرکری جبرئیل بن گیا۔ اس کے بعد معمولی فطرت پرست دیوتاؤں کی جگہ رسولوں نے لے لی۔ ہر قوم‘ ہر شہر اور ہر قصبہ کا ایک علیحدہ رسول بن گیا۔ لوگوں کے فطری رجحان نے فتح پائی۔

اسی طرح پرانے تہوار قائم رکھے گئے اور نئے تہواروں کو قبل مسیح کے مقدس ایام پر متعین کیا گیا۔ ایسٹر نے یہودیوں کے پاس ادور‘ بابل کی رسوم اشتر اور یونان کی احیائے ایڈونس کی رسوم کی جگہ لے لی۔ کرسمس دراصل آفتاب کی پیدائش کا جشن تھا‘ جسے ابتدائی مصری منایا کرتے تھے۔ اہل مصر نوزائیدہ سورج کی ایک بچہ کے مجسمہ سے نمائندگی کرتے تھے‘ جسے اسقف بازاروں میں لا کر لوگوں کو دکھاتے تھے۔ اسی طرح پرانی رسوم کو نئے مذہبی مطالبوں کے ماتحت ڈھالا گیا۔ بپتسمہ دینا ایک قدیم رسم تھی‘ جو بچے کی عالم بلوغت میں رسائی کی علامت تھی۔ اس کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ بچہ کو پانی میں ڈبویا جاتا اور پھر اس کو مصنوعی طور پر ڈوبنے سے بچایا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔

تھیوڈور: ڈائینو سیسس کے مذہب میں نوبالغ کو "دوزائیدہ بچہ" کہتے تھے۔

فلپ: جیسا کہ سر جیمز ہمیں بتا چکے ہیں عشائے ربانی کا تہوار دیوتاؤں کو کھانے کی رسم سے پیدا ہوا۔ مسیحیوں کی بعض دوسری رسوم بھی یہودیوں کی رسوم سے پیدا ہوئی ہیں۔ پہلے کلیسا‘ یہودیوں کے معبدوں کی مانند تھے۔ نسلا "بعد نسلا" یہ رسوم پیچیدہ تر ہوتی گئیں اور عقائد زیادہ ژولیدہ ہوتے گئے۔ پادریوں کی طاقت بڑھتی گئی۔ اپنے مخصوص علم کی وجہ سے وہ گناہ گاروں اور اس خدا کے درمیان وسیلہ بن گئے‘ جس کی رضاجوئی صرف چند مقدس رسوم کی ادائی سے ہو سکتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پادریوں نے مذہب کو تخلیق کیا ہے۔ والٹیر نے پوچھا "وہ کون شخص تھا‘ جس نے مذہب کی طرح ڈالی؟ اور اس نے خود ہی جواب دیا "وہ پہلا بدمعاش جسے پہلے احمق سے واسطہ پڑا"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پادریوں نے مذہب نہیں بنایا بلکہ مذہب نے پادریوں کی تخلیق کی۔ انسان کی مستقل امید آفرینی نے مذہب کی تعمیر کی اور ہمیشہ کرے گی۔ لیکن پادریوں نے کلیسا کی تعمیر کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک مستحکم نظام میں منظم کیا‘ جس کا سرمایہ یہ عوام بہم پہنچاتے تھے اور جس کا نظم و نسق اسقفوں کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے کانسٹنٹائن کو مسیحیت کی طرف مائل کیا۔ امرا کے وظائف قبول کیے اور کلیسا مفلس ماہی گیروں کی

عبادت گاہ کی بجائے دنیا کا متمول ترین اور مستحکم ترین ادارہ بن گیا۔ اصلاح مذہب کے عہد سے پہلے کلیسا یورپ کے ایک تہائی حصہ کا مالک تھا اور اس کا خزانہ مال و زر سے لبریز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہادی کے پیغام کی روح سے بیگانہ اور ہر قسم کی دنیاداری کا شکار ہو گیا۔ یورپ مسیحیت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ ابتدائی مسلک احیائے علوم کی نرم رو فطرت پرستی میں کھو چکا تھا۔ مذہب مفلس لوگوں میں پیدا ہوتا ہے اور امرا میں مقبول ہو کر مرجاتا ہے۔

"اصلاح مذہب" کی تحریک نے مسیحیت کی ابتدائی سادگی اور رہبانیت کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحریک کامیاب ہوئی اور اس نے ایک صحت مند فردیت کے رجحان کو عام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ضبط نفس اور استحکام شخصیت کا ایسا اخلاقی نظام بنایا، جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور نظام نہیں کر سکتا۔ جدید سیاسی اور اقتصادی تاریخ کی تقریباً تمام عظیم شخصیتیں، پروٹسٹنٹ تھیں لیکن انہوں نے یہ عظمت بعض دوسری اقدار کی قربانی کے ذریعہ حاصل کی۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے ایک مکمل کلیسا کی جگہ ایک مکمل کتاب کو دے دی اور کلیسا کی عدم موجودگی سے ہر شخص کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ الہامی کتاب کی تعبیر اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نئے پروٹسٹنٹ نے ایک نیا فرقہ بنایا اور یہ مسلک ہزاروں حصوں میں بٹ کر رہ گیا۔ ابتدائی مسیحیت کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش میں اس نے یہودیت کی روح کو بحال کر دیا اور اخلاقیات میں ایک شدید اور جنگجو قسم کی پارسائی کو شامل کر دیا، جس نے دو سو برس تک فنون لطیفہ کو ختم کیے رکھا۔ کیتھولک مذہب نے ہمیں حسن بنا دیا لیکن وہ حق سے دور تھا۔ پروٹسٹنٹ مسلک نے ہمیں حق عطا کیا لیکن وہ حسن سے عاری تھا۔ میرا خیال ہے کہ آخر میں فتح حسن کی ہوگی۔

۵۔ کیتھولک مسلک اور پروٹسٹنٹ مسلک

میتھیو: حسن اور حق کیا کبھی تم نے غور کیا ہے فلپ کہ حق حسن سے زیادہ معروضی نہیں ہے۔ خدا کے متعلق بھی اسی قدر اختلاف ہے، جس قدر کہ:

اینڈریو: دیوں کے متعلق اور دیویوں کے متعلق۔

میتھیو: یونہی سہی۔ شیطان، اینڈریو! تم مذہبی احساس سے قطعی محروم ہو۔ کیونکہ تم حسن کو آرزو سے جدا نہیں کر سکتے۔ یعنی تم وہ بے پناہ حسن نہیں محسوس کر سکتے جو زمین کبھی کبھی خزاں میں بھی ارزاں کرتی ہے، یا سرما کی کسی صبح کو ہر شجر پر فروزاں برف اور برف سے ڈھکے ہوئے مکانوں میں سے پھوٹتا ہے۔ لیکن اے غیر مطمئن متشککین! تم حق سے بھی تو محروم ہو۔ تمہاری سائنس ہر روز بدلتی ہے۔ وہ آج، پچاس برس پہلے کے مقابلہ میں ماؤلے کی حقیقت سے بے خبر

ہے۔ تمہارا علم حیاتیات ہر تیس برس کے بعد ایک نئے کلیہ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ایک نسل میں وہ ماحول کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ دوسری نسل میں وراثت کو اور تیسری نسل میں پھر ماحول کو اپنا ملجا و ماوئی بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اس کے نظریات اور تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ تمہاری نفسیات ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ شعور کا وجود ہے کہ نہیں اور تمہارا ریاضی یہ نہیں جان سکا کہ خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان قلیل ترین فاصلہ ہے کہ نہیں اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان فانی حقائق پر اس حسن کو نثار کر دوں جو مسیحی مذہب نے مجھے عطا کیا ہے۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے کہ ہم برخود غلط ذرے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم زندگی کے ایک پہلو یعنی انسانی عقل کے ذریعے ساری کائنات کا احاطہ کر لیں گے۔ تمہاری عقل کیا ہے۔ سوائے حواس اور منطق پر اعتماد کے۔ وہ حواس جو چیزوں کی اصلیت کو بگاڑتے ہیں اور وہ منطق جو ہر تعصب کو معقول صورت دے سکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جہاں تک دنیا کے متعلق نظریوں کا تعلق ہے، حقیقت کے نقطہ نظر سے ان میں سے کوئی بھی دوسرے نظریے سے بہتر نہیں ہے۔ اور میں اس نظریہ سے مطمئن ہوں جو مجھے حسن سے آشنا کرتا ہے اور دل میں امید کو مستحکم کرتا ہے۔ جب خرد کے نظریے ماند پڑ جائیں گے، اس وقت بھی میرا مذہب لاکھوں انسانوں کے دلوں کو برمائے گا۔ غالباً آپ کے پوتے اور نواسے آپ کی میراث تشکک کی سرد مہر فضا سے اکتا کر میرے ایمان کی طرف رجوع کریں گے۔ مغرب، بتدریج اس عظیم غلطی یعنی اصلاح مذہب کے تصور سے سنبھل رہا ہے۔ بہت سے پروٹسٹنٹ فرقے، خانہ جنگی سے تنگ آ کر پھر ایمان قدیم کی طرف لوٹ رہے ہیں اور باقی جدت پرستی اور ضبط تولید کی وجہ سے منتشر ہو جائیں گے۔ فردیت کا گھن ان کلیساؤں کو کھائے جا رہا ہے، جنہوں نے پاپائے روم کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب ہر شخص اپنے آپ کو فلسفہ اور دینیات کا ماہر سمجھنے لگے تو مذہب کو بھی انہی نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے جمہوریت کو ہونا پڑا ہے۔ جب فرد کنبہ کی اور تعیش یک زوجگی کی جگہ لے لے تو نسل روبہ انحطاط ہو جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کیتھولک طبقے میں مرد اور عورتیں آخر تک ایک دوسرے کے ساتھ وفادار رہتے ہیں اور بچوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے حسین نشوونما اور فطری بازی پسندی سے گھروں کو رنگین بنائیں۔

پال: میتھیو! تم سچ کہتے ہو۔ ہم پروٹسٹنٹ اپنے آپ کو فرقہ پروری اور ضبط تولید سے ختم کر رہے ہیں۔ امریکہ میں ہر پانچ مسیحیوں میں سے دو مسیحی آپ کے کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہاری شرح پیدائش ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ دو ہزار عیسوی تک (اگر یہی رجحانات حاوی رہے) یہ ملک سارا آپ کا ہو چکا ہو گا اور شاید یہ صحت مند تبدیلی ہو گی۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کا مذہب میرے مذہب سے زیادہ مسرت بخش اور حسین ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے نظریہ نکاح میں

حکمت، آپ کے نظام میں عظمت، آپ کے اسقفوں اور تارک الدنیا عورتوں میں نجابت اور سخاوت ہے۔ غالباً زندگی اپنے امراض اور درد و یاس کے ساتھ، اس شاعری کے بغیر ناقابل برداشت ہو جائے گی جو قدیمی ایمان ہماری بے کیف زندگی کو عطا کرتا ہے۔

لیکن مجھے آپ کے مذہب سے ڈر لگتا ہے۔ میں یہ بات فراموش نہیں کر سکتا کہ آپ کے کلیسا نے کبھی ظلم و تشدد کی حمایت کی تھی۔ اس نے کوپر نیکس کو جلاوطن کر دیا تھا۔ گلیلیو کو جبراً خاموش کر دیا تھا اور برونو کو آگ کی نذر کر دیا تھا۔ بسا اوقات کلیسا نے علم کی ترقی اور انسانی ذہن کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ مجھے اس خیال سے بھی دکھ ہوتا ہے کہ آپ کا کلیسا کچھ عرصے کے بعد اس ملک پر چھا جائے گا۔

میتھیو: ہاں ہم اپنا انتقام لے رہے ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ کے جہلا کے ہاتھوں ظلم و تشدد سہنے کے بعد ہمیں بھی اب عزت اور اقتدار حاصل کرنا چاہیے اور یہ بھی غلط ہے کہ کلیسا نے ہمیشہ علم کی نشوونما کی مخالفت کی۔ اس نے فقط اپنی ہر دلعزیزی کے زمانے میں ان غلط تصورات کے خلاف جہاد کیا ہے، جو وقت کی دھوپ چھاؤں نے پیدا کیے تھے۔ اس نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کے اراکین خبر و نظر کے اس انتشار میں نہ الجھیں جو ہمارے عہد کی عظیم ذہنی شخصیتوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیسا نے کبھی کبھی کسی قدیم تعصب کی بھی حمایت کی ہے لیکن انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ کیا اس سیاسی جماعت نے کبھی غلطی نہیں کی، جسے پچھلے انتخاب میں آپ کی حمایت حاصل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دو ہزار برس میں کلیسا عظیم ترین اخلاقی، فنی اور ذہنی قوت کی حیثیت سے تاریخ کو متاثر کرتا رہا ہے۔ ہسپانیہ کی عدالت تفتیش، اصلاح مذہب کا نتیجہ تھی۔ وہ محض خوف و ہراس کی ایک ہنگامی علامت تھی۔ کس نے سب سے پہلے امریکہ میں حریت عبادت کی روایت قائم کی؟ نیو انگلینڈ کے مہاجروں نے نہیں جو کویکروں کی اصلاح، جلتی سلاخوں کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ وہ اصلاح کرنے والے میری لینڈ کے کیتھولک تھے۔ کیتھولک مسلک نے آسٹریا، بیوریا اور فرانس میں، جہاں اسے تسلط حاصل ہے، کبھی حریت افکار یا ترقی علم کی مخالفت نہیں کی لیکن امریکہ کے بنیاد پرستوں نے ہر کہ و مہ کو یہ آزادی دے کر کہ وہ جدید حیاتیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں، علم کے حق و باطل کو مذاق بنا دیا ہے۔ کیا ہمہ دان اجتماع یا ہمہ دان کسان ایک ہمہ دان کلیسا سے بہتر ہیں؟

پال: میتھیو! یہ بڑی سخت چوٹ ہے۔ مجھے بنیاد پرستوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں ان کی حمایت میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ لوگ جہالت کے آخری حربہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے مدرسے اور دوسرے تعلیمی ادارے ان کے اثر کو جلد ہی زائل کر دیں گے۔ میرا اپنا

پروٹسٹنٹ عقیدہ اس واہمہ پرستی سے نجات کی ایک کوشش ہے۔ اگر ہم ان مصیبت زدہ لوگوں کے سامنے، جنہیں خدا اور بقائے روح کے تصور سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے، دہریت کا اعلان کریں تو ہم انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ تحفظ سکون کی خاطر تشدد پر اتر آئیں۔ نفرت اور خوف کی اس فضا میں میرا جدید نظریہ نہیں پنپ سکتا۔ خطرے کے وقت عقل کو کون نوازتا ہے؟ پھر بھی فتح ہماری ہوگی۔ متوسط طبقے اور تعلیم کی توسیع ہمارے عقیدے کے حق میں جاتی ہے، اور غالباً کیتھولک مسلک کی فتح تمام آزاد خیال لوگوں کو ایک ایسی متوازن مسیحیت کے شیرازہ میں یکجا کر دے گی جو اپنے پیروؤں سے فقط خدا پر ایمان اور اخلاق مسیح کی توقع رکھے گی۔

کلیرنس: پال! تمہارا مذہب ختم ہو رہا ہے۔ اس کے زوال کی طرف دیکھو۔ وہ دس ہزار فرقوں میں منتشر ہو چکا ہے اور ہر فرقہ اپنے عقیدے کو حق مطلق کا درجہ دے کر دوسرے نو ہزار نو سو ننانوے فرقوں سے نفرت اور حقارت کا سلوک کرتا ہے۔

پال: میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ پروٹسٹنٹ مسلک انتشار پیدا کرتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ فرد اپنے ضمیر کے مطابق دوسروں سے مختلف ہونے کا حق رکھتا ہے۔ یہ مسلک اس کڑے نظام سے بہتر ہے جو انفرادیت اور اختلاف رائے کو سرے سے کچل دیتا ہے۔

میتھیو: مرکزی نظام کا واحد بدل انتشار ہے۔

کلیرنس: پروٹسٹنٹ مسلک، کسی مرکزی نقطہ کی غیر موجودگی کے باعث تباہ ہو جائے گا۔

یہ مسلک رومانیت اور تعلیم کا امتزاج ہے۔ والٹیئر نے جو بات عوام کے بارے میں کہی تھی، وہ مذہب پر بھی صادق آتی ہے۔ جب مذہب استدلال شروع کر دے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مسلک اصلاح مذہب کی تحریک کے زمانے سے انحطاط پذیر ہے۔ علم اس کا بدترین دشمن ہے۔ سائنس کی ترقی سے کیتھولک مذہب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ کیتھولک مسلک استدلال کرتا ہی نہیں۔ وہ عقل کی بجائے قلب و نظر کو متحرک کرتا ہے۔ جب قلب و نظر مطمئن ہو جائیں تو ذہن ساکن ہو جاتا ہے لیکن پروٹسٹنٹ مسلک قلب و نظر کو نہیں، عقل کو تحریک دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے مذہب کو دلائل و براہین پر استوار کیا۔ اس کے کلیساؤں کی تعداد کم ہوتی جائے گی لیکن کیتھولک مسلک کئی صدیوں تک مستحکم رہے گا۔ پروٹسٹنٹ مسلک ذہن اور تخیل کی کشاکش میں کچلا جائے گا۔ امریکہ کا مستقبل فرانس کے حال کی طرح ہوگا۔ اقلیت تشکک میں مبتلا ہوگی۔ اکثریت پارسائی سے وابستہ ہوگی اور آزاد خیال لوگ توہمات کے لاوے کی زد میں ہوں گے۔ کیتھولک مسلک عوام کو مسحور کر لے گا اور اگر اقتصادی تقابل یا جنگ کے ہولناک نتائج کے باعث افلاس پھیلا تو پرانے اساطیر پھر لوگوں کے ذہن سے ابھریں گے۔ ہر ملک کے کاشت

کار ابھی تک قدیم حکایات سے شغف رکھتے ہیں۔ سادہ لوگ ہر جگہ ابھی تک روحوں اور مافوق الفطرت ہستیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ الیگزانڈر برکمین کہتا ہے کہ اس نے سینٹ پیٹرز برگ میں ایک دیوار پر یہ لکھا دیکھا کہ مذہب عوام کے لیے افیون کا اثر رکھتا ہے لیکن برابر والے کلیسا میں بہت سے لوگ عبادت کر رہے تھے۔ یہ قول لکھنے والا یہ بات بھول گیا کہ افیون مشرق میں بہت مقبول ہے اور مغرب میں بھی۔ ہم اہل مشرق سے بہتر نہیں ہیں، جہاں چند لوگوں میں آزاد خیالی کا چرچا ہے۔ وہاں قدیم مذہب کی خشک اور ویران زمین سے ہزاروں نئے فرقے ابھر رہے ہیں۔ ہمیں ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ مسیحی سائنس مقبول عام ہو رہی ہے کیونکہ لوگ نہ مسیحیت پر ایمان رکھتے ہیں نہ سائنس پر۔ تھیوسوفی ناکام کلرکوں اور دکان داروں کو ہندو فقیر بنا دیتی ہے۔ ایک اخبار کی حالیہ اشاعت میں ایک سو ترپن مذہبی اعلان تھے۔ ان میں سے ترپن باطنی فرقوں کے تھے۔ ایک شخص نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس موضوع پر تقریر کرے گا "کیا شیطان ایک شخصیت ہے اور کیا وہ ایک ہزار برس تک ایک اتھاہ گڑھے میں محبوس رہے گا؟" ایک پرانی روایت ہے کہ جب دیوتا دیوؤں کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں گے تو ایک نئی کائنات پیدا ہوگی اور دیوتا پھر زندہ ہو جائیں گے۔ دنیا کی تاریخ میں یہی ہو رہا ہے۔ دیوتا واپس آ جاتے ہیں اور ہمیشہ مشرق سے واپس آتے ہیں۔ ہم مشرق کے نئے فرقوں کے زیر اثر آ رہے ہیں۔ جس طرح یونان اور روما مسیح سے تین صدی پہلے مشرقی مذاہب سے متاثر ہو رہے تھے یا جس طرح افریقہ اور ہسپانیہ کو اسلام نے مسخر کر لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو ہمیشہ ایک ایسے مذہب کی طلب رہے گی جو مافوق الفطرت تقدس سے آراستہ ہو کر ان کے تخیل کی تسکین کرے۔ لوگ سائنس نہیں چاہتے۔ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ سائنس کا وعظ یہ ہے کہ زندگی، زندگی کو کھاتی ہے اور زندگی تباہ ہو جائے گی۔ عوام کبھی سائنس کو قبول نہیں کریں گے جب تک کہ وہ دنیا کو جنت نہ بنا دے۔ جب تک افلاس موجود ہے، دیوتا قائم رہیں گے۔

◆

بست و سوم

کتب خانہ میں

خدا اور بقا

۱۔ بقا

ایریئل: اس کتب خانہ میں ہمیں آسائش اور خاموشی میسر آئے گی۔ اگر آپ اس مباحثہ سے تنگ آ جائیں تو آپ کتابوں سے جی بہلا سکتے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ جب تک مجھے بقائے روح اور ہستی باری تعالیٰ کے متعلق کچھ بتا نہیں لیں گے، یہاں سے نہیں جائیں گے۔

پال: کلیرنس یہ سمجھتا ہے کہ روح لافانی نہیں ہے اور ہم سب کتوں کی طرح مر جائیں گے۔

کلیرنس: ہاں! اگر میں لافانی ہوں تو میرا کتا بھی لافانی کیوں نہ ہو؟ میں یہوداہ کی طرح اس پر جبر کرتا ہوں۔ میں خودغرض ہوں اور اسے وہی کچھ کھانے کو دیتا ہوں جو میں خود نہیں کھانا چاہوں۔ میں جب چاہتا ہوں اس سے جدا ہو جاتا ہوں لیکن وہ میرا وفادار ہے۔ ہم دونوں میں سے وہ بہتر مسیحی ہے۔

سر جیمز: پال! تمہاری "روح" ان روحوں سے پیدا ہوئی ہے جنہیں وحشی لوگ اپنے

خوابوں میں دیکھتے تھے۔ جب وحشی انسان نے مردوں کی روحیں ان کے جسموں سے جدا دیکھیں تو اس نے سمجھا کہ اس کے اندر بھی ایک ایسی ہی روح ہے جو اس کے جسم سے جدا ہو سکتی ہے۔ اس نے آوازوں کی گونج اور سایوں کی یہ تعبیر کی کہ یہ انسان کی روح ہیں۔ باسوتو قبیلے کا وحشی ندی کے پاس سے نہیں گزرتا کیونکہ وہ ڈرتا ہے کہ کہیں مگرمچھ اس کے سایہ کو نہ کھا لے۔ یہ حقیقت ہے کہ وحشی خواب میں اپنے آپ کو شکار کرتے، چلتے پھرتے اور اچھلتے کودتے دیکھتا تھا لیکن بیدار ہونے پر وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ اس نے تمام رات ذرا سی جنبش نہیں کی۔ یہ بات اس کے لیے اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچاتی تھی کہ اس کے جسم میں ایک روح ہے۔ اسی طرح سرمستی اور بیہوشی بھی اس کے لیے جسم کی روح سے ہنگامی جدائی کی علامت تھی۔ مغربی افریقہ کے حبشی یہ سمجھتے ہیں کہ جب روح کھو جائے تو درد سر ہوتا ہے۔ وہ اپنے طبیب کو جنگلوں میں بھیجتے ہیں کہ وہ روح کو ڈھونڈ لائے۔ وہ روح کو ایک بکس میں بند کر کے لے آتا ہے۔ وہ بکس کو مریض کے کانوں کے پاس کھول دیتا ہے اور درد سر دور ہو جاتا ہے۔

کلیرنس: اناطول فرانس کی ایک کہانی میں پولینیشیا کا ایک شخص کہتا ہے: ”روح ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میں مرنے لگا ہوں تو میں نے اپنی ناک دبا لی تاکہ روح نکلنے نہ پائے، لیکن میں نے ناک کو زور سے نہیں دبایا اور میں مر گیا“۔

سر جیمز: سیلیبس میں لوگ مریض کی ناک، کمر اور پاؤں میں مچھلی پکڑنے کے کانٹے لگا دیتے ہیں تاکہ اگر اس کی روح نکلنا چاہے تو وہ کانٹے میں اٹک جائے۔ وہ چھینک کو بڑے خطرے کی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر چھینک زور کی ہو تو ممکن ہے کہ روح باہر نکل آئے۔ اس لیے جب کوئی شخص ان کے سامنے چھینکتا ہے تو وہ خدا سے رحم کی دعا مانگتے ہیں۔ جب ہندوؤں کے سامنے کوئی جمائی لیتا ہے تو وہ چٹکی بجاتے ہیں تاکہ اس کی روح باہر نہ نکل پڑے۔ بعض وحشی تصویر نہیں اترواتے کہ کہیں ان کی تصویر کے ساتھ ان کی روح بھی نہ چلی جائے، کیونکہ اگر روح چلی جائے تو فوٹوگرافر جس وقت چاہے آ کے انہیں نگل سکتا ہے۔

نظریہ بقائے روح اسی تصور سے پیدا ہوا۔ ٹکارورا کے ہندی کہتے ہیں کہ تمام نیک ہندیوں کی روحیں ایک ایسی روحانی دنیا میں جاتی ہیں جہاں انہیں حسین عورتیں میسر آتی ہیں، جو نہ بوڑھی ہوتی ہیں نہ موٹی اور جہاں خوبصورت شکارگاہوں میں ان گنت ہرن چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں، گناہگار ہندی کی روح مرنے کے بعد ایک ایسی جگہ منتقل کی جائے گی جہاں غذا کمیاب ہو گی اور سانپ کھانے کو ملیں گے۔ اہل مصر میں بقائے روح کا تصور اس قدر اہم تھا کہ وہ اس زندگی میں جسموں کے لیے تو جھونپڑیاں بناتے تھے لیکن موت کے بعد روحوں کے لیے شاندار ”مکانات

دوام" تعبیر کرتے تھے۔ ہندوستان میں یہی تصور مسئلہ تناسخ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اطالیہ میں ہمیں فیثاغورث یہ کہتا سنائی دیتا ہے: "اس کتے کو نہ پیٹو کیونکہ اس کی آواز میں مجھے اپنے متوفی دوست کی آواز سنائی دیتی ہے"۔ ہمارے اپنے عہد میں نیطشے کے دائمی تواتر کا نظریہ ایک جدید شکل میں اسی موضوع کا اظہار ہے۔ جہنم کا تصور تمام قوموں میں ملتا ہے لیکن اس کی نوعیت ان آلام کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جو مختلف قومیں برداشت کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ یہی آلام ان کے دشمنوں کو نصیب ہوں۔ ہمارا اپنا تصور جہنم، ہمیں یہودیوں سے ملا جو صحرا کی جلتی ہوئی دھوپ سے نالاں تھے، لیکن اسکیمو یہ سمجھتے ہیں کہ جہنم ایک نہایت سرد جگہ ہے۔

پال: آپ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ تصور بقا بہت پرانا ہے، اس لیے غلط ہے۔ میں اس تصور کو انہیں وجوہات کی بنا پر قبول کرتا ہوں جن کی بنا پر وحشی نے اسے اپنایا تھا۔ میں اپنے اندر کی طرف جھانکتا ہوں تو ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہوتا ہوں جس کی مادی اصطلاحات میں توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میرے جسم کی موت سے میری روح آزاد ہو جائے گی۔

ولیم: پال! ممکن ہے کہ روح شاید مادی نہ ہو لیکن وہ وقت کی قید سے آزاد نہیں ہے۔ ذہن جسم سے وابستہ ہے۔ دونوں اکٹھے ہی پھلتے پھولتے اور مرجاتے ہیں اور اکٹھے ہی امراض اور صدموں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ولیم جیمز نے کہا تھا کہ دماغ فقط ذہن کی ایک شرط ہے لیکن غددوں کے علم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دماغ ذہن کی تحریکوں کا ذمہ دار ہے۔

میری شخصیت میرے موروثی میلانات اور میری عادات اور حافظہ پر مشتمل ہے جو میرے عصبی نظام سے وابستہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ذہن جسم ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ عصبی نظام سے متعلق ہے، اس کا محتاج ہے اور اس لیے اس کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا حافظہ ہنگامی یا مستقل طور پر اثر یا بعض کیمیاوی مرکبات کی وجہ سے مجروح ہو سکتا ہے۔ بڑھاپے میں حافظے کے بعض حصے ختم ہو جاتے ہیں اور شخصیت محدود ہو جاتی ہے، غالباً اس لیے کہ دماغ کمزور اور منتشر ہو جاتا ہے۔ جب میرے اعصاب قبر میں گل سڑ جائیں گے تو میری منفرد "انا" بھی ان کے ساتھ ختم ہو جائے گی کیونکہ میری "انا" میری وراثت اور تجربہ کا امتزاج ہے اور یہ دونوں عناصر میرے گوشت پوست سے وابستہ ہیں۔ شخصیت کی وحدت بھی جو بقائے روح کی شرط ہے، ایک مشکوک تصور ہے۔ میری شخصیت بدلتی رہتی ہے اور زندگی کے ہر دس سال میں میں بہت مختلف ہو جاتا ہوں۔ میں جو اب ہوں اور میں جو دس سال کا بچہ تھا، مختلف شخصیتیں ہیں۔ ان ہنگامی شخصیتوں میں سے کون "میں" ہوں؟ پھر دیکھیے کہ ایک ہی جسم میں دو یا دو سے زیادہ شخصیتیں ہو سکتی ہیں۔ "انا" محض تجربات کا مجموعہ ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہ تجربات کا مجموعہ کسی مرض یا صدمے کی وجہ سے دو

مجموعوں میں بٹ جائے۔ جیکل یا ہائیڈ میں سے کون غیر فانی تھا؟ اور اگر روح بدن کے بعد زندہ رہے بھی تو اس سے کیا حاصل؟ کیا آپ جسم کے بغیر کسی وجود کا تصور کر سکتے ہیں یا اس قسم کے وجود کا تصور کوئی تسکین بہم پہنچا سکتا ہے؟ کیا آپ جسم کے بغیر کوئی لذت یا محبت کی لرزش محسوس کر سکتے ہیں؟

میتھیو: پال، آپ نے دیکھا کہ اگر آپ بقائے روح پر یقین رکھنا چاہیں تو منطقی طور پر آپ کو احیائے جسم پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔

پال: نہیں! یہ بات ماننا کہ جب جسم کو کیڑے کھا چکے ہوں گے تو وہ قیامت کے دن اپنے کروڑوں حصوں کو پھر یکجا کر کے زندہ ہو گا، بہت مشکل ہے۔ اگر ہم جسم کے بغیر روح کا تصور نہیں کر سکتے تو یقیناً نقص ہم میں ہے نہ کہ امکان بقائے روح میں۔ طبیعیات میں سینکڑوں ایسی چیزیں ہیں (مثلاً برق) جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن ہیں وہ حقیقی۔ روحانی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ روح جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اس کے حق میں شہادت اتنی فیصلہ کن ہے کہ مسلمہ دیانت کے لوگ جو پہلے اس تصور کے خلاف تھے (مثلاً ہائیسلوپ لمبروسو اور الفرڈ رسل واس)، اب اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ “سائنٹیفک امریکن” کا مدیر بھی یہ مان گیا ہے کہ مارجری کرینڈن واقعی روحوں سے ہمکلام ہو سکتی ہے اور اس نے اپنے بھائی سے، جسے مرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا تھا، باتیں کی تھیں۔

ولیم: “سائنٹیفک امریکن” نے مسز کرینڈن کا جو امتحان کیا تھا، اس کے نتیجے کے متعلق متضاد آراء کا اظہار کیا گیا تھا۔ برڈ اور کیرنگٹن اس کے حق میں تھے، ہیوڈنی اور میگڈوگل خلاف تھے۔ ہارورڈ کے پروفیسروں نے جو امتحان کیے تھے، ان کے نتائج بھی اس تصور کے خلاف تھے۔ ہیوڈنی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ تمام روحانی معجزوں کو دہرا سکتا ہے۔ اس نے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور کہا کہ ہر روحانی معجزہ فریب نظر ہے۔ اس نے ہر مشہور وسیلہ کا نام لے کر یہ کہا کہ یہ شخص دھوکے باز ہے اور یہ بھی کہا کہ اگر میں غلط کہتا ہوں تو یہ شخص مجھ پر بے حرمتی کا دعویٰ کرے۔ کسی شخص نے دعویٰ نہیں کیا۔ اس نے روحانی واقعات کے سائنٹیفک ثبوت کے لیے دس ہزار ڈالر کے انعام کا اعلان کیا لیکن کسی نے یہ ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔ مسز پائپر نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ متوفی ڈاکٹر فیلنوٹ سے ہمکلام ہو سکتی ہے۔ ولیم جیمز، سر آلورلاج اور مسز سجوگ نے، جو روحانی تحقیق کے حامی تھے، مسز پائپر کا امتحان کیا۔ انہوں نے اس کے خلاف رپورٹ دی۔ آپ نے ڈگلس ہوم کی داستان سنی ہے۔ براؤننگ نے اس کردار کو عارضی طور پر گویا غیر فانی بنا دیا تھا۔ یوسیپیا بیلاڈینو نے یورپ کا دورہ کیا اور روحانی طاقت کا دعویٰ کیا۔ برگساں، موسیلو اور مادام کیوری نے اس کا امتحان کیا۔ انہوں نے

دیکھا کہ تاریکی میں جب روشنی میز پر پڑتی تھی تو میز ہوا میں اٹھ جاتی تھی اور کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی تھی جو اسے سہارا دے سکتی۔ فاضل ممتحنوں نے یہ کہا کہ انہیں اس عمل میں کوئی فریب نظر نہیں آیا، لیکن کوئی شعبدہ باز بھی اس قسم کا عمل کر سکتا ہے۔ جب ۱۹۰۹ء میں مادام پیلاڈینو امریکہ آئیں تو ہارورڈ میں منسٹر برگ نے اس کا امتحان کیا۔ جب مادام نے میز اٹھانے کے لیے پاؤں ہلائے تو ایک طالب علم نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبا استادوں سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر لارڈ نے اس کا امتحان کیا اور پھر طلبا نے اس کے فریب کو بے نقاب کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک کیمرہ لے گئے تھے، جس سے مادام قطعاً بے خبر تھیں۔ تصویر میں یہ دیکھا گیا کہ مادام اپنے ہاتھوں سے میز اٹھا رہی ہیں۔ یو سیپیا ۱۹۱۰ء میں نہایت مایوس اور نامراد اطالیہ واپس چلی گئیں۔

پال: ہاں، اس ضمن میں ہزاروں فریب کیے گئے ہیں۔ اگر سو یا لاکھ میں سے ایک وسیلہ دیانت دار ہے اور اس نے مردوں سے واقعی کلام کیا ہے تو فریب کی داستانیں بے سود ہیں اور بقائے روح ایک قطعی حقیقت ہے۔ یقیناً آپ یہ نہیں کہیں گے کہ سر آلور لاج فریبی تھے۔ اس موضوع پر کتابوں کو دیکھیے۔ اس کے ثبوت میں جو واقعات جمع کیے گئے ہیں، وہ اتنے حیران کن ہیں کہ اگر آپ انہیں نہیں مانتے تو آپ ڈارون کے مخالفین کی طرح بزدل قدامت پسند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سائنس کی روح کو آپ کے اندر یہ احساس پیدا کر دینا چاہیے کہ اس اعجاز آفریں کائنات میں ہر چیز ممکن ہے۔ یاد رکھیے کہ ذہن کے متعلق ہمارا علم ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔

اینڈریو: پھر بھی ہم ذہن کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ فکر کرنے کی صلاحیت ارتقا کا ایک حصہ ہے، جس طرح ہماری حرکت کرنے، ہضم کرنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتیں ارتقا کا حصہ ہیں۔ یقیناً ہمارے اذہان نے بھی ہمارے جسموں کی طرح نشوونما پائی ہے۔ اور یہ ارتقا ہر فرد میں اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ ارتقا کے اس عمل میں بقا کا عنصر کب اور کس طرح داخل ہوتا ہے؟ اگر انسان غیر فانی ہے تو بندر بھی غیر فانی ہے۔ اگر بندر غیر فانی ہے تو اس کی دم پر جو مکھی بیٹھتی ہے، وہ بھی غیر فانی ہے اور پرندہ بھی اسی طرح غیر فانی ہے جس طرح وہ کیڑا جو اس کی خوراک ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ خیال ہے کہ وہ تمام کھٹمل، جو چھٹیوں میں ہمیں پریشان کرتے ہیں، جنت میں ہمارے ہمسائے ہوں گے۔ پھر یہ دیکھیے کہ دنیا کی وہ تمام قومیں اور نسلیں، جو ہمیں ناپسند ہیں، جنت کی مشک افشاں ہوا کو اپنے تعفن سے بوجھل کریں گی۔

اس طرح جنت مخلوق سے بھر جائے گی۔ اگر ہم اس نسل کے لوگ غیر فانی ہیں تو پہلی نسلوں کے لوگ بھی غیر فانی ہوں گے۔ ہر سال لاکھوں جان دیتے ہیں اور چونکہ نسل انسانی لاکھوں

برس سے حالت وجود میں ہے، جنت کا بھی وہی سماں ہو گا جو براڈوے کا دوپہر کے وقت ہوتا ہے۔

ولیم: یہ بحث یقیناً لاطائل ہے کیونکہ بقا پر یقین ہماری فطرت میں رچا ہوا ہے اور استدلال کے احاطہ سے ماورا ہے۔ یہ یقین بقائے نفس کی خواہش پر استوار ہے۔ زندگی مختصر ہے اور "انا" خوشگوار ہے۔ اس لیے ہم کیونکر یہ مان لیں کہ ہم اتنی جلدی ختم ہو جائیں گے؟ بقائے روح کا تصور گرم ممالک میں پیدا ہوا، جہاں زندگی جلد پختہ ہو کر گل سڑ جاتی ہے اور بقائے روح کا تصور اس زندگی کو برداشت کرنے کے لیے لازمی ہو جاتا ہے۔ لنکا میں عورتیں دس سال کی عمر میں بیاہی جاتی ہیں۔ اٹھائیس سال کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہیں اور چالیس سال کی عمر میں مر جاتی ہیں۔ وہاں انسان زندگی کے سمندر میں محض ایک حقیر قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم بھی، حالانکہ ہمارا معیار زندگی ان سے دوگنا ہے، اس معیار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہم موت کی حقیقت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ہم ایک اور شباب اور ایک اور عہد محبت کے متمنی ہیں۔ کبھی مذہب خوف پر مبنی تھا، آج وہ امید پر استوار ہے۔

اینڈریو: آج بھی مذہب خوف پر مبنی ہے۔ ہم بقا اس لیے نہیں چاہتے کہ ہمیں زندگی سے محبت ہے، بلکہ اس لیے کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں۔ بسا اوقات ہم زندگی اور اس کے آلام سے تنگ آ جاتے ہیں۔ ہم سیزر کی طرح یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم کافی دیر زندہ رہ چکے ہیں۔ حیوان موت سے نہیں ڈرتے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی اور حیوان کو مرتے دیکھتے ہیں اور پھر موت کو تبھی دیکھتے ہیں جب وہ ان کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس وقت وہ کوئی نظریہ بقا نہیں بنا سکتے۔ جب حیوان، انسان بنے اور انہوں نے حافظہ کی صلاحیت پیدا کی اور اسے مستقبل پر چسپاں کر کے موت کو دریافت کیا تو اپنے سکون قلب کے لیے بقائے روح کا تصور ایجاد کیا۔ بقول وکٹر ہیوگو، پیدا ہونے کا مطلب موت کا انتظار کرنا ہے۔ موت کا خوف، مذہب کی ابتدا ہے۔

فلپ: مجھے تو اپنی بقا کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنے آپ کو زندگی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ ہم ایک کل کے اجزا ہیں اور ہم اس کل کی بقا کے لیے جو کچھ کرتے ہیں، وہی ہماری بقا ہے۔ افلاطون غیر فانی ہے، محض اس لیے کہ وہ ہمارے ذہنوں میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہم اپنی اولاد اور اپنے تخلیقی کاموں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔ اس قسم کی بقا فرد کے لیے اہم نہیں، لیکن اجتماع کے لیے بہت اہم ہے، کیونکہ تہذیب مرے ہوئے لوگوں کے کارہائے نمایاں کے تحفظ پر مبنی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی یونانیوں اور ابتدائی یہودیوں کی طرح اپنی بقا کو انفرادی بقا نہیں بلکہ اجتماع اور نسل کی بقا سے وابستہ کریں۔

کلیرنس: یہ عجیب بات ہے کہ ہم اسی مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، جسے دو ہزار برس

گزرے لیوکریٹس نے طے کر دیا تھا۔ ذرا لیوکریٹس کو سنئے:

"کیا یہ کائنات پھر عدم میں سما جائے گی اور یہ ناتواں "انا" --- یہ تازہ شعلہ --- تنہا غیر فانی اور اداس سلگتا رہے گا۔

کیا قدرت نے گہوارۂ شب میں اسی لیے اسے پالا تھا۔ قدرت نے اپنی بے نیاز قوت کے ساتھ اس بچے کو ساحل پر پھینک دیا؟

یہ بچہ کیا ہے؟ فقط ایک چیخ۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے اعضا بھی اپنے ہیں کہ نہیں۔ کل اس بچے کی حیثیت ایک چیخ سے بھی کم تھی اور کل وہ اس سے بھی کم ہوگی۔

ایک رگ میں سے دوسری رگ نکلتی ہے اور یہ روح بن جاتا ہے، جس طرح پنکھڑی، پنکھڑی میں سے ابھر کر گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔ رگیں گل سڑ جاتی ہیں اور پانی کے بلبلے کی طرح وہ پھٹ کر مر جاتا ہے۔

پانی کے جھاگ پگھل رہے ہیں۔ جسم میں روح بھی اس طرح پگھل جاتی ہے۔ ذرات تھک کر آرام کرتے ہیں۔ "بیم ورجا" راکھ کی طرح خاموش ہو جاتے ہیں"۔

میتھیو: آپ نے دیکھا کہ آپ کے دلائل کتنے فرسودہ اور پرانے ہیں!

کلیرنس: لیکن میرا خیال تھا کہ پال یہ سمجھتا ہے کہ کسی عقیدے کی قدامت اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حقیقت بہت پرانی ہے اور صرف شاعر کاذب اور احمق ہی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں۔ مجھے اناطول فرانس کا ایک فقرہ یاد ہے جو اپی کیورس کا آخری شاگرد تھا۔ "ہمارا سورج ہم سب کو ہرکولیس مجمع النجوم کی طرف لے جا رہا ہے جہاں ہم کروڑوں صدیوں کے بعد پہنچیں گے وہ راستے میں مر جائے گا اور دنیا بھی اس کے ساتھ تباہ ہو جائے گی"۔ اور ہم دنیا کے ساتھ مر جائیں گے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک فانی سیارے کی مخلوق بقا کا دعویٰ کر رہی ہے؟ لیکن ہم آپ کو اس حسین عقیدے سے محروم کرنا نہیں چاہتے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارا نظریہ یاس آفریں ہے اور ایک گرسنہ روح اس سلبی نظریہ کے لیے ممنون نہیں ہو سکتی۔

پال: ڈرائیے نہیں! آپ نے مجھے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ ایک لمحہ کا محاسبہ نفس تمام دلائل و براہین کو مسترد کر دیتا ہے۔ میں اپنے ذہن کو دیکھ سکتا ہوں اور میں یہ دیکھ سکتا ہوں کہ میرا ذہن، میرے جسم سے برتر کوئی چیز ہے۔ میرا جسم، میری روح کا ایک وقتی آلہ ہے۔ میں حیات بعد ممات کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف زیادہ امید آفریں نظریے کا حامی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، (اگرچہ وہ مادیت کی اصطلاحوں میں تحلیل نہیں ہو سکتا) صحیح ہے۔ اگر آپ کا کوئی عزیز مر جائے تو آپ کو ایک نئے فلسفے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قبر کے نزدیک آپ کے

لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قدرت اس قدر ظالم ہو سکتی ہے کہ آپ کے لخت جگر کو آپ سے چھین لے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مرے ہوئی عزیزوں کو پھر دیکھوں گا۔ اور میرا یہ یقین میرے دل میں جذبہ مسرت اور آلام برداشت کرنے کی وہ طاقت پیدا کرتا ہے جو آپ کے کھوکھلے دلوں کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب آپ پر کوئی صدمہ آئے تو صرف آپ کی حالت پر افسوس کر سکتا ہوں۔

سدھا: میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پال!

میتھیو: میں جانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پال!

کلیرنس: خدا کرے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں پال!

۲۔ خدا کے تغیر پذیر تصورات

الیستھر: یہ تو بے حد مایوس کن نقشہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا کے متعلق آپ کے پاس کچھ خوشگوار باتیں بھی کہنے کو ہیں۔

سر جیمز: محترمہ! اگر ہم اس خدا کی حقیقت ثابت نہ کر سکیں، جس کی عبادت آپ بچپن میں کیا کرتی تھیں، تو پریشان نہ ہو جیئے گا۔ انسان کا تصور خدا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی تاریخ خدا کے تصورات کے تغیر و تبدل کی داستان ہے۔ ایک تصور بدل جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے جو انسانیت کے پھلتے پھولتے اخلاقی نصب العین کی نمائندگی کرتا ہے۔ خداؤں کے ان مختلف تصورات کی فہرست دیکھ کر حیران ہوں گے جنہیں انسان نے لازوال سمجھ کر کبھی نہ کبھی مرکز عبادت بنایا ہے۔ اس فہرست میں ہمیں سینکڑوں بڑے خدا اور کروڑوں چھوٹے خدا نظر آتے ہیں۔ اگر آج پچھلی نسلوں کے لوگ پھر زمین پر واپس آئیں تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ ان کے قادر مطلق دیوتا، جن کے آگے کبھی وہ انہماک اور سپردگی سے سربہ سجود ہوتے تھے، آج صرف علم الانسان کے ماہرین کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ہر عہد میں لوگوں نے ایک نئے انداز سے خدا کو سمجھا ہے اور اس ہنگامی تصور کے تحفظ کے لیے جانیں دی ہیں اور کشت و خون کا بازار گرم کیا ہے۔ مورخ اس قتل و غارت یا شہادت سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ لوگوں نے اکثر تبدل پذیر تصورات کے لیے جانیں دی ہیں اور وہ اس بات کے لیے تیار ہے کہ جس طرح یہ تصور ماضی میں بدلتا رہا ہے، حال اور مستقبل میں بھی بدلے گا۔ اس لیے وہ خدا کے تصور کی نئی تعبیروں سے نہیں گھبراتا۔ وہ اس تصور کو بڑھتے ہوئے علم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوششوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ انسان ہمیشہ خدا پر یقین رکھیں گے کیونکہ طاقت اور کمال کا امتزاج روح میں امنگ اور طلب پیدا کرتا ہے۔ قدرت مطلق کے ساتھ دوست داری بہت خوشگوار ہوتی ہے۔

ہمارے آباؤ اجداد کا خدا' یہوداہ کی زندگی کی آخری شب تھی۔ فرائیڈ نے خداؤں کی تشکیل میں باپ کے تصور کے حصے کو کسی قدر مبالغے سے بیان کیا ہے۔ یقیناً نوجوان ذہن' خدا کو ایک باپ سمجھتے ہیں جو دنیا کے کنبہ پر حکومت کرتا ہے' لیکن باپ کا تصور آباپرستی کے ادارہ اور اس عقیدہ سے اخذ کیا گیا ہے کہ مختلف قبائل مختلف دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ خدا کو مردانہ خصائل سے متصف کرنا عورت کی آخری توہین ہے۔ جس کا انتقام وہ لے کر رہے گی۔

خدا کے ساتھ انسانی صفات وابستہ کرنے کا رجحان غالباً آباپرستی کے ادارہ سے پیدا ہوا۔ خدا ایک مرد کی مانند ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایک عام مرد سے زیادہ وسیع اور توانا ہے۔ زینوفن نے مسیح سے ۶۰۰ برس پہلے کہا تھا "انسان یہ سمجھتے ہیں کہ دیوتا پیدا ہوتے ہیں اور انسانوں کی طرح لباس پہنتے ہیں اور آواز دیتے ہیں' لیکن حبشہ کے دیوتا سیاہ فام ہوتے ہیں اور ان کی ناک چپٹی ہوتی ہے اور تھریشیا کے دیوتاؤں کے بال کم سیاہ اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔ ہومر اور ہسیائیڈ نے دیوتاؤں سے وہ تمام صفات منسوب کیں جو انسانوں میں مذموم سمجھی جاتی ہیں۔ چوری' زنا' فریب اور دوسرے غیر اخلاقی اعمال۔ اگر بیلوں' شیروں اور گھوڑوں میں صنم تراشی کی صلاحیت ہوتی تو وہ اپنی شکلوں کے مطابق دیوتا بناتے اور انہیں اپنی طرح کے جسموں میں ڈھالتے"۔

اولمپس کے خاندان کی بداخلاقی کے متعلق یہ شکایت اس عمل کو واضح کرتی ہے جس کے ذریعہ خدا مرجاتے ہیں۔ یہ خدا انسان کی اخلاقی نشوونما سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے کبریائی جمود کے باعث فنا ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی یونانیوں کے زناکار' چور اور دروغ گو دیوتا' ان لوگوں نے وضع کیے تھے جنہیں یہ طرز عمل معیوب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ عہد لوٹ مار' زنا بالجبر اور جنگ و جدل کا عہد تھا اور دیوتا ان کاموں میں خوب ماہر تھے۔ اخلاقی شعور کی ترقی نے ان بدچلن دیوتاؤں کو افلاطون اور زینوفن کا ہدف تنقید و تنقیص بنایا۔ یہی حال سب دیوتاؤں کا ہے۔ شروع شروع میں ان کے متعلق جو تصور باندھا گیا تھا' وہ بعد کے لوگوں کو ناپسند تھا۔ یہ ہر تہذیب کی بدقسمتی ہے کہ اسے وحشی دیوتا میراث میں ملتے ہیں۔ ہمیں اپنے موروثی خدا یہوداہ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جنگ کا دیوتا تھا۔ جس طرح جہنم کا تصور وحشی انسانوں کے ظلم و ستم کی عکاسی کرتا ہے' اسی طرح خدا کا تصور قبائلی زندگی کے خطرات و خدشات کا آئینہ دار ہے۔ اجتماعی نظام کی ترقی سے زندگی زیادہ محفوظ ہوگئی اور جنگیں کم ہوگئیں تو بالغ اذہان نے ایک ظالم خدا کے تصور کے خلاف بغاوت کی' جو کروڑوں انسانوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے۔ اجتماعی نظام کا یہ تقاضا تھا کہ لوگوں میں اخلاقی تعاون کی عادات پیدا ہوں۔ آہستہ آہستہ ایک کامل انسان کا تصور اس قدیم خدا کے تصور سے دور ہٹتا گیا۔ جان سٹوارٹ مل نے یہ کہا تھا کہ "اگر زمانہ وسطی کے دینی تصور کا خدا موجود ہے تو وہ خدا

نہیں شیطان ہے۔ اور اگر یہ خدا مجھے اس لیے جہنم میں بھیجے گا کہ میں اسے اچھا نہیں سمجھتا تو میں جہنم میں جانا پسند کروں گا"۔ انسان کی اخلاقی ترقی اس کے "تصور خدا" سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔

انسانی فطرت کی یہ تہذیب و تزکیہ کچھ اقتصادی ضروریات کی تسکین اور سیاسی حالات کی ترتیب سے اور کچھ مسیحی اخلاق کے انیس سو سال کی تاریخ سے وجود میں آئی ہے۔ مسیح نے یہوداہ کا خاتمہ کیا، مسیحیت نے مفروضہ مسیحی خدا کو ختم کیا۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ہم اپنی جنگجوئی اور سیاسی انتشار کے باوجود دو ہزار برس کی اخلاقی تربیت سے متاثر نہیں ہوئے۔ ہم آج کل جو حالات دیکھ رہے ہیں، ان کا یہ مطلب نہیں کہ مسیحیت ختم ہو گئی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسیح اپنے رحم و کرم کی تلقین کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک بہتر خدا کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

اینڈریو: یقیناً یہ کسی مذہب کی عظمت کی علامت ہے کہ وہ اپنے نظام اخلاق کے کمال کے باعث تباہ ہو جائے۔ لیکن آپ کے بیان میں سب اسباب و نتائج کا ذکر نہیں۔ جب کوپر نیکس نے اعلان کیا کہ زمین ان گنت دنیاؤں کے درمیان محض ایک ذرہ کی حیثیت رکھتی ہے تو قدیمی ایمان ختم ہو گیا۔ کائنات کا کوئی مرکز نہیں ہے، کوئی اعلیٰ ادنیٰ کی نسبتیں نہیں ہیں۔ زمین اپنا وقار کھو چکی تھی اور اس ایمان کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں کہ کائنات کے پس پردہ جو کبریائی قوت کارفرما ہے، وہ محض اس حقیر سیارہ کی حقیر مخلوق کے حقیر گناہوں کی خاطر اس دنیا میں آئی، دکھ اٹھائے اور سولی پر چڑھ گئی۔ اسی لیے اناطول فرانس نے اس انقلاب کے متعلق یہ کہا تھا کہ یہ تاریخ فکر کا اہم ترین واقعہ ہے۔ دنیا نے اس انقلاب کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا۔ وہ انقلاب، جس نے جنت کی جگہ مکان کو دے دی اور دنیا اور انسان کو سیاروں کی تاریخ میں محض حادثات بنا دیا۔ برونو کو محض اس لیے نذر آتش کر دیا گیا کہ اس نے ان مطالب کی وضاحت کر دی تھی "لیکن اصلاح مذہب" کی تحریک کچھ اس طرح جاری رہی جیسے کوپر نیکس اور گیلیلیو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔

ڈارون نے اس تخریبی مہم کو مکمل کر دیا جس طرح ماہر فلکیات نے کرۂ ارض کو مکان کی خلا میں جھونک دیا تھا۔ اسی طرح ماہر حیاتیات نے انسان کو لامحدود زمان کی نذر کر دیا۔ قیمت کی جگہ "فطری انتخاب" نے لے لی، دائمی عشق کی جگہ دائمی مبارزہ نے لے لی۔ جنگ پھر خالق زندگی بن گئی۔ پالی کے عہد میں ہر عضو ایک خاص وظیفہ کی ادائیگی کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ اور ہر حیوان، انسان کی ضروریات کی تسکین کے لیے پیدا ہوا تھا لیکن ڈارون نے نہ صرف اس تمام نظام کو ختم کر دیا بلکہ اس نے یہ بھی بتایا کہ تمام انسانی زندگی میں ایک بدنظمی اور ابتری کا اصول کارفرما ہے۔ کیا کوئی چیز اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہو سکتی ہے جس سے انسان اپنی نسل میں اضافہ کرتا ہے؟ پیدائش

اور موت کی حقیقت ہی خدا کے وجود کی تردید کے لیے کافی ہے۔ کوئی طبیب اور کوئی جرنیل اس پر یقین نہیں رکھتا۔ کیا کوئی ذہین خالق اس قسم کی دنیا بنا سکتا تھا جس میں ذی حیات کا واحد آئین رزم بیکار ہے اور جس میں فقط جابر، مکار اور بے رحم کی فتح ہوتی ہے۔ اس آئین کی رو سے ہر جگہ جنگ ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان قبیلے اور قبیلے کے درمیان سلطنت اور سلطنت کے درمیان جنس اور جنس کے درمیان بس جنگ کا آئین کارفرما ہے۔ اور شاید وہ وقت بھی آجائے جب سیارے اور سیارے کے درمیان بھی جنگ ہونے لگے۔ سیارے ابھی سے ایک دوسرے کے خلاف آمادہ پیکار نظر آتے ہیں جیسے کوئی شیطان تخریب وتباہی سے لذت اندوز ہو رہا ہو۔

ہم جو خدا کے اس منتخب سیارے میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جہاں اس کا پیارا بیٹا پیدا ہوا تھا، ہماری ہر ایجاد اور ہر اختراع ہمارے درد و آلام میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ہر مشین ہماری غلامی کی زنجیروں کو مستحکم تر کرتی جا رہی ہے۔ ہم نے فضاؤں میں پرواز کرنا محض اس لیے سیکھا ہے کہ اگلی جنگ میں ہم زیادہ آسانی سے کروڑوں شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار سکیں۔ بیتھوون، جسے سب سے زیادہ کانوں کی ضرورت تھی، بہرا ہوگیا۔ نیطشے کو آنکھیں چاہئیں تھیں، وہ اندھا ہوگیا۔ ڈاکٹر جانسن کی عظمت کا راز اس کی طلاقت ہی تھی۔ مگر اس کی قوت گویائی اس سے چھین لی گئی۔ مصور عظیم رینلڈز کا بازو بیکار ہوگیا۔ چند دن ہوئے، میں نے ایک مفلوج عورت کو دیکھا۔ بیس برس پہلے وہ جوان اور حسین تھی۔ ٹینس کھیلنے کے فوراً بعد تیرنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہوگئی۔ کوئی نامعلوم زہر اس کے اعضا میں سرایت کرگیا۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی معذور ہے۔ اس کا چہرہ سوج کر کپا ہوگیا ہے اور اس کے ذہن کے سوا اس کی تمام شخصیت شکستہ اور افسردہ ہے۔ اس کا ذہن پہلے سے زیادہ بیدار ہے تاکہ وہ اپنے دکھ کو زیادہ شدت سے محسوس کرسکے۔ بقول ہنری ایڈمس "یہ دنیا، رنج والم کی آماجگاہ ہے۔ طاعون، وبا اور قحط، سیلاب، خشک سالی اور انجماد، عالمگیر مصائب اور شہروں کے گمنام گوشوں میں ہونے والے حوادث، ظلم و ستم، بداخلاقی، حماقت، تذبذب اور جنون، نیکی کے بدلے بدی، بدی سے نیکی کی پیدائش، شعور کے بغیر مسرت، بے نتیجہ خود غرضی، بے سبب اندوہ اور مبہم خطرات"۔۔۔ اور موت ان تمام کیفیتوں کا صلہ ہے، رحمت ایزدی کا ذکر ہی انسان کے آلام و مصائب کی توہین کے مترادف ہے۔

میتھیو: اینڈریو! آپ بدی کا ذکر اس شدت احساس سے کر رہے ہیں کہ میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ آپ کو کسی نہ کسی دن دولت ایمان ضرور حاصل ہو جائے گی۔ کلیسا نے ہمیشہ شر کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ پاپائے انوسنٹ نے "انسان کے دکھ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی، اور ہمارے مذہب کا ہر عقیدہ یہ فرض کرتا ہے کہ یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ اسی لیے ہمیں ایمان کی

ضرورت ہے۔ ہم اس زندگی کو کس طرح برداشت کر سکیں گے اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہمیں اس کے عوض دوسری دنیا میں راحت و مسرت حاصل ہو گی۔ آپ نے شاید ابھی تک والٹیئر کا سبق نہیں سیکھا کہ اگر خدا کا وجود نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا ایجاد کرنا پڑے گا۔

اینڈریو: میتھیو، آپ ایک شریف انسان ہیں۔ آپ اس تحمل اور رواداری سے ہمارے کفر و شرک کو برداشت کرتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی ہر بات مان لی جائے۔ میں کسی جذبہ خود پسندی کی وجہ سے آپ کی مخالفت نہیں کر رہا۔ شاید آپ ہی صحیح کہہ رہے ہوں، لیکن آپ کی ساری دینیات انسان کے "ہبوط" کے عقیدے اور اس یقین پر استوار ہے کہ مسیح نے انسان کو جہنم سے بچا لیا ہے، اور ارتقا نے ان عقائد کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ جب تاریخ نے اپنی داستان میں سے حضرت آدم کو خارج کیا تو آپ کی دینیات کی بنیادیں مسمار ہو گئی تھیں۔ تاریخ، دینیات کی اتنی ہی دشمن ہے جتنی کہ حیاتیات۔ قوموں کے عروج و زوال، جنگ کی وجہ سے استیصال فن، چوروں، دیوانوں اور قاتلوں کی متصل فتح اور کامرانی سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جو اناطول فرانس نے نکالا تھا کہ "دنیا ایک المیہ ہے جسے کسی عظیم شاعر نے تصنیف کیا ہے" یا "یہ ایک طربیہ ہے جسے جنت کے ارسٹوفینیز نے تصنیف کیا ہے"۔

کلیرنس: مجھے اس تاثر سے دلچسپی ہے، جو میتھیو نے آپ کی تقریر سے حاصل کیا ہے۔ شر، ایمان اور شک دونوں کی تخلیق کرتا ہے۔ ہر سپاہی، جب تک کہ اسے ترقی نہ ملے، مذہب پر ایمان رکھتا ہے۔ ہر جرنیل دہریہ ہوتا ہے۔ دکھ، جو آپ کے لیے خدا کی ہستی کے خلاف ایک بین ثبوت ہے، اس پر یہ بات واضح کرتا ہے کہ روح کو کسی نہ کسی طرح تسکین بہم پہنچانی چاہیے۔ جب تک دنیا میں افلاس یا موت ہے، دیوتا موجود رہیں گے۔ دولت کا وفور مذہب کے انحطاط کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دولت رہبانیت کو کچل کر ہمارے شہروں کو تعیش اور بد اخلاقی کے سامان سے مالا مال کرتی ہے اور جب مذہب تعیش اور بد اخلاقی کی مذمت کرتا ہے تو ہر شخص، سوائے اس کے، جو شر کی توفیق نہیں رکھتا، مذہب کے خلاف ہو جاتا ہے۔

پال: دولت سے کہیں زیادہ مشین بے دینی کا سبب ہے۔ صنعتی انقلاب نے مشین کی مدد سے معجزے کر کے دکھائے ہیں اور جدید ذہن ان معجزوں سے اس قدر متاثر ہوا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مشین ہی اہل کائنات ہے۔ زمانہ وسطیٰ کے لوگوں کے نزدیک فطرت میں خدا جلوہ گر تھا، اس لیے وہ فطرت کی پرستش کرتے تھے اور فن کی تخلیق سے حسن فطرت کے تقابل کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جدید ذہن فطرت کو مفید اشیا بنانے کے لیے خام مال سمجھتا ہے۔ جدید انسان درخت کاٹ دیتا ہے تاکہ ان سے کاغذ بنائے۔ وہ ہوا اور پانی کو کیمیاوی مرکبوں سے مسموم کر دیتا ہے۔ وہ

ایک خاموش گاؤں کو ایک پر خروش صنعتی شہر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ نئے آلات بناتا ہے اور زمین کو قبضہ قدرت میں لانے کی کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ ایمان کے زوال کا ایک سبب یہ ہے کہ انسان کے "انا" کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ وہ اپنے اوزاروں سے سب کچھ کر سکتا ہے، اس لیے اسے خدا کی ضرورت نہیں رہی۔ جب لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے تو وہ زیادہ منکسر المزاج اور غالباً زیادہ شدید جذبات کے حامل تھے۔ وہ زمین سے ابھرتی، پھلتی پھولتی زندگی کے مشاہدہ سے طلسم حیات کا اندازہ لگاتے تھے اور کبھی اپنے بچوں کو مشینیں نہیں سمجھتے تھے۔

کلیرنس: اسپنسر کو بھی آپ سے کسی قدر اتفاق تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مافوق الفطرت ہستیوں پر یقین صنعتی عہد سے قبل عسکری گروہوں میں زیادہ مستحکم تھا۔ اس لیے کہ اس وقت عوام میں اطاعت کی صفت بہت ضروری تھی، پھر یہ کہ صنعت نے، چونکہ وہ ذہانت کی نشوونما کرتی ہے، اس ایمان کو کمزور کر دیا۔ میرے خیال میں صنعت اس لیے بھی مذہب کے لیے مضر ہے کہ وہ مختلف مذاہب کے پیرودؤں کو بڑے بڑے شہروں میں یکجا کرتی ہے اور مختلف مذاہب ایک دوسرے سے مل جل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور صنعت سے جمہوریت پیدا ہوتی ہے، اسی لیے آمرانہ ذہنیت کا قدیم خدا کمزور ہوتا گیا اور اس کی جگہ ایک آئین پسند خدا نے لے لی اور پھر اعداد کی پرستش سے انسانیت کے مذہب نے جنم لیا۔

اینڈریو: آپ ہمارے کفر والحاد کے اسباب کا شمار کرتے کرتے کہیں تعلیم کو نہ بھول جائیے گا۔ آج کا طالب علم کیمیاوی اور طبیعیاتی دارالعمل میں دھکیل دیا جاتا ہے اور وہ اپنے سامنے دنیا کو تحلیل ہوتے اور پھر نئے سرے سے بنتے دیکھتا ہے۔ اس تمام عمل کی توجیہ میں خدا کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ وہ "حیاتیات" پڑھتا ہے اور اگر وہ کسی ایسی ریاست کا باشندہ نہیں جہاں سائنٹیفک مسائل، استصواب رائے یا آئین سازی سے طے ہوتے ہیں تو وہ یہ سیکھتا ہے کہ "کبریائی مقصد" محض ایک مفید ارتقائی حادثہ ہے۔ وہ علم الانسان اور تقابلی مذہب سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، سر جیمز کی تصانیف کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے ایمان اور رسم و رواج کو ایک وسیع تناظر کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ ان کی حیثیت قدیم جہالت کے توہمات سے زیادہ نہیں رہتی، اسی لیے پیرانہ سال بزرگ ہمارے کالجوں کو دہریت کے خم کدے سمجھتے ہیں۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں، یہ مجبور ہیں۔

ولیم: آپ سب یہ بھول گئے ہیں کہ لادینی کی ایک وجہ جنگ بھی ہے۔ جنگ سے افلاس زدہ طبقہ مذہب کے اور قریب آگیا، لیکن متمول لوگوں میں تشکک بڑھ گیا۔ جو دنیا خودکشی پر آمادہ ہو، وہ ایک فیاض اور اعلیٰ ذہن کی تخلیق کیونکر کر سکتی ہے!

فلپ: اسباب کچھ ہی ہوں، یہ حقیقت واضح ہے کہ مذہب مغربی دنیا میں اپنا اثر کھو چکا

ہے اور دنیاداری کی ایک رو زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو اپنی زد میں لے رہی ہے جو کبھی مذہب کے زیر اثر تھے۔ یہ کالج، جن کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے، کبھی مذہبی فرقوں کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن صنعت کے دور میں یہ محسوس کیا گیا کہ ہمارے کالج، فلسفی، شاعر، خطیب اور ماہرین دینیات پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن انجینئر، اکاؤنٹنٹ اور کلرک، جن کی صنعت کو ضرورت تھی، ناپید تھے۔ صنعت نے شکایت کی اور جب کالجوں نے دیکھا کہ شکوہ سنج مالدار ہے تو انہوں نے پادریوں کو برطرف کر دیا اور سرمایہ داروں کو اپنا سرپرست بنا لیا۔ آج کالجوں میں ادب اور فلسفے کی جگہ طبیعیات اور کیمیا نے لے لی ہے۔ سائنس نے مذہب سے یونیورسٹیاں چھین لی ہیں۔

یہ ہے سرچشمہ ہماری دنیاداری کا۔ اسی سرچشمہ سے وہ ندیاں پھوٹیں جنہوں نے ہماری زندگی کے ہر پہلو کو شاداب کیا ہے۔ وہ مقدس ہستیاں، جو کبھی ہمارے تہواروں کو پرمسرت اور حزیں بناتی تھیں، آج فراموش کر دی گئی ہیں۔ زراعت کبھی دعاؤں اور مذہبی رسوم سے متاثر ہوتی تھی، آج وہ کیمیاوی مرکبات کے زیر اثر آ گئی ہے۔ قانون جو کبھی جلوۂ ربانی کی حیثیت رکھتا تھا، آج کانگرس کے قائدوں کی رضا کا اظہار ہے۔ ریاست جو کبھی مذہب میں مدغم تھی، آج ہر قسم کے اصول سے بے نیاز ہے۔ وہ اب مذہب کو محتسب کی حیثیت دینے پر بھی تیار نہیں۔ ہماری حکومت کسی مقدس تہوار کو مسیحی بن جاتی ہے، لیکن سال کے باقی دن اس ایک دن کی کمزوری کا کفارہ ادا کرنے میں صرف کر دیتی ہے۔ مصطفیٰ کمال نے ریاست کو لادینی قرار دے دیا اور ترکیہ کے صرف چند اخباروں نے اس انقلاب کو قابل ذکر سمجھا۔

یہ حقیقت ہے کہ بہت سے فرقوں میں اور بہت سے روشن خیال ذہنوں کے گمنام اور تاریک گوشوں میں آج بھی بے بنیاد توہمات اور نامعقول عقائد جاگزیں ہیں۔ لیکن عہد ماضی کی خونیں رسوم اور بے ڈھب عقائد کے مقابلے میں وہ معقول اور ناتواں معلوم ہوتے ہیں۔ ہم مغربی یورپ اور مشرق کا مقابلہ کریں تو ہمیں اپنی لامذہبیت کی وسعت کا اندازہ ہو گا۔ گبن کہتا ہے کہ "ابتدائی مسیحی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ہر طرف سے عفریتوں کے حملوں کی زد میں ہیں۔ تصورات انہیں سکون قلب عطا کرتے تھے، القا ان کی راہبری کرتا تھا اور کلیسا کی شفقت انہیں بھوک، مرض، حتی کہ موت سے بھی نجات دلواتی تھی"۔ آج ان عقائد میں سے کیا باقی رہ گیا ہے؟ تہذیب کی تاریخ دراصل دنیاداری کی تاریخ ہے۔ آج جو وعظ ہم سنتے ہیں، وہ تصورات، عفریتوں اور الہاموں کا ذکر نہیں کرتے۔ جہنم، اعراف اور معجزے کا ذکر بھی کہیں سنائی نہیں دیتا۔ ہر چیز عقل کی نذر ہو گئی ہے اور دینیات، اپنے جذبہ پارینہ سے محروم ہو کر اب فلسفے اور اخلاقیات کا ایک مرکب بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن اخلاق جو کبھی کلیسا کی ملکیت تھا، اب کلیسا اور ریاست دونوں سے علیحدہ

ہوگیا ہے۔ اخلاق کی مافوق الفطرت بنیادیں کمزور ہوگئی ہیں اور احساس گناہ زوال پذیر ہے۔ ہمارے نوجوانوں کا اخلاقی نصب العین نیکی نہیں بلکہ احتیاط ہوگیا ہے۔

اینڈریو: مذہبی رسوم کی پابندی کے متعلق جو اعداد و شمار شائع کیے گئے ہیں‘ ان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی یورپ اور امریکہ میں مذہب کا تسلط اور غلبہ ختم ہوچکا ہے۔

کلیرنس: مذہب کے نام لیواؤں کی فہرست میں فقط مسیحی ہی نہیں بلکہ تھیوسوفسٹ بھی ہیں۔ آج امریکہ میں صرف چار کروڑ انسان گرجے جاتے ہیں۔ باقی لوگ اتوار کے دن آرام سے بستروں میں پڑے رہتے ہیں۔ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ مسیحیت اسی انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے جو کبھی سوفسطائیوں کے عروج کے باعث قدیم یونانی مذہب پر آیا تھا۔ والٹیئر‘ پروٹیگورس تھا--- ڈڈرو‘ ڈیموکریٹس تھا--- کانٹ‘ افلاطون تھا--- اسپنسر‘ ارسطو تھا اور اناطول فرانس‘ اپی کیورس تھا۔ ہم خداؤں کے عہد زوال میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۳۔ مذہب کا منصب

پال: کلیرنس‘ آپ کے لہجہ میں اداسی کی جھلک ہے۔ آپ کے احساسات کا اندازہ بھی مذہبی ہے لیکن آپ کی تجزیہ پسند عقل آپ کو ایمان سے محروم کر رہی ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی منطق آپ کے دل سے زیادہ قابل اعتماد ہے؟ کیا یہ فلکیات‘ طبیعیات‘ حیاتیات جیسے علوم اتنے مستند ہیں کہ آپ ان کے آگے ان تمام امید آفریں عقائد کو پس پشت ڈالنے میں حق بجانب ہو جائیں جو لاکھوں انسانوں کا ملجا و ماویٰ ہوں۔

کلیرنس: مجھے معلوم ہے کہ ایمان سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ میرا ایک بوڑھا چچا پہاڑ پر رہتا ہے۔ وہ ساری عمر کھیتی باڑی کرتا رہا اور جب اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا تو وہ خاموشی سے آگ کے پاس بیٹھ کر زندگی کے دن کاٹنے لگا۔ وہ کہتا ہے: ”میں کوئی ایسا برا آدمی نہیں۔ اپنی زندگی میں‘ میں نے دو چار گناہ ضرور کیے ہیں لیکن خدا رحیم و غفور ہے‘ وہ ضرور مجھے معاف کر دے گا“۔ اس کی بیوی اس کے پاس بیٹھ کر انجیل پڑھتی ہے اور مسیح کے ہر لفظ کو اپنے اندر خوشی سے جذب کرتی رہتی ہے۔ میں ان کی امیدوں کو توڑنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں کو آخر سکون قلب سے کیوں محروم کیا جائے؟ قریب کے گاؤں میں ایک صاف ستھرا‘ سفید اور ہمدرد قسم کا گرجا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی روحوں کو یہاں سے دولت ایمان حاصل ہوتی ہے۔ اس گرجے کے پیچھے ایک قبرستان ہے۔ ہر قبر پر کسی فرشتہ کا مجسمہ یا صلیب کا نشان بنا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر کتبہ مردے کو مسیح کے سایہ شفقت میں لا کر اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ عوام کس طرح امید کے سہارے جیتے ہیں۔

پال: میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ سادہ لوح لوگ راستی پر ہیں تو دنیا یقیناً زیادہ حسین ہے۔

اینڈریو: آپ بہت جذباتی ہیں، کلرینس! آپ نے میتھیو کی پیروی میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ جنت کی امید ہماری زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہے۔ لیکن آپ یہ بھول گئے کہ کلیسا نے جہنم کی آتش ابدی کی دھمکی دے کر لاتعداد انسانوں کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا اور مقدس کتاب یہ کہتی ہے کہ اکثر لوگ جہنم ہی میں جائیں گے۔ آپ میتھیو کو یہ بات کیوں یاد نہیں دلاتے کہ مذہب نے لوگوں کی زندگیوں کو تاریک اور المناک بھی بنائے رکھا ہے۔ عقیدہ پرستی اور معمولی مذہبی اختلافات کی بنا پر خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ فرقہ پرستی نے لاکھوں انسانوں کو رزم و پیکار میں مبتلا کیا ہے۔ مرد اور عورتیں محض اس خدشہ کے باعث جان سے مار دیئے گئے کہ ان کا کوئی معمولی مشرکانہ عقیدہ کتاب مقدس یا کلیسا کی حقانیت کو داغدار نہ کر دے۔ آپ کی باتوں سے مجھے سینگز کا ایک قول یاد آگیا۔ وہ کہتا ہے کہ دہریت اور صحیح مذہبیت کی آرزو میں کوئی تناقض نہیں۔ ہماری صدی کے اوائل میں اس قسم کے بہت سے دہریے پیدا ہوئے مثلاً اناطول فرانس، جارج مور، اور جارج سنیانا، جو ایمان افسردہ کے رومانی ماتم گسار تھے، وہ ایک عبوری دور کے نمائندے تھے۔ ان کے بعد کی نسلیں ان کی طرح محسوس نہیں کرتیں اور شاید ہماری اولاد اس مذہبی کیفیت سے بالکل نابلد ہو۔ اگر ہم انسان کو دو تین نسلوں تک بقا کے تصور سے دور رکھیں تو یہ شاعرانہ اداسی بھی ختم ہو جائے۔

ولیم: مجھے آپ سے اتفاق نہیں، اینڈریو! یقین ایک فطری چیز ہے۔ یہ جبلی اور جذباتی تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی خوش قسمتی کے لیے تشکر اور امتنان کا احساس ہم پر حاوی ہو جاتا ہے اور ہم یہ آرزو کرنے لگتے ہیں کہ "روح کائنات" ہمارے خاموش تشکر سے آگاہ ہو جائے۔ نیطشے کہتا ہے کہ بد نصیبی کا یہ رجحان کہ وہ غیر متوقع طور پر خوش نصیبی بن جاتی ہے، مجھے اس بات پر مائل کرتا ہے کہ میں خدا پر یقین لے آؤں۔ ایک صدی کے لیے مذہب کو دبا دو، اس کے بعد ڈھکنا کھولو تو مذہب پھر ابھر آئے گا۔ ایمان کی نوعیت تشکک سے زیادہ فطری ہے، اس لیے اس کا ابھرنا بھی آسان ہے۔ شک ہماری شخصیت کو سکیڑتا ہے مگر ایمان ہماری شخصیت میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ہاضمے اور دوران خون کو بہتر بناتا ہے۔ ہر متشکک کا ہاضمہ خراب ہوتا ہے، اس لیے رجائیت، یاسیت سے زیادہ عام ہے اور مقبول ترین مصنف، بقول نپولین، امید کے تاجر ہوتے ہیں۔ شک کرنے والے کو کاوش کرنی پڑتی ہے اور انسان فطرتاً "تن آسان ہے۔ عوام ذہنی طور پر خوشہ چین ہیں۔ چند مستحکم ذہن ہی کاوش کرتے ہیں۔ صرف مستحکم شخصیتیں ہی شک کر سکتی ہیں۔ شک کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔

میتھیو: آپ مذہب کا ایک اور ماخذ بھول گئے اور وہ ہے انسان کی شاعرانہ صلاحیت۔

مذہب نے نہ صرف موت کے خوف کو کم کر دیا ہے، بلکہ زندگی کو رسوم، فن تعمیر، صنم تراشی، مصوری، تمثیل اور موسیقی سے زیادہ حسین بنا دیا ہے۔ اس نے زندگی کے روزمرہ واقعات کو، پیدائش سے لے کر شادی اور شادی سے لے کر موت تک کے واقعات کو ایسا تقدس عطا کیا ہے کہ یہ عام واقعات گہرے جذبات سے وابستہ ہوگئے ہیں اور متعلقہ فنون سے حسین بن گئے ہیں۔ اس نے زندگی کے المیہ کو ایک مقدس منزل کی طرف ایک شاعرانہ سفر میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کے بغیر زندگی اسی طرح بے کیف ہے جس طرح روح کے بغیر جسم۔ میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ اتوار کی شام کو جب گرجے کی گھنٹیاں بجتی ہیں، دہریہ کیا محسوس کرتا ہے؟ کیا اس پر احساس تنہائی نہیں چھا جاتا؟ کیا مقدس تہوار آپ کے لیے دوسرے دنوں سے مختلف نہیں ہوتے؟ میرا خیال ہے آپ کی تمام مجالس رقص و سرود ان کی جگہ نہیں لے سکتی۔

اینڈریو: میتھیو! سچ بتایئے گا کیا آپ گرجے میں جانے سے اکتا نہیں جاتے؟

میتھیو: شاید کبھی کبھی، لیکن جب میرا ذہن روشن ہو جاتا ہے تو میں یہ جانتا ہوں کہ گرجے میں ایک گھنٹہ گزارنے سے میں پورے ہفتے شاداں اور فرحاں رہتا ہوں۔ اس کے برعکس آپ کے لیے کرسمس کتنا بے کیف ہوتا ہوگا! مجھے یاد ہے کرسمس سے ایک دن پہلے ہم خاندان کے سب افراد مل کر دعا کرتے۔ کرسمس کے دن بھی عبادت کرتے۔ ہر شخص خوش نظر آتا۔ برف سے تمام فضا شفاف ہوتی، گھنٹیاں بجتیں اور کرسمس کے درخت چمکتے ہوتے۔ بچے تحفے لے کر خوش ہوتے، بڑے تحفے دے کر خوش ہوتے۔ نوروز کو ہم سب بچے اپنے باپ کے سامنے جھک کر اس کی شفقت طلب کرتے۔ یہ تھے ان دنوں کے کنبے! آج، جبکہ تقدس ختم ہوگیا ہے، خاندان ٹوٹ رہے ہیں اور جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کلیرنس: میرے ایک دوست نے مجھے شعور مذہب کی چار منزلیں بتائی ہیں۔ پہلی منزل جذباتی یقین، دوسری منزل الہیاتی یقین، تیسری منزل مطلق مایوسی اور چوتھی منزل جمالیاتی شعور۔ میں اس چوتھی منزل میں آپ کے ساتھ ہوں، میتھیو، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اسے صحیح بھی سمجھتے ہیں؟

میتھیو: اسے صحیح سمجھنا لازمی ہے۔ بغیر صحیح ہوئے یہ حسین کیونکر ہو سکتی ہے؟

پال: میتھیو! آپ نے مذہب کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ آپ نے فرد کے لیے اس کی اہمیت واضح کی ہے، لیکن وہ سماج کے لیے بھی اسی قدر مفید اور اہم ہے۔ شادی سے متعلق مذہبی رسوم محض ایک مرد اور ایک عورت کو یکجا نہیں کر دیتیں۔ وہ اس واقعہ کو وہ جذباتی شدت اور تقدس عطا کرتی ہیں، جس کے بغیر شادی محض تناسل کی اجازت ہوتی۔ اس طرح خاندان اور

ریاست مستحکم رشتوں میں بندھ جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ہم بسا اوقات یہ دیکھتے ہیں کہ انفرادی جبلتیں اجتماعی جبلتوں سے کہیں زیادہ توانا ہوتی ہیں۔ جبلت تناسل ضروری نہیں کہ اجتماعی ہو۔ یہ جبلت انتشار اور تفرقہ پیدا کر سکتی ہے جیسا کہ آج کل کرتی ہے۔ مذہب کا عظیم وظیفہ یہ ہے کہ وہ احساس تقدیس، اخلاقی تدریس اور وعدۂ جنت سے..............

اینڈریو: اور خوف جہنم سے..............

پال: اجتماعی جبلتوں کو مضبوط تر بنائیے۔ جہنم پر میرا ایمان نہیں۔ اس کے تصور نے ہزاروں انسانوں کو گناہ سے باز رکھا ہے۔ جب کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جہنم کا وجود نہیں ہے تو وہ شیطان کی تحریص کا شکار ہو جاتا ہے۔ اخلاق کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ جزو کے خلاف کل، اور حال کے خلاف مستقبل کی اہمیت واضح کرے۔ مذہب بھی یہی فرض ادا کرتا ہے۔ بقول ہاف ڈنگ، مذہب اقدار کے تحفظ کا نام ہے۔ مذہبی بنیادوں کے بغیر اخلاق محض حساب کتاب بن جاتا ہے۔ "احساس فرض" مٹ جاتا ہے اور ہر نوجوان اپنی تمام ذہانت اور تعلیم اخلاقی احکام کی خلاف ورزی کرنے پر صرف کر دیتا ہے۔

فلپ: اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ مذہب مدرسوں کی ایجاد سے پہلے تاریخ کی سب سے بڑی تہذیبی اور تعمیری قوت تھی۔ بنجمن کڈ کا یہ خیال تھا کہ تمام تہذیب ان الہیاتی بنیادوں پر استوار ہے جو مذہب اخلاق کو دیتا ہے۔ ٹارڈ کا یہ ایمان تھا کہ بعض دہریوں کی مقدس زندگیاں اس وجہ سے مقدس تھیں کہ وہ مذہبی تربیت کے اثرات دور نہیں کر سکے تھے۔ یہی حقیقت تھی، جس کی طرف رینان نے اس قول میں اشارہ کیا تھا۔ "ہم ایک سایہ کے سایہ پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے بعد لوگ کس چیز پر زندہ رہیں گے؟" جب یہ عقائد نہ رہیں گے تو ان لوگوں کی تخریبی جبلتوں یعنی جھوٹ بولنے، چوری کرنے اور قتل و غارت کے محرکات کو کون سی چیز قابو میں لائے گی؟ رینان کا خیال ہے کہ "مذہب ایک لازمی التباس فکر ہے"۔ ڈوسٹوسکی نے دنیا کے عظیم ناول لکھے، محض یہ دکھانے کے لیے کہ جب لوگ خدا کو ترک کر دیتے ہیں تو شیطان ان کے دماغ پر چھا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب امریکہ سے پہلے ریاست ہمیشہ اپنے آپ کو کسی مذہب سے وابستہ رکھتی تھی اور اخلاقی حمایت کے بدلے اسے اقتصادی اور فوجی امداد بہم پہنچاتی تھی۔ کلیسا اور ریاست کے درمیان موجودہ عناد کا سبب یہ ہے کہ مسیحیت اب قومی مذہب نہیں بلکہ بین الاقوامی مذہب بن گئی ہے۔ کلیسا، خادم کی بجائے اب آقا ہے۔ اور ہر جدید ریاست اپنی حکومت قائم کرتے ہوئے کلیسا کی طاقت کے خلاف لڑنے پر مجبور ہو گئی۔ حکومت میں نر اور مادہ کے اصولوں کا اختلاف، ایک نادر حادثہ ہے اور ممکن ہے کہ اس حادثے کی عمر بہت مختصر ہو۔

پلوٹارک کہتا ہے کہ یہ بات زیادہ ممکن ہے کہ کوئی شہر علاقہ کے بغیر قائم ہو جائے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ریاست خدا پر ایمان کے بغیر قائم رہے۔ بیل کا خیال تھا کہ ایک دہریہ ریاست بالکل ممکن ہے لیکن والٹیئر کا یہ خیال تھا کہ اگر بیل کو چھ سو کسانوں پر حکومت کرنی پڑے تو وہ بھی انتقام ربانی کی تبلیغ کرنے پر مجبور ہو گا۔ نپولین کا خیال تھا کہ مسیحیت کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ "اس نے مفلسوں کو امیروں کے قتل سے باز رکھا"۔ اس نے کہا کہ "اگر پاپائے روم کا وجود نہ ہوتا تو مجھے ایک پاپائے روم ایجاد کرنا پڑتا"۔ ایک مذہب جو ایک گروہ کا مشترکہ ایمان ہو، اس گروہ کو وہ اتحاد اور جذبہ حیات عطا کرتا ہے جس سے ان میں میدان جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگانے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال مسلمان اور جاپانی ہیں۔

اینڈریو: حکومت اور اخلاق کے دوام کے لیے مذہب کی ضرورت کے ضمن میں خاصی بے سروپا باتیں کہی گئی ہیں۔ ڈین سوفٹ، جو مذہب سے خوب واقف تھا، کہتا ہے کہ مذہب محبت کرنا نہیں بلکہ نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ مذہب لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا بھی کرتا ہے اور ان کے دلوں کو ملاتا بھی ہے۔ ذرا ۱۹۲۸ء کے انتخابات کو یاد کیجئے۔ ایک آئرستانی نے کہا کہ "ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم مذہب زدہ ہیں۔ ہم میں سے کوئی پروٹسٹنٹ ہے اور کوئی کیتھولک۔ اگر ہم سب دہریے ہوتے تو ہم اچھے مسیحیوں کی طرح مل جل کر رہ سکتے تھے"۔ آپ جس چیز کو اتحاد کہتے ہیں، میں اسے جمود کا نام دیتا ہوں۔ وہ اتحاد، جو مذہب کسی قوم کو عطا کرتا ہے، روایت اور مطلق فرمانبرداری کا اتحاد ہے۔ اس کی بہترین صورت مشرق کی اجداد پرستی کی روایت ہے۔ اب رہا مذہب کی تہذیبی سرگرمیوں کا سوال۔ بتایئے کہ قدیم مذاہب میں انسانی قربانی کی رسم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور پھر جدید کلیسا کی ادارۂ غلامی کی حمایت اور حالات کو نہ بدلنے کی تلقین کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ ہیوم نے اس خیال کو، مدت ہوئی مسترد کر دیا تھا کہ مذہب اخلاق کی اساس ہے۔ مذہب نے اخلاق کے بعد جنم لیا ہے۔ دونوں میں اگر کوئی تعلق ہے تو صرف یہ کہ اخلاق نے تعلیم اور تحفظ کے ذریعے مذہب کو بہتر بنا دیا ہے۔ سمز نے اس حقیقت کو بیباکانہ طور پر بے نقاب کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "کلیسا نے کبھی اپنے زمانے کی بہترین اقدار کی حمایت نہیں کی۔ ہر تحقیق یہی بتاتی ہے کہ کلیسا نے کبھی کسی اچھے خیال کی پشت پناہی نہیں کی بلکہ حقیقت یوں ہے کہ روحانی اقدار کو حق کے ان پیاسوں نے اپنایا ہے جو ہمیشہ کلیسا سے منحرف رہے ہیں"۔

میتھیو: لیکن کیا یہ بات واضح نہیں ہے کہ مذہبی عقیدے کے انحطاط نے اخلاق میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اپنے ذہنی فساد، جنسی تلون، فحش ادب اور نمائش پسند تمثیل کو دیکھیے۔ آپ کو یہ صفات کلیسا کے پیروؤں میں ملتی ہیں یا "آزاد خیال" لوگوں میں؟ ڈارون کے فلسفے نے ہم میں

قسمت پرستی، یاسیت اور ایک اداس عشرت پسندی کے اوصاف پیدا کر دیئے ہیں۔ ٹامس ہارڈی “اس دائمی حزن” کا ذکر کرتا ہے “جو مہذب لوگوں کے ذہن پر چھا گیا ہے کیونکہ وہ ایک رحیم اور غفور خدا پر ایمان سے محروم ہوگئے ہیں”۔ ہماری نسل ایک اداس اور افسردہ نسل ہے۔ اس کی شادمانی اور مسرت دلوں کے خلا کو فراموش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ آپ کو وہ قول یاد ہے کہ مذہب ہر قوم کے عروج کی علامت ہے اور فلسفہ اس کی موت کا نشان ہے؟

فلپ: نپولین نے کہا تھا کہ “ایک اچھا فلسفی ایک برا شہری ہوتا ہے”۔

میتھیو: ایک برا شہری ایک اچھا فلسفی نہیں بن سکتا۔ کوئی محب وطن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک سطحی اور ہنگامی سائنس اس مذہب کو ختم کر دے جس نے ہماری تہذیب اور ہمارے اخلاق کی تعمیر کی تھی۔ بے دین یورپ اپنے خودغرض طبقاتی مفاد اور انفرادی ہوسناکی سے کب تک مشرق کا مقابلہ کر سکتا ہے، جو مذہب اور صنعت دونوں سے آراستہ ہے؟ اگر آپ اپنی تعلیمات میں انسان کی ان امیدوں کی تضحیک کریں گے جو اس کا محبوب ترین سرمایہ ہیں تو الم اور مایوسی کے اس سیلاب کو روکنا ناممکن ہو جائے گا جو آج ہر دل کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ ڈی موسے اپنی کتاب “ایک نمائندہ صدی کے اعترافات” کے آغاز میں ایک سوال پوچھتا ہے جس کا آپ جواب نہیں دے سکتے۔

> “مسیح کے مخالفین نے مفلسوں سے کہا “تم روز عدل کا صبر سے انتظار کرتے ہو۔ حالناکہ عدل کا وجود نہیں ہے۔ تم اپنے انتقام کے لیے دائمی زندگی کا انتظار کرتے ہو حالانکہ دائمی زندگی کا وجود نہیں ہے۔ تم اپنے اور اپنے بال بچوں کے آنسوؤں کو جمع کر رہے ہو، بچوں کی چیخ و پکار، عورتوں کی آہ و بکا کو اکٹھا کر رہے ہو تاکہ موت کے وقت اسے خدا کے حضور میں پیش کر سکو، حالانکہ خدا کا وجود نہیں ہے۔
>
> مفلس انسان نے اپنے آنسو پونچھے اور اس نے اپنی بیوی سے رونا پیٹنا بند کرنے کو کہا۔ پھر وہ ایک بیل کی سی قوت سے مسلح ہو کر اپنے بچوں کے ساتھ زمین پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے امیروں سے کہا: “تم بھی محض انسان ہو، تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو”۔ اس نے پادری سے کہا “تم مجھے جھوٹی تسلیاں دیا کرتے تھے”۔ مسیح کے مخالفین بس یہی کچھ چاہتے تھے، غالباً وہ یہی سمجھتے تھے کہ انسان کو آزاد ہو کر ہی راحت حاصل ہو سکتی ہے”۔

لیکن اگر مفلس انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ پادری اسے فریب دے رہے ہیں اور امرا اسے لوٹ رہے ہیں، ہر شخص کو یکساں حقوق حاصل ہونے چاہئیں، دنیوی فلاح و بہبود ہی اصل

نکوئی ہے‘ اور یہ افلاس سب سے بڑا گناہ ہے اور اس احساس کے بعد وہ اپنے آپ پر اور اپنے بازوؤں پر اعتماد کر کے یہ کہہ دے کہ ”امیروں سے لڑ کر میں اس زندگی میں راحت و مسرت حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ مجھے زمین کی حکومت چاہیے کیونکہ جنت کا وجود نہیں ہے۔ تمام انسان مساوی ہیں اور سب کو زمین کی دولت میں سے برابر کا حصہ ملنا چاہیے‘ تو اعلی استدلال کرنے والا اچھی طرح سمجھ لے کہ مفلس کو اس مقام پر تم نے پہنچایا ہے۔ اگر وہ جنگ میں شکست کھا گیا تو تم کیا کہہ کر اس کے زخموں کو مندمل کرو گے؟“

آپ نے دیکھا کہ کلیسا کا ایک منصب یہ ہے کہ کمزور کو‘ جسے طاقتور کے مقابلے میں کمزور رہنا ہے‘ سکون قلب عطا کرے“۔ آپ مفلسوں کو بغاوت کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ یہ نہیں سمجھتے کہ دولت مند‘ چالاک‘ طاقتور اور حیلہ جو کے مقابلے میں کمزور لازمی طور پر شکست کھائے گا۔ آپ اس سے اس کا خدا چھین لیتے ہیں اور اسے آزادی کی نعمت دیتے ہیں‘ لیکن آزادی‘ علم اور طاقت کے بغیر کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ لوگ شکست کھا گئے تو آپ ان سے کیا کہیں گے!

فلپ: بہت ممکن ہے کہ ہماری سماج الہیاتی عقائد کے انتشار سے منتشر ہو جائے کیونکہ یہی عقائد ہمارے نظام اخلاق کی اساس تھے۔ غالباً سائنس ان عقائد کا بدل نہیں ہے‘ ہم صرف توسیع علم پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

میتھیو: لیکن تھوڑا علم خطرناک ہوتا ہے اور لوگ اس زندگی میں تھوڑا ہی علم حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کی تعلیم محض ایک مشین ہے جو مردوں اور عورتوں کو حیلہ جو اور عیار بناتی ہے۔

فلپ: ہاں! ابھی ہم تھوڑے علم کی منزل میں ہیں‘ لیکن ہم ترقی کریں گے۔ کسی دن تو علم حکمت بنے گا اور پھر ہم سقراط کی طرح اس حقیقت تک رسائی حاصل کریں گے۔ وہی اخلاق مستقل حیثیت رکھتا ہے جو علم کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اگر ہم تعلیم پر بھروسہ نہیں کرتے تو کسی چیز پر نہیں کر سکتے۔

میتھیو: آپ میں سے چند لوگ رواقیوں کے فطری اخلاق کو پسند کریں گے اور اکثر لوگ عیش و عشرت میں کھو جائیں گے۔ غالباً دو ایک نسلوں کے بعد آپ کو یہ پتا لگے گا کہ بے یقینی انسان کو کہاں لے جاتی ہے لیکن اور پھر لوگ گرجوں کا رخ کریں گے۔ جب آپ فنا ہو جائیں گے لیکن کلیسا پھر بھی زندہ رہے گا اور اسی طرح ہزاروں لوگوں کے دلوں کو روشنی اور سکون قلب کی نعمت عطا کرتا رہے گا۔ لوگ آپ کو فراموش کر دیں گے اور بالآخر مسیح کی طرف رجوع کریں۔

کلیرنس: غالباً یہی ہو گا۔

۴۔ خدا کا نیا تصور

پال: میتھیو، آپ کی باتیں سن کر میں آپ کے کلیسا کا پیرو بن سکتا ہوں، لیکن غالباً مستقبل آپ کا ساتھ نہیں دے گا۔ جوں جوں تعلیم بڑھے گی، لوگ اس ذہنی سطح پر پہنچ جائیں گے کہ حسن اور حق میں تمیز کرنے لگیں۔ اگر مسیحیت محض جہلا کی تسکین کا ایک وسیلہ نہیں رہنا چاہتی تو اسے اپنے آپ کو کوپرنیکس اور ڈارون کی دنیا سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ غالباً مذہب کی بدنصیبی کے یہ دن اس کے لیے رحمت کے دن ہوں گے کیونکہ اس وقت مذہب کو نئے حقائق سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمیں اس نئی کائنات کے لیے ایک نیا خدا چاہیے۔ ہمیں خدا کے تصور کو وسعت دینی ہے۔

لارڈ مارلے نے کہا "سائنس کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ انسانیت کے ایک مذہب کی تخلیق کرے"۔ مذہب کبھی فنا نہیں ہوگا۔ ہم ہمیشہ اپنے سے بہتر ہستی کی تلاش کرتے رہیں گے اور کائنات کے ایک مربوط نظریہ کے متمنی رہیں گے۔ یہ نظریہ فلسفہ ہے۔ جب اس فلسفہ کو جذبات کی گرمی نصیب ہوتی ہے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ اس طرح ہم مذہب اور سائنس کو ایک ہی روح میں بسا سکتے ہیں جیسے وہ لیونارڈو، سپنوزا اور گوئٹے کی روحوں میں مل کر رچ گئے تھے۔

اریئل: کس طرح رچ گئے تھے؟

پال: میں جس خدا پر یقین رکھتا ہوں، وہ قدیم ترین خدا ہے۔ وحشی انسان کا وہ "انا" وہ سرچشمہ حیات جس سے ہر چیز اخذ ہوتی ہے۔ خدا، زندگی ہے، اس کائنات کی تخلیقی قوت ہے، عمل مجرد ہے۔ ہیرٹکلیٹس سے لے کر ہیولاک ایلس تک ہر عظیم شخصیت نے ساکن ترین چیزوں میں بھی موج حیات محسوس کی ہے۔ ایلس کہتا ہے! "یہ دنیا لامحدود زندگی سے بھرپور ہے۔ یہ انکشاف کس نے کیا؟ سائنس نے۔ وہ سائنس، جس کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ اس نے ہمیں حسن و خوبی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ انکشاف اسی نے کیا ہے"۔

ہاں، طبیعیات اور حیاتیات ہمیں نیا خدا دیں گی۔ طبیعیات نے ہر ذرے میں بے پناہ قوت دریافت کی ہے۔ حیاتیات نے ہمیں نشوونما کے اعجاز سے روشناس کیا ہے۔ مذہب ٹھیک کہتا ہے کہ دنیا کی اہم ترین حقیقت تخلیقی قوت ہے، یعنی وہ زندگی، جس کے بغیر بقول سپنوزا، کوئی چیز وجود نہیں حاصل کر سکتی۔ سپنوزا ٹھیک کہتا ہے کہ "ہر چیز زندہ ہے"۔ شوپنہار اور نیٹشے ٹھیک کہتے تھے کہ "مادے کی تہہ میں "عزم" کارفرما ہے"۔ ہیگل ٹھیک کہتا تھا کہ "خدا" وہ ارتقائی عمل ہے جس کے ذریعہ ہر منزل دو متناقض قوتوں میں بٹ کر نشوونما پاتی ہے"۔ ارسطو ٹھیک کہتا تھا کہ "سب چیزوں

میں کمال حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کی تکمیل کی آرزو پوشیدہ ہے"۔ برگساں ٹھیک کہتا تھا "زندگی اور انتخاب، یہی دو چیزیں حقیقت کے راز ہیں"۔ لیکن برگساں یہ غلط کہتا تھا کہ "مادہ اور زندگی متناقض حقائق ہیں"۔ مادہ زندگی کی ایک شکل ہے۔ زندگی ایک آرزو ہے جو لیمارک کے حیاتیاتی فلسفہ میں عضو کے بعد عضو پیدا کرتی ہے اور جسم کو تصور عزم کے مطابق ڈھالتی ہے۔

سائنس نے مجھے یہ مذہب عطا کیا ہے، کیونکہ نظریہ ارتقا میرے خدا کے حق میں ثبوت پیش کرتا ہے۔ مشین کا ارتقا ناممکن ہے۔ ارتقا کو ڈارون کی نظر سے نہ دیکھیے، اس پر لیمارک، شوپنہار اور نیٹشے کی نظر ڈالیے۔ ماحول ذی حیات کی تشکیل نہیں کرتا بلکہ ذی حیات ماحول کو تبدیل کرتے ہیں اور ذی حیات کی اصلیت کیا ہے؟ نہ مٹنے والی آرزو! ایک حقیر حیوان کے ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے آئن شائن، ایڈ-سن اور اناطول فرانس بننے کے ارتقا کو ہم صرف کرشمہ یزدانی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کس قدر عجیب حیوان ہیں! ہم ایک ندی میں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہم دنیا کے اقتصادی میدانوں میں لڑتے ہیں اور قتل و غارت کرتے ہیں۔ ہم جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں اور دوسروں پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی حسین صنم کدے اور کلیسا تعمیر کرتے ہیں۔ کبھی ہم موسیقی اور شاعری کے شاہکار تخلیق کرتے ہیں اور کبھی اپنے بچوں اور اپنی نسل کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے صعود کی ابتدا ہے۔ یہ لمحہ ہمارے ارتقا کے ابتدائے شباب کا لمحہ ہے۔ ہمارے گرد و پیش اور ہمارے دلوں میں نئی زندگی پھوٹ رہی ہے۔ میں جب کسی نئے پودے کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں، یہ خدا ہے۔ جب میں ماں کی آغوش میں کسی بچے کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں، یہ خدا ہے۔ یہ اس کائنات کی تخلیقی قوت کا ایک نشان ہے۔

اینڈریو: مجھے آپ کے خدا کی جنس کے بارے میں شک ہے۔ خدا کو زندگی کے مترادف بنانا اسے شخصیت سے محروم کرنا ہے، آپ اسے خاص طور پر مامتا میں دیکھتے ہیں۔ شاید برنارڈشا کی تحریک سے متاثر ہو کر آپ اپنے خدا کو مادہ سمجھنے لگیں گے۔

پال: جنس دیر سے پیدا ہوئی اور یہ محض ایک سطحی چیز ہے۔ شخصیت بہت بعد میں آئی اور وہ بھی ایک سطحی چیز ہے۔ خدا ان سے ماورا ہے اور ان کے گرد موجود ہے۔ خدا سے شخصیت کو منسوب کرنا خدا کو انسانی روپ میں ڈھالنے کے برابر ہے۔ شخصیت کا مطلب ہی علیحدگی ہے، لیکن خدا علیحدہ اور محض جزوی شخصیت نہیں ہو سکتا۔ خدا ہمارے مختلف "اناؤں" کے پیچھے ایک تخلیقی قوت ہے۔ میں خدا کو "نر" ہی کہتا رہوں گا، اس کے لیے میں مذکر اسم اشارہ ہی استعمال کروں گا۔ برنارڈشا ٹھیک کہتا ہے، نر تخلیق کا محض ایک حادثہ ہے۔ مادہ نسل کی زندگی کے تسلسل کی

براہ راست ذمہ دار ہے۔ وہ جسمانی تخلیق کا مجسمہ ہے۔ جینیئس ہی فقط اس کے برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ جینیئس روحانی تخلیق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ نئی اقدار اور نئے علم کی تخلیق کرتا ہے۔ گوئٹے کا خیال غلط تھا کہ انسانیت خدا ہے۔ جو انسانیت کو جانتا ہے، کبھی اسے قابل پرستش نہیں سمجھ سکتا۔ ہم محض خام مال ہیں، ایک عمارت کی اینٹیں، اس عمارت کے خاکے کو ہم ابھی نہیں دیکھ سکتے۔ صرف تخلیق کے چند لمحات الم میں ہم خدا کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ پارسا دہریہ، نیطشے، کہتا ہے کہ جب میں واگنر کے ہمراہ چلتا تھا تو میں خدا کو محسوس کر سکتا تھا، خدا کو ایک خارجی حقیقت بنا دینے سے حریت عزم اور جینیئس محض فریب نظر بن جاتے ہیں۔ جینیئس اسی صورت میں ممکن ہے کہ خدا ہمارے اندر موجود ہو۔ یعنی وہ مستقل زندگی جو ذرہ سے فیڈیاس کے فن اور مسیح کے الہام کی تخلیق کا باعث بنتی ہے۔ ہر مادی چیز میں زندگی کے احساس کو مذہبی احساس کہتے ہیں۔ وحشی انسان کی طرح ہم ہر درخت، ہر حیوان، ہر محبت اور ہر پیدائش، ذہن اور روح کی ہر عظمت، ہر انحطاط اور موت میں خدا کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم "کل" کے نقطۂ نظر سے جز کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کل میں شرکت کرکے اس کے نشوونما کا ایک سبب بن سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو یہ خدا کی عبادت ہوگی۔

اینڈریو: پال! یہ اچھی شاعری ہے، لیکن اس بیان میں صداقت کم ہے۔ آپ اپنے آپ کو فریب نہ دیجئے۔ ہر سائنس دان اس زندگی کو خدا سمجھنے پر ہنسے گا جو ایک گولی کے نشانے، حرارت کے نشیب و فراز یا ہوا میں آکسیجن کی کمی سے ختم کی جا سکتی ہے۔ اور ہر پارسا روح اس مذہب کا مضحکہ اڑائے گی جو خدا کو آسمان میں نہیں بلکہ پھولوں اور کانٹوں، کتوں اور مکھیوں، فربہ ماؤں اور غلیظ بچوں اور تاریخ موسیقی کے عظیم عطائی، رچرڈ واگنر میں موجود پاتا ہے۔

پال: واگنر کو بھول جائیے اور مسیح کو یاد رکھئے۔ میرے مذہب میں دو عناصر ہیں: زندہ خدا اور انسانی مسیح۔ کیونکہ مسیح خدا کا سب سے اہم پیکر تھا۔ زندگی کی سب سے عظیم تخلیق فکر نہیں، محبت ہے اور انسانی جینیئس کا سب سے بڑا کارنامہ شیکسپیئر کے ڈرامے یا پار تھینوں کے صنم کدے نہیں، بلکہ مسیح کا اخلاق ہے۔ مامتا کے بعد نکوئی کی یہ بہترین قوت ہے۔ میں جانتا ہوں فلپ، کہ آپ مسیح کے اخلاق کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں لیکن آپ ہی نے سپنوزا کا یہ قول دہرایا تھا کہ تمام اچھے کام مشکل اور شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ کسی کام کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ مشکل ہے، اس کے خلاف اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی نصب العین کا یہ فرض ہے کہ ہمیں ہماری جبلتوں سے بلند کر کے تہذیب اور تعاون باہمی کو ممکن بنائے۔ مسیح کا نظریہ کیا ہے؟ اعتدال۔ کیا اعتدال مشکل اور ناقابل عمل ہے؟ اس کے برعکس انسانی تعلقات کی حکمت اعتدال میں مضمر ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جہاں میں مدافعت کرتا ہوں پیکار بڑھتی ہے، جہاں میں رحم و کرم کرتا ہوں مجھے اس کے بدلے

ہزاروں نعمتیں میسر آتی ہیں۔ جہاں میں نے محبت سے کام لیا، میں نے فتح پائی۔ میرے نزدیک دہریہ وہ ہے جو زندگی اور نشوونما کا منکر ہے اور مسیحی وہ ہے جو مسیح کے نظام اخلاق پر سچے دل سے کاربند ہے۔

فلپ: خوب، پال! میں آپ کے کلیسا کا پیرو بننے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ شخصی بقا کے اصول پر اصرار نہ کریں۔

پال: یہ ضروری نہیں کہ چونکہ ہم بعض باتوں پر اختلاف رائے رکھتے ہیں، اس لیے کسی بات پر اتفاق نہ کریں۔ ہمارا اختلاف محض لفظی اختلاف ہے۔ پچھلی نسل ہم سے مختلف باتیں نہیں کہتی تھی۔ وہ محض مختلف الفاظ و علائم استعمال کرتی تھی۔ میرے کلیسا میں ہر وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جو اعتدال کے اصول پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کسوٹی نہیں۔ میرا کلیسا ہر شخص کا خیر مقدم کرے گا، کسی کو نہیں ٹھکرائے گا۔ وہ حسن و حق کا احترام کرے گا۔ وہ ہر فن کی اشاعت کرے گا اور اپنے گرجوں کو "تعلیم بالغاں" کا مرکز بنائے گا۔ وہ اخوت کے بغیر علم کی مذمت کرے گا۔ وہ ہر شک کی اجازت دے گا، بشرطیکہ اس کی انتہا محبت ہو۔

اریئیل: یہاں یہ بحث ختم کر دیں۔ اس کتب خانہ میں، جہاں سینکڑوں سرزمینوں کے عظیم اذہان کی حکمت موجود ہے، ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم سب بھائی ہیں اور یہ کہ مذہب اور اخوت ایک حقیقت کے دو نام ہیں۔ کنفیوشس اور بدھ، یسعیاہ اور مسیح، سپنوزا اور وٹمن ایک ہی مذہب کے پیغمبر تھے۔ اگر ہم ان لوگوں کے مشترکہ خیالات پر متفق ہو جائیں تو یہ بہت کافی ہے۔

* * *

حصہ نہم

باب بست و چہارم

زندگی اور موت

کیا ہم ایک باب میں انسانی زندگی کا کوئی واضح تصور پیش کر سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے' کیونکہ زندگی ایک طلسم ہے' ایک ایسا دریا ہے جس کے سرچشمے سے ہم بے خبر ہیں اور جو اپنے بہاؤ میں اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کا بیان ناممکن ہے۔ پھر بھی ربط کی آرزو ہمیں آگے لیے جاتی ہے۔ تجربے اور تاریخ کے اس صحرا کا نقشہ کھینچنا' ماضی کی ناہموار اور غیر مربوط روشنی کو مستقبل پر بکھیرنا' احساس اوز آرزو کے انتشار میں اہمیت اور مقصدیت پیدا کرنا اور اس طرح اس دریا کے رخ کا اندازہ کر کے اس کے بہاؤ کو قابو میں لانا۔ یہ مابعد الطبیعیاتی طلب ہماری نسل کا ایک حسین پہلو ہے۔ ہم اس باب میں یہ کوشش کریں گے کہ انسان کی زندگی کے آغاز سے لے کر اس کے انجام یعنی موت تک کا ایک مربوط خاکہ کھینچیں۔

۱۔ بچپن

والٹ وہٹمن کہتا ہے: "استدلال کے بعد چھوٹے بچوں کا ایک گروہ داخل ہوتا ہے۔ ان کی طفلانہ حرکتیں اور باتیں میرے اعصاب زدہ بدن پہ لہراتے ہوئے پانی کا سا سکون پیدا کرتی ہیں"۔

ہم بچوں کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ ہماری شخصیتوں کے تسلسل کو قائم رکھتے ہیں۔ ہم انہیں پسند کرتے ہیں کیونکہ ان میں وہ اوصاف ہوتے ہیں جو ہمیں محبوب ہیں لیکن ہم ان اوصاف سے عاری ہیں۔ ان کی فطری سادگی اور ربط عمل‘ ایسے خصائل ہیں‘ جنہیں فلسفی سعی و کاوش سے دوبارہ حاصل کرتا ہے۔ ہم ان کی غیر منافقانہ صاف گوئی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ہمیں سخت ناپسند کرتے ہوئے بھی ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے نہیں۔ ”بچے اور احمق سچ بولتے ہیں۔ اور وہ اپنے خلوص میں سکون و راحت حاصل کرتے ہیں“۔

ذرا نوزائیدہ بچے کو دیکھو۔ غلیظ مگر حیرت انگیز‘ مضحکہ خیز مگر ان گنت ممکنات سے لبریز اور اس طلسم ازلی یعنی نشوونما کی صلاحیتوں کا حامل۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آواز اور درد کا یہ مرکب کبھی محبت‘ تفکر‘ دعا‘ الم‘ تخلیق‘ مابعد الطبیعیات اور موت کے رموز سے آشنا ہو گا۔ وہ چیختا ہے۔ وہ اتنے عرصے اپنی ماں کے پیٹ میں آرام سے پڑا سوتا رہا‘ اب اسے سانس لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور تنفس اسے دکھ دیتا ہے۔ وہ روشنی کو دیکھتا ہے اور وہ اسے دکھ پہنچاتی ہے۔ وہ اب شور و غوغا سننے پر مجبور ہے اور یہ چیز اسے دکھ دیتی ہے۔ اس کا جسم سردی محسوس کرتا ہے اور یہ چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے لیکن فطرت اسے دنیا کے ان ابتدائی حملوں سے محفوظ کرنے کے لیے اسے کم حساس بناتی ہے‘ اسے روشنی کم نظر آتی ہے اور وہ آوازوں کو اس طرح سنتا ہے جیسے وہ دور سے آ رہی ہوں۔ اس کا زیادہ وقت سوتے کٹتا ہے۔

اس کی ماں اسے ننھا بندر کہتی ہے۔ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ چلنا سیکھنے سے پہلے وہ بندر کی طرح ہوتا ہے‘ اس کے بعد انسان بنتا ہے۔ غور کیجئے وہ کس طرح آہستہ آہستہ چیزوں کو چھیڑ کر‘ ہاتھوں میں پکڑ کر اس دنیا سے علم اور واقفیت حاصل کرتا ہے۔ دنیا اس کے لیے ایک معمہ ہے۔ اس معمے کو حل کرنے کے لیے فطرت اسے ہوس علم سے لبریز رکھتی ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور چکھتا ہے۔

یہ بچہ ہمارے فلسفہ کی ابتدا اور انتہا ہو سکتا ہے۔ اس کی طلب علم ہماری مابعد الطبیعیات کا سرچشمہ ہے۔ وہ بہتی ہوئی رواں دواں زندگی ہے جو تمام میکانکی تصورات کو باطل ٹھہراتی ہے۔ یہ عزم توسیع‘ یہ سعی پیہم‘ یہ بے بسی سے طاقت‘ بچپن سے بلوغت اور حیرت سے حکمت تک کا صعود ہی اکثر فلسفیوں کی حقیقت مطلق ہے۔ زندگی نشوونما کی اس بیتابی کا نام ہے جو تحقیق اور طلب سے معمور ہو کر آخری دم تک جہالت اور تاریکی سے برسرپیکار رہتی ہے۔ کوئی میکانکی فلسفہ کسی شجر کی نشوونما یا بچوں کی آرزو اور لطافت احساس کی کماحقہ توجیہ نہیں کر سکتا۔

۲- شباب

بچپن کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ کھیل کھیلنے کا عہد ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض بچوں میں بچپن نہیں ہوتا اور بعض جوان ہمیشہ بچے رہتے ہیں۔ شباب کھیل سے کام کی طرف اور کنبہ کا محتاج ہونے سے خود اعتمادی کی طرف انتقال کا نام ہے۔ یہ انتقال انسان کی زندگی میں خاصا انتشار پیدا کرتا ہے کیونکہ دنیا میں ہر آرزو کی تسکین نہیں ہوتی۔ دنیا میں داخل ہوتے ہی جوان آزادی کے سرور سے سرشار ہو کر، دنیا کی تسخیر اور تشکیل کے لیے میدان میں اترتا ہے۔

ڈیمو ستھینز نے کہا تھا کہ اچھی خطابت کے تین راز ہیں: عمل، عمل اور عمل۔ اس بات کا اطلاق شباب پر بھی ہوتا ہے۔ جوان آدمی میں خدا کی سی خود اعتمادی ہوتی ہے۔ وہ کھانے سے زیادہ معرکہ آرائی پسند کرتا ہے۔ وہ مبالغہ آمیز تصورات اور غیر محدود فضاؤں کا دلدادہ ہوتا ہے اور اپنی بے پناہ توانائی کے اظہار کے لیے نت نئے وسیلے ڈھونڈتا ہے۔ خطرات اسے زندگی کی ہر چیز کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔

جوان ضبط و نظم کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پیتا ہے۔ شور و غلغلہ اس کی زندگی ہے، لیکن اسے خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ عمل کا آرزومند ہے اور اسے ساکن رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس کے خون کی روانی اس سے سرمستی و سرشاری کا تقاضا کرتی ہے اور لوگ اسے متانت اور اعتدال کا سبق دیتے ہیں۔ یہ سپردگی کا عہد ہے اور اس کا اصول ہے کہ "بے اعتدالی سے زیادہ کوئی چیز کامیاب نہیں ہو سکتی"۔ جوان کبھی نہیں تھکتا، وہ حال میں رہتا ہے، ماضی پر افسوس نہیں کرتا اور مستقبل سے خوف نہیں کھاتا۔ یہ حواس اور آرزو کی پیہم تحریک کا عہد ہے۔ اس عمر میں ہر لمحہ محبوب ہوتا ہے۔ دنیا ایک جمالیاتی منظر ہے، جس سے شدید لذت حاصل کی جا سکتی ہے، جس کے متعلق انسان شعر کہہ سکتا ہے اور اپنی قسمت پر ناز کر سکتا ہے۔ خوشی شباب کی طرح جبلتوں کے آزاد کھیل کا نام ہے۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر لوگ محض اسی عہد میں زندہ رہتے ہیں اور چالیس برس کی عمر میں اس عہد کی ایک افسردہ یادگار رہ جاتے ہیں۔ زندگی کا المیہ یہ ہے کہ زندگی ہمیں حکمت اس وقت عطا کرتی ہے جب وہ ہم سے شباب چھین لیتی ہے۔

صحت عمل سے حاصل ہوتی ہے اور شباب کو آراستہ کرتی ہے۔ مصروفیت اطمینان قلب کا راز ہے۔ ہمیں خدا سے ملکیت کی توسیع کی دعا نہیں مانگنی چاہیے بلکہ کام کرنے کی اہلیت کی طلب کرنی چاہیے۔ تھورو نے کہا ہے کہ جنت الارض میں ہر شخص اپنا مکان خود بنائے گا، دلوں میں ایک بار پھر نغمہ پیدا ہو گا، جس طرح اس طائر کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو اپنا گھونسلا خود بناتا ہے۔ اگر ہم

اپنے گھر خود تعمیر نہیں کر سکتے تو کم سے کم ہم چل پھر سکتے ہیں، چیزیں پھینک سکتے ہیں، دوڑ سکتے ہیں۔ ہمیں کبھی اتنا بوڑھا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کھیل کھیلنے کی بجائے کھیل دیکھنے لگیں۔ کھیل، دعا کی طرح لازمی ہے۔

اس لیے جب جوان کھیل کو علم و فلسفہ پر ترجیح دیتا ہے تو وہ اچھا کرتا ہے۔ جب ایک چینی کرم کتابی نے امریکی یونیورسٹیوں کے متعلق یہ کہا "یہ ورزشی ادارے ہیں جہاں کمزور جسم والوں کو پڑھنے کے بھی چند مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں"۔ اس چینی طالب علم کا یہ قول ہماری یونیورسٹیوں کے خلاف نہیں جاتا۔ ہر مفکر کو کھلاڑی ہونا چاہیے۔

ہمارے جوان پڑھنے بھی لگے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اگر انسان اسے زندگی میں استعمال نہ کر سکے۔ زندگی تعلیم دیتی ہے اور زندگی میں محبت سب سے زیادہ جامع اور مکمل ذریعہ تعلیم ہے۔

عنفوان شباب کے عہد میں لڑکا اور لڑکی دونوں کے لاابالی طرز عمل پر تفکر کا بادل چھا جاتا ہے۔ وہ دونوں اپنے جسموں کی آرائش و ترصیع پر اپنا وقت اور اپنی دولت صرف کرتے ہیں۔ لڑکی شرمانا سیکھتی ہے اور لڑکا اپنی ہر حرکت اور ہر عمل میں ایک حجاب آمیز تذبذب محسوس کرتا ہے۔

جنس کے بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ ذہن بھی ترقی کرتا ہے۔ جبلت کی جگہ فکر اور عمل کی جگہ پریشانی لے لیتی ہے۔ جوان ہر چیز کا معائنہ کرتا ہے اور اس دنیا کے ماخذ اور مقاصد پر غور کرتا ہے۔ جنسی آرزو جمالیاتی احساس پر تازیانہ کا کام کرتی ہے اور نغمہ فن اور رقص ظہور میں آتے ہیں۔

دنیا کو دریافت کر کے جوان "شر" کے وجود سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس کا خاندان تعاون باہمی اور محبت کی اساس پر استوار تھا، مگر اس دنیا میں لاٹھی بھینس کو ہانکتی ہے۔ وہ پریشان ہو کر بغاوت کرتا ہے، چیختا ہے چلاتا ہے کہ آؤ اس دنیا کو ایک خاندان کے رشتوں میں منسلک کر دیں، لیکن تھوڑی مدت کے بعد تقابل کا نشہ اس کے خون میں رچ جاتا ہے اور وہ بھی زر و دولت کی ہوس میں ہاتھ پھیلانے لگتا ہے۔ بغاوت ختم ہو جاتی ہے اور تقابل کا کھیل جاری رہتا ہے۔

آخر میں جوان محبت دریافت کرتا ہے۔ یہ محبت بچپن میں بھی معصومیت اور شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے، لیکن اب اس محبت میں جسم اور روح دونوں کی طلب گہری ہو جاتی ہے۔ لڑکی میں جب زندگی موجزن ہوتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ لڑکا سراپا اضطراب و بیتابی ہے، لیکن صبر و تحمل کے ساتھ لڑکی کا دل موہتا ہے۔ زندگی کا یہ حسن دنیا کی تمام خرابیوں پر حاوی ہے۔

یہی انسان کی تہذیب کی معراج ہے۔

اگر جوان عقلمند ہے تو وہ محبت کو سب سے زیادہ اہمیت دے گا۔ لڑکی کا دل موہنے میں صبر اور احتیاط سے کام لے گا اور شادی، مذہبی رسوم کی دل آویز جھنکار کے ساتھ رچائے گا۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو محبت کے تابع کرے گا۔ حکمت اگر جوان ہو تو وہ محبت کو سپردگی سے پروان چڑھائے گی، ایثار سے اس میں شدت پیدا کرے گی، تولید سے اسے مستحکم کرے گی اور دو عالم کے ہنگاموں کو اس کا فرمانبردار بنائے گی۔ محبت کا مقام اور درجہ سب سے پہلا ہے، چاہے وہ المناک نتائج سے ہمیں تباہ کر دے یا فراق کی آگ میں بھسم کر دے!

۳۔ کہولت

جوان شادی کر لیتا ہے اور شباب ختم ہو جاتا ہے۔

مرد اور عورت شادی کے دوسرے ہی دن اپنی عمر میں پانچ سال کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے کہولت شادی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ بے پروائی ختم ہو جاتی ہے اور کام اور ذمہ داری کا دور شروع ہوتا ہے۔ کہولت مختلف ممالک میں مختلف عمروں میں آتی ہے۔ سٹینلے ہال کہتا ہے: "وہ نوجوان اہل مشرق جو تیرہ برس کی عمر میں شادی کرتے ہیں، اکثر تیس برس کی عمر میں بڈھے ہو جاتے ہیں اور پھر کشتے اور طاقت کی دوائیں کھاتے ہیں۔ گرم ممالک کی عورتیں تیس سال کی عمر میں معمر ہو جاتی ہیں۔ یہ اصول عمومی طور پر صحیح ہے کہ جو لوگ دیر سے بلوغت حاصل کرتے ہیں، وہ دیر سے بڈھے ہوتے ہیں"۔ اگر ہم جنسی بلوغت کو اقتصادی خود اختیاری کے زمانے تک ملتوی رکھیں تو ہم عنفوان شباب اور عہد تعلیم کو طوالت دے کر ماضی سے کہیں بہتر تہذیب پیدا کر سکتے ہیں۔

زندگی کے ہر دور کے اپنے محاسن و مصائب، فرائض و لذائذ ہوتے ہیں۔ جس طرح ارسطو نے اعتدال کو کمال اور حکمت کا راز ٹھہرایا تھا، اسی طرح ہم شباب، بلوغت اور پیرانہ سالی کے مخصوص خصائل کی فہرست بنا سکتے ہیں۔ مثلاً

شباب	کہولت	پیری
جبلت	قیاس	استخراج
جدت	عادت	رسم

ایجاد	عمل	رکاوٹ
کھیل	کام	آرام
فن	سائنس	مذہب
تخیل	ذہن	حافظہ
مفروضہ	علم	حکمت
رجائیت	امید آفرینی	یاسیت
انقلاب پسندی	حریت پرستی	رجعت پسندی
مستقبل سے شغف	حال سے شغف	ماضی سے شغف
جرات	شعور	احتیاط
آزادی	تنظیم	جبر

یہ فہرست لامتناہی طور پر طویل ہو سکتی ہے۔ اس سے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے لیے تشفی کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ یہ عمر کارہائے نمایاں کر گزرنے کی عمر ہے۔ پینتیس سال کی عمر میں ایک مرد اپنے کمال پر ہوتا ہے۔ وہ وسیع تجربہ اور شعور سے اپنی جذباتی تندی کو تخلیقی کاموں کے لیے وقف کر سکتا ہے۔ غالباً ذہنی کمال جسمانی پختگی کے ساتھ آتا ہے جو عموماً بتیس سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہے۔ ایلس کہتا ہے کہ برطانیہ کی اکثر عظیم شخصیتیں اس وقت پیدا ہوئیں جب ان کے والدین کی عمریں بتیس اور چونتیس سال کے درمیان تھیں۔

جب ہم اقتصادی دنیا میں اپنے لیے کوئی جگہ بنا لیتے ہیں تو جوانی کے باغیانہ جذبات دب جاتے ہیں۔ جب ہمارے پاؤں زمین پر جمے ہوں تو ہم زلزلوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہم اپنی انقلاب پسندی کو ایک نرم رو آزاد خیالی میں ڈھال لیتے ہیں۔ انقلاب پسندی دولت کے حصول سے دھیمی پڑ جاتی ہے۔ جوں ہی ہم ماحول کو اپنے لیے سازگار بنا لیں، ہم کسی بنیادی تبدیلی سے خوفزدہ رہنے لگتے ہیں، چالیس برس کی عمر کے بعد ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا ساکن ہو جائے اور زندگی کا بہاؤ رک جائے۔

کہولت میں قدامت پسندی کی ایک اور وجہ ذہانت ہے۔ ہم اس عمر میں اداروں کی پیچیدگی اور آرزو کی خامیوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ تھکا ماندہ انسان اخلاقی نقطۂ نظر سے بے داغ شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہم پہلے تو گھٹتی ہوئی قوت کو محسوس نہیں کرتے، پھر مایوس ہو کر اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہم پہلے موت کا خیال ہی نہیں کرتے تھے اور کرتے بھی تھے تو محض علمی نقطۂ نظر سے، لیکن اب موت قریب اور اٹل نظر آتی ہے۔ ہم کام، مسلسل کام اور جوانوں کی صحبت میں کچھ وقت کے

لیے اس المناک حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

کہولت، کام اور تولید میں تسکین حاصل کرتی ہے۔ جوانی کی آرزوئیں جب زندگی کے مرکزی ایام کے تحمل اور احتیاط کے زیر اثر آتی ہیں تو وہ کیے ہوئے کاموں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور تسخیر عالم کے خوابوں سے گریز کرتی ہیں۔

شباب کا کام یہ ہے کہ وہ مزید تسخیر کائنات کے لیے نئے نئے خیال پیدا کرے۔ پیری کا یہ کام ہے کہ وہ اس خیال کی قوت کو آزمانے کے لیے اس کی مخالفت کرے، اور کہولت کا یہ وظیفہ ہے کہ اس خیال کو قابل عمل بنانے کے لیے اس میں قطع و برید کرے۔ جوانی تجویز کرتی ہے، بڑھاپا مخالفت کرتا ہے اور کہولت ان دونوں کے بین بین فیصلہ کرتی ہے۔ شباب، دور انقلاب پر حاوی ہوتا ہے، پیری رسم و رواج کے دور میں اور کہولت تعمیری دور پر مسلط ہوتی ہے۔ نیٹشے نے کہا تھا کہ انسان جنگل کی آگ کی مانند ہیں۔ جب وہ بھسم ہو جاتے ہیں تو مفید بن جاتے ہیں لیکن جب وہ بھڑکتے اور دھواں دھار حرکتیں کرتے ہیں تو دلچسپ تو ہوتے ہیں لیکن تکلیف دہ اور بے سود ثابت ہوتے ہیں۔

شباب رومانی ہوتا ہے۔ اس پر تخیل اور جذبات حاوی ہوتے ہیں۔ پیری، کلاسیکی ذوق رکھتی ہے اور ضبط و نظم کو پسند کرتی ہے۔ کہولت ان دونوں کے درمیان رہ کر رومانی اور کلاسیکی اقدار کو ملا کر انھیں مرئی وجود عطا کرتی ہے۔ ڈے کارٹ کہتا ہے، علم کا اصول واضح فکر ہے۔ جو چیز وضاحت سے سمجھی جائے، وہی حقیقت ہے۔ کردار کا بنیادی اصول ہے۔ وضاحت سے آرزو کرنا، اسی طرح آرزوئیں شخصیت اور عزم کے قالب میں ڈھلتی ہیں۔ کہولت ہمیں مربوط آرزو عطا کرتی ہے۔

کہولت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں اعتدال بخشتی ہے۔ اس میں خطرہ یہ ہے کہ ہم "اوسط" انسان نہ بن جائیں۔ سعی و کاوش سے پہلو بچا کر تواتر اور یکسانیت کی زندگی بسر کرنا کس قدر آسان ہے؟ یہ خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور ہم میں سے اکثر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ قیلولہ اس کی ابتدا اور علامت ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اعتدال سے اوسط درجہ کا انسان پیدا ہو۔ اعتدال ذہن کی طاقت اور عقل کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔ نیٹشے جیسا غیر معتدل انسان بھی لکھتا ہے کہ "توازن اور اعتدال اعلیٰ صفات ہیں جن کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہیے، فقط چند لوگ ہی ان کی طاقت اور اہمیت سے واقف ہیں"۔

ان مفکروں سے قطع نظر اکثر لوگ کہولت کی ایک اور ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایک

عام ادھیڑ عمر کا آدمی صبح کو ناشتہ پر اخبار پڑھ کر بیوی اور بچوں کو جلدی سے پیار کر کے دفتر چلا جاتا ہے۔ دفتر میں کیا کرایا کام اسے مل جاتا ہے اور وہ گھر پہنچنے کے انتظار میں وقت گزار دیتا ہے۔ شام کو وہ گھر پہنچ جاتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ اسے واپس لوٹنے کی جلدی کیوں تھی؟

بیوی سے اس کی محبت سرد پڑ جاتی ہے۔ وہ بازار کی حسین و جمیل عورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ دو ایک مرتبہ بیوی سے بے وفائی کے گناہ کا بھر مرتکب ہوتا ہے، لیکن گناہ کی بے کیفی سے بیزار ہو کر پھر گھر کا رخ کرتا ہے اور بیوی سے محبت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی وقت وہ گھر کے باغیچہ کی قطع و برید اور آرائش و ترصیع میں مصروف رہتا ہے۔ تاش اور گولف کھیلتا ہے اور شہر کی سیاسیاست میں سرسری دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ سیاسیات میں کوئی دیانت دار شخص دلچسپی نہیں لے سکتا، وہ خاموشی سے گھر آ بیٹھتا ہے اور سکارنٹیاڈو کے ان الفاظ کی صحت محسوس کرتا ہے: ”میں نے دنیا کے سفر میں ہر حسین اور نادر شے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سوائے اپنے گھر کے اب کوئی اور جگہ نہیں دیکھوں گا۔ میں نے شادی کر لی اور جلدی ہی میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی مجھ سے بے وفائی کرتی ہے۔ اس شک کے باوجود میں نے یہ دیکھا کہ زندگی کی تمام کیفیات میں یہی بہترین کیفیت ہے“۔

اس عرصے میں اس کی بیوی نے بھی زندگی سے کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رومان کی گرمی ختم ہو چکی ہے۔ اور وہ محض گھر کا کام کاج کرنے والی بیوی بن گئی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ وہ اس شخص کے لیے اپنے آپ کو حسین و جمیل کیوں بنائے جو اسے محض ایک مفید خادمہ سمجھتا ہے۔ بالا خر وہ گھر کے کام کاج کو ترک کر کے اجتماعی بہبود کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہے۔

اور پھر وہ ماں بن جاتی ہے۔ وہ اس حادثہ سے خوش بھی ہے اور خوفزدہ بھی۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ اب وہ عورت بن گئی ہے، محض نمائش کا سامان نہیں رہی۔ وہ دعا کرتی ہے کہ لڑکا پیدا ہو، لیکن جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو کچھ عرصہ رونے کے بعد وہ اپنی بیٹی کا حسن دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے۔ وہ اس کے لیے دن رات محنت کرتی ہے اور ”خوشی“ کی تلاش نہیں کرتی اور اپنے اندر ایک خاص قسم کا سکون اور روشنی محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کو بھی مطمئن دیکھتی ہے۔ اس طرح فطرت ہماری بڑی قربانیوں کے عوض ہمیں بہترین خوشیاں عطا کرتی ہے۔

۴- موت

میرے ایک سنگ دل دوست نے کہا ہے: ”لوگوں کو اپنے عروج پر پہنچ کر مرجانا

چاہیے لیکن وہ مرتے نہیں، اس لیے بازار میں چلتے پھرتے اکثر شباب اور موت کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے"۔

بڑھاپا کیا ہے؟ بنیادی طور پر یہ جسم کی ایک کیفیت ہے۔ جسم کی موج حیات اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ بڑھاپا جسمانی اور ذہنی انحطاط کا دور ہے۔ یہ رگوں، فکری پیمانوں، خون اور تدبر کے سکڑنے کی حالت ہے۔ ایک انسان اتنا ہی زندہ ہے جتنی کہ اس کی رگیں اور اتنا ہی جوان ہے جتنے اس کے خیالات۔

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ سیکھنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ دماغ اپنے لیے ایسے ڈھرے بنا لیتا ہے، جو نئے اور نادر واقعات کو قبول نہیں کرتے اور حافظہ ناتواں ہو جاتا ہے۔

جس طرح بچہ بہت جلدی پھلتا پھولتا ہے، اسی طرح بوڑھا ہر روز زیادہ مرجھاتا رہتا ہے اور جس طرح بچے میں حس کم ہوتی ہے، اسی طرح بوڑھا بھی کم حساس ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اس میں آگہی اور شعور بالکل ختم ہو جاتے ہیں تاکہ موت اپنا عمل اچھی طرح کر سکے۔ جوں جوں حواس مدہم پڑتے ہیں، توانائی بھی گھٹتی رہتی ہے۔ موت کے خوف کے ساتھ آرام اور سکون کی خواہش مل جاتی ہے اور اگر انسان نے یہ زندگی بھرپور طریقے سے گزاری ہو تو پھر وہ اطمینان سے جان دے دیتا ہے کہ شاید اس زندگی کے ہنگامہ میں مجھ سے بہتر لوگ میری جگہ لے لیں۔

لیکن اگر یہ ہنگامہ کبھی بہتر نہ ہوا، اگر یہ زندگی اندوہ اور مرگ کے محور کے گرد گھومتی رہی، اگر نئے سوار پیدا ہوتے رہے، نئی نئی راہوں کی تعمیر کے بعد پھر ایک ہی المناک انجام کا شکار ہوتے رہے، اگر میرے بعد بھی دنیا میں زناکاری، قتل و غارت، اندیشے، فریب اور وبائیں بھی بدستور جاری رہیں تو موت میں کوئی تسکین کا پہلو نہیں رہتا۔ اگر میرے بعد بھی لوگوں نے وہی غلطیاں کیں، انہی برائیوں سے لوگ متاثر ہوئے اور اسی طرح دکھ جھیل کر مر گئے تو موت فنائے مطلق ہے اور اس لیے مہیب اور خطرناک خلا۔

یہ ہے بڑھاپے کا المیہ کہ وہ ماضی کو رومانی نظروں سے دیکھ کر کبھی کبھی اس میں اندوہ و الم کے علاوہ اور کچھ نہیں پاتا۔ زندگی جب ساتھ چھوڑ رہی ہو تو اس کی مدح و ستائش کیونکر ہو سکتی ہے۔ مدح و ستائش اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمیں یہ امید ہو کہ ہم اس موت کے حادثہ کے بعد بھی کسی بہتر حالت میں زندہ رہیں گے۔

یہ عظیم الشان کلیسا، جو دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں، مایوسی کو نظرانداز کر کے دلوں

کو امید کی دعوت دیتے ہیں۔ کیا موت کا مطلب فنا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں لیکن جب تک لوگ غمزدہ ہیں، یہ کلیسا قائم رہیں گے۔

لیکن کیا ہم زندگی کی خاطر ہی نہیں مرتے؟ ہم محض علیحدہ فرد نہیں، ہم زندگی کے سمندر کی موجیں ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو زندگی کی رو سے الگ سمجھتے ہیں تو موت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ ہم اس لیے مرتے ہیں کہ زندگی جوان اور توانا رہے۔ اگر ہم ہمیشہ زندہ رہتے تو نشوونما ختم ہو جاتی اور نوجوانوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہ رہتی۔ جذبہ محبت کی بدولت ہم اپنی زندگی دوسرے جسموں کو عطا کرتے ہیں۔ موت سے پہلے زندگی اپنے آپ کو تازگی اور بقا بخشتی رہتی ہے۔

بڑھاپے میں یہ حکمت پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم ہر چیز کا دوسری چیز سے تعلق دیکھیں اور کل کے نقطۂ نظر سے اجزاء کا مشاہدہ کریں۔ یہ شعور موت کو قابل برداشت بناتا ہے۔ اچھا فلسفہ وہی ہے جو زندگی کی اہمیت واضح کر کے موت کو شکست دیتا ہے۔ حکمت یہی بتاتی ہے کہ موت جزو کو آتی ہے لیکن زندگی قائم و دائم ہے۔

تین ہزار سال گزرے، ایک شخص نے سوچا کہ انسان شاید فضاؤں میں پرواز کر سکے۔ اس نے اپنے لیے پر و بال بنائے۔ اس کے بیٹے، آئی کیریلس نے اس پر و بال کی مدد سے اڑنا چاہا تو سمندر میں گر پڑا، لیکن زندگی نے اس خواب کو قائم رکھا۔ لیونارڈو نے پرواز کی ایک کل ایجاد کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا، لیکن کئی نسلوں کے بعد انسان فضاؤں میں پرواز کرنے کے قابل ہوگیا۔ زندگی تین ہزار برس تک ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کی سعی پیہم کا نام ہے۔ وہ کبھی ہتھیار نہیں ڈالتی۔ فرد ناکام ہو سکتا ہے لیکن زندگی کی جیت ہوتی ہے۔ فرد مر جاتا ہے لیکن زندگی طلب اور تجسس حیرت اور آرزو میں منہمک رہتی ہے۔

ایک بڈھا آدمی بستر مرگ پر پڑا ہے۔ بے بس دوست اور غمزدہ اقارب، اس کے پاس ہیں۔ کتنا خوفناک منظر ہے یہ! یہ گلے سڑے گوشت کا ناتواں جسم، پچکے ہوئے گالوں میں یہ بے دندان دہن، یہ قوت گویائی سے محروم زبان، یہ بصارت سے محروم آنکھیں! جوانی اپنی امیدوں اور آزمائشوں کے بعد، کہولت اپنی محنت شاقہ اور غم و درد کے بعد اس مقام پر پہنچی ہے۔ صحت، طاقت اور خوش آئند تقابل کا یہ انجام ہونا تھا۔ یہ بازو جو کبھی مردانہ کھیلوں میں پر زور ضربیں لگایا کرتے تھے، اب ناکارہ ہیں! یہ ہے علم، سائنس اور حکمت کی انتہا۔ ستر برس تک اس انسان نے جانفشانی اور عرق ریزی سے علم و فضل حاصل کیا۔ اس کا ذہن ہزاروں تجربات

اور ہزاروں افکار و اعمال کی آماجگاہ تھا۔ حزن و غم کی بدولت اس کے دل نے رحم و کرم اور اس کے ذہن نے شعور سیکھا۔ ستر برس میں وہ حیوان سے انسان بنا اور حق کی جستجو اور حسن کی تخلیق کرتا رہا۔ لیکن اب موت آئی ہے۔ موت نے اس کے خون کو سرد، دل کو بند، دماغ کو پاش پاش اور حلق کو جامد کر دیا ہے۔ بالاخر جیت موت ہی کی ہوتی ہے۔

باہر کھلی ہوا میں طیور چمک رہے ہیں اور مغنی آفتاب کی بارگاہ میں گیت گا رہا ہے۔ روشنی میدانوں پر پھیل رہی ہے، غنچے پھوٹ رہے ہیں، پودے آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اشجار میں قوت نمو کارفرما ہے۔ یہ بچے ہیں، ذرا دیکھئے یہ کتنے خوش ہیں۔ شبنم آلود گھاس پر دوڑ رہے ہیں، ہنستے ہیں، شور مچاتے ہیں اور ان تھک کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ بھی علم حاصل کریں گے، تجسس سے بہرہ اندوز ہوں گے، محبت کریں گے، تخلیق کریں گے۔ اور غالباً مرنے سے پہلے زندگی کو کچھ اور زیادہ بہتر بنا دیں گے۔ مرنے سے پہلے وہ اور بچے پیدا کر کے موت کو فریب دیں گے اور اچھے والدین کی طرح ان بچوں کو اپنے آپ سے زیادہ بہتر انسان بنائیں گے۔ شام کو باغ میں عاشق و محبوب اکٹھے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ ان کی خاموش بات چیت میں ان کیڑوں کی آوازیں گھل مل رہی ہیں جو اپنے محبوبوں کو بلا رہے ہیں۔ یہ قدیم طلب، آرزو مند مگر پر حجاب آنکھوں کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے اور ایک پاکیزہ جنون ہاتھوں اور ہونٹوں میں موجزن ہوتا ہے۔ بالاخر جیت زندگی ہی کی ہوتی ہے۔

* * *

تاریخ اور سیاست پر تخلیقات کی مستند کتب

میری کہانی	جواہرلال نہرو	250 روپے
تلاش ہند	جواہرلال نہرو	250 روپے
تاریخ عالم پر ایک نظر	جواہرلال نہرو	160 روپے
تاریخ پنجاب	سید محمد لطیف	500 روپے
تاریخ لاہور	سید محمد لطیف	300 روپے
احمد شاہ ابدالی	گنڈا سنگھ	200 روپے
انسانی تمدن کی داستان	باری علیگ	80 روپے
اسلامی تاریخ و تہذیب	باری علیگ	70 روپے
تاریخ کیا کہتی ہے	ڈاکٹر مبارک علی	35 روپے
غلامی اور نسل پرستی	ڈاکٹر مبارک علی	35 روپے
المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو	وسیم گوہر	200 روپے
گواہی	وسیم گوہر	120 روپے
لیبیا سازش کیس	افضل توصیف	100 روپے
پاکستان برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک	روش ندیم	100 روپے
پاکستان قیام اور ابتدائی حالات	سری پرکاش	70 روپے
ہندوستان	ول ڈیورائٹ	160 روپے

تخلیقات

اکرم آرکیڈ، ۲۹ ٹمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۴

Get more e-books from www.ketabton.com